سسپنس ڈائجسٹ
CPNE MEMBER APNS

مدیرِ اعلیٰ
عذرا رسول

مدیرہ
یمنیٰ احمد

نائب مدیر
اطہر حسین

مینجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

سرکولیشن مینجر
سید منیر حسین
0333-3285269

07 انشائیہ
جون ایلیا
انسان کی ناگزیر ضروریات کے حوالے سے افسردہ و دل گرفتہ شخص کے احساسات

08 آپ کے خط ۲
مدیر اعلیٰ
سسپنس کی مجلس مشاورت و قارئین کی تلخ و شیریں باتیں، گلے شکوے اور پرخلوص مشورے

12 رقصِ شمشیر
ڈاکٹر عبدالرب بھٹی
ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

47 ڈیڑھ ہوشیار
تنویر ریاض
خیالی کردار کو تخلیق کرنے والے ایک زیرک مجرم کا فسانہ

56 شہ زور
اسما قادری
اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی تحیر انگیز داستان

جلد 51 • شمارہ 02 فروری 2022 • زرِ سالانہ 1800 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 120 روپے •
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: (021) 35895313 E-mail:jdpgroup@hotmail.com

TAGBK.COM

85 **ہانی شہہ مرید**
منظر امام
ٹوٹے دلوں اور بکھرے خوابوں کی دل گداز اور عبرت اثر روداد

96 **ساز باز**
مرزا امجد بیگ
مجرموں کی ساز باز اور قدرت کی منصوبہ سازی کی دلچسپ معرکہ آرائی

125 **قصور وار**
شاہ زین رضوان
ایک معصوم مجرم کے بھیانک قصور کا عبرت ناک انجام

134 **محفلِ شعر و سخن**
قارئین
آپ کے ہاتھوں سجی ایک انجمن رنگ رنگ آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

137 **پردہ**
محمد فاروق انجم
انجام سے بے خبر بے سمت مسافروں کے سفر کی دلخراش روداد

150 **کانچ محل**
طاہر جاوید مغل
ٹوٹے خوابوں کی کرچیوں پر محوِ سفر...... ایک بے باک مگر گھائل عشق اور حسن کی فتنہ سامانیوں کی طویل داستان

181 **پُراسرار**
میاں محمد احمد
ایک رات کے پراسرار میزبانوں کی پرلطف ضیافت کا احوال

185 **زندہ لوگ**
ڈاکٹر شیر شاہ سید
پردیس جانے والوں کی دائمی جدائیوں کی پرسوز روداد

191 **شیخ ابوالعباس قصاب**
ضیا تسنیم بلگرامی
ایک ایمان پرور اور جاں فزا معلوماتی تحریر

205 **انوکھی واردات**
سید غضنفر محمود
دلوں میں بڑھتی رنجشوں سے جنم لینے والی سازشوں کا قصہ

210 **بے وفائی**
صبا مغل
محبت کی گرفت میں پل پل بے کل رہنے والے عاشقوں کے استقلال اور آبلہ پائی کی عبرت اثر داستان

** **کترنیں**
ادارہ
دنیا بھر سے ادھر ادھر سے لطیفے چٹکلے اقتباسات مسکراہٹیں اور قہقہے سب کچھ آپ کے لیے

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

TAGPK.COM

انشائیہ

بھوک

جون ایلیا

''یہ ابر و باد کی شام ہے جون ایلیا اور بہت فرحت انگیز شام ہے۔''

ہاں، یہ ابر و باد کی شام ہے نشیان! مگر فرحت انگیز شام ہرگز نہیں ہے۔''

''لیکن یہ ایک فرحت انگیز شام کیوں نہیں ہے؟''

''بس نہیں ہے۔ یہ میرا باطنی احساس ہے اور رہا ''کیوں'' تو اس کا جواب نہ میرے پاس ہے اور نہ پروٹا گورس اور افلاطون کی روحوں کے پاس ہے۔ بہرحال چند لمحے پہلے میں کچھ کہہ رہا تھا نشیان! جانے کیا کہہ رہا تھا؟''

''تم روزی اور پوشش کی بات کر رہے تھے۔ یعنی روٹی اور کپڑے کی بات۔''

''ہاں، میں روٹی اور کپڑے اور انسان کی دوسری ناگزیر ضرورتوں کی بات کر رہا تھا۔ ذرا سوچو تو سہی، محسوس تو کرو کہ روٹی کتنی مہنگی ہو گئی ہے اور کپڑا کتنا مہنگا ہو گیا ہے۔ اب تو کچھ ایسا ہے کہ ہمارے مُردے بے کفن دفن کیے جایا کریں گے اور روٹی اور کپڑے کی بات تو ہے ہی، اب تو پانی تک مہنگا ہو گیا ہے۔ روشنی مہنگی ہو گئی ہے۔ ہمارے اندر اتنا سوکھا پن پایا جاتا ہے کہ آنسو تک مہنگے ہو گئے ہیں۔ ہم اس تیرہ نصیبی میں مبتلا ہیں کہ بینائی تک مہنگی ہو گئی ہے۔''

''ہاں ایسا تو ہے جون ایلیا!''

''ایسا ہی ہے نشیان ایسا ہی ہے۔ تیری دانش اور بینش کی قسم، ایسا ہی ہے۔''

''مگر آخر ایسا کیوں ہے؟''

''ایسا یوں ہے نشیان کہ ہم بے حس ہو گئے ہیں۔ اتنے بے حس کہ اپنے معمولی سے معمولی حق کی بات بھی پوری دل گیری کے ساتھ ہمارے لبوں تک نہیں آتی۔ ہم نے اپنے آپ سے اتنی غیریت اختیار کر لی ہے کہ بے غیرت ہو کر رہ گئے ہیں۔''

''ہاں سچ کہا تم نے جون ایلیا! سچ کہا۔ ہم بے حس، بے غیرت اور بے حیا ہو گئے ہیں۔ یہ تو ہمارا بڑا ابینڈا پن ہے۔ یہ بینڈا پن تو ہمارا کھوجڑا کھودے گا۔''

''ارے بڈیم، بوزم! اتو اب بھی یہ کہہ رہا ہے کہ یہ بینڈا پن تو ہمارا کھوجڑا کھودے گا۔ میاں جی! اس نے ہمارا کھوجڑا کھودیا۔ ہم اذیت اور عقوبت سہنے کے ہنر میں مشاق اور طاق ہیں۔ اس ہنر میں ہماری مہارت شہرۂ آفاق ہے۔ کسی کا مقولہ ہے، شاید میرا ہی مقولہ ہے کہ ہمارا اپنی قبروں کے کتبے لکھنے میں کوئی جواب نہیں ہے۔ ہم اس باب میں بے مثال اور بے ہمال ہیں۔

''ہماری روداد بڑی بُری روداد ہے نشیان! ہماری تاریخ کی بدترین حرکتیں ظہور میں آرہی ہیں اور ہم خاموش ہیں۔ نہ جانے ہم ہیں بھی کیوں۔ ہم آخر دنیا کی کس کمی کو دور کر رہے ہیں۔ ہم آخر سماج کے کس پھٹے ہوئے گریبان کی بخیہ گری کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ بتاؤ نشیان، بتاؤ۔ ہمیں دانش اور بینش کی باتیں کرنے کی لت اور دھت ہے، بتاؤ! دنیا کو ہماری آخر کیا ضرورت ہے۔ ہم آخر کیوں واقع ہوئے ہیں، آخر کیوں؟

''مجھے تو اپنا ہونا ایک گھڑی کے لیے بھی گوارا نہیں ہے۔ سنا جائے کہ ہم سر سے پاؤں تک ایک دھاندلی ہیں، ایک دھاندلی ہیں۔ سچ جانو، کہ مجھے اپنا اور تمہارا ہونا اور ہر لحہ ہوئے جانا بہت ہی اولوا ولولگتا ہے۔ ہم وقت کا ایک جنجال ہیں۔ ہم خود اپنے حق میں ایک وبال ہیں۔

''میں تم سے باتیں کر رہا ہوں اور میرا دل خون ہو رہا ہے۔ اب رات ہو رہی ہے۔ اس وقت اس ملک میں لاکھوں گھروں کے چولہوں میں بجھی ہوئی راکھ کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ لگاتار فاقوں کے سبب کتنی ہی ماؤں کی چھاتیاں اپنے دودھ پیتے بچوں کے حق میں سوکھ چکی ہوں گی۔ وہ مہنگائی ہے، وہ کال ہے کہ ماؤں اور ان کے جایوں کے رشتے سوکھ کر رہ گئے ہیں۔ ایسے میں بولنے اور سننے اور لکھنے اور پڑھنے کو ایک بری طرح جھنجلا دینے والا جرم قرار دیا جانا چاہیے۔

''میں بولتا ہوں اور تم سنتے ہو۔ میں لکھتا ہوں اور تم پڑھتے ہو۔ پر اس بولنے اور سننے اور اس لکھنے اور پڑھنے کا بھلا کیا حاصل ہے۔ جو کچھ بھی ہے وہ باطل ہے، باطل ہے، باطل ہے۔

''اس ملک کے بہت کم لوگ عیش اور آرام یا آسودگی کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور باقی تمام لوگوں پر بھیانک نہوت کی وہ افتاد پڑی ہے کہ وہ مر مر کے جی رہے ہیں اور جی جی کے مر رہے ہیں۔

''بھوکے قریب قریب ہر قوم میں پائے جاتے ہیں (اگرچہ بعض قوموں میں ایک بھوکا بھی نہیں پایا جاتا) سو ہماری قوم میں بھی پائے جاتے ہیں اور ان کی اکثریت ہے مگر دوسری قوموں کے بھوکوں اور ہماری قوم کے بھوکوں میں جو فرق پایا جاتا ہے وہ ''بلا کا خوشگوار'' ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ دوسری قوموں کے بھوکوں کو بھوک لگتی ہے مگر ہماری قوم کے بھوکوں کو ذرا بھی بھوک نہیں لگتی۔ ان کے معدے تاریخِ انسانی کے عجیب و غریب معدے ہیں۔ اگر ہماری قوم کے بھوکوں کو بھوک لگتی تو ایسا نہ ہوتا جیسا کہ ہے۔

''آخر ایسا کیوں ہے؟ ایسا کیوں ہے؟ نشیان، خدارا مجھے بتاؤ کہ ایسا کیوں ہے؟''

''بھوک، بھوک اور بھوک...... جون ایلیا! تو کچھ نہیں کر سکتا۔ بس ایک ہی کام کر سکتا ہے اور وہ یہ کہ لہو تھوک، تھوک اور تھوک...... بھوک، بھوک اور بھوک۔''

TAGPK.COM

عزیزانِ من!
السلام علیکم!

فروری 2022ء کا شمارہ تمام تر تجسس کے ساتھ آپ کے شوق کی نذر ہے۔ گزشتہ دنوں ملک بھر میں یخ بستہ ہواؤں کے ساتھ برسات کا سلسلہ جاری رہا اور مخصوص علاقوں میں برف باری کا حسن بھی رہا مگر..... بدقسمتی سے جو صورتِ حال سامنے آئی اس کی وجہ وہی ہے یعنی بغیر سوچے سمجھے گنجائش سے زیادہ افراد کا چلے جانا اور ذمے دار ارباب کا بے پروائی سے آنکھیں بند کر لینا..... پھر اس کا نتیجہ تو کچھ ایسا ہی تباہ کن نکلنا تھا جو نکلا..... برف باری کا دیدار کرنے کا جنون بالآخر رنگ لے آیا اور ملکہ کوہسار کے رستوں پر خاموشی سے رقصِ اجل جاری ہو گیا..... کسے خبر تھی کہ تفریح کے لیے آنے والوں کا انجام اتنا دردناک ہوگا..... جو جگہ ہر سال کروڑوں کی آمدنی کا سبب بنتی ہے، سیاحوں کا میلا لگتا ہے، اس کی طرف سے یوں بے پروائی برتی جائے گی..... حیرت ہے۔ کیا ارباب اختیار کو علم نہیں تھا کہ گنجائش سے زیادہ گاڑیوں اور لوگوں کا ازدحام نقصان کا سبب بن سکتا ہے۔ کیا برف باری کے رستوں کی خطرناکی کا ادراک نہیں تھا۔ انتہائی افسوس ناک صورتِ حال سامنے آئی ہے۔ اللہ پاک ہلاک ہونے والوں کے لواحقین کو حوصلہ دے اور مرحومین کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ اللہ تعالیٰ سب کی مشکلات کو آسان فرمائے۔ اس سال موسم گرما کی طرح سرد موسم بھی اپنے جوبن پر ہے جس کے باعث صحت بھی متاثر ہو رہی ہے۔ جس طرح کورونا نے زندگی کو عذاب بنایا اب اومی کرون کے نام سے وائرس نے ہماری زندگیوں میں مداخلت شروع کر دی ہے۔ دنیا کے کئی ممالک اس مہلک وبا کی زد میں آ گئے ہیں جن میں پاکستان بھی شامل ہے لہٰذا تمام احتیاطی تدابیر پر عمل کرتے ہوئے اپنا اور اپنے پیاروں کا خیال رکھیے اور خیال تو ہمیں تمام معاملات میں اپنا خود ہی رکھنا پڑے گا کیونکہ اتنے مسائل میں گھری ہوئی عوام کا کوئی بھی پرسانِ حال جو نہیں ہے۔ سب ایک دوسرے پر انگلی اٹھا کر خود کو بچا لینے کا ہنر جانتے ہیں۔ زرعی ملک ہونے کے باوجود بہترین چاول اور دیگر اجناس اپنے ہی لوگوں کی دسترس سے دور ہیں۔ معدنیات کی دولت سے مالا مال ملک میں غربت کا گراف بڑھتا جا رہا ہے۔ قدرتی گیس کا خزانہ پاکستان میں موجود ہے مگر پاکستانیوں کے لیے نہیں..... یہی حال بجلی کے محکمے کا ہے۔ دستیاب ہو یا نہ ہو مگر بلوں کی باقاعدگی اور ان میں اضافے کا رجحان عوام کو حیران اور پریشان کیے ہوئے ہے۔ ایک مخصوص مافیا ہے جو ہر موسم کے اعتبار سے میسر سہولیات پر قابض ہو کر عوام کو محروم کیے ہوئے ہے تاکہ متبادل اشیا کو مارکیٹ میں لا کر عوام کی جیبوں پر اضافی بوجھ ڈالا جائے اور ان کے خزانے منہ تک بھر جائیں..... جیسے سرد موسم میں گیس کے مصنوعی بحران نے آج کل سلینڈر اور ایل پی جی گیس اور چولہے وغیرہ کے کاروبار کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ چولہوں میں گیس نہیں، دلوں میں رحم نہیں، نیتوں میں خلوص نہیں۔ ایسے میں کس سے شکوہ کیا جائے..... کوئی چارہ گر نہیں..... ایسا لگتا ہے جیسے پاکستان بلاؤں کا مرکز اور مسائل کا گھر بن کر رہ گیا ہے۔ جہاں کوئی طبقہ مطمئن نہیں..... دورِ حاضر کے لوگ جیسے تیسے کر کے گزارہ کرنے پر مجبور ہیں مگر جس معاشرے میں خودکشی کی شرح میں اضافہ اور جس کا سبب بیروزگاری ہو، کیا ہم اپنی آئندہ آنے والی نسلوں کا مستقبل محفوظ دیکھ سکتے ہیں؟ ایک انجانے خوف کی چادر ہمارے گرد دھیرے دھیرے لپٹتی جا رہی ہے..... کاش کوئی اس جانب بھی خلوصِ نیت سے سوچ لے۔ ہماری اگلی نسل ہمارے مستقبل کے معمار ہیں۔ اللہ ان کی حفاظت کرے اور ان کے لیے آسانیاں عطا فرمائے..... اور اب انہی اندیشوں اور دعاؤں کے ساتھ ذرا چلتے ہیں ان سندیسوں کی جانب جنہیں آپ نے بڑے پیار سے ہمیں بھیجا ہے۔

✠ عبدالجبار رومی انصاری کا جامع تبصرہ قصور سے۔ ”پتلے سے منہ والی دوشیزہ سال نو کی مبارک باد پیش کر رہی تھی۔ پتا نہیں اس میں کوئی خاص کشش محسوس نہیں ہوئی ورنہ شاعرانہ موڈ اپنے آپ ہی ہو جانا تھا۔ بہرحال، جو بھی ہے اچھی ہے اور انکل ایلیا فرما رہے تھے کہ نئے اور پرانے سال کے کوئی معنی نہیں ہیں اور ہمارے دل کی بات جو انہوں نے کی وہ یہ کہ نئی خواہش، نئے خواب اور نئے خیال کے ساتھ زندگی بسر کرنا چاہیے اور سال بھر کے یہی لمحے امید افزا ہوتے ہیں۔ سو نئے سال کی خیر مبارک وصول کرتے سب کو مبارک باد دیتے ہیں۔ ناہید یوسف صدارت اپنے نام کر رہی تھیں اور ساتھ ہی موسم کے لحاظ سے گرم کپڑوں میں گہرے رنگوں کا انتخاب بھی۔ کنول لگتا ہے کافی دیر بعد ہی آتی ہیں میری طرح جو سوچ رہی تھیں کہ تبصرہ کر ہی دوں۔ عمدہ تبصرہ۔ مجھے تو دو ماہ سے ٹائم ہی نہیں ملا تبصرہ کرنے کا۔ محمد عثمان ذوالفقار نے بھی بہت اچھا تبصرہ کیا ہے جنہیں شمارے میں ہر طرف محبت ہی محبت نظر آئی۔ بابا جی ریاض بٹ بھی بھرپور تبصرے میں نظر آئے لیکن ہمارا نام کہیں بھولے سے بھی نظر نہیں آیا۔ روبینہ اشعر کا تبصرہ بھی خوب صورت رہا۔ چودھری محمد رفیق مہر کے شکوے بھی بجا ہیں لیکن مہنگائی کو بین الاقوامی مسئلہ کہنا ہماری تو سمجھ سے بالا ہے۔ بین الاقوامی سطح پر ترقی پذیر ممالک میں جو ایک آدمی کی تنخواہ ہے، پاکستانی اس کے مقابلے میں کچھ نہیں ہے سو مہنگائی کا اثر بھی پاکستان میں ہی ہے۔ حکمرانوں نے خوامخواہ اسے بین الاقوامی ٹرک کی بتی کے پیچھے لگایا ہوا ہے۔ چلیں کہانیوں کی گرما گرمی دیکھیں۔ سب سے پہلے ”کانچ محل“ پڑھی جس کے نیچے تیز آنچ ہو رہی تھی۔ ساہی فیملی نے تو تقریباً ہر شعبے کو دبکا رکھا ہے۔ اب شوبز کی اے بی کلاس کی کاسٹ بھی ”راز“ ڈرامے میں کام کرنا نہیں چاہتی اور جو راضی ہوئی وہ سی کلاس ہی لگتی ہے۔ شکر ہے آخر میں حاشہ

نے بھی خدشات بالائے طاق رکھتے ہوئے ''راز'' کی ہیروئن بننے کی ہامی بھر لی ہے۔ امید ہے اب یہ ڈراما بلندیوں کو چھولے گا اور کھویا ہوا وسیم بھی واپس آجائے گا۔ غیاث کے پاپا بھی روتے سسکتے ساہی فیملی کی بھینٹ چڑھ گئے ہیں۔ باقی تیمور اور حاشہ کی محبت کی شمع تو روشن ہو چکی ہے۔ ملک صفدر حیات کی ''قبل از ایذا'' بھی زبردست رہی جنہوں نے سوچے سمجھے منصوبے کا حصہ بننے والے حکیم ارشاد علی کی برکت میں حرکت ڈھونڈ نکالی اور پھر تفتیش کی گاڑی ہائی اسپیڈ پکڑتے ہی مقتول حسن علی کی بھاوج حسنہ کے گھر جا پہنچی جو قتل موذی قبل از ایذا مقولے پر عمل پیرا تھی پھر ملک صاحب نے اس کی درستگی فرما کر حوالۂ قانون کر دیا۔ زویا اعجاز کو سب سے پہلے تو شادی کی ڈھیروں مبارک باد۔ نئے سفر کی مبارک گھڑیاں ہمیشہ خوش آئند رہیں۔ آپ کی تحریر ''سرکش'' بھی زبردست رہی۔ عمر خیام کی کہانی بے حد اچھی لگی۔ جب تک علم دوست بادشاہ اس کے ساتھ رہے، اس نے علم ریاضی، ہیئت دانی، تخلیق کاری میں گرانقدر خدمات انجام دیں اور جب مذہب کے کارپرداز اٹھ کھڑے ہوئے تو انہوں نے عمر خیام کی ہیئت دانی کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اس کی رصدگاہ کو بھی نذر آتش کر دیا۔ وہ جیسا بھی تھا، آخری لمحات میں اس کا کہنا تھا کہ ''جتنا بھی جانا وہی تیرے حضور میرا وسیلہ تھا۔'' اور یہی اس کی عمر بھر کی آواز اس کے لبوں پر آئی جسے لوگ سمجھ نہ سکے۔ ''شہ زور'' نے بھی خوب رفتار پکڑی ہوئی ہے۔ معاذ میں بھی جیسے برق کوند گئی۔ اس نے سبھاش سے تفتیش کرنی چاہی لیکن درمیان میں سبھاش کی بیوی نے فائر ٹھوک دیا جس سے سبھاش بھی جان سے گیا اور اس کی بیوی بھی لڑھک گئی۔ دوسری طرف سونیا ساحل سمندر پر لفنگوں کے ہاتھوں اغوا ہوئی لیکن اس نے اپنا بدلہ فوری چکایا اور چاروں لفنگوں کو سپرد آگ کر دیا۔ دیکھو معاذ اب عالم تک کیسے پہنچتا ہے یا پھر میڈم ایکس معاذ تک پہنچ پاتی ہے یا نہیں۔ اب شہ زور اپنے فل ایکشن میں ہے تو زبردست لگ رہی ہے۔ ماں تصور وار تھی۔ موحل خود یا ان کی ازلی غربت۔ لیکن سمجھ آیا کہ مجبوری و بے کسی میں انسان بہت کچھ لٹا دیتا ہے اور وڈیرے اس حال میں غریبوں کی قیمتی متاع لوٹ لیتے ہیں۔ عبدالرب بھٹی کی ''سسکیاں'' بھی ایسی ہی کہانی تھی۔ امجد جاوید کی کہانی نے آخر میں سارا سسپنس توڑ دیا۔ بے چارے اعجاز نے سحرش کی تذلیل تو کی ہی تھی لیکن پھر اس کا ازالہ بھی کر دیا تھا اور سحرش نے بھی معاف کر دیا اور پھر اعجاز کے سپنوں پر اس وقت اوس پڑ گئی جب سحرش نے اسے اپنی شادی کا کارڈ تھما دیا۔ تب وہ واقعی سب کچھ ہار گیا تھا۔ ''شیشے کا بال'' عمدہ کہانی تھی۔ عشق رقص کرتا ہے اور جہاں عشق ہوتا ہے وہاں رقص بھی ہوتا ہے۔ ہم نے تو عجب دیکھا ہے قلندروں کا طریق۔ سرتاپا ہوتے ہیں وہ سوزِ عشق میں غریق۔ شیخ بدرالدین کے ایمان افروز واقعات سے دل خوشی اور ایمان سے بھر گیا۔''

✠ کنول، چنیوٹ سے خط لکھ رہی ہیں۔ ''اس بار بھی سسپنس وقت پر ملا اس لیے تبصرہ حاضر ہے۔ خطوط اور تبصرے سب کے ہی اچھے تھے۔ ''مرضِ نسیاں'' عیوق بخاری کی تحریر کا کوئی سر پیر ہی نہیں تھا۔ کہانی لکھی گئی ہے مغربی ماحول میں لیکن مغرب سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ حرکتیں سب مشرق والی ہی ہیں۔ لکھاریوں سے گزارش ہے کہ پلیز مغرب کے ماحول کو پہلے اچھی طرح اسٹڈی کیا کریں۔ تھوڑی ریسرچ کریں پھر کہانی لکھیں۔ اعتزاز سلیم وصلی کی تحریر ''آسیب'' اچھی تحریر تھی۔ وبا کے موسم میں وبا سے متاثر ہو کر لکھی گئی تحریر جسے قدامت کے رنگ میں پیش کیا گیا۔ شاہ زین رضوان کی تحریر ''زادراہ'' بھی اچھی لگی لیکن فرینک اور ہربرٹ نے ایک خوانخواہ کی مصیبت کھڑی کی ورنہ مسئلہ کچھ بھی نہیں تھا۔ احمد سلیم سلیمی کی تحریر ''بجنگ آمد'' شاندار تھی۔ شکر ہے کوئی تحریر تو کسی خامی کے بغیر نظر آئی۔ سلیقہ بے چاری کا انجام بنا کسی قصور کے انتہائی بھیانک ہوا۔ جب نصیر جیسے مرد سے عورت کی شادی ہو جائے تو پھر جو بھی ہو جائے کم ہے۔ جو مرد اپنی ماں کی گود سے نکلنے اور بیوی کی حفاظت کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا اسے ساری زندگی شادی نہیں کرنی چاہیے۔ انجم فاروق ساحلی کی تحریر ''سرخ کار'' انتقام در انتقام کی کہانی تھی اور ٹھیک ہی تھی۔ ''کانچ محل'' زبردست جا رہی ہے۔ تیمور نے عدیل کی جان بچانے کی اتنی بھیانک غلطی پتا نہیں کس برتے پر کر دی؟ حاشہ اب شوبز جوائن کر کے اپنے باپ اور بھائی سے صحیح انتقام لے سکتی ہے۔ ان کی نظر میں تو یہ ڈوب مرنے کا مقام ہوگا۔ ظفر اقبال ظفر کی تحریر ''پانچ دن'' بھی بری نہیں تھی لیکن بالکل سیدھی سادی سی پروڈیکٹیبل تحریر تھی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی اپنی تحریر ''سسکیاں'' میں غربت کی تلخ حقیقتیں بیان کرتے نظر آئے۔ تحریر اچھی تھی۔ عاطر شاہین کی تحریر ''ڈراما'' دلچسپ تحریر تھی۔ ڈیزل کو میکونی اور جینفر نے کتنی ذہانت سے جال میں پھنسایا اور قانون کو ہاتھ میں لیے بغیر مجرم کو سزا بھی دلوا دی۔ تنویر ریاض کی تحریر ''دردِ مشترک'' بھی دلچسپ ثابت ہوئی۔ ماریا ریان سے جان چھڑانے میں کامیاب رہی اور ایشلے کی قسمت اچھی رہی کہ بنا کچھ کیے ایسے انسان سے چھٹکارا مل گیا۔ اس بار ڈاکٹر شیر شاہ سید کی ہمیشہ کی طرح دل کو چھو جانے والی ایک اور تحریر ''ناقابلِ معافی'' شائع ہوئی ہے۔ اس بار موضوع اقلیتوں کی جبری مذہبی تبدیلی کا تھا۔ حساس موضوع کو بہت خوبصورتی سے پیش کیا۔ یہ تحریر پڑھ کر آنکھیں نم نہ ہوں یہ نہیں ہو سکتا۔ شاندار تحریر۔''

✠ ریاض بٹ، حسن ابدال سے چلے آرہے ہیں۔ ''سال جنوری 2022ء یعنی سال کا پہلا شمارہ اس وقت ہاتھوں میں ہے۔ سرورق اس بار سوگوار سا ہے لیکن ہے حسین۔ کتنا عجیب حسن ہے تیری اداس آنکھوں میں..... سکوت صبحِ ازل کا خیال آتا ہے۔ اس بار جون ایلیا صاحب کی سدا بہار تحریر ''نیا سال'' سسپنس کی زینت بنی ہے۔ وقت کا کام تو گزرنا ہوتا ہے۔ یہ گزر جاتا ہے۔ پیچھے اپنی یادیں چھوڑ جاتا ہے۔ دن کی اینٹیں رفتہ رفتہ ہفتوں کی دیواروں میں بدل جاتی ہیں اور ان دیواروں پر جب مہینوں کی چھتیں پڑتی ہیں تو ایک سالہ عمارت بن جاتی ہے یعنی سال مکمل ہو جاتا ہے۔ ذرا سوچیے گا کہ ہم نے گزرے سال میں کیا کھویا، کیا پایا۔ اس کے بعد اپنی محفل میں پہنچے تو کرسی صدارت پر ناہید یوسف کو بیٹھا ہوا دیکھا۔ بہن مبارک ہو۔ خط بھی زبردست ہے اور تبصرہ بھی۔ کنول کی حاضری بھی خوب ہے۔ اپنی پسند اور ناپسند کا خوب اظہار کیا ہے۔ محمد عثمان ذوالفقار ہم بھی چاہتے ہیں کہ محفل میں خوب گہما گہمی ہو۔ کافی لوگ محفل سے غائب ہیں۔ اب آجائیے، ہم چشم براہ ہیں۔ محمد عثمان خان شکریہ۔

آپ نے مختصر لیکن اچھا تبصرہ کیا۔ روبینہ اشعر بہن تبصرہ خوب ہے۔ کہانیوں پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ چودھری محمد رفیق مہر واقعی تبدیلی کے غبارے سے ہوا نکل گئی ہے۔ مہنگائی کے اژدہے نے ہمیں اپنی گرفت میں لے لیا ہے اور ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کی گرفت مضبوط سے مضبوط ہو رہی ہے۔ اب بڑھتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ تاریخی کہانی ''سرکش'' کا تیسرا اور آخری حصہ پڑھ کر مزہ آیا۔ بڑے اچھے طریقے سے مناسب لفظوں کا استعمال کرتے ہوئے کہانی لکھی گئی اور انجام تک پہنچائی گئی۔ زویا اعجاز اس کے لیے شاباش کی مستحق ہیں۔ لفظ ''شاباش'' لکھتے ہوئے ہمیں وہ وقت یاد آ گیا ہے جب تختی پر ماسٹر صاحب شاباش لکھتے تھے تو ہمیں بہت خوشی ہوتی تھی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی بڑے حساس موضوع پر کہانیاں لکھتے رہے ہیں۔ اس بار وہ ''سسکیاں'' جیسی انمول کہانی لے کر آئے ہیں۔ یہ سسکیاں ہمارے اردگرد گونجتی رہتی ہیں لیکن ہم اپنے کان بند کر لیتے ہیں۔ بھوک اور بیماری بڑی ظالم ہیں۔ یہ انسان کو عصمت فروشی پر مجبور کرتی ہیں۔ ایسی کہانیاں پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم اندر باہر سے ہل گئے ہیں۔ ویل ڈن ڈاکٹر صاحب۔ ظفر اقبال ظفر کی ''پانچ دن'' بھی پسند آئی۔ اتنی بڑی شرط۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ پیسا بولتا ہے۔ اب بات ہو جائے ملک صفدر حیات کی کہانی ''قبل از ایذا'' کی۔ ملک علی حسن کے جو ارادے تھے وہ کسی طرح بھی اچھے نہیں تھے۔ اس کے دل میں ہوس تھی۔ دماغ پر لالچ نے قبضہ کیا ہوا تھا۔ وہ خودغرض انسان اپنی بیوہ بھاوج اور یتیم بھتیجی کو بازارِ حسن کی زینت بنانا چاہتا تھا لیکن حسنہ نے جو کیا وہ بھی غلط تھا۔ اگر وہ قانون کو ہاتھ میں لینے کے بجائے قانون کی مدد حاصل کرتی تو سانپ بھی مر جاتا اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹتی۔ انجم فاروق ساحلی کی کہانی ''سرخ کار'' انتقام در انتقام کی کہانی ہے۔ نیلم سے جو غلطی، کوتاہی یا بے پروائی ہوئی وہ بھی ایک غلط بات تھی۔ کسی کا معصوم بچہ کسی کار کے نیچے آ کر کچلا جائے تو اس کا جو حال ہوتا ہے اس کو سمجھنے کے لیے کسی ارسطو کے دماغ کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن شہزاد نے انتقام میں اندھا ہو کر جو کیا وہ بھی مناسب نہیں ہے۔ یہ تو جنگل کا قانون ہوا۔ بہرحال انسانی نفسیات کی عکاسی کرتی یہ ایک اچھی کہانی ہے۔ احمد سلیم سلیمی بڑی اچھی اور جذبات کو جھنجوڑنے والی کہانیاں لکھتے ہیں۔ ان کی اس ماہ کی کہانی بجنگ آمد بھی ایک حساس موضوع پر لکھی ہوئی کہانی ہے حالانکہ موضوع پرانا ہے لیکن اس میں کچھ نیا بھی ہے۔ انجام خلافِ توقع ہے اور درس کے کئی ورق کھول کر سامنے رکھ رہا ہے۔ ویری گڈ۔ باقی کہانیوں میں شاہ زین رضوان کی ''زادِ راہ''، اعتزاز سلیم وصلی کی ''آسیب'' اچھی کہانیاں لگیں۔ ''دردِ مشترک'' بھی تنویر ریاض کی ایک انوکھی کہانی ہے۔ دشمنی دوستی میں اس طرح بدل جاتی ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ (بہت شکریہ، آپ کے خوبصورت تبصرے کا..... اور جو سوال آپ نے کیا ہے اس کا جواب یہی ہے کہ نام صرف ایک ہی جگہ آ سکتا ہے، بار بار نہیں)۔''

✠ بشیر احمد بھٹی کی بھولی بسری یادیں بہاولپور سے۔ ''جنوری 2022ء کا شمارہ سامنے ہے۔ وقت گزرتے وقت لگتا ہے لیکن جب یہ وقت گزر جاتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے یہ کل کی بات ہو۔ گزرنے والا کل، جی ہاں یہ کل ہی کی بات لگتی ہے جب 1971ء میں جاسوسی ڈائجسٹ کا پہلا شمارہ شائع ہوا۔ پتا ہی نہیں چلا۔ آدھی صدی گزر گئی۔ سسپنس کے پراسرار شمارے ماضی کا حصہ بن گئے۔ پراسرار اسکیچ، بدروح نے لالٹین اٹھا رکھی ہے۔ قبرستان کے مناظر۔ برہم چاری، صدیوں کا بیٹا، مزید کئی لاجواب سلسلے وار کہانیاں۔ معراج رسول صاحب کی جوانی۔ سسپنس ڈائجسٹ کی سسپنس سے بھرپور ہر کہانی۔ طویل سلسلہ دیوتا۔ محی الدین نواب صاحب جو لاہور کی ایک بستی میں گمنام زندگی گزار رہے تھے۔ معراج صاحب نے دیبا خانم کے نام سے شائع محی الدین نواب صاحب کا ناول پڑھا۔ نہ جانے اتنے مصروف مدیر اعلیٰ صاحب کے پاس اتنا وقت کیسے نکل آیا کہ انہوں نے ناول پڑھ لیا۔ یہ قدرت کے کھیل ہیں۔ نواب صاحب کی قسمت جاگنا تھی سو جاگ گئی۔ بہرحال یہ بات چمکتے سورج کی طرح عیاں ہے کہ معراج صاحب رائٹر حضرات کو اوج پر پہنچاتے تھے۔ بہترین معاوضوں کی جناب معراج رسول صاحب نے داغ بیل ڈالی۔ معراج رسول صاحب اچھے اچھے مصنفین کو اپنے پلیٹ فارم پر لائے۔ سب کے لیے ایک ہی دسترخوان تھا۔ جنوری 2022ء نئے سال کا پہلا شمارہ۔ ٹائٹل ظفر صاحب نے بنایا ہے۔ آخری کہانی ''شیشے کا بال'' کا اسکیچ بھی ظفر صاحب کا ہے۔ ذاکر صاحب صرف ٹائٹل بناتے تھے۔ ٹائٹل پر موجود خاتون کے کھلے بال کسی شیمپو ماڈلنگ کا حصہ لگتے ہیں۔ محی الدین نواب صاحب نے ہر کہانی خوب لکھی تھی۔ بہت زیادہ لکھنے کی وجہ سے انہوں نے اپنا اسٹیٹس باتوں پر مبذول کر لیا تھا۔ تھوڑا لکھو، اچھا لکھو والا معاملہ مزے کو برقرار رکھتا ہے۔ دیوتا کو لکھنا، تاریخی کہانیاں لکھنا پھر آخری سماجی معاشرتی کہانیاں لکھنا۔ یہ بات نواب صاحب کے دماغ پر بوجھ بن گئی تھی۔ میز پر کاغذات کا ڈھیر، چائے، سگریٹ اور لکھنا۔ یہ ان کی تحریروں سے پتا چلتا تھا۔ آہ..... معراج صاحب، ذاکر صاحب، مختیار آزاد صاحب، کاشف زبیر صاحب، سب آنجہانی ہوئے اور پتا بھی نہ چلا۔ یادِ ماضی واقعی عذاب ہے یارو۔''

✠ محمد عثمان خان کی لاہور سے اُمید ''امید کرتا ہوں کہ سسپنس ڈائجسٹ کا تمام اسٹاف اور قارئین خیریت سے ہوں گے۔ نئے سال کا پہلا شمارہ 27 دسمبر کو نیوز ایجنسی سے خریدا۔ سرورق کی خاتون خوبصورت لگ رہی تھی۔ تمام قارئین کے خطوط پسند آئے۔ کرسیِ صدارت سنبھالنے پر ناہید یوسف صاحبہ کو مبارک باد۔ جن کو میرا تبصرہ پسند آیا ان کا شکریہ۔ زویا اعجاز صاحبہ جواب زویا صفوان ہو گئی ہیں کو شادی کی بہت مبارک باد۔ ''سرکش'' کا تیسرا حصہ بھی دلچسپی سے بھرپور تھا۔ تاریخی کہانیاں زویا صفوان صاحبہ بہت عمدگی سے لکھتی ہیں۔ ''ناقابلِ معافی'' میں سلمان پر بہت غصہ آیا۔ ایسے لوگوں کا انجام یہی ہونا چاہیے۔ ''دردِ مشترک'' میں ماریا نے عمدہ طریقے سے اپنی مشکلات کا حل نکالا۔ زبردست تحریر تھی۔ ''ڈراما'' میں میکونی نے ثابت کیا کہ ہر ہیرو پر سوا ہیرو ہوتا ہے۔ عمدہ تحریر تھی۔ ''سسکیاں'' پڑھ کر دل اداس ہو گیا۔ ''پانچ دن'' میں الیاس نے جو

نا ٹک کیا، ایسا واقعہ کسی اور کہانی میں بھی پڑھ چکا ہوں۔ ''قبل از ایذا'' میں تصویر اس مرتبہ امجد بیگ والی لگ گئی۔ کہانی سسپنس سے بھرپور تھی۔ پڑھ کر مزہ آیا۔ ''سرخ کار'' اور ''بجنگ آمد'' پسند آئیں۔ ''زادِ راہ'' بھی دلچسپ تحریر تھی۔ ''کانچ محل'' بھی عمدگی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ وسیم میرے خیال سے اب واپس نہیں آئے گا۔ حاشہ اب ڈرامے میں کام کرے گی۔ یہ بات اس کے والد اور بھائی کے اشتعال میں اضافہ کرے گی۔ ''آسیب'' بہت زبردست تحریر تھی۔ شیخ بدر الدین غزنوی کے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں۔ ''مرضِ نسیاں'' میں مسز گلوریا نے عمدگی سے اپنی اولاد سے اپنا حق وصول کیا۔ آخری صفحات پر ''شیشے کا بال'' بھی بس ٹھیک تحریر تھی۔''

✠ سلطان احمد قائم خانی، ٹنڈو جان محمد سے دسمبر 2021ء کے شمارے پر تبصرہ لے کر حاضر ہیں۔ ''اس بار سسپنس جیسے ہی ملاسب سے پہلے نظر قیمت پر گئی اور دیکھ کر حیرت بھی نہیں ہوئی کیونکہ اس مہنگائی کے دور میں جس تیزی سے چیزوں کے دام بڑھ رہے ہیں تو ایسے میں آپ نے انتہائی مجبوری ہی کی حالت میں یہ فیصلہ کیا ہوگا۔ بہرحال، چلتے ہیں تبصرے کی جانب تو جناب اس بار سرورق کی حسینہ سردی کی مناسبت سے لباس زیب تن کیے سوچ میں گم تھی۔ جون ایلیا صاحب کی ''نسخۂ نجات'' میں نوکر شاہی کا پس منظر اور حال بیان کیا اور خوب کیا۔ خطوط میں ریاض بٹ صاحب صدارت کی کرسی سنبھالے ہوئے تھے۔ ''سرکش'' کا دوسرا حصہ پڑھا اور تیسرے حصے کا شدت سے انتظار ہے۔ نجمہ مودی کی ''چھپر پھاڑ کے'' دیوتا کی پہلی دوسری قسط سے متاثر ہو کر لکھی گئی تحریر تھی۔ آپ کہیں گے اتنی پرانی بات۔ بس ہم ہیں ہی ایسے۔ سسپنس کی ہر بات ہم کو یاد رہتی ہے ورنہ عام حالات میں تو صبح بیگم سبزی لانے کا کہے تو شام کو خالی ہاتھ ہی آجاتے ہیں، یاد ہی نہیں رہتا۔ ''شہ زور'' اور ''کانچ محل'' اپنی آب و تاب سے جاری ہیں۔ ''اصحاب کہف'' لاجواب تحریر تھی۔ بہت سی کتابوں کی معلومات کو ایک ہی تحریر میں سمونا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ مغربی کہانیوں میں ''خونی عصا'' اور ''جادوگرنی'' انتقام میں ڈوبی ہوئی تحریریں تھیں۔ ''نئی زندگی'' ان لوگوں کے لیے مشعلِ راہ ہے جو غلط راستوں سے بچ کر اپنی ایک نئی زندگی شروع کرنا چاہتے ہیں۔ ''خارِ ماضی'' حسام بٹ صاحب کی لاجواب تحریر تھی جس میں مجرم منصور سب کے سامنے گھومتا رہا اور اپنے آپ کو بہت ہوشیار سمجھ کر عدالت میں بھی موجود رہا مگر جب کیس مرزا صاحب کے پاس ہو تو بچنا ذرا مشکل ہوتا ہے۔ ''ادھورا خاکہ'' ایک ذہنی مریضہ کی کہانی تھی جو کہ آخر میں ایک بے گناہ کی جان لے گئی۔ ''الجھی ہوئی کہانی'' ایک ایسے شخص کی تھی جس نے اپنا خوشیوں کا محل کسی کا حق چھین کر بنایا تھا اور اس کہانی میں ایک لمحہ ایسا بھی آیا کہ ہر پڑھنے والا اظہر کی بیوی نائلہ کے بارے میں منفی سوچ اپنے دماغ میں لے آیا مگر جب حقیقت پتا چلی تو وہی نائلہ ایک دردمند دل رکھنے والی نکلی۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ کبھی کبھی آنکھوں کا دیکھا بھی وہ نہیں ہوتا جو انسان دیکھ رہا ہوتا ہے۔ اس کے بعد ''سانولی'' جسے پڑھ کر کچھ دیر کے لیے گاؤں کے قدرتی حسن اور ماحول میں گم سے ہو گئے تھے۔ کہانی اچھی لگی۔ اب آتے ہیں آخری صفحات کی جانب تو اس بار ''آئینہ مثال'' کاوش صدیقی کی تحریر پڑھ کر نہ جانے کیوں ''طالوت'' یاد آگئی۔ کاوش صاحب کی اچھی کاوش تھی۔ چھوٹے سے گھر اور خاص کر اوپری منزل پر رہنے والوں کی مشکلات اور درد کو جس طرح سے مصنف نے قلم بند کیا ہے، سلام ہے آپ کو۔ اشعار میں شہباز اکرم اور ناصر علی کا شعر بہت پسند آیا۔ نئے سال کی آپ کو ایڈوانس میں مبارک باد۔''

✠ محمد رؤف مغل کا شاہ کوٹ ضلع ننکانہ صاحب سے ستمبر 2021ء کے شمارے پر تبصرہ۔ ''اس بار سرورق منفرد تھا۔ کنول صاحبہ کو صدارت کی کرسی سنبھالنے پر مبارک باد۔ کرن صاحبہ کا شکریہ کہ انہوں نے میرا تبصرہ پہلے نمبر پر شائع ہونے پر مبارک باد دی۔ عبدالجبار رومی بھائی آپ کا تبصرہ ہمیشہ ہی اچھا ہوتا ہے۔ ویکسین لگوانا ہم سب کے لیے بہت ضروری ہے تاکہ کورونا کے نقصانات سے بچا جا سکے۔ انجم فاروق ساحلی صاحب! اللہ تعالیٰ آپ کو اچھی صحت عطا فرمائے۔ شاہانہ سلطان صاحبہ آپ ہمت سے کام لیں۔ ان شاء اللہ آپ کو کینسر سے صحت یابی نصیب ہوگی۔ ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ سب سے پہلے اسما قادری کی ''شہ زور'' پڑھی۔ کہانی میں بہت سے ٹوئسٹ آگئے ہیں اور کہانی اپنا چارم کھوئے جا رہی ہے۔ بشریٰ اپنا انتقام لیے بغیر ہی مر گئی بے چاری۔ عالم شاہ اور سرداب ''را'' کے ہتھے چڑھ گئے ہیں اور معاذ ایک سادھو کے ڈیرے سے نکل کر کسی انڈین فلم اسٹار کا مہمان بن گیا ہے۔ اس بار ملک صفدر حیات کی اسٹوری ''عملِ پیہم'' تھوڑی ماٹھی تھی مگر ساری پڑھ کر ہی دم لیا۔ طاہر جاوید مغل کی ''کانچ محل'' اچھی جا رہی ہے مگر غیاث کو اتنی جلدی مار کر ایک جاندار کردار کو آؤٹ کر دیا۔ اس کی سمجھ نہیں آئی۔ حاشہ کو اپنے بھائی اور باپ کی بات مان کر صائم سے شادی کرنا پڑی اور پھر تیمور صاحب کی انٹری ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ تیمور اب غیاث کی جگہ ہیرو کا رول ادا کرے گا کیونکہ حاشہ اور تیمور کے درمیان بڑی تیزی سے رابطے بڑھ رہے ہیں۔ بساط اور وسیم ساحلی میں بھی جدائی ڈال دی گئی ہے۔ محمد ظفر حسین کی ''پہلی محبت'' بڑی زبردست رہی مگر فرحت کی موت نے بدمزہ کر دیا۔ میرے خیال میں اس کو مرنا نہیں چاہیے تھا۔ وہ زندہ رہتی اور اپنی بڑی بہن کے ساتھ مل کر زندگی کی خوشیاں انجوائے کرتی۔ کہانی کا اختتام بھی کتنا اچھا اور خوبصورت ہوتا۔ شاکر لطیف کی ''شقی القلب'' بہت زبردست کہانی تھی۔ شک بہت بڑی بیماری ہے جس کا علاج حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا۔ شقی القلب شخص کسی گھر میں ہو تو گھر کو نقصان پہنچاتا ہے۔ شاہ کوٹ میں ڈائجسٹ 28 تاریخ تک بھی دستیاب نہیں تھا۔ ڈیرہ غازی آیا تو موجود تھا۔ تمام دوستوں سے التماس ہے کہ نماز کی پابندی کریں۔ پتا نہیں کب زندگی ساتھ چھوڑ دے۔ اللہ ہم سب پر اور ہمارے ملک پاکستان پر اپنی رحمتوں کا نزول کرے۔ زندگی رہی تو پھر ملاقات ہوگی۔ اللہ حافظ۔ آخر میں، میں اپنی مرحومہ بیوی کے لیے ایک شعر لکھنا چاہتا ہوں۔ بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رت ہی بدل گئی...... اک شخص سارے شہر کو ویراں کر گیا۔ (آپ کا خط ہمیں اتنی دیر سے ملا جس کا افسوس ہوا۔ بہرحال آپ کے محبت نامے کو محفل میں شامل کر لیا گیا ہے)۔''

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے: ریاض احمد انصاری، منڈی بہاالدین۔ غلام حسین، لیہ۔

TAGPK.COM

رقصِ شمشیر

اے آر راجپوت

دور کوئی بھی ہو... حسن کی فتنہ سامانیوں سے محفوظ نہیں رہا۔ وہ جو ایک ادنیٰ ملازم کی دسترس میں تھی مگر اس کے غیر معمولی حسن کی ایک جھلک اس جنگجو کے ساتھ ساتھ جانے کتنے دلوں میں طوفان برپا کرگئی... میدان جنگ میں شمشیر کا رقص یا موت کی آہٹ... اس کا تصور ہر لمحے اس کے ساتھ رہا لیکن... عشق اور ڈاکا زنی میں فرق وہ نہیں سمجھ پایا... عورت کا دل نہ تو جنگ میں لوٹا ہوا مال غنیمت ہوتا ہے اور نہ ہی اس کے جذبات و احساسات میں کسی سازش کے ذریعے جگہ لی جاسکتی ہے... بس یہی وہ خطا تھی جس نے ایک سچے عاشق کا رستہ صاف کرڈالا تھا... کیونکہ قدرت کبھی غلط کا ساتھ نہیں دیتی... بے شک اس کے پاس اقتدار کی طاقت تھی... وہ بلبن کا عزیز دوست بھی تھا اور میدانِ جنگ کا کامیاب سپاہی بھی مگر محبت کے میزان پر بدنیتی کی وجہ سے پورا نہ اتر سکا۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

VGPK.COM

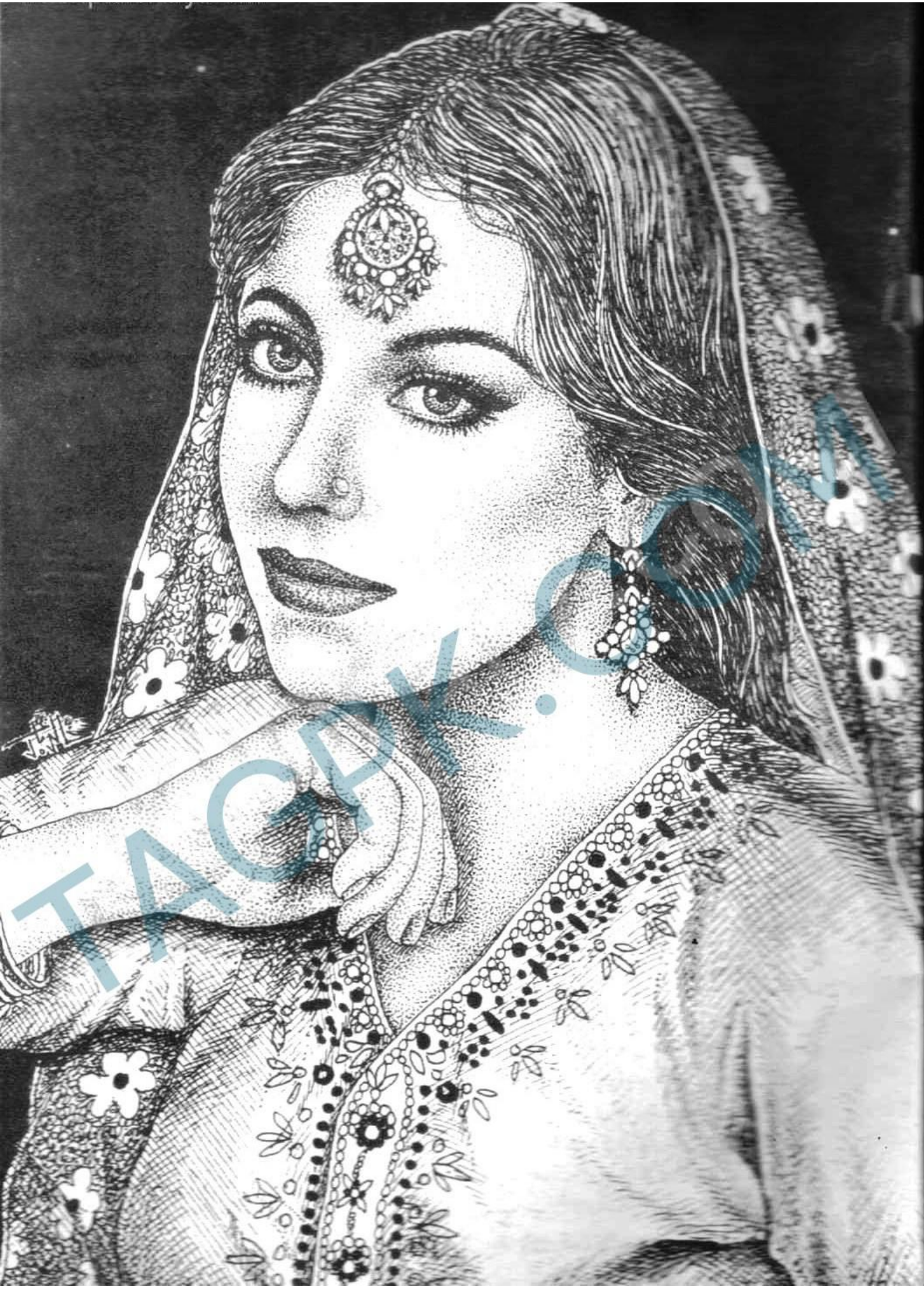

بدایوں کی عالیشان جامع مسجد التمش کی سنگین دیواروں پر سپیدۂ سحر کی روشنی نمودار ہو رہی تھی۔ شہر اپنی پُرسکون، سرد اور تاریک رات کی گراں خوابیوں سے بیدار ہو کر انگڑائیاں لینے لگا۔ مؤذن کی صدائے برحق نے پرانے قلعے میں بدایوں کے صوبہ دار امیر رفیق جامدار کو خواب راحت سے بیدار کر دیا تھا۔ وہ مصاحبوں کے ہمراہ گھوڑے پر سوار ہو کر نماز باجماعت میں شرکت کے لیے آچکا تھا۔ اگلی صفوں میں نمازیوں نے جگہ گھیر لی تھی۔ امیر جامدار کو بہ مشکل پچھلی صفوں میں ہمراہیوں سمیت جگہ ملی۔ وہ عبادت سے فارغ ہو کر واپس ہوا تو دکانیں کھل رہی تھیں۔ مندروں کے ناقوس بج رہے تھے۔ رات بھر گشت کرنے والے کوتوال شیخ شریف الدین اور اس کے تھکے ہارے پہریدار پرانے قلعے کے دروازے پر روزمرہ کا عریضہ دینے حاضر تھے۔ امیر جامدار نے شیخ شریف الدین کو بڑھتے دیکھا۔

''السلام علیکم یا امیر! رات خدا کے فضل سے ... بہ خیریت گزری۔ رعایا آرام سے سوئی، چوری کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔''

''خدا کا فضل و کرم سلطان غیاث الدین بلبن کی سلطنت پر ہمیشہ قائم و دائم رہے۔'' امیر جامدار نے جواب دیا۔

کوتوال نے سلام کیا۔ مڑ کر پہریداروں کو واپسی کا اشارہ کیا۔ وہ صف بستہ ہو کر آہستہ آہستہ روانہ ہو گئے۔ امیر جامدار ان کو جاتے دیکھتا رہا۔

''غریبوں کو نیند قربان کرنا پڑتی ہے۔'' وہ تاسف کے لہجے میں بولا۔

''امیر محترم کے فرمان کے مطابق پہریدار کی تنخواہ میں پچاس جیتل (دہلی کے بادشاہوں کا ایک سکہ تھا جیتل تانبے کا پیسا تھا اور اس وقت من بھر گیہوں دس جیتل کا مل جاتا تھا اس لیے ملک میں رعایا خوشحال تھی) کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔''

جیتل کوتوال کی یہ بات سن کر امیر جامدار مسکرایا۔

''پچاس جیتل کی حیثیت کیا ہے شریف الدین؟'' اس نے سوال کیا۔

''سلطان بلبن کی سلطنت میں کھانے پینے کی چیزیں سستی ہیں۔ زمین کے خزانے کھل گئے ہیں۔ پہریدار بہت خوش ہیں۔''

''انسان چھوٹی چھوٹی چیزوں پر خوش ہو جاتا ہے۔'' امیر جامدار نے سرد آہ بھر کر کہا۔ ''اور کبھی کبھی ساری دنیا کی دولت بھی اس کو خوش نہیں کر سکتی۔ انسان کتنا عجیب ہے۔ کاش! میں انسان نہ ہوتا۔''

امیر جامدار کے لہجے میں بڑا درد تھا۔ چوڑے چکلے چہرے پر جو گھنی ڈاڑھی سے مزین تھا، درد و کرب کے آثار ابھرے۔ کسی نے کچھ نہیں کہا۔

وہ گھوڑے سے اترا اور قلعے میں داخل ہو گیا۔ زرکار عبا میں اس کے شانے ڈھلے ہوئے نظر آتے تھے۔ نظریں زمین پر تھیں۔ ساٹھ سال کی عمر میں جنگجو اور صحت مند امیر جامدار اچھے اچھے جوانوں کو شرماتا تھا۔ وسمہ (خضاب) لگانے کے باوجود وہ جھریوں کے عیب سے پاک تھا۔ مصاحب ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھ کر رہ گئے اور ادھر کچھ عرصے سے امیر جامدار کا عجیب حال تھا۔ بے فکری اور قہقہے بند تھے۔ سرکاری کاغذات پر توجہ دینا چھوڑ دی تھی۔ حد یہ کہ اوقات میں ہی فرق آ گیا تھا اور کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کون سا غم امیر جامدار کو کھا رہا ہے؟

وہ ملوک چہل گانی کے بااثر طبقے سے تعلق رکھتا تھا اور بدایوں کے نواح میں اس کی جاگیر تھی۔ شمس الدین التمش کے چہل گانی غلاموں کی جماعت اب بھی ہندوستان کے خوش قسمت انسانوں کا وہ گروہ تھی جس کے ہاتھ دولت اور اقتدار کی نبضوں پر تھے۔ حالانکہ سلطان غیاث الدین بلبن نے جو اسی جماعت کا ایک فرد تھا، تخت پر جلوہ فرما ہونے کے بعد ان امیر کبیر اور بااثر غلاموں کا زور توڑنا شروع کر دیا تھا اور ملوک چہل گانی دن بہ دن بے دست و پا ہوتے جا رہے تھے۔

لیکن امیر جامدار کو غیاث الدین بلبن کی ذاتی دوستی کا فخر حاصل تھا اور بلبن اسے بے حد عزیز رکھتا تھا۔ جنگ و سیاست کے بڑے نازک مرحلوں پر امیر جامدار نے اپنی صلاحیتوں کا ثبوت دے کر نیک نامی حاصل کی تھی۔ بدایوں کا صوبہ اس کو اسی لیے دیا گیا تھا ورنہ قاعدہ یہ تھا کہ جہاں جس امیر کی جاگیر ہوتی تھی، وہاں کوئی عہدہ اسے نہیں ملتا تھا تاکہ ایک غیر کی صوبہ داری میں اس پر کڑی نگرانی رہے۔ اقتدار کی یہ تقسیم امیر جامدار کی خاطر بلبن نے منسوخ کر دی اور اسے بدایوں کا صوبہ دار بنا کر ایک طرح سے اس علاقے کا بے تاج بادشاہ بنا دیا گیا تھا۔

رعایا اس سے دونوں طرح خوش تھی۔ جاگیر کے گاؤں اور قصبے اس کی نرمی اور انصاف کے قائل تھے اور پورے صوبے کو احساس تھا کہ بدایوں کا صوبہ دار ہر لحہ چشم و گوش کھلے رکھتا ہے۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ کسی پر ظلم کرے۔ بے لاگ انصاف امیر جامدار کا شیوہ تھا۔ اس کے رنج و غم پر اس لیے سب کو افسوس تھا۔

''کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ معاملہ کیا ہے؟'' کوتوال نے مصاحبوں کی سمت دیکھ کر تعجب سے سر ہلایا۔

''شیخ جی! ہم بھی حیران ہیں۔ سرکار تو جیسے بدل گئے ہیں۔''

''پوری رات ساتھ رہ کر بھی نہیں جان سکتے تو لعنت ہے تم پر۔'' شیخ شریف الدین نے ہنس کر کہا۔ ''دیکھو ہم پتا لگاتے ہیں۔''

''کیوں ڈینگ مارتے ہو شیخ جی!'' ایک مصاحب منہ بنا کر بولا۔ ''جاؤ جا کر چوروں، بدمعاشوں کی فکر کرو۔ بڑے آدمیوں کے دل تک پہنچنے کا راستہ ہم لوگ ہی جانتے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو میں معلوم کرلوں گا کہ سرکار کو کس کا غم ہے۔''

کوتوال نے غور سے اس مصاحب کو دیکھا۔ اس کا نام قربان خاں تھا۔ موٹا تازہ اور قینچی کی طرح زبان چلانے والا قربان خاں سرتاپا مصاحب تھا۔ خوشامد اور مزاج شناسی کے فن میں وہ ماہر تھا۔

کوتوال نے کچھ کہنے کا ارادہ کیا پھر خاموشی اختیار کرلی اور گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں سے چل دیا۔

قربان خاں مونچھوں پر تاؤ دے کر لوگوں سے کہنے لگا۔ ''شیخ جی بڑے خطرناک ہیں۔ ہمارے سرکار کا راز لینا چاہتے تھے۔ بھلا ہم جاں نثاروں کے ہوتے ہوئے ان کی چال کامیاب ہوسکتی ہے؟''

☆☆☆

دوپہر کا وقت تھا۔ قربان خاں قلعے کی محل سرا سے نکل کر ٹہلتا ہوا چھاؤنی میں پہنچا۔ وہاں امیر جامدار کے ملازم رہتے تھے۔ قربان خاں نے ایک گھر کے دروازے پر آواز دی۔

''میاں ساحر! ارے بھائی ساحر میاں گھر میں ہو؟''

اندر سے ایک مترنم نسوانی آواز نے جواب دیا۔ ''وہ محل سرا سے ابھی نہیں آئے۔''

قرباں خاں آہستہ سے ہنسا اور بولا۔ ''ذرا ایک بات سن لیجیے۔''

وہ جانتا تھا کہ امیر جامدار کا ملازم ساحر فراش ابھی محل سرا میں ہے۔ اس کے ذمے فرش، مسند اور قالین بچھانے کا کام تھا۔ ساحر فراش کی خوب صورت بیوی حسینہ اکیلی تھی۔ قرباں خاں کی آواز پر اس کا صندل چہرہ اس کے حنا آلود نازک ہاتھوں کی طرح سرخ ہوگیا۔ وہ دوپٹا سنبھالتے ہوئے دروازے کے پاس آکر بولی۔

''کہو بھیا! کیا کام ہے مجھ غریب سے؟''

ٹاٹ کے پردے کے پار گزر کر یہ ترنم ریز آواز قربان خاں کے کانوں تک پہنچی تو وہ کھسک کر پردے کے قریب ہوگیا۔

''اپنے کو غریب نہ کہو حسینہ! تم کو تو وہ دولت ملی ہے جس کی خواہش نے بدایوں کے صوبہ دار کو بے تاب کر رکھا ہے۔''

''اللہ ان کو صبر دے اور سیدھا راستہ دکھائے۔''

''تم ہی ان کی راہنما بن سکتی ہو۔''

''میں شادی شدہ عورت ہوں بھیا! ماں باپ نے جس کا ہاتھ پکڑا دیا، اسی کو اپنا مجازی خدا سمجھتی ہوں۔''

''دیکھو حسینہ! میں جانتا ہوں کہ تمہیں زبردستی ساحر فراش کے سر منڈھا گیا ہے۔'' قربان خاں نے تیز ہو کر کہا۔ ''تم کسی اور سے محبت کرتی تھیں مگر ماں باپ نے تم کو بدصورت فراش کے عقد میں دے دیا۔''

حسینہ پردے کی اوٹ میں کھڑی تھی۔ یہ بات سن کر اس کی پیشانی پر پسینا چمکنے لگا۔ قربان خاں نے اس کے بارے میں جو کچھ معلوم کرلیا تھا وہ حیرت انگیز تھا۔ حسینہ کی پچھلی زندگی کے سارے گوشے قربان خاں کو معلوم تھے۔ اس کی غزال چشم میں اشکِ مجبوریت کے موتی چمکنے لگے۔

''کیا میں نے کچھ غلط کہا ہے حسینہ؟'' قربان خاں نے پوچھا۔

''نہیں بھیا! سچ ہی کہتے ہو۔'' پردے کے پیچھے سے بھنچی بھنچی سی آواز ابھری۔

''پھر تم کو ساحر فراش کے گھر پر لعنت بھیجنے میں کیا عذر ہے؟''

''مرنے والے ماں باپ کی عزت کا خیال ہے۔''

''امیر جامدار کی بیگم بن کر تم ان کی عزت بڑھاؤ گی حسینہ! دنیا کہے گی کہ محل سرا میں راج کرنے والی حسینہ فلاں فلاں ماں باپ کی اولاد ہے۔ عزت اور دولت کی سہیلی ہے۔''

''میں اپنی غربت میں خوش ہوں۔'' حسینہ نے آہستہ سے کہا اور اپنی بے بسی پر اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ قربان خاں کچھ دیر چپ رہا پھر بدستور نرم لہجے میں بولا۔

''میری بات پر غور کرو۔ جلدی نہیں ہے۔ خوب سوچ سمجھ کر آج نہیں تو کل جواب دینا۔ یہ ایسا معاملہ نہیں ہے کہ فوراً کوئی بات ہوجائے۔''

''اچھا! میں سوچوں گی۔'' حسینہ نے بیزاری سے کہا۔

''تمہارے بھلے کی بات ہے۔''

''جی!'' حسینہ نے ہونٹ بھینچ کر کہا۔

فاتحانہ تبسم قربان خاں کے لبوں پر کھیلنے لگا پھر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور صدری میں ہاتھ ڈال کر موتیوں کا ہار

نکالا اور جلدی سے ہاتھ پردے کے اندر کر کے بولا۔ ''یہ لو! سرکار نے بھیجا ہے۔ سچے موتیوں کی چمک دیکھو۔''

کئی لڑیوں کا خوب صورت ہار قربان کی ہتھیلی پر پڑا تھا۔ حسینہ نے موتیوں کی دمک دیکھی اور اس طرح پیچھے ہٹی جیسے وہ سانپ اور بچھو ہوں۔

کچھ دیر بعد قربان خاں نے اپنی ہتھیلی سے ٹھنڈے ٹھنڈے موتیوں کو اچانک اٹھتے محسوس کیا۔ ایک بار حسینہ کی لمبی سانس سنی۔ موتیوں کے ہار کا تحفہ امیر جامدار کی محبوبہ نے قبول کرلیا تھا۔

قربان خاں بہت خوشی خوشی واپس لوٹا۔ محل سرا پہنچ کر اس نے امیر جامدار کی خلوت کا رخ کیا۔ چوبدار جانتے تھے کہ وہ امیر جامدار کا منہ چڑھا مصاحب ہے اور ہر وقت ساتھ رہتا ہے۔ کسی نے روک ٹوک نہیں کی۔ خلوت گاہ میں پہنچ کر اس نے امیر جامدار کو بے چینی سے ٹہلتے دیکھا۔ وہ ململ کے جامے اور شلوار میں ملبوس تھا۔ آستینیں چڑھی ہوئی تھیں اور سر برہنہ تھا۔ قربان خاں کو دیکھتے ہی مضطرب ہو کر بولا۔

''حسینہ نے میرا تحفہ لیا؟''

''حضور! بڑی خوشی سے لیا۔'' قربان خاں نے مسکرا کر کہا۔ ''پہلے تو ذرا ناز و انداز دکھائے مگر میں جانتا تھا کہ یہ سب دکھاوا ہے۔ سچے موتیوں کا ہار دیکھ کر سانس رکنے لگی تھی۔''

امیر جامدار کا چہرہ بشاش ہو گیا۔ ''میں سمجھتا تھا کہ وہ بگڑ جائے گی۔''

''گستاخی معاف ہو۔ اس کو بگاڑنے کی کوشش تو میں کر رہا ہوں۔ آج اس کو بہن بھی بنا آیا تاکہ ذرا بے جھجک ہو کر بات کرلے۔''

''اپنی بہن کو بداطواری کی ترغیب دو گے؟'' امیر جامدار مسکرا کر بولا۔

قربان خاں نے اقرار میں سر ہلایا اور کہنے لگا۔ ''اس میں حرج ہی کیا ہے؟ اس فراش کے گھر میں اتنی خوب صورت لڑکی دیکھ کر مجھ سے صبر نہیں ہوتا۔ سب سے بہتر ہے کہ طلاق لے لے.....''

''ہاں! طلاق ہی لے لے۔'' امیر جامدار نے بات کاٹ کر زور سے کہا۔ ''تلوار کی قسم! میں اس سے نکاح کرلوں گا۔''

''حسینہ بھی نکاح کے بغیر نہیں مانے گی۔'' قربان خاں نے سنجیدگی سے کہا۔

''کیا تم نے کچھ بات کی ہے؟'' امیر جامدار نے چونک کر پوچھا تھا اور سوال میں اشتیاق کی بے صبری بھی جھلک رہی تھی۔ قربان خاں کو ہنسی آ گئی۔

''نہیں حضور! ابھی ایسی بات چیت کا موقع کہاں ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ حسینہ بری عورت نہیں ہے۔ وہ اپنے شوہر سے خوش ہو یا نہ ہو، بے عزتی اور گناہ کا راستہ کبھی اختیار نہ کرے گی۔ اگر اس نے حضور کی محل سرا کو اپنے حسن و جمال سے روشن کرنا منظور کرلیا تو نکاح میں آنے سے پہلے یہاں قدم نہ رکھے گی۔''

امیر جامدار کی بے تابی حد سے گزر چکی تھی۔ قرباں خان کو معلوم تھا کہ اس کے حرم میں کئی خوب صورت کنیزیں ہیں، بیوی کا عرصہ ہوا انتقال ہو چکا تھا۔ دو لڑکے تھے جو جاگیر پر رہتے تھے۔ حرم کی پری پیکر اور گل بدن لڑکیوں سے امیر جامدار کو دلی لگاؤ نہیں تھا۔ وہ ان کو اپنے ہتھیاروں، گھوڑوں اور ریاست و امارت کے دوسرے مظاہروں کی طرح ضمنی چیزیں سمجھتا تھا۔

لیکن حسینہ کا معاملہ تو جدا تھا۔ یہ تو اس کے دل میں ناتمام آرزو کی چبھن اور تشنہ کام تمناؤں کی کسک بن کر جاگزیں تھی۔ توشہ خانے میں ساحر فراش بڑے بڑے قالین جھاڑ رہا تھا۔ داروغہ نے اس کو دوپہر کو گھر جانے کی اجازت نہیں دی تھی۔

قربان خاں توشہ خانے میں آیا اور داروغہ کو آنکھ ماری۔

''میاں ساحر! ذرا ادھر آنا۔'' داروغہ نے فوراً آواز دی۔ ساحر پیشانی سے پسینا پونچھتا ہوا آیا اور قربان خاں کو سلام کیا۔ اس نے ساحر کو دیکھا۔ وہ توانا بدن کا مالک تھا۔ کالا اور بدصورت تھا۔ اس پر ستم یہ تھا کہ ایک زخم کا نشان رخسار پر باقی تھا جو اسے اور مکروہ بناتا تھا۔

''کتنے قالین جھاڑے تم نے؟'' داروغہ نے پوچھا۔

''سرکار! چالیس قالین جھاڑ کر تہ کر دیے ہیں۔''

''ابھی تو بڑا کام باقی ہے۔'' داروغہ نے مسکرا کر کہا۔ ''مگر جاؤ۔ پھر کسی دن سہی۔ تم نے تو کھانا بھی نہیں کھایا ہوگا۔''

ساحر سلام کر کے چلا گیا۔ قربان خاں کچھ سوچ رہا تھا۔

''کیا اس کی بیوی سے عشق کر رہے ہو؟'' داروغہ نے ہنس کر پوچھا۔ ''امیر جامدار نے سن لیا تو شامت آجائے گی۔''

''شامت کیوں آجائے گی؟'' قربان خاں نے پوچھا۔

''شادی شدہ عورت پر بری نظر ڈالنا جرم ہے۔''

''اور کنواری لڑکی ہو تو جرم نہیں ہے؟''

''ہے کیوں نہیں، مگر شادی شدہ عورت کی طرف ملتفت ہونا دہرا جرم ہے۔'' داروغہ نے ہنس کر کہا۔ ''سنا ہے

کہ عورت بہت حسین ہے؟''

''عورت نہیں، لڑکی ہے داروغہ جی!''

قربان خاں کی سنجیدگی پر توشہ خانے کا داروغہ سنبھلا اور حیرت سے قربان خاں کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کیا سچ مچ تم اس حماقت میں مبتلا ہو؟''

''خدا کی قسم! حسینہ کو بہن کہتا ہوں۔'' قربان خاں نے مسکرا کر کہا۔ ''تم کو معلوم ہے کہ یہ سب حرکتیں میں نے جوانی جانے کے ساتھ چھوڑ دی ہیں۔ جب شباب تھا تو شیطانی سوجھتی تھی۔ اب تو چربی اور بڑھاپے کا زمانہ ہے۔''

دونوں میں کچھ دیر تک باتیں ہوتی رہیں پھر زمانے کی بے حیائی اور قربِ قیامت کا ذکر چھڑ گیا۔ قربان خاں ہنس پڑا اور کہنے لگا۔

''اطمینان رکھو، قیامت بہت دور ہے۔ قربِ قیامت کی جو نشانیاں بیان کی جاتی ہیں، وہ ابھی ظاہر نہیں ہوئی ہیں۔''

داروغہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ''لوگ کہتے ہیں کہ یاجوج ماجوج تو نکل پڑے ہیں۔'' اس نے قربان خاں کا منہ تکتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

''بغداد کی تباہی کے بعد عام خیال یہی ہے۔''

قربان خاں نے حقارت سے کہا۔ ''لیکن یہ وحشی مغل اور تاتاری یاجوج ماجوج ہرگز نہیں ہیں۔ ابھی ابھی مصر کے سلطان رکن الدین بیبرس نے ان کو عین جالوط کے معرکے میں شکست دے کر شام و فلسطین اور عراق سے مار بھگایا ہے۔ خود ہمارے سلطان غیاث الدین بلبن نے ان کی بارہا سرکوبی کی ہے۔ ہر دوسرے تیسرے سال یہ وحشی ادھر کا رخ کرتے ہیں اور مار کر بھگائے جاتے ہیں۔''

''یہ تو ہے مگر بغداد کی تباہی کی داستانیں سن کر دل لرز اٹھتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم محفوظ ہیں اور مغل ہم سے ڈرتے ہیں۔''

''ہم سے نہیں، ہمارے سلطان سے ڈرتے ہیں۔'' قربان خاں ہنس کر بولا۔ ''غیاث الدین بلبن ہر لمحے چوکنا رہتا ہے۔ مغلوں نے جب بھی حملہ کیا ہے، منہ توڑ جواب پایا ہے پھر بھی کم بختوں کی ہمت دیکھو کہ باز نہیں آتے۔''

''دو سال سے تو امن ہے۔'' داروغہ نے سوچ کر حساب نکالا۔

''تو اس سال حملہ ضرور ہوگا۔''

''خدا کے لیے یہ نہ کہو۔'' داروغہ نے گھبرا کر اسے روکا۔ ''خدا سے دعا مانگنا چاہیے کہ آزمائش میں نہ ڈالے۔ کیا معلوم کس جنگ میں کس کی قسمت کیا پلٹا کھائے؟''

قربان خاں بھی چپ ہوگیا۔ مغلوں کی وحشیانہ ترک تازیوں کا رعب ایسا چھا گیا تھا کہ ان کو ذلت آمیز شکستوں سے دوچار کرنے والے بھی دل میں ان سے خوف محسوس کرتے تھے۔

یہ تیرھویں صدی کا زمانہ تھا۔ کرۂ ارض پر جو علاقے مہذب کہلاتے تھے وہ ایک محدود رقبے میں رہتے تھے۔ چین کو چھوڑ کر ہندوستان سے اندلس تک مسلم ممالک تھے جن کی سرزمینوں پر یونان کی منطق و فلسفے کے چراغ جل رہے تھے۔ فلکیات کے ماہر ستاروں کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ معالج طب کی قدیم دریافتوں میں نئے اضافے کر رہے تھے۔ شعر و ادب کا چرچا تھا۔ انسان کے وجود پر بحث ہو رہی تھی۔ اس کی زندگی کے مقاصد کا جائزہ لیا جا رہا تھا۔ یہ ساری سرگرمیاں جو دنیا کو ارتقاء کے راستے پر تیز قدم کر رہی تھیں، صرف ہندوستان سے اندلس تک ہو رہی تھیں۔ بقیہ دنیا میں تاریکی اور موت کا راج تھا۔

افریقا وحشی تھا، یورپ وحشی تھا۔ چین اپنے خواب گراں میں مبتلا تھا۔ صرف مسلمانوں نے تاریکی میں نور کی مشعلیں روشن کر رکھی تھیں۔

یہ عربی میں کتابیں لکھنے والے لوگ، فارسی کے مترنم اور لطیف سانچے میں جذبات کے اظہار کے طریقے بنا رہے تھے۔ عربی اور فارسی بولنے والے سماج دنیا کے بہترین افراد سے آراستہ تھے اور انہیں ممالک کو تاریکی، موت اور برف کے علاقوں سے نکلنے والے مغلوں نے نشانہ بنا رکھا تھا۔ وہ دنیا کے تمدن و تہذیب کے بہترین مرکز بغداد کو برباد کر چکے تھے اور ان کی نظروں نے ہندوستان کو تاک لیا تھا جس کی گرم خوشبودار سرزمین پر عربی بولنے والے علماء اور فارسی بولنے والے ادیبوں اور شاعروں نے فکر و دانش کی ایک جنت بنالی تھی۔ عرب و عجم کی برباد بستیوں سے ہجرت کرنے والے عالم و فاضل ادیب اور شاعر ہندوستان جنت نشان میں پناہ لے رہے تھے۔

سلطان غیاث الدین بلبن کا دربار رعب و جلال کی ساری تمکنت سے آراستہ اور ہر مظلوم کی امیدوں کا آخری سہارا تھا۔

مؤرخوں نے لکھا ہے کہ مغل گردی کے زمانے میں وسط ایشیا ایران، خراسان اور عرب کے چالیس بادشاہ اور شہزادے اپنی حکومتوں کے ساتھ دھوکا کر کے بلبن کے دربار میں پناہ گیر ہوئے تھے اور بلبن نے ان سب کو پورے احترام سے مہمان بنایا تھا۔ وہ روزانہ اس کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔

☆☆☆

نوبت دنقارے کی گرج سے دلوں میں ہیبت پیدا ہورہی تھی۔

دہلی میں قصرِ سفید کے صدر دروازے میں شاہی نقیب کھڑا ہوا تھا۔ چوگان کی تیاریاں مکمل ہوچکی تھیں۔ میدان کے کناروں پر مسلح سپاہی مؤدب کھڑے تھے۔

قصرِ سفید کے صدر دروازے کے عین روبرو بہت بڑا شامیانہ لگا ہوا تھا۔ چاندی کے چالیس کھمبوں پر ریشم کا یہ سرخ شامیانہ بلبن کی نشست گاہ تھا۔ یہ موتیوں کی جھالر سے آراستہ تھا۔ اندر زرکار مسندوں پر اہلِ دربار بیٹھے تھے۔ بیچ میں صندل کی بلند چوکی تھی جس پر چرمی گدا پڑا تھا اور غیاث الدین بلبن ململ کے سادہ لباس میں دوزانو بیٹھا تھا پھر اس نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ چوبدار دوڑ کر شامیانے سے نکلے اور برجی میں کھڑے نقیب کو رومال ہلا کر اشارہ دیا۔ اس نے پورے زور سے قرنا پھونکا۔ قرنا کی تیز سنسناتی آواز سنتے ہی نوبت و نقارے بجنا موقوف ہوگئے۔ صرف قرنا کی تیز و تند لہر جیسی آواز فضا میں پھیلتی رہی۔

میدان کے اس کنارے پر بارہ شہ سوار کھڑے تھے۔ یہ چہل گانی امیروں میں سے وہ نامور بہادر تھے جن کی جنگجوئی اور شجاعت کا شہرہ تھا۔ ان کے گھوڑے برابر کھڑے تھے۔

ان امیروں کی نظریں میدان کے وسط میں رکھی ہوئی سفید گیند پر تھیں۔ قرنا کی آواز پر وہ ہمہ تن تیار ہوگئے۔ قرنا کی آواز سن کر ان کے اعصاب تن گئے تھے۔ چوگان بازی (چوگان گھوڑے پر سوار ہوکر کھیلا جاتا تھا اور سلاطین مشرق کا دل پسند کھیل تھا۔ موجودہ زمانے کا پولو اسی طرح کا کھیل ہے) کے صدہا میدان دیکھے ہوئے گھوڑے بھی کنوتیاں بدل رہے تھے پھر وہ بے تاب ہوکر زمین پر ٹاپیں مارنے لگے۔

دفعتاً قرنا کی صدا دھیمی پڑی پھر ٹوٹ گئی۔

بارہ کے بارہ امیروں نے باگیں ڈھیلی کردیں اور آہنی مہمیز زور لگا کر گھوڑوں کی پسلیوں میں گڑا دیے۔ وہ ہنہنا کر اپنی جگہ سے اڑے۔ چھڑکاؤ کی گئی زمین سے گرد و غبار اٹھنا ناممکن تھا مگر تیز رفتار گھوڑوں کی جولانی سے مٹی کھد کھد کر اڑنے لگی۔ لوگ سانس روکے دیکھ رہے تھے۔ چوگان کا آغاز ہوچکا تھا۔

''سبحان اللہ!'' غیاث الدین بلبن نے آہستہ سے کہا۔

تمام گھوڑے ایک صف میں تھے۔ برابر سے اڑ رہے تھے اور ایک موج کی طرح چوگان کی گیند کی طرف جارہے تھے۔

ایک امیر کے گھوڑے نے اچانک جست بھری۔ بلبن نے پھر تعریف کی۔ صف ٹوٹ گئی تھی۔ ایک گھوڑا کافی آگے تھا۔ بقیہ سواروں نے بھی اپنے گھوڑوں کو چھلانگ لگانے پر مجبور کیا مگر چند لمحوں کی دیر نے معاملہ کچھ کا کچھ ہوگیا تھا۔

اگلے گھوڑے نے چند چھلانگیں اور لگائیں اور وہ اپنی پیش قدمی برقرار رکھنے میں کامیاب رہا۔ بجلی کی طرح اڑ کر وہ چوگان کی سفید گیند کے پاس ... آیا اور اس پر بیٹھے ہوئے سوار نے پلک جھپکتے میں وہ چوب چوگان کی کمر سے کھینچی جس کا نچلا سرا ذرا موٹا تھا اور جھک کر گیند پر ایسی ضرب ماری کہ وہ اچھل کر بہت دور بائیں طرف جا گری۔

غیاث الدین بلبن نے زیرلب پھر سبحان اللہ کہا۔ لب متبسم تھے، آنکھوں کی چمک سے پتا چلتا تھا کہ چوگان بازوں کی ہر ہر جنبش سے اس کے خون کی گردش تیز ہورہی ہے اور دل اچھل اچھل پڑتا ہے۔ وہ خود بھی چوگان بازی کا دلدادہ تھا لیکن جب سے چہل گانی امیروں میں سے ایک امیر کی جگہ وہ سلطان ناصرالدین محمود کا امیر حاجب، داماد اور پھر اس کی موت پر وصیت کے مطابق تخت و سلطنت کا وارث بن کر ہندوستان کا سلطان ہوا تو اس نے چوگان کھیلنا بالکل چھوڑ دیا۔

اس کی وجہ کسی کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ کھیلنا تو چھوڑ دیا تھا مگر بلبن کو چوگان بازی دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ آئے دن قصرِ سفید کے سامنے بڑے میدان میں چوگان کھیلنے والے جمع کیے جاتے تھے۔

جب تمام شہ سوار گھوڑے دوڑا کر گیند کو اڑا لے جانے والے کے پیچھے پڑے تو شامیانے کے نیچے بیٹھے ہوئے لوگوں کا جوش و خروش بڑھا۔

''اوہ! یہ تو شہزادہ محترم ہیں۔'' اس نے تحیر زدہ لہجے میں کہا۔

بلبن کی مسکراہٹ اور زیادہ گہری ہوگئی۔ جو سوار گیند کو لے کر اڑا تھا، وہ بلبن کا بیٹا شہزادہ محمد تھا جس کی علم نوازی اور علمی قابلیت کا شہرہ تھا۔ وہ بلبن کا سب سے چہیتا لڑکا تھا اور ابھی بے حد نوعمری میں اقبال کے آثار اس کی پیشانی پر چمکتے تھے۔

بہرطور، شہزادہ محمد بڑی پھرتی سے کام لے رہا تھا۔ اس کا گھوڑا سب سے آگے تھا۔ سب سے آگے ہی رہا۔ لاکھ کوششوں پر دوسرے گھوڑے اس کے قریب نہ جاسکے اور

اس کی چوب دست بجلی کی طرح لہراتی رہی، گیند کو اپنے آگے دائیں بائیں پھینکتی رہی ... اور دوسرے شہ سوار گیند کو بالکل نہ پا سکے۔

غیاث الدین بلبن کا تبسم ایک مرتبہ اتنا نمایاں ہوا کہ دانت نمودار ہوگئے اور پھر وہ سنبھل کر سنجیدہ ہوگیا۔ شامیانے کی فضا بے ساختہ داد و تحسین کی آوازوں سے معمور تھی۔ شہزادہ محمد نے مسلسل دو گھنٹے تک چوگان کے میدان میں اپنے ساتھیوں کو تھکا مارا، چکر دیے اور تعاقب میں مسلسل ناکام رکھا۔

پھر قرنا کی آواز گونجی اور چوگان کا کھیل بند ہوگیا۔ تمام شہ سوار گھوڑے دوڑاتے ہوئے شامیانے کے سامنے آئے، سلطان کی خدمت میں مؤدبانہ فوجی سلام کیا اور گھوڑوں سے کود کر اندر آئے۔ چہروں پر پسینا تھا اور گھوڑے عرق میں تر کھڑے ہانپ رہے تھے۔

بلبن نے بڑی شفقت سے نرم آواز میں کہا۔ ''جانِ پدر! مقابلہ برابر کا نہیں تھا۔ تمہارا گھوڑا اتنا دم دار تھا کہ اس نے دوسروں کو پیچھے چھوڑ کر مقابلے سے محروم کر دیا۔''

''سلطان محترم! اس میں میرا کیا قصور؟'' شہزادے نے معصومیت سے پوچھا۔

''تمہارا قصور یہ ہے کہ تم نے چوگان بازوں کو دست و بازو سے شکست نہیں دی، اپنے جانور کی قوت سے ہرایا ہے۔''

شہزادے نے ادب سے سر جھکا کر ندامت کا اظہار کیا۔

''زندگی کا میدان بھی میدانِ چوگان ہے نورِ چشم!'' بلبن نے اسے تنبیہہ کی۔ ''اس میدان کا سربلند فاتح وہی ہے جو حریفوں کو برابر کے مقابلے میں اپنے کس بل سے شکست دے۔ سہاروں کے بل پر میدان جیتنے سے بہتر ہے کہ شکست کھا جاؤ اور دوسری بار میدان مارنے کی کوشش کرو۔''

یہ کہہ کر بلبن نے چوبدار کو اشارہ کیا۔ وہ صندل کی کشتی لیے آگے بڑھا۔ اس پر کارچوب کا چمکتا ہوا سرخ کپڑا پڑا ہوا تھا اور کشتی میں ہزار اشرفیاں ڈھیر تھیں۔ یہ چوگان جیتنے والے کا انعام تھا۔

''میں دیکھ رہا تھا کہ میدان میں چستی، چالاکی اور گھوڑے کو اپنے قابو میں رکھنے کا سب سے اچھا مظاہرہ امیر رفیق جامدار نے کیا ہے۔''

امیر جامدار نے ہنس کر احتجاج میں کچھ کہنا چاہا مگر بلبن کے اشارے نے اسے خاموش کر دیا اور چوبدار نے وہ کشتی اس کے سامنے کر دی۔

امیر جامدار کو تسلیم کر کے کشتی لینا پڑی مگر وہ بولا۔

''حکم سلطانی سے مجبور ہوں لیکن یہ حق شہزادے کا ہے۔''

''بلبن انصاف کرنا جانتا ہے۔'' سلطان نے گرج دار آواز میں کہا۔

''مابدولت کے فیصلے رورعایت نہیں کرتے۔ اس کی شہادت خدائے بزرگ و برتر کی وہ ساری مخلوق دے گی جس نے مجھے اپنا حکمراں بنایا ہے۔''

شامیانے کے نیچے جتنے لوگ تھے، سب نے بہ یک آواز کہا ''ہم سلطان محترم کے عدل و انصاف کے شاہد ہیں۔ خدا سلطان کی عمر دراز کرے۔''

امیر جامدار کے چہرے پر مسرت کے آثار تھے۔

''ہم نے سنا تھا کہ امیر جامدار نے غفلت اور تساہل کو اپنا شعار بنایا ہے۔'' بلبن نے اہلِ دربار سے مسکرا کر کہا۔ ''لیکن الحمدللہ چوگان کے میدان میں ان کو کھیلتا دیکھ کر اس خبر کی تردید ہوگئی۔''

امیر جامدار نے معذرت کی۔ وہ جانتا تھا کہ بلبن کو ہر بات کی خبر ملتی ہے۔ بلبن کے پرچہ نویس ذرا ذرا سی باتوں سے باخبر رہتے تھے اور مفصل اطلاعات برابر دہلی کو بھیجتے رہتے تھے۔ کسی کو یہ معلوم بھی نہیں ہوتا تھا کہ شہر یا محلے میں کوئی مخبر آدمی بھی رہتا ہے۔ پرچہ نویس پوشیدہ رہ کر فرائض انجام دیتے تھے۔

بلبن نے امیر جامدار کی معذرت مسکرا کر نظر انداز کی کیونکہ پریشانی امیر جامدار کی پیشانی پر ابھر آئی تھی۔

''بہت دنوں تک آرام کرنے کا فطری نتیجہ ہے کہ انسان کاہل ہو جائے۔'' وہ ملائمت آمیزی سے بولا۔

''سپاہی کی تلوار کو امن کے زمانے میں زنگ لگنے لگتا ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ امیر جامدار اس سال مغلوں کے مقابلے پر جائیں۔ جنگ و جدل کی گرمی سے طبیعت میں بحالی اور بشاشت آجاتی ہے۔''

امیر جامدار سناکت کھڑا تھا۔ بلبن کے مشورے کے معنی وہ خوب جانتا تھا کہ یہ بلبن کا فرمان تھا یا حکم تھا جس کی تعمیل لازمی اور ضروری تھی۔ انکار کا سوال ہی نہیں تھا۔

بہرطور، بلبن کے اشارے پر دوسرا چوبدار بڑھا اور اس نے امیر جامدار کو قرمزی رنگت کی ایک عبا اوڑھا دی جس کے کناروں پر طلائی تاروں کی نقاشی تھی اور پھر ایک مرصع دستے کی تلوار امیر جامدار کی کمر سے باندھ دی گئی۔

بلبن نے امیر جامدار کا آداب بڑے اخلاق سے لیا اور تخت سے اٹھا۔

قصر سفید کے دروازے پر نوبت و نقارے نے گرجنا

شروع کر دیا۔

☆☆☆

امیر جامدار کو بلبن نے اچانک بدایوں سے طلب کیا تھا اور یہاں آ کر اس طرح اچانک چوگان بازی کے میدان میں اس کو سرحدی لشکر کی سپہ سالاری سپرد کر دی گئی تھی۔ قاعدہ یہ تھا کہ جاڑے کے موسم بھر چہل گانی امیروں میں سے کوئی ایک امیر سرحدی لشکر کا سپہ سالار بن کر ملتان میں مقیم رہتا تھا۔

یہی موسم مغلوں کے حملوں کا ہوتا تھا۔ وہ ہندوستان کی برسات اور گرمی کے نام سے سراسیمہ ہوتے تھے کیونکہ برسات میں کیچڑ، پانی اور گرمی کی شدت اور گرد و غبار مغلوں کے برق رفتار گھوڑوں کی راہ میں کانٹے ثابت ہونے والی چیزیں تھیں۔ ان کا طریقۂ جنگ یہ تھا کہ اچانک نمودار ہوتے، لمبے لمبے دھاوے مارتے اور دشمن کے ملک میں سرحدیں کاٹ کر اندرونی علاقے کے سرسبز و شاداب اہم شہروں پر ٹوٹ پڑتے۔ یہی شہر حکومت اور سلطنت کی جان ہوتے تھے۔ ان کی بربادی اور سقوط کے بعد وحشی مفتوحہ علاقے کے مالک بن جاتے۔ لوٹ مار کرتے اور جس رفتار سے آتے تھے، اسی طرح واپس چلے جاتے۔

ہندوستان کی گرمی اور برسات ان کے برق رفتار حملے کے خلاف فطرت کی بنائی ہوئی دیوار تھی اس لیے وہ صرف جاڑے میں حملہ کرتے تھے۔

امیر جامدار کو بلبن نے خلوت میں طلب کیا۔

امیر جامدار نے خلوت میں بلبن کو اپنا پرانا بے تکلف دوست پایا۔ دربار میں اس کی تمکنت اور رعب و جلال کے آگے لوگ لرزہ براندام رہتے تھے لیکن یہ خلوت تھی اور دو بے تکلف دوست جمع تھے۔

بڑی خندہ پیشانی سے بلبن نے امیر جامدار کی مزاج پرسی کی تھی اور اتنی ہمدردی سے بال بچوں کی خیریت پوچھی تھی کہ تھوڑی دیر کے لیے امیر جامدار اپنی دلی اذیت کو بھول گیا پھر بلبن نے مسکرا کر پوچھا۔

''لیکن برادرم! تم پریشان کیوں رہتے ہو؟''

''اوہ.....! کوئی خاص بات نہیں۔'' اس نے گھبرا کر کہا۔

''یہی بات میرے پرچہ نویسوں نے بھی لکھی ہے کہ تم بے وجہ پریشان رہتے ہو اور مجھے اس پر یقین نہیں آ رہا تھا۔''

بلبن کی بات سن کر امیر جامدار نے اطمینان کی سانس لی۔ پرچہ نویسوں کو اصل راز معلوم نہیں تھا۔ یہ بہت اچھا تھا۔ امیر جامدار اپنے عشق کے صرف ایک رازدار قربان خاں کی دل ہی دل میں تعریف کرنے لگا۔

بلبن اس کی خاموشی پر غور سے گھور کر بولا۔ ''کوئی وجہ ایسی ہے جو پرچہ نویسوں کو معلوم نہیں ہو سکی تو خلوت میں بلبن اس کو سن کر ہمدردی کر سکتا ہے۔ کیا بات ہے؟''

''کچھ نہیں۔ محض کاہلی ہے۔'' امیر جامدار نے مصنوعی تبسم سے کام لیا۔ ''مجھے چند روز فجر کی نماز میں دیر ہو گئی اس کا اعتراف ہے لیکن ایسا جرم یا خطا نہیں جس پر شاہی پرچہ نویس کاغذ سیاہ کرنے لگتے۔''

''ہر بات کی اہمیت ہے۔'' بلبن نے خشک لہجے میں کہا۔

''میں یقین دلاتا ہوں کہ میں ٹھیک ہوں۔'' امیر جامدار نے ہنس کر کہا۔

''اس کا میں نے خود مشاہدہ کر لیا ہے۔'' بلبن نے متانت سے کہا۔ ''بہرحال چار مہینے کی لشکری زندگی بھی بہترین دوا ہے۔''

''بہ خوشی جا رہا ہوں۔'' امیر جامدار نے خوش دلی سے کہا اور یہ بات اس کے دل سے نکلی تھی۔ وہ جنگجو اور بہادر تھا۔ لڑائی کے میدان اس کو چوگان کے میدانوں سے زیادہ پسند تھے۔ بے خوفی کی وجہ سے لشکر کی راہنمائی کرنے میں امیر جامدار کامیاب رہتا تھا۔ سپاہیوں کے لیے وہ حکم دینے والا سپہ سالار نہیں تھا، ساتھ ہو کر شانہ بشانہ لڑنے والا ساتھی تھا۔

بلبن نے کچھ سوچا پھر لمبی سانس لی۔ ''آج تم کو چوگان کھیلتے دیکھ کر وہ زمانہ یاد آ گیا جب میں بھی اسی طرح بے فکری اور آزادی سے چوگان بازی کرتا تھا۔''

اس کا لہجہ حیرت زدہ تھا۔

''لیکن تم نے عرصے سے چوگان کھیلنا چھوڑ رکھا ہے۔'' امیر جامدار نے یاد دلایا۔

''جب سے تخت ملا ہے، زندگی وبال ہو گئی ہے۔''

''کیا مطلب؟'' امیر جامدار نے حیرت سے پوچھا۔

''بادشاہ بن کر قدم قدم پر مصلحتیں دامن پکڑتی ہیں۔ وہ آزادی کہاں رہی؟'' بلبن نے تاسف کے انداز میں کہا۔

''کیا بادشاہ چوگان نہیں کھیلتے؟'' امیر جامدار نے پوچھا۔ ''یہ تو مردانہ جنگی ورزش ہے اور تمام بادشاہوں کا خاص مشغلہ رہا ہے۔''

''ہاں! خاص شاہی مشغلہ۔'' بلبن نے ہنس کر کہا۔ ''اس شوق نے سلطان قطب الدین ایبک کی جان بھی لے لی اور وہ قطب مینار کے پاس دنیا کی جو سب سے بڑی مسجد قوت الاسلام بنانا چاہتے تھے، ادھوری رہ گئی۔''

''زندگی کا کیا بھروسا اور کیا قیمت؟ وہ اتفاق تھا۔ کیا

موت کے ڈر سے چوگان کھیلنا چھوڑ دیا جائے؟''

''میں بزدل نہیں کہ ایسی رائے دوں۔''

''پھر تم نے چوگان کو کیوں چھوڑ رکھا ہے؟'' امیر جامدار نے ضد کی۔

بلبن نے اس کے اصرار پر مجبور ہوکر جواب دیا۔

''سنو دوست! میرے نزدیک سب انسان برابر ہیں۔ میں کسی کو اونچا کسی کو نیچا نہیں سمجھتا۔'' بلبن نے نرم آواز میں کہا۔ ''پھر بھی سلطنت کے لیے رعب اور دبدبہ لازمی ہے ورنہ میں بے لاگ انصاف کرنے سے معذور ہوجاؤں گا۔''

امیر جامدار متعجب ہوکر بلبن کو دیکھنے لگا۔ ''تم سمجھتے نہیں۔ ایک بادشاہ کو صرف بادشاہوں کے ساتھ چوگان کھیلنا چاہیے۔ اپنے امیروں اور رعایا کے ساتھ کھیل کے میدان میں نظر آنا جاہ وجلال کے منافی ہے۔''

بلبن نے تاسف کے عالم میں مزید کہا۔ ''میری طبیعت چاہتی ہے کہ چوگان کھیلوں مگر یہی مصلحت بار بار دامن پکڑتی ہے۔''

امیر جامدار نے بلبن کی سیاست کی داد دی اور بولا۔

''چہل گانی امیروں نے یہی سوچ کر تم کو اپنا اور ہندوستان کا سلطان بنایا تھا کہ تم سے بہتر آدمی حکومت کرنے کے لیے دنیا بھر میں نہیں ملے گا۔''

اس کی آواز میں جوش تھا۔ بلبن کو اپنے پرانے دوست کی تعریف سے دلی مسرت ہوئی۔ امیر جامدار کا شکریہ ادا کرکے اس نے کہا۔ ''میں ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں۔''

''درخواست! میں حکم سنوں گا۔'' امیر جامدار ہنسا۔

''نہیں، یہ ایک بادشاہ کا حکم نہیں، ایک باپ کی درخواست ہے۔'' بلبن نے لمبی سانس لے کر کہا۔ ''اور باپ کا دل بڑا کمزور ہوتا ہے۔''

امیر جامدار پوری طرح متوجہ تھا۔

''میں اپنے چھوٹے بیٹے کو جی جان سے چاہتا ہوں۔'' بلبن نے کہا۔ ''وہ ضد کررہا ہے کہ اس سال سرحدی لشکر میں شامل ہوگا۔ پندرہ سولہ سال کے لڑکے کو میں بزدلی کا سبق بھی نہیں دینا چاہتا مگر وہ میرے گھر کی روشنی ہے اور اس کی ماں بھی اس کو دیوانہ وار چاہتی ہے۔''

امیر جامدار نے سر ہلایا۔ شہزادہ محمد کی ماں ماہ خانم، سلطان نصیر الدین محمود کی بیٹی تھی۔ اس کی خوب صورتی اور ذہانت کا بڑا حصہ شہزادہ محمد نے ورثے میں حاصل کیا تھا اور وہ پیدائشی سپہ سالار تھا۔ تلوار اور قلم دونوں سے اس کی دوستی تھی۔

''میں اس کو تمہارے ساتھ کررہا ہوں۔'' بلبن نے کہا۔ ''درخواست ہے کہ کسی لڑائی میں اپنی نادانی سے وہ آفت میں مبتلا نہ ہونے پائے۔ یوں جو خدا کو منظور ہے وہ ہوگا مگر میں اس کی موت کے بعد زندہ نہیں رہوں گا۔'' بلبن کی آواز بھرا گئی۔

امیر جامدار نے اپنے دل میں کہا۔ ''بلبن صرف ایک بادشاہ ہی نہیں ہے جس کے بدن پر زرکار عبا وقبا پردے ڈال دے۔ وہ ایک انسان بھی ہے جس کا دل انسانی کمزوریاں رکھتا ہے۔''

وہ بلبن سے شہزادہ محمد کی خاص نگرانی کا وعدہ کرکے رخصت ہوا اور دوسرے دن بدایوں روانہ ہوگیا۔ ارادہ یہ تھا کہ مہینا بھر کی تیاریوں کے بعد بدایوں سے لشکر لے کر لاہور ہوتا ہوا ملتان کا رخ کرے گا۔

جاڑے کا آغاز ہوچکا تھا لیکن شمالی اور مغربی سرحدوں پر امن تھا۔ وحشی مغلوں نے ابھی تک کوئی لشکر اس طرف نہیں بھیجا تھا۔

امیر جامدار کے ہمراہ شہزادہ محمد بھی بدایوں روانہ ہوا۔ اس کے ساتھ چار ہزار غلام تھے جو اعلیٰ درجے کے شہ سوار اور جنگجو تھے۔ شہزادے کے اس لشکر میں کئی سو جانوروں پر اس کا کتب خانہ، مصاحبت کرنے والے شاعروں، عالموں اور ادیبوں کا ساز وسامان اور رسد بھی تھی۔

☆☆☆

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ حسینہ کے سڈول صندلی ہاتھوں نے امیر جامدار کے دونوں کندھوں کو جھنجوڑ دیا تھا۔ بڑھاپے کا دل اس لڑکی پر مرمٹا تھا جس کے جسم سے تازگی کی خوشبو اٹھتی تھی اور عشق نے ازلی اندھے پن کے ساتھ امیری غریبی کے فرق کو نظر انداز کردیا تھا۔

پھر بھی ایک دیوار حائل تھی جس کو پھلانگنے کی صورت نہیں تھی۔ حسینہ شادی شدہ تھی اور اس کا بدصورت شوہر اپنے عجیب وغریب طریقوں کے مطابق اس سے محبت کرتا تھا۔

ایک دن ساحر گھر سے باہر نکلا تو اس کی نظر ایک سپاہی پر پڑی۔ ساحر چونک کر رہ گیا۔ خوب صورت بیوی ہونے کے سبب وہ اپنے سائے سے بھی ڈرتا رہتا تھا۔

''تم یہاں کیسے کھڑے ہو؟'' ساحر نے سپاہی سے پوچھا۔ اس کی آواز میں نفرت اور تلخی کی ہلکی سی آمیزش تھی۔

''میں اپنی چچازاد بہن حسینہ سے ملنے آیا ہوں۔'' اجنبی سپاہی نے کہا۔ ''میں نے سنا ہے وہ یہیں کہیں رہتی

ہے۔ میرا نام داراب ہے۔''

''لیکن میں کسی داراب کو نہیں جانتا۔'' ساحر کے لہجے کی تلخی بدستور تھی۔ ''میں حسینہ کا شوہر ہوں۔''

اجنبی سپاہی کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی اور اس نے بڑی حسرت سے کہا۔ ''میں سات سال بدایوں سے باہر رہا ہوں، ساحر بھائی! ماں باپ پہلے ہی مر چکے تھے۔ کیا تعجب ہے کہ حسینہ بھی مجھے بھول گئی ہو۔ پھر بھی آپ اس سے میرے بارے میں پوچھیں۔''

حسینہ نے جب داراب کا نام سنا تو اس کا چہرہ زرد ہوگیا۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے ساحر کو دیکھنے لگی۔

''داراب!'' اس کے ہونٹ گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح لرز کر رہ گئے۔

''میں اسے اندر بلائے لیتا ہوں۔'' ساحر مڑا۔

''نہیں..... نہیں.....!'' حسینہ نے بے تاب ہوکر کہا اور دوڑ کر ساحر کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کی آنکھوں سے وحشت جھانک رہی تھی۔ ''خدا کے لیے اس کو نہ بلاؤ۔''

''ارے تیرا دماغ خراب ہے کیا؟'' ساحر ہاتھ چھڑاتا ہوا بولا۔ حسینہ اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مختلف خفتہ و ریختہ جذبات کی کشمکش نے اسے بے قابو کر دیا تھا۔ خوف اور اندیشے کی کیفیت سے اس کا رنگ اڑ گیا تھا اور وہ سہمی ہوئی نظروں سے دروازے کی سمت دیکھ رہی تھی جیسے ادھر سے کوئی بلا در آنے والی ہو۔

''میں اس سے نہیں ملوں گی۔'' وہ تلملائی آواز میں بولی۔

''وہ ملتان جا رہا ہے۔ پتا نہیں میدانِ جنگ میں اس پر کیا گزرے؟'' ساحر نے ازراہِ ہمدردی کہا۔ ''آخر بات کیا ہے؟''

حسینہ کے آنسو رخساروں پر ڈھلک آئے۔

''داراب کو دیکھ کر مجھے اپنے ماں باپ یاد آئیں گے۔'' حسینہ نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ''اور اپنے دکھے ہوئے دل کو میں اور زیادہ دکھانا نہیں چاہتی۔ میں نے ان باتوں کو بھلا دیا ہے۔ میرا دل وہ باتیں پھر یاد کرنا نہیں چاہتا۔''

ساحر فراش کے لیے یہ ایک معما تھا مگر وہ حسینہ کی ساری زندگی کو معما سمجھتا تھا۔ وہ حسینہ کے دلکش چہرے کو گھورتا رہا۔ یہ دلفریب چہرہ اس کے گھر میں سچی خوشی کی شادابی سے کبھی نہیں چمکا تھا۔ اس چہرے پر ماضی کی یادوں کے دبیز پردے پڑے رہتے تھے۔

اور اب حسینہ ان دبیز پردوں کو ہٹانے پر تیار نہیں تھی۔ وہ داراب سے ملنے سے انکار کر رہی تھی۔ میکے کی لطیف یادوں کو زندہ کرنے کا ایک موقع ملا تھا اور وہ اس کو ٹھکرا رہی تھی۔

اچانک ساحر مسکرایا اور پیار سے حسینہ کا گال تھپتھپا کر باہر چلا گیا۔ انکار کی وجہ سے اس نے مسرت محسوس کی تھی۔

داراب بے چینی سے اس کا منتظر تھا۔

''میاں داراب! اب وہ تم سے ملنا نہیں چاہتی۔'' ساحر نے کہا۔

داراب کا چہرہ سرخ ہوکر پیلا پڑ گیا۔ پہلے اس نے شبہ کیا اور کچھ کہنا چاہا۔ یہ ممکن تھا کہ ساحر نے حسینہ سے کچھ کہے بغیر اپنی طرف سے یہ کہہ دیا ہو مگر داراب کے دماغ نے دلیل دی۔ ''وہ یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ حسینہ نے تم کو سرے سے پہچانا ہی نہیں۔''

اور..... اب داراب کا دل چیخنے لگا۔

یہ وہی حسینہ ہے جس نے تم کو ماں باپ کی مرضی کے نام پر ٹھکرا دیا تھا۔ سات سال بعد وہ اب تم کو دیکھنے تک کی روادار نہیں۔ یہ ظلم حسینہ کے سوا اور کون کر سکتا ہے؟

درد و کرب کے آثار اس کے چہرے پر ابھرے۔

''اچھا! میں جا رہا ہوں ساحر بھائی!'' وہ افسردگی سے بولا۔ ''حسینہ سے کہہ دیجیے گا کہ میں نے مرنے سے پہلے اسے دیکھنا چاہا تھا۔ اب ہم قیامت میں ملیں گے۔ اس سے کہنا کہ داراب نے بچپن کے اس زمانے کو فراموش نہیں کیا ہے جب ہمارے گھر آس پاس تھے اور ہم لوگ تمام فکروں سے آزاد اور معصوم تھے اور خوش رہتے تھے۔''

''یہ ساری باتیں مجھے یاد نہیں رہیں گی۔'' ساحر نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

داراب کے ہونٹوں پر افسردگی نے تبسم کا جامہ پہن لیا۔ چہرے کی غمگینی کے باوجود ساحر کی سادگی پر اس کو ترس آمیز ہنسی آنے لگی۔

''اچھا، خدا حافظ!'' اس نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔

ساحر نے لمحہ بھر کے لیے بھونچکا ہوکر داراب کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو اس طرح دیکھا جیسے وہ کسی خنجر کے برہنہ پھل کو دیکھ رہا ہے۔ ساحر فراش کے لیے مصافحہ ایک اجنبی دستور تھا جو بڑے آدمیوں کے درمیان رائج تھا۔ توشہ خانے کے فراش اور نچلے درجے کے ملازم ان نزاکتوں کو برتنا نہیں جانتے تھے۔

پھر بھی اس نے دونوں ہاتھ بڑھا کر داراب کے ہاتھ کو گرفت میں لے لیا۔ گرمجوشی کے باوجود داراب کو یہ

اندازہ کرنے میں دشواری نہیں ہوئی کہ ساحر اناڑی ہے اور رسوم وآداب برتنے کا بالکل عادی نہیں۔

وہ چلا گیا اور ساحر کھڑا ہوا اس کو سر جھکائے آہستہ آہستہ جاتے دیکھتا رہا۔

داراب کی باتیں اس کے لیے معما بن کر رہ گئی تھیں اور اس طرح وہ حسینہ کے انکار پر حیرت زدہ تھا۔ اچانک بدگمانی کے سانپ نے سر اٹھایا اور ساحر کا خون ابلنے لگا۔ اس کا جی چاہا کہ دوڑ کر داراب کو روک لے اور پوچھے کہ تم حسینہ سے کیوں ملنا چاہتے تھے اور اس نے تم سے ملنے سے کیوں انکار کیا؟ لیکن پھر اس کا غصہ دھیما پڑ گیا۔

حسینہ کے انکار کی وجہ یاد آئی تو وہ یہ سوچ کر خوش ہوا کہ داراب کو حسینہ نے اپنے سامنے آنے کا موقع دیے بغیر واپس کر دیا۔ گھر میں آیا تو ساحر کے چہرے سے مسرت ٹپک رہی تھی۔

''گھر آئے مہمان کی بے عزتی نہیں کرتے۔'' ساحر نے کہا۔ ''بے چارہ جنگ پر جا رہا ہے۔ کیا معلوم زندہ بچے گا یا نہیں۔''

''خدا کی جو مرضی ہے، وہ پوری ہوگی۔'' حسینہ کا لہجہ بے رنگ اور بہت دھیما تھا۔ ساحر نے اسے ہنس کر دیکھا۔ حسینہ نے نظریں جھکا لیں اور ہونٹ چبانے لگی۔

''تو بڑی بے رحم ہے۔'' ساحر نے لمبی سانس لے کر حسینہ کے شاداب جسم کی رعنائیوں پر حسرت بھری نظر ڈالی اور کہا۔ ''تو دنیا میں کسی سے محبت نہیں کر سکتی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ خدا نے اتنے حسین پیمانے میں یہ زہریلی تلخ شراب کیوں بھری ہے؟ کیا اچھا ہوتا کہ اپنے خوب صورت بدن کی طرح تیرا دل بھی اچھا ہوتا۔''

آنسوؤں کی نمی حسینہ کی شربتی آنکھوں میں ابھری۔ اس نے کچھ کہنا چاہا تھا، اتنے میں باہر سے کسی نے زور سے ساحر کو آواز دی۔ حسینہ چونک پڑی۔ یہ موٹے تازے قربان خاں کی بھاری بھرکم آواز تھی۔

ساحر نے جواب دیا اور فوراً باہر نکل آیا۔

''سرکار آ گئے!'' وہ سلام کرتا ہوا بولا۔

''ہاں! اور تمہاری ضرورت ہے۔ شہزادہ محمد ساتھ ہیں۔ ان کے لیے قالین، پردے اور مسندیں سب ہی کچھ نکالنا ہوں گی۔''

''میں ابھی چلتا ہوں۔'' ساحر نے کہا اور اندر آ کر جلدی جلدی کپڑے تبدیل کر کے روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

قربان خاں کی بھاری آواز پر حسینہ چونک پڑی اور اس کے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ وہ اٹھ کر دروازے کی طرف یوں بڑھی جیسے سہمی ہوئی بکری کو اژدہے کی پھنکار نے اپنی سمت کھینچا ہو۔ قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ ٹاٹ کے پردے کے قریب آ کر وہ کھڑی ہو گئی۔

''حسینہ! مجھے سرکار نے بھیجا ہے۔'' قربان خاں نے آہستہ سے کہا۔ ''دہلی سے واپس آ کر وہ تمہارے لیے پہلے سے زیادہ بے چین ہیں۔''

''تو میں کیا کروں؟'' حسینہ نے عاجزی سے پوچھا۔

''مجھے معلوم ہے تم ساحر کی وجہ سے اپنے آپ کو مجبور سمجھتی ہو۔''

حسینہ نے کوئی جواب نہ دیا۔

''کیا وہ تم کو طلاق نہیں دے سکتا؟''

ہلکی سی سرخی اس کے چہرے پر پھیلی اور ناگواری کے عالم میں اس نے کچھ کہنا چاہا پھر رک کر ہونٹ چبانے لگی۔

''نہیں۔'' حسینہ نے تلملائے لہجے میں کہا۔

''یہ تمہارے لیے بہتر ہوگا۔ بیوگی اس سے بڑی مصیبت ہے۔''

قربان خاں کے یہ الفاظ سن کر حسینہ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اشارہ اتنا واضح تھا کہ اس کی سمجھ میں فوراً آ گیا۔ قربان خاں نے فوراً کہا۔

''دیکھو حسینہ! سرکار اتنے بے تاب ہیں کہ صبر نہیں کر سکتے۔ ایک صورت یہ ہے کہ ساحر تم کو طلاق دے دے، دوسری یہ ہے کہ اس کی جان سلامت نہ رہے اور تم اس کی موت کے بعد آزاد ہو جاؤ۔''

حسینہ کے بدن میں تھرتھری سی پیدا ہو گئی تھی۔

''تم نے جواب نہیں دیا۔'' قربان خاں نے شکایت کی۔

''کیا جواب دوں؟ قسمت کا کھیل ہے۔ یہ الفاظ کانوں میں پڑنے سے پہلے خدا مجھ کو اٹھا لیتا تو اچھا تھا۔''

وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی۔ قربان خاں نے رونے کی آواز سن کر منہ بنایا اور مونچھیں مروڑنے لگا۔ وہ انتظار کر رہا تھا کہ جذبات کا یہ طوفان جس طرح آیا ہے اسی طرح گزر جائے۔ جب سسکیاں دھیمی پڑیں تو وہ بولا۔

''بیکار رونے دھونے سے کیا فائدہ؟ آدمی تقدیر کے آگے بے بس ہو جاتا ہے اور تمہاری تقدیر ہے کہ بدایوں کے صوبے دار نے تمہیں دیکھ لیا اور فیصلہ کر لیا کہ پوری عزت سے وہ تم کو اپنی محل سرا میں لے جائیں گے۔''

''مجھے اپنا جھونپڑا پسند ہے۔'' حسینہ نے تلخی سے کہا۔

''یہ تمہارا بچپنا ہے۔ ابھی تم نے محل سرا دیکھا نہیں۔ ریشم کے بستر، سونے کے زیور اور عیش و آرام کی زندگی.....''

''مجھے یہ چیزیں نہیں چاہئیں۔'' حسینہ نے تلخی سے کہا۔

''جیسی تمہاری مرضی۔'' قربان خاں نے بے پروائی سے کہا۔ ''گھر آئی دولت کو ٹھکرا رہی ہو مگر میری مانو تو ابھی اور سوچ کر جواب دینا۔''

''میرا جواب ہمیشہ یہی رہے گا۔''

قربان خاں کے ہونٹوں پر زہریلا تبسم کھیلنے لگا۔

''خیر! یہ لو، سرکار دہلی سے تمہارے لیے لائے ہیں۔'' اس نے جیب سے ریشم کی ایک تھیلی نکال کر پردے کے اندر کر دی۔

''میں..... میں..... یہ نہیں.....'' حسینہ نے ہونٹ چبا کر کہا۔

''انکار کرو گی تو سرکار کہیں بگڑ نہ جائیں۔'' قربان خاں نے مکروہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''ایسا ہوا تو بے چارے ساحر کی جان پر بن جائے گی۔'' اور حسینہ نے گھبرا کر وہ تھیلی لے لی۔ اس کو نفرت سے دیکھا اور پھر آہستہ سے زمین پر رکھ دیا۔ قربان خاں کے مطمئن ہو کر ہنسنے کی آواز اس نے سن لی۔

''آج تو داراب اس گلی کے پھیرے لگا رہا تھا۔'' وہ تمسخر سے بولا۔

حسینہ کے منہ سے ایک دبی ہوئی چیخ نکل گئی۔

''گھبراؤ نہیں۔ داراب کے بارے میں نہ تو تمہارے شوہر کو کچھ معلوم ہے اور نہ میں نے سرکار سے کہا ہے ورنہ ظاہر ہے سرکار تو اپنے رقیب کو فوراً مروا ڈالتے۔ داراب ہی کی وجہ سے تم ان کی محل سرا کو ٹھکرا رہی ہو۔''

حسینہ کو ان الفاظ میں کسی بھیانک اور خبیث روح کی وہ ہنسی جھلکتی معلوم ہو رہی تھی جو انسانی بے بسی کا تماشا دیکھ رہی ہو۔ قربان خاں نے اپنے الفاظ بڑی سفاکی اور بہت اطمینان سے ادا کیے پھر وہ کچھ کہے بغیر وہاں سے چلا گیا۔

معلوم نہیں کتنی دیر تک حسینہ کھڑی رہی، زرد اور پسینے میں ڈوبے ہوئے چہرے پر مردنی چھائی رہی۔ وہ پتھر کا بت بن کر رہ گئی تھی پھر اس نے جھک کر ریشمی تھیلی اٹھالی۔ بے خیالی میں اس نے اس کو کھولا۔ بے حد چمک دار سرخ نگینوں کا ہار اندر چمک رہا تھا۔ اس نے تھیلی الٹی۔ ہار کے ساتھ کانوں کے آویزے بھی تھے۔ وہ بھی سرخ نگینوں سے آراستہ تھے۔ توشہ خانے کے معمولی فراش کی بیوی نے آب و تاب سے شبنم کے قطروں کو شرمانے والے پتھروں کو بڑی دیر تک دیکھا پھر سرد آہ بھر کر تھیلی میں رکھ دیا اور اندر چلی گئی۔

دروازے کو کسی نے زور سے کھٹکھٹایا۔

''کون ہے؟'' حسینہ نے کوٹھری سے نکلتے ہوئے پوچھا اور بیزاری کے عالم میں دروازے کے نزدیک پہنچ گئی۔ پردہ ہوا سے اڑا اور وہ کونے میں ہو گئی۔

ایک نرم کپکپاتی آواز حسینہ نے سنی۔

''حسینہ! میں اندر نہیں آسکتا؟''

اور وہ دیوار کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی۔ چکر آنے لگے۔ یہ داراب کی آواز تھی۔ ماضی کی تمام یادوں کے جادو میں ڈوبی ہوئی اور بہت پست لیکن اس میں عزم و ارادے کی شدت تھی۔ داراب نے جواب کی ضرورت نہیں سمجھی۔

وہ پردہ اٹھا کر اندر داخل ہو گیا۔

اس کی تشنہ کام نظروں نے حسینہ کو سر جھکائے دیکھا۔ گھنے ریشم جیسے بال چاند کے گرد ہالا کیے ہوئے تھے اور حسینہ کے سرخ ہونٹ کانپ رہے تھے۔

وہ ہاتھ پھیلا کر اس کی سمت بڑھا۔

''نہیں داراب!'' حسینہ نے سہم کر پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

''میں تم سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہونے آیا تھا۔'' داراب نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''جنگ کے میدان میں لڑنے نہیں، مرنے جا رہا ہوں۔''

حسینہ کی نگاہیں اٹھیں اور داراب سے ملیں۔ دونوں بڑی دیر تک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ سات آٹھ سال کی مدت جو درمیان میں تھی، وہ کھنچی ہوئی رسی کی طرح ٹوٹ گئی تھی۔ اب وہ پھر ایک دوسرے کے نزدیک تھے۔

''قسمت کا کوئی علاج نہیں۔'' حسینہ نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

''یہ مجھے بھی معلوم ہے۔'' داراب نے تلخی سے ہنس کر کہا۔ ''یہ قسمت ہی کا کھیل تھا کہ اچانک تمہارے ماں باپ نے تمہاری شادی کر دی حالانکہ میں نے ان سے کہا تھا کہ وہ کچھ دن تک اور انتظار کریں۔''

''ابا اور اماں بیمار تھے۔'' حسینہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

''ہاں! اسی لیے انہوں نے جلدی کی اور بہت جلدی کی۔'' داراب کا لہجہ تلخ ہوتا گیا۔ ''غلطی ہماری تھی حسینہ! ہم کو ان سے کہہ دینا چاہیے تھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے مگر تم اس پر تیار نہ تھیں۔''

''یہ بڑے شرم کی بات تھی۔'' حسینہ نے سادگی سے کہا۔

داراب نے اسے دیکھا اور بے ساختہ مسکرادیا۔ حسینہ کی یہ معصومیت فطری اور دلکش تھی۔ داراب کو اس کی یہ ادا سب سے زیادہ پسند تھی۔

''اچھا! تم کو دیکھ لیا۔اب چلتا ہوں۔''

وہ خدا حافظ کہہ کر مڑا۔ حسینہ نے روکنا چاہا پھر چپ ہوگئی۔ داراب پردہ اٹھا کر باہر نکل گیا اور حسینہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

☆☆☆

امیر جامدار نے قلعے کو پوری طرح سے آراستہ کر رکھا تھا۔اس کی آمد سے پہلے ملازموں کو حکم مل گیا تھا کہ وہ شہزادہ محمد کی وجہ سے قلعے اور محل سرا کو آراستہ کرکے شہزادے کے شایانِ شان بنادیں۔

اپنی جگہ پر اس کے اضطراب اور بے قراری کا حال پہلے سے زیادہ خراب ہو چکا تھا جس کو حسینہ کے عشق نے بوڑھے امیر کے سینے میں روشن کر رکھا تھا۔

قربان خاں نے حسینہ کے پاس سے واپس آکر کہا۔

''حضور! بس ایک صورت ہے۔ اگر اجازت دیں تو اس پر عمل کروں اور ان شاء اللہ حسینہ محل سرا میں آجائے گی۔''

''وہ کیا؟'' امیر جامدار نے اشتیاق سے پوچھا۔

قربان خاں نے ہاتھ جوڑ دیے اور بولا۔''چاہے سر کاٹ دیجیے، پہلے سے نہ بتاؤں گا۔بس اتنا یقین رکھیں کہ ساحر اش کو خود طلاق دینا پڑے گی۔''

''تم جو چاہو کرو۔'' امیر جامدار نے ہنس کر کہا۔

''قربان خاں! جس دن حسینہ کو میرے محل سرا میں لاکر بٹھادو گے، تلوار کی قسم! تم کو سونے میں تول دوں گا، جو مانگو گے دوں گا۔''

''مجھے معلوم ہے حضور!'' وہ ہنس کر سلام کرتے ہوئے بولا۔

امیر جامدار نے اپنے موٹے تازے مصاحب کو دیکھا۔اسے قربان خاں کی عیاری پر بھروسا تھا لیکن پھر بھی اس نے اچانک ایک بات دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتی محسوس کی۔ امیر جامدار کی پیشانی فکر آلود ہوگئی۔

قربان خاں کی باز جیسی آنکھوں سے یہ تردد پوشیدہ نہ رہ سکا۔ ملائمت آمیزی سے بولا۔''حضور کو اپنے خادم پر بھروسا نہیں ہے؟ دامنِ یقین تھامے رکھیے۔ جو کچھ کر رہا ہوں، کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی اور خدا نے چاہا تو آپ پر کسی طرح کا الزام نہیں آئے گا۔''

امیر جامدار کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا۔''بھئی تم سے کیا پردہ

خُدارا ___ خُدارا

شوگر کے مریض

مایوس نہ ہوں۔ کیونکہ مایوسی تو گناہ ہے۔ ہم نے طویل ریسرچ کے بعد دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک خاص قسم کا ہربل۔ شوگر نجات کورس۔ تیار کیا ہے۔ جس سے انشاء اللہ آپ کو شوگر سے مستقل نجات مل سکتی ہے۔ شفا من جانب اللہ پر ایمان رکھیں۔ شوگر انسانی جسم کے اعصاب کو دیمک کی طرح اندر ہی اندر کھوکھلا۔ کمزور۔ بے جان بنا کر اعصابی کمزوری۔ جوڑوں کی درد اور ہر وقت کی تھکاوٹ سے بے بس۔ لاچار اور ناکارہ بنا دیتی ہے۔ آج ہی فون پر اپنی شوگر کی تمام علامات سے آگاہ کرکے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP شوگر نجات کورس منگوالیں۔ خدا کیلئے آپ ایک دفعہ ہمارا شوگر نجات کورس آزما کر تو دیکھ لیں۔ آج ہی فون کریں۔

المسلم دار لحکمت (رجسٹرڈ)
ضلع حافظ آباد پاکستان
فون صبح 10 بجے تا رات 9 بجے تک
0300-6526061
0301-6690383

مجھے؟'' وہ قدرے ندامت سے بولا۔ ''میں سلطان محترم سے بہرحال ڈرتا ہوں اور ان کے پرچہ نویسوں کو ہر بات کی خبر ہوجاتی ہے۔ اگر یہ شکایت پہنچی کہ ایک عورت کے لیے میں نے انصاف کو پامال کیا ہے تو پھر بدایوں کی صوبے داری تو ایک طرف رہی، جاگیر کے لالے بھی پڑ جائیں گے۔''

''ارے نہیں حضور! دشمنوں کے منہ میں خاک۔''

''مذاق نہ سمجھو، خطرہ بہت بڑا ہے۔''

''لیکن حضور تو سلطان محترم کے پرانے دوست اور چہل گانی امیروں کے سرتاج ہیں۔'' قربان خاں نے احتجاج کیا۔

امیر جامدار نے نفی میں سر ہلا کر غمگین لہجے میں جواب دیا۔ ''بلبن کو اصولوں کے سامنے دوستی کی پروا نہیں ہوتی ہے۔ چہل گانی امیر تو اب بلبن کے معمولی سپاہیوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ وہ ہم کو اس طرح سزا دیتا ہے جیسے قصر سفید کے پہرے داروں کو سزا دیتا ہے۔''

قربان خاں بڑے غور سے سنتا رہا۔ امیر جامدار کو بلبن سے اتنا خوفزدہ دیکھ کر اسے جرأت بھی ہوئی اور ڈر بھی لگا۔ اس کا خیال تھا کہ امیر جامدار کو سلطان بلبن کی طرف سے باز پرس کا کوئی خدشہ نہیں ہوسکتا اور اس چھوٹے سے ترک غلام سے ڈرتا ہے جو غیاث الدین بلبن کے نام سے ہندوستان پر سلطنت کرتا ہے۔

''سنبھل سنبھل کر قدم رکھنا۔'' امیر جامدار نے تنبیہ کی۔

''حضور کی نصیحت پر پورا عمل ہوگا۔''

''شہزادہ بھی موجود ہے۔'' امیر جامدار نے کہا۔

''قربان خاں! یہ عجیب لڑکا ہے۔ اتنا عجیب کہ میں اس کو پاگل سمجھنے پر مجبور ہوں۔''

''وہ کیوں حضور؟'' قربان خاں نے پوچھا۔

''رات دن شعر و شاعری میں مبتلا رہتا ہے۔ نہ معلوم کون سی کتابیں جن کے نام بھی یاد نہیں رکھے جاسکتے، پڑھوا کر سنتا ہے۔ صحبت میں فقیر، صوفی اور مسجدوں کے ملا بھی ہیں اور لا ابالی شاعر بھی۔''

''ابھی کم عمر ہے حضور! یہ ناتجربہ کاری کی خامی ہے۔''

''شاید یہی بات ہے۔'' امیر جامدار نے لمبی سانس لی۔ ''میں نے کہا تھا کہ شکار کے لیے بدایوں کے جنگل بہترین جگہ ہیں مگر اس نے بات اڑا دی اور پوچھنے لگا کہ بدایوں میں کتنے عالم، صوفی، درویش اور ملا رہتے ہیں؟ میں نے شرف الدین کوتوال کو بلا کر ایک فہرست مانگی اور شہزادے کے حوالے کردی۔ اب سنا ہے کہ اس نے باری باری سب کو دعوت دے کر محل سرا میں بلایا ہے۔''

قربان خاں کو توال کے نام پر چونک پڑا۔

''ایک بات عرض کروں حضور؟'' وہ جھک کر آہستہ سے بولا۔

''میرا خیال ہے کہ شریف الدین پرچہ نویسوں کا سردار ہے۔''

امیر جامدار مسکرا کر نفی میں سر ہلانے لگا۔

''قربان خاں! پرچہ نویس بہت معمولی آدمی بن کر رہتے ہیں۔ ملازم، سپاہی اور تاجر بن کر اپنا کام کرتے ہیں تاکہ صوبے دار سے لے کر کوتوال اور قاضی تک، سب کو اپنی شکایات کا نشانہ بنا سکیں۔''

اس کے باوجود قربان خاں کو کوتوال شہر پر شبہ رہا۔

''وہ کہہ رہا تھا کہ آپ کے رنج و غم کا سبب معلوم کرے گا۔'' اس نے رکتے رکتے بتایا۔ امیر جامدار کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

''تم ایک کام تو کر ڈالو۔'' وہ سوچ کر بولا۔

قربان خاں نے مستعدی ظاہر کی۔

''کوتوال کے پاس جا کر اس کے دوست بنو۔'' امیر جامدار مسکرایا۔ ''ہوسکتا ہے کہ اس نے کہیں سے سن گن لی ہو کہ میں حسینہ پر عاشق ہوں۔''

''حضور! یہ راز تین آدمیوں کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔'' قربان خاں نے قسم کھانے والے انداز میں دعویٰ کیا۔

امیر جامدار سوچتا رہا۔ وہ فکرمند ہوگیا تھا۔ قربان خاں نے اس کو تسلی دی اور اجازت لے کر اٹھا تو امیر جامدار نے اس کو اشارے سے روکا۔

''حسینہ نے وہ ہار لے لیا تھا؟'' اس نے مسکرا کر پوچھا۔

''بڑی خوشی سے حضور!'' قربان خاں ہنس کر بولا۔ ''اس نے حضور کے عطیے کو ہمیشہ سر آنکھوں پر لیا ہے اور دل سے لگایا ہے۔''

''اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ میری طرف متوجہ ہے؟''

امیر جامدار کے الفاظ میں اشتیاق اور اضطراب کی جھلک تھی۔ قربان خاں نے اس کو مایوس کرنا کفر سمجھا... اور مبالغے سے بولا۔

''حسینہ کو ہر لمحے آپ ہی کا خیال رہتا ہے۔ وہ جانتی ہے کہ جھونپڑی میں چمکنے والے لعل پر جوہری کی نگاہ ہے اور یہ نگاہ ایسی ہے کہ اس نے پتھر کا جگر چیر ڈالا ہے۔ حضور! کہتے ہیں کہ حسینوں کا دل بلور سے زیادہ سخت ہوتا ہے مگر آپ نے وہ جادو کیا ہے جس نے بے چاری کو نیم بسمل بنا دیا ہے۔''

امیر جامدار نہایت اشتیاق و پسندیدگی سے یہ خوشامد سنتا رہا پھر زانو پر ہاتھ مار کر زوردار قہقہہ لگایا اور کہنے لگا۔

''قربان خاں! تیری زبان میں جادو ہے جادو۔''

''سرکار کے نمک کی قسم! جو کہا ہے اس میں ذرہ برابر بھی جھوٹ نہیں ہے۔''

امیر جامدار ہنستا ہوا اٹھا اور اسے بیٹھنے کا حکم دیا پھر خود بغلی حجرے میں چلا گیا جہاں جواہر خانہ تھا۔ قربان خاں کے ہونٹوں پر اطمینان اور مکاری کی ملی جلی مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ اسے معلوم تھا کہ امیر جامدار اس کے لیے انعام لینے گیا ہے۔

''کم سے کم پانچ سو اشرفیاں ملیں گی۔'' وہ دل ہی دل میں خوش ہو کر سوچنے لگا۔ ''یہ بھی کم ہیں! لالچی بڈھے نے ایک لڑکی کو جواہرات سے نوازا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ میرے بغیر اس کو وہ لڑکی ہاتھ نہیں لگ سکتی۔''

امیر جامدار واپس آ کر اسے زربفت کی تھیلی دیتے ہوئے بولا۔ ''ہزار اشرفیوں کی کوئی قیمت نہیں قربان خاں! بہت جلد میں تم کو ایک پورا گاؤں دینے کا ارادہ کرتا ہوں جو نسل در نسل تمہارے خاندان میں رہے گا اور اس بات کی یاد دلاتا رہے گا کہ احسان کا بدلہ کیسے ادا کیا جا سکتا ہے۔''

مسرت سے چمکتے چہرے کے ساتھ قربان خاں نے سات سلام کیے۔ زربفت کی تھیلی لی اور خوشی خوشی چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد امیر جامدار نے اپنی مہندی لگی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا اور حسینہ کی یاد میں کھو گیا۔

☆☆☆

اچانک سلطان غیاث الدین بلبن کے قاصد، شہزادہ محمد اور امیر جامدار کے نام فرمان لے کر آئے۔ بلبن نے لکھا تھا کہ مغلوں کے ایک لشکر نے ہرات سے پیش قدمی کی ہے اس لیے امیر جامدار اور شہزادہ محمد کو بلا تاخیر فوراً ملتان روانہ ہو جانا چاہیے۔

نوعمر اور ناتجربہ کار شہزادے نے اظہارِ مسرت کیا۔ شعر و شاعری کی شبانہ محفلوں کی طرح اسے حرب و ضرب سے بھی دلچسپی تھی۔ اس نے بدایوں کے علماء اور صوفی بزرگوں سے التماس کی کہ وہ اس کے لیے شہادت کی دعا کریں۔

جمعے کے دن وہ جامع مسجد التمش میں پہنچا۔ امیر جامدار کے چہرے پر فکر و اضطراب کے نقوش تھے اور شہزادے کا چہرہ دمک رہا تھا۔ امام نے خطبے میں سلطان غیاث الدین بلبن کی سلامتی کی دعا مانگی اور مغلوں پر قہرِ الٰہی کے نزول کی التجا بارگاہِ خداوندی میں پیش کی تو ساری مسجد میں آمین کی دل سے نکلنے والی صدائیں گونجنے لگیں۔

یہ جوش و خروش ایسا تھا کہ شہزادے پر بے خودی سی طاری ہو گئی۔ اس نے رعایا کو اپنے حکمراں کے لیے سچے دل سے بے تاب دیکھا۔ واپسی پر بدایوں کے بازار آدمیوں کے دو طرفہ ہجوم سے کھچا کھچ بھر گئے تھے۔ بلبن کے خوب صورت بیٹے کو فوجی لباس میں گزرتے دیکھ کر عوام نے پُرزور نعرے لگائے، دعائیں دیں اور چاندی کے سکے نثار کیے۔

شہزادہ محمد قلعے کے دروازے میں داخل ہوا تو اس کی نظر دارالسزا پر پڑی اور وہ چونک کر امیر جامدار کی طرف مڑا۔

''کسی مجرم کو سزا دی جا رہی ہے۔'' اس نے بے تعلقی سے بتایا۔

دارالسزا کے بیچ میں پتھر کا بڑا سا چبوترا تھا جس پر بھاری ستون نصب تھا اور ایک آدمی اس ستون سے بندھا ہوا تھا۔ شہزادے نے اپنا گھوڑا اس سمت بڑھایا۔

اس آدمی کے منہ پر ڈھاٹا باندھ دیا گیا تھا۔ کمر سے لنگوٹی بندھی تھی اور چار جلاد تازیانے لیے کھڑے تھے۔ سزا کا تماشا دیکھنے کے لیے دارالسزا کے آس پاس کافی لوگ جمع تھے۔ شہزادے کی آمد پر بھیڑ کائی کی طرح پھٹ گئی۔

''اس کو کس جرم کی سزا دی جا رہی ہے؟'' شہزادے نے پوچھا۔

''حضور! اس نے چوری کی ہے۔''

''کیا اس کی سزا یہ ہے؟'' شہزادے نے ناگواری سے کہا۔ ''کس قاضی نے مقدمہ سنا تھا اور شہر کے کوتوال نے کیا کیا ہے؟''

سناٹا چھا گیا۔ لوگ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ ایک فوجی عہدے دار بڑھا اور ادب سے سلام کر کے بولا۔

''شہزادہ عالم! قلعے کے اندر جو جرائم ہوتے ہیں ان کی بابت شہر کوتوال کچھ نہیں کر سکتا اور نہ مقدمہ قاضی کے سامنے جاتا ہے۔''

''تم یہ بات بلبن کی سلطنت میں کہہ رہے ہو؟''

''جان کی امان حضور! یہ پرانا قاعدہ ہے۔ لشکر کے مقدموں کا فیصلہ ہم لوگ خود کرتے ہیں اور قلعہ لشکر کی حدود میں ہے۔''

''یہ سرزمین کس کی ہے بہادر سردار؟'' شہزادے نے پوچھا۔ اس کی آواز میں بے حد نرمی تھی۔ لہجہ ہموار تھا مگر فوجی عہدے دار کانپ گیا۔ اس کا سر جھک گیا۔ وہ سہم کر بولا۔

''سلطان غیاث الدین بلبن کی حضور!''

''ہرگز نہیں۔ تم غلط سمجھے۔'' شہزادے نے مسکرا کر کہا۔ ''یہ خدا کی زمین ہے۔ ساری دنیا اس کی ہے۔ بادشاہوں کا کام تو صرف خدا کی مخلوق کو آفات و مصائب سے محفوظ رکھنا ہے۔ وہ خادم ہیں، مالک نہیں ہیں۔''

''بجا ارشاد ہوا شہزادۂ عالم!'' فوجی عہدے دار گھبرا کر بولا۔

''پھر خدا کی زمین پر ہر جگہ خدا کا قانون چلنا چاہیے۔ قلعے اور لشکر گاہیں شیطان کے قانون کے تابع نہیں ہو سکتیں۔''

شہزادے کے تیور بدل گئے تھے۔ اس نے درشتی سے حکم دیا کہ ملزم کو رہا کر دیا جائے اور اس حکم کی تعمیل فوراً کی گئی۔ ملزم کو کھولا گیا تو وہ لنگڑاتا ہوا اور چلنے میں اذیت سے منہ بناتا شہزادے کے قریب گیا اور رکاب تھام کر رونے لگا۔

''کیا بات ہے؟'' شہزادے نے محبت سے کہا۔

''میں کوڑے کھانے سے نہیں ڈرتا۔'' وہ روتے ہوئے بولا۔ ''محنت کرنے والا ہوں۔ جس طرح میرا نام چوری کے الزام سے بدنام ہوا، وہ میرے لیے مرنے کے مترادف ہے۔''

''تم کون ہو اور تم پر چوری کے الزام کی نوعیت کیا ہے؟''

''حضور! میرا نام ساحر ہے۔ توشہ خانے کا فراش ہوں۔ داروغہ نے برسوں کی نمک حلالی اور خدمت پر پانی پھیر دیا۔ الزام لگایا کہ میں نے توشہ خانے سے ایک زرکار مسند چرالی جو حضور کے خیمے میں بچھائی جاتی ہے۔''

''اور تم نے چوری نہیں کی؟'' شہزادے نے مسکرا کر پوچھا۔

ساحر نے سر اٹھایا۔ بدنما چہرے پر آنسوؤں کی لکیریں تھیں اور دلی تکلیف کے آثار تھے۔ بہت درد بھرے لہجے میں اس نے کہا۔

''زندگی میں آج تک حرام کا ایک لقمہ پیٹ میں نہیں گیا۔ شہزادے حضور! میں مزدور ہوں۔ فاقے کر سکتا ہوں، چوری نہیں کر سکتا۔''

اس دعوے میں بے چارگی کے ساتھ غرور اور اکھڑپن تھا اور شہزادہ محمد کو یہ ادا بھا گئی۔ اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ''اب توشہ خانے کی نوکری کرو گے؟''

''نہیں حضور! جہاں عزت گئی، وہاں قدم رکھنا ٹھیک نہیں۔'' ساحر نے ٹھنڈی سانس بھر کر مایوسی سے کہا۔ ''دنیا بہت بڑی ہے۔ کہیں بھی محنت کر کے پیٹ بھر لوں گا۔''

''بال بچے ہیں؟''

''ایک بیوی ہے۔'' ساحر نے شرما کر کہا۔

''اچھا! تم ہمارا ملازم ہونا قبول کرو گے؟'' شہزادے نے ہنس کر پوچھا۔ ''مگر لڑائی کے میدان میں چلنا پڑے گا۔''

ساحر نے کچھ سوچا اور پھر سادگی سے پوچھا۔ ''میں اپنی بیوی کو بھی ساتھ لے چلوں حضور؟''

''ضرور لے چلو۔ تم کو الگ خیمہ ملے گا۔'' شہزادے نے قہقہہ لگا کر کہا۔ ''معلوم ہوتا ہے کہ بیوی کے عاشق ہو۔ اس کی جدائی برداشت نہیں کر سکتے۔ بہرحال، میرے ساتھ شاعر تو بہت ہیں مگر سچا عاشق کوئی نہیں ہے۔''

ساحر نے شرم سے سر نیچا کر لیا اور شہزادے نے ہنستے ہوئے اسے ساتھ آنے کا حکم دیا اور گھوڑے کو موڑ لیا۔

محل سرا میں ساحر کو لشکر کے میر منشی نے تقرر کا پروانہ دے دیا اور فوراً حاضر ہونے کی ہدایت کی۔

ساحر بہت خوش تھا۔ جو مار پیٹ ہوئی تھی، اسے بھول گیا۔ مسکراتا ہوا لنگوٹی پہنے اپنے گھر کی طرف چلا۔ ایک آواز سن کر مڑا۔ یہ قربان خاں تھا اور خوفزدہ صورت بنائے اس کی طرف آ رہا تھا۔

''تم نے شہزادے سے کوئی شکایت تو نہیں کی؟'' وہ گڑگڑایا۔

ساحر نے نفرت سے زمین پر تھوک کر منہ بنایا۔ ''تم سب کو اپنے جیسا بے حیا نہ سمجھو۔'' وہ دانت پیس کر بولا۔ ''تم نے میرے اوپر الزام لگوایا اور مجھ سے کہا کہ بیوی کو طلاق دے کر کوڑوں کی مار سے بچ جاؤں۔ میں یہ بات شہزادے سے کہتا تو یہ نہ معلوم ہو جاتا کہ تم میری بیوی کے عاشق ہو۔''

ساحر کی آنکھوں کی خونخواری دیکھ کر قربان خاں پیچھے ہٹا۔

''ڈرمت ذلیل کتے!'' ساحر نے مٹھیاں بھینچ کر کہا۔ ''میں تجھے مار بھی نہیں سکتا۔ ساری دنیا کو یہ بتانا مجھے گوارا نہیں کہ کمینے اور خبیث لوگوں نے میری بیوی کو غریب سمجھ کر اس کی آبرو سے کھیلنا چاہا تھا۔''

قربان خاں کے ہونٹوں پر عیاری اور شیطنت نے زہر بھرے تبسم کی شکل اختیار کر لی۔ وہ ساحر کو گھور کر بولا۔ ''بڑے غیرت دار بن رہے ہو؟''

''دکھاؤں اپنی غیرت؟'' ساحر نے گرج کر پوچھا اور اس کی سمت بڑھا۔ بازوؤں کی مچھلیاں تڑپ رہی تھیں۔ ننگے بدن کی سطح پر تمام رگ پٹھے فولاد کی طرح ابھر رہے تھے۔

قربان خاں نے وہاں سے چلے جانے میں ہی عافیت سمجھی۔ جب قربان خاں واپس جانے لگا تو ساحر کے

ہونٹوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ ابھری اور وہ اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

ملتان میں حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانی کی آخری آرام گاہ تھی اور ان کی خانقاہ میں بھی صدہا درویش رہتے تھے۔ حضرت شیخ کے صاحبزادے شیخ صدرالدین جہاں خانقاہ میں درس و ہدایت کے فرائض انجام دے رہے تھے اور بلبن کو ان سے بڑی عقیدت تھی۔ شہزادہ محمد اور امیر جامدار وہاں پہنچے تو شیخ صدرالدین نے ایک درویش کو بھیج کر انہیں طلب کیا۔

دونوں نیاز مندانہ حاضر ہوئے تو انہوں نے فرمایا۔ ’’سلطان کو ہم نے لکھ دیا ہے کہ حضرت شیخ کی برکت سے... ان شاءاللہ ملتان کو مغلوں کے قدم بھی ناپاک نہیں کرسکیں گے۔‘‘

امیر جامدار نے منہ بنایا اور پوچھا۔ ’’حضرت! کیا لشکر کی وجہ سے آپ ناراض ہیں؟‘‘

’’ہاں! یہی بات ہے امیر جامدار!‘‘ شیخ نے متانت سے کہا۔ ’’اہلِ شہر کو سپاہیوں کی کثیر تعداد کے آجانے سے تکلیف ہے۔ ضرورت کی چیزیں گراں ہورہی ہیں اور غریبوں کو اندیشہ ہے کہ گرانی بڑھی تو ایک وقت فاقہ کرنا پڑے گا۔‘‘

شہزادے نے جو مؤدب بیٹھا ہوا تھا، امیر جامدار کو اشارے سے منع کیا اور امیر جامدار کو ناگواری کے ساتھ چپ ہوجانا پڑا۔ شہزادے نے وعدہ کیا کہ بہت جلد لشکر ملتان سے نکل کر کھلے علاقے میں چلا جائے گا۔‘‘

واپسی کے وقت امیر جامدار نے شکایت کی۔ ’’ان فقیروں کی باتیں بے سروپا ہوتی ہیں شہزادے! تم اس طرح ان کے کہنے پر چلے تو سلطانِ محترم کے عتاب کا شکار ہوجاؤ گے۔‘‘

’’مجھے اس کی توقع نہیں۔‘‘ شہزادے نے آہستہ سے کہا۔

’’کیوں نہیں! شہر کو مغلوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا جرم ہے۔‘‘

’’حضرت شیخ کی برکت ملتان کی محافظ ہے۔‘‘

امیر جامدار نے قہقہہ لگایا اور اپنی سرخ ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ یہ ایسی بات تھی جس پر اس نے تبصرہ کرنا مناسب نہ سمجھا اور اس کو یہ امید تھی کہ ملتان کے صوبے دار امیر بختیار خلجی کی جانب سے شہر کو بے سہارا چھوڑنے اور وہاں سے لشکر نکال لے جانے کی مخالفت بھی ضرور ہوگی۔

امیر جامدار احتیاط برت رہا تھا۔ شہزادے سے کھلی

ذہن کے بند دریچوں میں قید نا آسودہ خواہشوں کا

احوال جو کسی کی بدترین محرومیوں کی عکاسی کرتی تھیں

محبت کو انا کی سولی پر لٹکانے والوں کا فسانۂ عبرت

معاشرتی ناہمواریوں کو قلم بند کرنے والے قلم کار

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

کے قلم کا جادو

جنگ باز

بہت جلد سسپنس کے صفحات پر... تہلکہ خیز واقعات کا سلسلہ

مخالفت کرنے سے وہ دامن بچا رہا تھا۔ ساحر فراش نے جب سے شہزادے کی پناہ لی تھی، امیر جامدار بہت محتاط ہوگیا تھا۔ ڈر یہ تھا کہ کہیں حسینہ سے عشق کا راز فاش نہ ہوجائے۔

ساحر فراش ان دنوں خوش تھا۔ طویل سفر میں بھی شہزادہ محمد کے توشہ خانے کے ملازم کی حیثیت سے وہ آرام میں رہا۔ کام کم تھا، تنخواہ معقول تھی اور سلوک بھی بہت اچھا ہوتا تھا۔ ایک الگ خیمہ مل گیا تھا اور وہ حسینہ کے ساتھ بڑے سکون سے رہتا تھا۔

ملتان پہنچ کر حسینہ کی طبیعت بگڑی۔ ساحر فراش نے اسے حکیم سعد الدین تبریزی کو دکھایا جو شہزادے کے درباری حکیم تھے۔ انہوں نے حسینہ کی نبض پر ہاتھ رکھا اور مسکرا کر بولے۔

''یہ تو بڑا مبارک مرض ہے۔''

ساحر گھبرا کر ان کا منہ تکنے لگا۔

''تمہاری بیوی کے اولاد ہونے والی ہے۔'' حکیم تبریزی نے ہنس کر کہا۔

ساحر نے چادر میں لپٹی حسینہ کو دیکھا جو یہ سن کر اور سمٹ گئی تھی۔ اس کا چہرہ چمک اٹھا اور وہ فرطِ مسرت سے خود بھی ہنسنے لگا۔

''لیکن لشکر کی زندگی کی سختیاں تمہارے لیے مناسب نہیں۔'' حکیم تبریزی نے قلم اٹھا کر نسخہ لکھتے ہوئے کہا۔

''میر منشی کو بتا دینا۔ وہ ملتان میں تمہارے رہنے کا بندوبست کردے گا اور تم کو چھٹی بھی مل جائے گی۔''

ساحر فراش کو امید نہ تھی مگر میر منشی نے ساحر کی درخواست سن کر فوراً منظور کرلی اور اسی دن ساحر کو تمام سامان سمیت شہر کے ایک مکان میں بھیج دیا اور تاکید کرتے ہوئے کہا۔ ''تم کل شہزادہ محترم سے زبانی طور پر عرض کردینا کہ بیوی کی دیکھ بھال کے لیے مستقل شہر میں رہنے کی اجازت مل جائے۔''

''کہیں شہزادہ خفا نہ ہوجائیں؟'' ساحر ڈرتے ہوئے بولا۔

''نہیں، وہ اپنے سے کمزوروں پر کبھی غصہ نہیں ہوئے۔''

میر منشی کے ہمت دلانے پر ساحر فراش نے جرأت کی اور شہزادے سے عرضِ حال کردی۔ شہزادہ محمد نے پوچھا۔

''ولادت کو کتنا عرصہ باقی ہے؟''

''مجھے معلوم نہیں۔'' ساحر نے جھینپ کر سر جھکا لیا۔

''خیر! مجھے یہ معلوم کرکے افسوس ہوا کہ اس حال میں تم نے سفر کیا ہے۔ جاؤ، ہم شہر واپس آکر تم کو اپنے ساتھ لے چلیں گے۔''

ساحر سلام کرکے چلا آیا لیکن وہ الجھن میں پڑ گیا تھا۔ شہزادے کی بات سے اندازہ ہوا تھا کہ وہ ملتان سے باہر جا رہا ہے۔ ملتان کے قلعے اور شہر پناہ کے باہر خیموں میں لشکر مقیم تھا۔ اپنے نئے گھر آکر اس نے آس پاس کے لوگوں سے سنا کہ شہر والے لشکر کی آمد سے گھبرا گئے ہیں۔

''تم لوگ بھی عجیب ہو۔'' ساحر نے اپنے پڑوسی سے کہا۔

''ہم مغلوں سے نہیں ڈرتے۔'' پڑوسی نے منہ بنا کر کہا۔ ''البتہ تمہاری وجہ سے جو گرانی ہوگئی ہے، اس کی تکلیف ناقابلِ برداشت ہے۔'' ساحر کو غصہ آگیا۔ وہ بحث کرنے لگا۔ اس نے سارا الزام ملتان کے تاجروں پر رکھا۔

''نہیں! ساری نحوست تم لوگوں کی ہے۔'' پڑوسی نے طعنہ دیا۔

ساحر بے قابو ہوگیا اور اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، پڑوسی کے ایک زوردار تھپڑ مارا۔ مزدور کے طاقت ور ہاتھ کی پانچ انگلیوں کے نشان اس غریب پڑوسی کے رخسار پر بن گئے جو ملتان کے ایک کپڑے کے بیوپاری کے یہاں حساب کتاب لکھا کرتا تھا۔ جھگڑا بڑھا۔ دو چار آدمیوں نے دخل دیا تو ساحر نے سب کو مارا پیٹا اور جسمانی قوت کے بل پر انہیں بھگا دیا۔

وہ لوگ شکایت لے کر سیدھے شیخ صدرالدین جہاں کے پاس پہنچے اور انہوں نے شہزادہ محمد کو خط لکھ کر سخت الفاظ میں مطالبہ کیا کہ لشکر کو ملتان سے فوراً اٹھایا جائے۔ امیر جامدار نے بے قابو ہوکر ملتان کے صوبے دار بختیار خلجی کو مخاطب کیا۔

''کیا تم خانقاہ کے اس فقیر کا دماغ درست نہیں کرسکتے؟''

''گستاخی نہ کرو دوست!'' بختیار خلجی نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''حضرت شیخ خدا رسیدہ اور قابلِ صد احترام ہیں۔''

''ہوں گے، مگر امورِ حکومت میں دخل اندازی کیا معنی رکھتی ہے؟''

''آپ کیا فرماتے ہیں؟'' بختیار خلجی نے شہزادہ محمد سے پوچھا۔

''لشکر کو آج ہی یہاں سے ہٹا لیا جائے گا۔'' شہزادے نے مسکرا کر کہا۔ ''والد محترم نے فرمایا تھا کہ حضرت شیخ کی ہر نصیحت پر کان دھرنا۔''

''سنا تم نے؟'' بختیار نے امیر جامدار کو متوجہ کیا جو

ہونٹ چبا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں غصے کی چمک تھی۔ امیر جامدار نے لمبی سانس لی اور نفرت اور غصے سے شہزادے کو دیکھا پھر بختیار خلجی کو گھورنے لگا۔ اس کی مٹھیاں بھنچ گئی تھیں۔

''ہم جائیں کدھر؟ جہنم میں؟'' وہ گرج کر بولا۔

''دریائے سندھ کے کنارے لشکر کے جانوروں کے لیے سبزہ زار بھی ہیں اور کھلی جگہ بھی ہے۔'' بختیار خلجی نے سکون سے کہا۔ ''میں نے پرگنوں کے عہدے داروں کو لکھا ہے کہ وہ لشکر کے لیے رسد اور غلہ خرید کر بھیجیں۔''

فیصلہ ہو چکا تھا۔ امیر جامدار ناراضگی کے عالم میں اٹھ کر اپنے خیمے میں چلا گیا۔ شہزادہ محمد اور بختیار خلجی آپس میں باتیں کرنے لگے۔

''امیر جامدار کو غرور نے پاگل کر دیا ہے۔'' بختیار نے تبصرہ کیا۔

''وہ نہیں جانتا کہ حضرت شیخ اور ان کے والد محترم کا درجہ کیا ہے۔''

شہزادے نے تاسف سے کہا۔ ''والد محترم نے بتایا تھا کہ جب وہ امیر کی حیثیت سے ملتان میں مغلوں کا مقابلہ کرنے پہلی بار آئے تھے تو حضرت بہاؤالدین زندہ تھے۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے مغلوں کو تمہارے سامنے مغلوب کر دیا ہے۔ تم ان پر ہمیشہ فتح یاب رہو گے۔''

''اور یہ پیش گوئی کتنی درست نکلی۔'' بختیار خلجی عقیدت سے بولا۔

''بے شک! دنیا میں مغلوں کو شکست دینے کا فخر صرف ہندوستان اور مصر کے سلطان کو حاصل ہوا ہے۔''

''میں نے سنا ہے کہ مصر کے سلاطین بیبرس کو شام و فلسطین اور مصر کے ایک ہزار بزرگوں نے اپنی روحانی امداد کا یقین دلایا تھا اور ان کی دعاؤں کا ثمر تھا کہ وہ مغلوں پر فتح یاب ہوا۔''

''ان شاء اللہ ہمارے لیے حضرت بہاؤالدین اور ان کے صاحبزادے، کی برکت کافی ہوگی۔''

''ان شاء اللہ! ان شاء اللہ!'' بختیار خلجی جوشِ عقیدت سے بولا۔

''مغل ابھی دو یا تک نہیں پہنچے۔''

''جی نہیں! ہرات سے ان کا لشکر بلوچستان کی طرف بڑھا مگر بلوچوں کے بہادر سردار امیر حمزہ کوچک نے ان کو روک دیا۔ اب سنا ہے کہ وہ مڑ کر بولان کے درّے سے واپس جا رہے ہیں۔''

''اس کے معنی یہ ہیں کہ جنگ نہیں ہوگی۔'' شہزادے نے مایوسی سے کہا۔

بختیار خلجی مسکرانے لگا اور اس نے تعریفی نگاہوں سے شہزادہ محمد کی صورت دیکھی۔ حسین و جمیل شہزادے کی خوش اخلاقی اور علم دوستی کی شہرت اس کے کانوں تک پہنچی تھی لیکن اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ شہزادے کو قلم اور قرطاس کی طرح تلوار اور جنگ کے میدان سے بھی رغبت ہے۔

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد شہزادے نے سکوت توڑا۔ ''میں حضرت شیخ کے دربار میں حاضری دینے جا رہا ہوں۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔ ''آپ نقیبوں کو حکم دیجیے کہ وہ لشکر میں کوچ کا حکم پکار دیں۔ حضرت شیخ کے سامنے میں اس طرح نہیں جا سکتا کہ ان کے حکم کی تعمیل نہ ہوئی ہو۔''

ملتان کے صوبے دار بختیار خلجی نے فوراً نقیب طلب کیے اور کوچ کا حکم پکارنے کی ہدایت کی۔ شہر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور جب شہزادہ محمد خانقاہ کے سامنے نمودار ہوا تو ایک بھیڑ نے اس کو دیکھ کر نعرے لگائے۔ لوگوں کو معلوم تھا کہ اس نے حضرت شیخ کے فرمان کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا ہے۔

☆☆☆

رات کافی ڈھل چکی تھی۔ امیر جامدار نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ وہ اپنے خیمے میں ٹہل رہا تھا۔ پہرے داروں کو حکم دیا تھا کہ کسی کو اندر آنے کی اجازت نہ دیں۔ بار بار خود نکل کر تاروں کو دیکھتا تھا اور پھر ٹھنڈی سانس لے کر اندر چلا آتا تھا۔

آخر انتظار کا طلسم ٹوٹا اور قربان خاں اندر آیا۔

''تم نے مجھے مار ڈالا۔'' امیر جامدار نے شکایت کی۔

''حضور! بڑی مشکل سے مکان کا پتا ملا ہے۔'' قربان خاں ہانپتے ہوئے بولا ''مگر کمبخت نے میری ایک نہ سنی بلکہ مجھے مارنے کو دوڑا۔''

''تم نے کہا نہیں کہ ہم اسے مالا مال کر دیں گے؟''

''کہا تھا حضور! میں نے بہت سمجھایا کہ امیر جامدار تم کو اپنے توشہ خانے کا داروغہ بنا دیں گے۔ اس سفر میں اس کے ساتھ رہو مگر اس کا دماغ خراب ہے۔ اتنا خراب ہے کہ مجھے مارنے کو دوڑا۔''

''بزدل! کتنی بار کہے گا۔'' امیر جامدار نے نفرت سے کہا تو قربان خاں نے سر جھکا لیا۔

کچھ دیر سکوت طاری رہا۔ امیر جامدار بار بار آہیں بھر رہا تھا۔ اس نے بہت دنوں سے حسینہ کو نہیں دیکھا تھا۔ سفر میں وہ ساتھ رہی تھی لیکن ساحر، شہزادہ محمد کے لشکر میں

تھا۔ امیر جامدار کو صرف یہ تسلی تھی کہ حسینہ ساتھ ہے۔

''تم حسینہ سے نہیں مل سکے؟'' اس نے مایوسی سے پوچھا۔

''ساحر ہر وقت گھر پر رہتا ہے حضور!''

''کہیں اس نے تو کچھ نہیں کہہ دیا اپنے شوہر سے؟''

امیر جامدار کے الفاظ میں ہلکا سا خوف تھا۔ قربان خاں بھی چونکا اور سوچنے لگا لیکن پھر فوراً سنبھل کر سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''نہیں حضور! یہ نہیں ہوسکتا۔ وہ تو دل و جان سے سرکار پر فریفتہ ہے۔''

''تم یہی کہہ کر مجھے بہلاتے رہے ہو۔'' امیر جامدار نے جھنجلا کر کہا۔ ''میں بچہ نہیں ہوں۔ چلو میں خود چل کر حسینہ سے بات کروں گا۔''

قربان خاں کے ہوش اڑ گئے۔ وہ گھبرا کر بولا۔ ''حضور! وہ ساحر کم بخت ہر وقت گھر میں رہتا ہے۔ موقع کہاں سے ملے گا۔ اس لیے میں چاہتا تھا کہ وہ پھر سے سرکار کی ملازمت اختیار کرلے تاکہ جب تک وہ یہاں کام کرتا ہے، سرکار حسینہ سے ملتے رہا کریں۔''

امیر جامدار نے تلوار کھینچ کر اسے ڈانٹا۔ ''قربان خاں! تُو مجھے دھوکا دے رہا ہے۔ مسلسل دھوکا دے رہا ہے۔ چل! میں خود حسینہ سے مل کر پوچھوں گا کہ کیا وہ مجھ سے محبت کرتی ہے؟''

دہشت اور خوف کے مارے قربان خاں کی سانس رکنے لگی۔ وہ ذبح کی جانے والی بکری کی طرح امیر جامدار کو سہمی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔ ''حضور! میں نے آپ سے بار بار عرض کیا ہے کہ وہ آپ پر جان دیتی ہے۔''

''ہاں! تو یہ مجھ سے کہتا رہا ہے مگر اس کا نتیجہ کیا ہوا؟''

امیر جامدار کا غصہ بڑھ رہا تھا۔ قربان خاں نے اندازہ کیا کہ اب اس کو اپنے اعصاب پر قابو نہیں۔ جس ہاتھ میں تلوار تھی وہ لرز رہا تھا۔

قربان خاں نے لپک کر اس کے پیر پکڑ لیے اور گڑگڑا کر بولا۔ ''میں نے تو سرکار پوری کوشش کی تھی کہ وہ محل سرا میں جلوہ گر کر ہو کر آپ کو خوش رکھے۔ میں نے ساحر کو چوری کے الزام میں گرفتار بھی کروایا تھا اور اگر اس پر دس بیس کوڑے پڑ جاتے تو وہ ضرور حسینہ کو طلاق دینے پر تیار ہو جاتا لیکن شہزادہ محترم نے اسے چھڑا لیا۔''

آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ کر امیر جامدار کے پیروں پر گرنے لگے۔ امیر جامدار کو خیال آیا کہ قربان خاں نے سچ کہا ہے۔ بہرحال اس نے بہت کوشش کی تھی۔ یہ سوچ کر تلوار نیام میں رکھتے ہوئے بولا۔

''خیر! وہ ترکیب تو ناکام رہی۔ اب تو نے کیا سوچا ہے؟''

''کچھ سمجھ میں نہیں آتا حضور۔'' قربان کی سانس پھول رہی تھی۔ لہجہ مایوسی کا شکار تھا۔ جب سے ساحر کو شہزادہ محمد نے دارالسزا سے چھڑا کر اپنا ملازم رکھ لیا تھا، قربان خاں کبھی اس کے پاس جانے کی ہمت نہیں کرسکا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا کرے۔ اتنے میں امیر جامدار کی برہنہ تلوار نے اسے چونکا دیا۔ گھبرا کر نظر اٹھائی تو امیر جامدار کے ہونٹوں پر سفاک تبسم کھیل رہا تھا۔

''اٹھو۔ تم اس ذلیل فراش کو باتوں میں لگا کر کچھ دور لے جانا اور میں اس دوران حسینہ سے مل لوں گا۔''

''حضور! میں..... سرکار کی عزت.....''

قربان خاں کی زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ امیر جامدار نے بہ آوازِ بلند قسم کھا کر دھمکی دی۔ ''ٹال مٹول کی تو سر اڑا دیا جائے گا۔''

کپکپاتے بدن کو سنبھالتا ہوا قربان اٹھا اور جب وہ خیمے سے نکلے تو اندازہ ہوا کہ رات آدھی سے زیادہ ہو چکی ہے۔ امیر جامدار کا لشکر ملتان کے قلعے کے سامنے بڑے میدان میں مقیم تھا اور لشکر گاہ میں روشنیاں ہو رہی تھیں۔ کوچ کی تیاریوں میں سامان بندھ رہا تھا، خیمے اکھاڑے جا رہے تھے۔ ہنگامے میں کسی نے دیکھا بھی نہیں کہ سادہ لباس میں امیر جامدار قربان خاں کے ساتھ تیز تیز قدم بڑھا کر شہر کی سمت جا رہا تھا۔

قربان خاں چلتا رہا اور امیر جامدار اس کے ساتھ سائے کی طرح لگا رہا۔ تنگ گلیوں اور پختہ مکانوں کے ایک محلے میں پہنچ کر وہ مڑا۔

''وہ سامنے ساحر کا گھر ہے۔'' کھوکھلی آواز میں اس نے سرگوشی کی۔ امیر جامدار نے اِدھر اُدھر کا جائزہ لیا۔ گلی ایسی تھی کہ دونوں طرف سے دوسری گلیوں سے ملتی تھی۔

''تم اسے بلا کر ادھر لے جاؤ۔'' اس نے اشارہ کیا اور خود بڑھ کر ایک کنارے پر دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اچانک ایک کتا بھونکتا ہوا اٹھا۔ پہلے تو امیر جامدار گھبرایا پھر قربان خاں کو گھبرا کر ادھر آتے دیکھا۔

''لوگ جاگ اٹھیں گے۔'' وہ گھبرا کر بولا۔

کتا اس کی طرف بھونکتا ہوا بڑھا۔ امیر جامدار نے بجلی کی تیزی سے تلوار نکال کر ایک ہی ضرب میں کتے کے دو ٹکڑے کر دیے۔ اس کی آخری چیخ فضا میں ابھری تھی۔ قربان خاں تلوار کی چمک اندھیرے میں دیکھ کر لرز اٹھا۔

''جاؤ! اب کیا ڈر ہے؟'' امیر جامدار نے تلوار نیام

میں رکھتے ہوئے پُرسکون لہجے میں کہا۔ ''ورنہ اپنی تلوار کو دوسری بار ناپاک کرنا پڑے گا۔''

یہ سن کر قربان خاں فوراً مڑا اور تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا ساحر کے دروازے پر آ کر رک گیا۔ وہ اب تک کوئی بہانہ سوچ نہیں سکا تھا اور اس کو اب اچانک اطمینان ہونے لگا۔ وہ بے ساختہ مسرت سے ہنس پڑا۔

''ساحر تو مجھ کو دیکھتے ہی بگڑ جائے گا۔'' اس نے سوچا۔ ''وہ مجھ کو حسینہ کا عاشق سمجھتا ہے۔ جہاں وہ بگڑا، وہاں ہنگامہ ہوا۔''

اور یہی اس کی خواہش تھی کہ وہ کسی طرح نہیں چاہتا تھا کہ امیر جامدار کو حسینہ سے بات کرنے کا موقع ملے اور بہت سے جھوٹ جو بولے تھے، ان کا بھانڈا پھوٹ جائے۔ اس نے سوچا تھا کہ جب کامیابی ہو جائے گی تو حسینہ کو پانے کی مسرت میں امیر جامدار بہت ساری باتیں ہنس کر معاف کر دے گا۔

قربان خاں نے بڑے اطمینان سے دروازے کی زنجیر ہلا کر ساحر کا نام لیا اور آہستہ آہستہ پکارنے لگا۔ پیروں کی چاپ سنائی دی۔ پھر ساحر کی آواز آئی۔

''کون ہے؟'' وہ ناراضگی سے بولا۔

قربان خاں کا دل دھڑکا مگر وہ سنبھل کر مطمئن لہجے میں بولا۔ ''میں ہوں قربان خاں! حسینہ کی طبیعت کیسی ہے؟''

لمحہ بھر سناٹا رہا۔ ساحر کا خون ابل رہا تھا۔ وہ لپک کر بڑھا اور دروازہ کھولتے کھولتے رک گیا اور بولا۔ ''اچھا آ رہا ہوں۔''

وہ مڑا اور دالان میں آیا۔ چراغ کی روشنی میں حسینہ کا چہرہ چمک رہا تھا۔ وہ غافل سو رہی تھی۔ ساحر نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ایک بڑا سا چھرا چراغ کے قریب رکھا تھا، اس کو اٹھا لیا اور ہاتھ پیچھے کر کے دروازہ کھول دیا۔

''حسینہ کو دیکھنے آئے ہو؟'' وہ دانت پیس کر بولا۔

تاریکی میں قربان خاں کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کا بھاری بھرکم جسم پہاڑ کی طرح تھا اور وہی پیچھے ہٹا۔ ساحر کے لہجے میں خون کو سرد کرنے والا خاموش غصہ جھلک رہا تھا۔

ساحر نے نکل کر دروازہ بند کر دیا اور قربان خاں کا گلا پکڑ لیا۔

''ارے بھائی ذرا سن۔'' قربان خاں کشمکش کرنے لگا مگر ساحر نے جھٹکا دیا اور اس کی سانس رکنے لگی۔ گلے پر الٹے ہاتھ کی گرفت نے قربان خان کو بے بس کر دیا تھا۔ ساحر اس کو کھینچنے لگا۔

اس حال میں بھی قربان خاں کا دماغ یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ دروازے سے ہٹنا خطرے سے خالی نہیں۔ امیر جامدار اندر پہنچ جائے گا اس لیے وہ وہیں رکنے کے لیے پیر جمانے کی کوشش کرنے لگا۔

''آگے چلو۔'' ساحر غرایا۔

''نہیں! ذرا میری بات سنو۔'' قربان خاں ہانپتا ہوا بولا۔

ساحر نے دو تین جھٹکے دیے۔ قربان خاں نے زور لگایا تو ساحر نے سیدھا ہاتھ پشت کے سامنے کر دیا۔ اس میں چھرا چمک رہا تھا۔ قربان خاں کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے۔ ساحر اس کو کھینچتا ہوا آگے لے چلا۔ وہ رسی میں بندھے کتے کی طرح گھسٹ رہا تھا۔ اچانک اس نے چھرے پر جھپٹا مار کر اس سے چھین لیا۔

''میری بات سنو۔'' وہ لجاجت سے بولا۔

ساحر تحیر زدہ تھا۔ اسے شاید موٹے تازے قربان خاں سے اس تیزی کی توقع نہ تھی۔ اس نے چھرے پر جھپٹا اس طرح مارا تھا کہ وہ اسے بچا نہ سکا۔ اب اس نے قربان خاں سے چھرے کو واپس لینے کی خاطر ایک ہاتھ سے گلا پکڑ لیا اور چھرا چھیننے کی کوشش کرنے لگا۔

اس کشمکش میں ایک بار ساحر نے ناکامی دیکھ کر اچانک زوردار گھونسا قربان خاں کے جبڑے پر رسید کر دیا۔ دبی دبی سی چیخ قربان خاں کے منہ سے نکلی۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا اور دیوار سے لگ گیا پھر اس نے منہ میں خون کا نمکین مزہ محسوس کیا۔

''کہو عشق بازی کا مزہ چکھا؟''

ساحر کی تمسخر آمیز آواز سن کر اس کو ہوش سا آیا۔ ساحر آہستہ آہستہ ہنس رہا تھا اور قربان خاں کی حالت پر خوش ہو رہا تھا جو ہانپتا ہوا دیوار سے پیٹھ لگائے کھڑا تھا۔

قربان خاں نے منہ سے خون تھوکا۔ اس کی انگلیاں بے جان سی ہو گئیں۔ چھرے کا دستا چھوٹا جا رہا تھا۔ یکا یک وہ سنبھل کر آگے بڑھا لیکن دوسرے ہی لمحے ساحر کا زوردار تھپڑ اس کے منہ پر پڑا اور وہ لڑکھڑا کر گرا۔ ساحر اس پر ٹوٹ پڑا۔

امیر جامدار دور سے یہ کشمکش دیکھ رہا تھا۔ قربان خاں کی درگت بنتے دیکھ کر وہ گھبرا کر آگے بڑھا۔

اتنے میں ایک چیخ فضا میں گونج کر رہ گئی۔ امیر جامدار نے قربان خاں کو ساحر کے نیچے سے نکلتے دیکھا۔ وہ امیر جامدار کے پاس بھاگتا ہوا آ رہا تھا اور امیر جامدار حیرت سے ساحر کی طرف دیکھ رہا تھا جو زمین پر پڑا ہوا تھا۔ اچانک

قربان خاں نے اس کے قریب آ کر کہا۔
''بھاگیے سرکار! میں نے اس کو مار ڈالا ہے۔''

☆☆☆

شہزادہ محمد کے لشکر نے ملتان سے باہر نکلنا شروع کر دیا تھا۔ شہزادے نے اپنی کتابوں کو ہمراہ لے جانے کے بجائے جامع مسجد کے کتب خانے میں امانت رکھوانے کا فیصلہ کیا۔ یہ خدمت داراب کے سپرد ہوئی کہ وہ کتابیں جامع مسجد تک پہنچائے۔

خطیب مسجد نے کتابوں کا شمار کیا اور ایک رسید لکھ کر اس کے حوالے کی۔ اس میں کافی دیر لگی۔ رات آدھی سے زیادہ ہو چکی تھی کہ داراب کو ایک اور بات یاد آئی۔

شہزادے نے حکم دیا تھا کہ ساحر فراش کے گھر جا کر پچاس ٹنکہ (بلبن کے دور کا سکہ) دے آنا اور داراب انکار نہیں کر سکا تھا۔ وہ دھڑکتے دل سے ساحر کے مکان کی طرف چلا۔

اس عرصے میں وہ کئی بار ساحر سے ملا تھا۔ سفر کے درمیان وہ ایک دوسرے سے ملتے رہے مگر داراب نے ساحر کے خیمے تک جانے کی ہمت نہیں کی کیونکہ ساحر نے اس سے کبھی پوچھا بھی نہیں کہ وہ حسینہ سے ملنے پھر کیوں نہیں آیا، یوں بھی حسینہ کے طرز عمل نے داراب کو کافی صدمہ پہنچایا تھا اور اس نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا تھا کہ حسینہ سے سامنا نہیں کرے گا۔ اس کو مکان نہیں معلوم تھا البتہ ایک دن گلی میں ساحر کو مڑتے دیکھا تھا۔ داراب کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ادھر نہ جائے۔ جیسے جیسے قدم اس کی طرف بڑھے اضطراب اور پریشانی بڑھتی گئی۔

دل کا عجیب حال تھا۔ چہرے پر پسینا پھوٹ آیا اور داراب اپنے حال پر خود حیرت محسوس کرنے لگا۔ اندھیری گلی میں قدم رکھتے ہی اس کو ٹھوکر لگی۔ اس نے جھک کر دیکھا۔ آنکھیں تاریکی کی عادی ہونے لگی تھیں۔ نظر آیا کہ یہ کتے کی لاش ہے۔

''عجیب بات ہے۔'' وہ بڑبڑایا۔ لاش دو حصوں میں تقسیم تھی۔ داراب نے سیدھے ہو کر لمبی سانس لی اور سامنے نظر دوڑائی۔ دور زمین پر ایک انسان پڑا ہوا دیکھا۔

اس کی ہلکی جنبش اور پھر کراہنے کی آواز سن کر داراب چونکا اور تیزی سے قریب پہنچ کر اس پر جھک گیا۔ سینے میں اترے ہوئے چھرے کا دستہ نمایاں تھا۔ زخم سے کون نہیں نکل رہا تھا مگر اس آدمی کے منہ سے جھاگ دار خون جاری تھا۔ داراب نے بیٹھ کر اس کی نبض دیکھی جو تقریباً معدوم تھی۔ اچانک داراب نے خدوخال پہچان لیے۔

''ساحر بھائی!'' وہ گھبرا کر بولا اور ساحر کے ہاتھ کو جھنجوڑ ڈالا۔

ایک بار کراہ کر ساحر نے ہاتھ پیر پھیلائے۔ داراب کا دماغ چکر کھا گیا اور وہ بے ساختہ کانپ اٹھا۔ ساحر کا ہاتھ لرزتا ہوا اٹھا اور اس نے ہونٹوں سے خون پونچھنے کی ناکام کوشش کی۔ آنکھیں کھل گئیں اور آسمان کے تاروں کو تکنے لگیں جو نیلگوں پہنائیوں میں دمک اور جھلملا رہے تھے۔

''پا..... پانی..... آہ..... پانی۔'' ساحر نے کراہ کر بہ مشکل کہا۔

''ساحر بھائی!'' داراب نے جھک کر سرگوشی کی۔ ''آپ کا گھر کہاں ہے؟''

اسے خود احساس ہوا کہ اس نے حماقت کی ہے مگر ساحر نے اسے پہچانا اور آہستہ سے اس کے ہونٹ ہل کر رہ گئے۔ داراب نے جھک کر کان منہ کے قریب کیے اور ساحر کو بار بار حسینہ کا نام لیتے سنا۔

داراب کی سمجھ میں اور کچھ نہیں آیا۔ اس نے جھک کر ساحر کو اپنے طاقت ور بازوؤں میں اٹھا لیا اور دروازوں پر نظر ڈالی۔ تقریباً سب ہی بند تھے۔ صرف ایک دروازے سے روشنی چھن رہی تھی۔ داراب نے وہاں پہنچ کر آواز دی۔

''حسینہ..... حسینہ! تم کہاں ہو؟''

سامنے والے پلنگ پر سے کوئی گھبرا کر اٹھا۔ چراغ کی دھیمی دھیمی زرد روشنی میں بکھرے ہوئے بالوں کے بیچ میں اس کا چہرہ داراب نے پہچانا۔

وہ اندر داخل ہو گیا۔ ساحر اس کے بازوؤں میں تھا۔ اس کا سر اور پیر لٹک رہے تھے۔ حسینہ کا ہاتھ اٹھا اور اس نے چیخ روکنے کے لیے منہ بند کر لیا اور پھر وہ پتھر بن گئی۔

داراب نے ساحر کو لٹایا اور صراحی سے پانی انڈیل کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ بہت نرمی سے ساحر کا سر اٹھا کر پیالہ ہونٹوں سے لگا دیا۔

چند بوندیں جلتے ہوئے حلق میں اتری ہوں گی کہ ساحر نے آنکھیں کھول دیں اور تین چار گھونٹ پانی بڑی مشکل سے پیا۔

''حسینہ! میرے پاس.....'' وہ حسرت سے بولا

حسینہ آ کر پائینتی بیٹھ گئی۔ اس کی زبان گنگ ہو چکی تھی۔ چھرے کے دستے کو سینے میں اترا ہوا دیکھ کر وہ سب کچھ سمجھ گئی تھی لیکن آنکھیں خشک اور ساکت تھیں۔ وہ ٹکٹکی باندھے ساحر کو دیکھتی رہی۔

داراب نے پیالہ رکھ کر نبض دیکھی۔ ''اب آپ پہلے سے بہتر ہیں۔'' اس نے لمبی سانس لے کر کہا۔

مایوسی کی مسکراہٹ ساحر کے ہونٹوں پر آئی۔ اس نے اچانک اپنا داہنا ہاتھ اٹھا کر چھرے کا دستہ پکڑا اور جھٹکا دے کر چھرے کو نکال لیا۔ داراب کے منہ سے خوف و دہشت بھری چیخ نکلی۔

ساحر کی یہ آخری حرکت تھی۔ سینے کے زخم سے خون ابل پڑا۔ ہاتھ جو زور سے پٹی پر جا کر لگا تو چھرا چھن چھنا کر زمین پر گرا۔ ساحر کے منہ سے لمبی کراہ نکلی اور ہاتھ پیر پہلے کھنچے پھر ساکت ہو گئے۔

داراب نے آہستہ سے انا للہ و انا الیہ راجعون پڑھا پھر ساحر کے ہاتھ پیر سیدھے کیے۔ آنکھیں جو حسینہ کو دیکھ رہی تھیں، بند کر دیں اور منہ قبلہ رخ کر دیا۔ وہ سر جھکائے ہوئے یہ فرائض انجام دے رہا تھا۔

حسینہ اب بھی چپ تھی اور اس کو معلوم تھا کہ کیا ہو چکا ہے۔ داراب کے ہاتھوں کی حرکت کے ساتھ ساتھ اس کی نظریں گھومتی رہیں۔ جب داراب پلنگ سے اٹھا اور اس کی سمت مڑا تو حسینہ نے نفرت کی نگاہوں سے اس کو گھورا پھر سرد لہجے میں بولی۔

''تم نے میرا سہاگ لوٹ لیا ہے داراب!''

داراب تڑپ کر رہ گیا۔ کچھ کہنا چاہا پھر رک گیا۔ اس کے دماغ نے تیزی سے حالات کا جائزہ لیا۔ حسینہ کے جملے کا جو بدترین مطلب ہو سکتا تھا وہ سامنے آیا اور داراب نے فیصلہ کیا کہ اس پر یہ شبہ کیا جا سکتا ہے۔ ساحر اس کا رقیب تھا۔

''مجھے تم سے یہ امید نہ تھی۔'' حسینہ نے آنسو صاف کیے۔ آواز تلخی کے زہر سے بھری ہوئی تھی۔ ''تم میری نظروں میں فرشتہ تھے لیکن فرشتے نے شیطان کا کام کیا ہے۔ تم نے ان کو قتل نہیں کیا ہے، اپنے آپ کو قتل کیا ہے۔ تمہاری وہ آسمانی تصویر مٹ گئی جس کو میں نے ہمیشہ اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھا تھا اور جس کو میں ایک غیر کی ہو کر بھی دل میں بسائے ہوئے تھی۔'' یہ کہتے کہتے اس کی آواز بھرا گئی۔ وہ آنسو جو روکے نہیں جا سکتے تھے، پھوٹ پڑے اور وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر زار و قطار رونے لگی۔

داراب کا رنگ فق ہو گیا تھا اور چپ چاپ کھڑا رہا۔

پھر وہ آگے بڑھا اور حسینہ کے قریب جا کر بولا۔

''خدا کی قسم میں بے گناہ ہوں۔''

''میرے قریب نہ آؤ۔'' حسینہ چیخ پڑی اور ہاتھ منہ سے ہٹا کر پیچھے ہٹ گئی۔ ''چلے جاؤ یہاں سے..... چلے جاؤ۔''

''میری ایک بات سن لو!'' داراب نے التجائیہ کہا۔

''تم یوں نہیں مانو گے۔'' حسینہ نے وحشت آمیز لہجے میں کہا اور تیزی سے خون آلود چھرا اٹھا لیا جس نے ساحر کی جان لی تھی۔

داراب کے ہونٹ بھنچ گئے۔ وہ بولا۔ ''بے شک تم مجھے مجرم سمجھتی ہو تو مجھے سزا دے دو۔''

''میں تم کو نہیں مار سکتی داراب!'' حسینہ نے کانپتے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔ ''لیکن اگر یہاں سے نہ گئے تو میں یہ چھرا اپنے آپ کو مار لوں گی۔''

داراب بدحواس ہو گیا۔ حسینہ پر جنون طاری تھا۔ پورا بدن لرز رہا تھا۔

''اچھا میں جا رہا ہوں۔'' داراب نے عاجزی سے کہا۔ ''لیکن تمہاری قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں بے گناہ ہوں۔''

''تم جھوٹ بول رہے ہو۔''

داراب نے چند جملوں میں بتایا کہ شہزادہ محمد کے حکم سے وہ ساحر کو پچاس ٹنکہ دینے آیا تھا اور اس نے گلی میں ساحر کو پڑا پایا تھا۔ حسینہ نے خاموشی سے یہ داستان سنی اور جب داراب نے پچاس ٹنکے کی تھیلی نکال کر پلنگ پر رکھی تو اس کے لبوں پر حقارت کا تبسم ابھر آیا مگر وہ پھر بھی چپ رہی۔

داراب جانے کے لیے بڑھا۔ وہ کن انکھیوں سے حسینہ کو دیکھتا ہوا دالان سے نکلا۔ جیسے ہی حسینہ نے چھرے والا ہاتھ نیچے کیا، داراب نے ایک جست کی اور حسینہ کے سنبھلتے سنبھلتے اس سے چھرا چھین لیا۔

''ذلیل، وحشی درندے۔'' حسینہ نے چیخ کر کہا اور اس کی آواز تاریک رات کے سناٹے کا جگر چیر کر دور دور تک پھیلتی چلی گئی۔

''میں جا رہا ہوں حسینہ۔'' داراب نے مطمئن انداز میں کہا۔

حسینہ یوں پیچھے ہٹ گئی جیسے داراب ایک زہریلا سانپ ہے۔ داراب جست لگا کر اس کے قریب آیا تھا تو دونوں کے جسم ٹکرا گئے تھے اور پلک جھپکتے میں وہ ایک دوسرے کے اتنے قریب آ گئے تھے جتنے وہ پہلے کبھی نہیں ہوئے تھے۔

داراب نہیں رکا۔ دروازے سے باہر نکل گیا اور دروازہ بند کر دیا۔ وہ خون آلود چھرا ہاتھ میں لیے ہوئے تھا۔ گلی کے دروازے کھل رہے تھے۔

حسینہ کی چیخ سے لوگ بیدار ہو گئے تھے۔ وہ گھبرا کر گھروں سے نکلے۔ داراب ان کو ساحر کے گھر کے

دروازے پر کھڑا ہوا نظر آیا۔ ایک آدمی برنجی فانوس لے کر باہر آیا تھا۔ خون آلود چھرا دیکھ کر لوگ اپنی اپنی جگہ کھڑے ہو گئے اور دہشت زدہ نظروں سے داراب کو گھورنے لگے۔

داراب نے ان کے خوف کی وجہ سمجھ کر چھرا زمین پر پھینک دیا۔

''کیا ہوا؟ تم کون ہو؟'' فانوس والے پڑوسی نے پوچھا۔

گھروں سے عورتوں کے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ دو چار آدمی اور نکل آئے۔ داراب کے گرد جمع ہو کر انہوں نے سارا قصہ سنا تو ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

ان کی زبان اور خاموش شبہے داراب نے سن لیے۔

''میں مجرم نہیں ہوں۔'' اس نے کہا اور اپنی آواز خود اس کو کھوکھلی اور بے جان لگی۔ فانوس والے آدمی نے روشنی اس کے چہرے پر ڈالی۔ وہ چند لمحے تک اس کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا پھر بولا۔ ''چہرہ تو خونی کا نہیں مگر میاں، اللہ بہتر جانتا ہے۔''

''مجھے اسی کے انصاف پر بھروسا ہے۔''

''ہاں! وہی فیصلہ کرے گا۔'' پڑوسی نے کہا۔

وہ عمر رسیدہ آدمی تھا۔ اس نے لوگوں سے کہا کہ وہ چند تجربہ کار عورتوں کو حسینہ کے پاس بھیج دیں اور پھر گشت کرنے والے پیادوں کو حادثے کی اطلاع دینے کی کوشش کی جائے۔

داراب کو بڑی تھکن اور کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔ وہ دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ وہ لوگوں کی سرگوشیاں سن رہا تھا۔

☆☆☆

ملتان کی مسجدوں میں صبح کی جماعتیں ہو رہی تھیں۔ شہزادہ اور امیر جامدار نے نماز پڑھ کر کوچ کرنے کا اعلان کیا تھا۔ لشکر کا سامان بندھ چکا تھا اور وہ شہر پناہ کے باہر کمربستہ کھڑا تھا۔ جیسے ہی شہزادہ مسجد سے نکلا، امیر جامدار گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا اور گھوڑے سے کود کر شہزادے سے بولا۔

''مغلوں نے سندھ پار کر لیا ہے۔''

''ان کا رخ کدھر ہے؟''

''ملتان کی طرف۔'' امیر جامدار نے مسکرا کر طنز کیا۔ ''خانقاہوں سے برکتوں کے دعوے ہوتے ہی رہتے ہیں۔ مغلوں کو یہ زبانی دعوے روک نہیں سکتے۔''

''کیا ہم بھی نہیں روک سکتے؟'' شہزادے نے اس کو گھور کر پوچھا۔ امیر جامدار نے مہندی سے سرخ ڈاڑھی کو مٹھی میں پکڑ لیا اور ہنسا۔ اس کی آنکھوں میں اضطراب تھا مگر وہ خود پُرسکون تھا۔

''مغلوں کو اسی صورت میں روکا جا سکتا ہے کہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر آگے بڑھیں اور ان کو راستے ہی میں سبق سکھا کر الٹے پاؤں بھاگنے پر مجبور کر دیں۔''

شہزادے نے سر ہلایا اور اپنا گھوڑا طلب کیا۔ امیر جامدار بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔

''لشکر تیار ہے شہزادے! ہم کو فوراً کوچ کر دینا چاہیے۔'' اس نے امید و بیم کے عالم میں مشورہ دیا اور شہزادے کا منہ تکنے لگا۔

''ایک معاملہ مجھے پریشان کر رہا ہے۔''

''وہ کیا؟'' امیر جامدار نے پوچھا۔

''وہ فراش آپ کو یاد ہے نا جس کو میں نے اپنی ملازمت میں لے لیا تھا؟'' شہزادے نے تاسف سے کہا۔ ''اس کو قتل کر دیا گیا ہے۔''

''ارے..... بڑا افسوس ہوا۔''

''ہاں! اس کی بیوی.....'' شہزادے نے زبان روک لی۔

امیر جامدار نے سانس روک کر شہزادے کو گھورا جو سامنے دیکھ رہا تھا۔ ایک ایسا شبہ امیر جامدار کے سینے میں آیا کہ وہ تلملا گیا۔ جوشِ غضب سے چہرہ لال ہو گیا مگر ضبط کر کے ہونٹ چبانے لگا۔

''اس کی بیوی بہت خوب صورت ہے۔'' شہزادے نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

''آپ نے اسے دیکھا ہے؟'' امیر جامدار کا لہجہ تیز و تند تھا۔ شہزادے نے اس کی سمت نظر کی اور شرمندگی سے نظریں جھکا کر اثبات میں سر کو آہستہ سے جنبش دی۔

''میں نے اس کو دیکھا ہے۔'' وہ پست آواز میں بولا۔

ندامت اور اضطراب کے عالم میں شہزادہ محمد، امیر جامدار کا حال نہیں دیکھ سکا جس کی آنکھوں میں غیظ و غضب کی چنگاریاں اڑ رہی تھیں۔ سکوت کو شہزادے نے توڑتے ہوئے کہا۔

''شہر کوتوال نے مجھے حادثے کی خبر دے دی تھی کیونکہ میرا ایک سپاہی داراب وہاں مشتبہ حالت میں موجود تھا۔ میں نے خود اس کو فراش کے گھر رقم دے کر بھیجا تھا۔ داراب اچھا آدمی ہے مگر وہ لوگ شبہ کرتے ہیں.....''

پہلی بار امیر جامدار کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑی اور وہ اطمینان کے انداز میں مہندی لگی سرخ ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

''میرے خیال میں مقدمے کا فیصلہ واپسی پر کیا جاسکتا ہے۔'' اس نے پھر مشورہ دیا اور شہزادے کو گھورنے لگا۔

''یہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔''

شہزادے کی جانب امیر جامدار نے مسرت کی نگاہ کی اور باگ ڈھیلی کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ''بسم اللہ! چلیے، ایسے حادثے برابر ہوتے رہتے ہیں اگر وہ عورت خوب صورت ہے تو پھر جرم کا سبب ظاہر ہے۔''

شہزادہ محمد نے کچھ نہیں کہا۔ دونوں شہر سے نکلے اور باہر آئے۔ لشکر کمر بستہ تھے۔ شہزادے نے گھوڑے کو موڑا اور اپنے خاص لشکر میں لے گیا جہاں اس کے غلام گھوڑوں پر سوار کھڑے تھے۔ وہ ان کے آگے ہولیا اور نقیب کو اشارہ کیا۔

نقیب نے کوچ کا حکم پکارا۔ نقارے پر چوٹ پڑی اور گھوڑوں کی ٹاپوں کا شور اٹھا۔ سلطان غیاث الدین بلبن کے چہیتے لڑکے کی حیثیت سے امیر جامدار نے احترام و عزت کا پورا مظاہرہ کیا تھا۔ شہزادے کا لشکر آگے تھا۔ وہ ..... اپنے لشکر کے ساتھ پیچھے پیچھے روانہ ہوا۔

کچھ دیر بعد قربان خاں ایک گھوڑے پر سوار منہ بناتا ہوا امیر جامدار کے پاس پہنچا اور امیر جامدار نے مسکرا کر کہا۔

''سب ٹھیک ہے! تمہاری اطلاع درست تھی۔'' اور یہ سن کر قربان خاں نے اطمینان کی لمبی سانس لی۔ زیادہ گفتگو کا موقع نہیں تھا۔ امیر جامدار کے چہرے پر جو اطمینان جھلک رہا تھا وہی قربان خاں کو مطمئن کرنے کے لیے کافی تھا۔

لشکر بڑے نظم و ضبط کے ساتھ کوچ کر رہا تھا۔ ملتان کے صوبے دار بختیار خلجی نے جو راہنما دیے تھے وہ لشکر کو آبادیوں اور جنگلوں کے بیچ سے ایسے راستے پر لے گئے جس پر سفر آسان تھا۔

ہرکاروں نے خبر دی کہ مغلوں کا لشکر کنارے کی بستیوں کو غارت کرنے کے بعد پھر دریا پار اتر گیا۔ شاید انہوں نے سن لیا تھا کہ بلبن کے لشکر ان کی خبر لینے آرہے ہیں۔

شہزادہ محمد نے تحیر کے عالم میں سوال کیا۔ ''ان لوگوں کو دریا پار کرنے کا موقع کیسے ملا؟''

''ان کے پاس بے شمار کشتیاں ہیں۔''

یہ خبر اور زیادہ تعجب انگیز تھی۔ شہزادے کے خیمے میں امیر جامدار اور لشکر کے جو عہدیدار بیٹھے تھے وہ ہرکاروں کا منہ تکنے لگے۔

فانوس کی روشنی میں سب کے چہرے پھیکے پڑ گئے تھے۔ صرف شہزادہ محمد تھا جس نے ہنس کر پوچھا۔

''کیا اب مغلوں کا لشکر کشتیاں لے کر سفر کرنے لگا ہے؟''

''نہیں حضور! مغلوں نے یہ کشتیاں آپ کی بدنصیب رعایا سے بیگار میں بنوائی ہیں۔ دریا پار کے علاقے میں انہوں نے ہر گاؤں سے ایک ایک کشتی وصول کی اور لوگوں نے خوف کے مارے درخت کاٹے، تختے چیرے اور کشتیاں تیار کر کے بطور خراج پیش کی ہیں۔''

امیر جامدار کو شہزادے کا قہقہہ بہت ناگوار گزرا۔ ''یہ ہنسنے کی بات نہیں شہزادے۔'' وہ منہ بنا کر بولا۔ ''بڑا برا ہوا۔ اب ایک طرح سے ہم ان کے رحم و کرم پر ہیں۔''

''میں اس خیال سے اتفاق نہیں کروں گا امیر جامدار!''

''آپ بچے ہیں۔'' امیر جامدار اور بگڑ کر بولا۔

''اس کے سوا کیا آپ میرے اوپر کوئی اور الزام لگا سکتے ہیں۔''

یہ سن کر امیر جامدار نے شہزادے کو گھور کر دیکھا۔

''تجربہ بہت بڑی چیز ہے۔'' وہ تلخی سے بولا۔ ''کشتیوں کی وجہ سے مغلوں کو ہم پر فوقیت حاصل ہوگئی ہے۔ وہ کسی بھی وقت دریا پار کر کے ہم پر حملہ کر سکتے ہیں اور حملہ کرنے میں پہل کرنے کی صلاحیت فتح یابی کی کنجی ہے۔''

''بجا ارشاد ہوا۔ کیا ہم کشتیاں تیار نہیں کر سکتے؟''

''درخت کاٹنے، تختے چیرنے اور کشتیاں بنانے میں کافی مدت صرف کرنا پڑے گی۔ کم سے کم ایک مہینا تو ضرور لگے گا۔''

''اس عرصے میں نہ جانے مغل کیا کر گزریں گے۔'' شہزادہ محمد نے حقارت سے کہا۔ ''نہیں! صرف ایک ترکیب مناسب ہوگی۔''

امیر جامدار کی سوالیہ نظروں کے سوا تمام عہدے دار شہزادے کی سمت متوجہ ہوگئے کیونکہ اس کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

''ہمارے لشکر کے دو حصے ہیں۔'' شہزادے نے پرسوچ انداز میں کہا۔ ''ایک حصہ ہمت کر کے پار اترے اور ان پر حملہ کر دے۔ جب وہ لڑ رہے ہوں تو دوسرا حصہ پار اتر کر پشت پر حملہ کر سکتا ہے۔''

''مگر دریا پار کیسے کیا جاسکتا ہے؟'' امیر جامدار نے ناراضگی سے کہا۔ اس کا لہجہ اس قدر تیز تھا کہ لوگ چونک پڑے۔

''کیا گھوڑے تیرنا نہیں جانتے؟ میرے چار ہزار شہ سواروں میں ایک ایک کا گھوڑا پانی میں بے دھڑک کودنے کا عادی ہے۔'' شہزادے نے مسکرا کر جواب دیا۔

لشکر کے دوسرے عہدے دار حیرت زدہ رہ گئے۔

''فوجی جانوروں کو اس کی تربیت ضرور ملتی ہے۔'' امیر جامدار نے خفت کے عالم میں اقرار کیا۔ ''پھر بھی یہ

مناسب نظر نہیں آتا۔''

''اس کے سوا چارۂ کار کیا ہے؟''

شہزادہ محمد کے سوال کا کسی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا اور سب نے اپنی لاجوابی کا اظہار خاموشی سے کیا۔ امیر جامدار بھی اتنا گھبرایا ہوا تھا کہ مناسب بہانہ سوچتا رہ گیا۔ خیمے کے اندر دھڑکتا سناٹا طاری تھا۔

''اگر ہم نے مغلوں پر حملہ نہیں کیا تو وہ پھر دور چلے جائیں گے۔'' شہزادے نے وضاحت کی اور آگے بولا۔

''اور ہماری واپسی پر وہ دریا پار کر کے نہ معلوم کدھر قتل و غارت گری کا بازار گرم کریں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ابھی ذرا دور ہٹ کر دریا پار کریں اور خود ہم پر غفلت میں حملہ کریں اس لیے میرا مشورہ یہی ہے۔''

کسی نے جواب کی زحمت نہیں کی، سب کے سر جھکے ہوئے تھے۔ گویا انہیں شہزادے کی اس جنگی حکمتِ عملی پر ''صاد'' تھا۔

''جلدی نہیں ہے۔ آج کی رات آرام کیجیے اور سوچ لیجیے۔'' شہزادہ محمد نے آخر میں نرمی سے کہا اور غلاموں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے لپک کر خیمے کے پردے اٹھا دیے اور سرد ہوا کے جھونکوں سے برنجی فانوس جھلملانے لگے۔

یہ رخصت کا اشارہ تھا۔ سب کھڑے ہو گئے۔ خیمے کے دروازے پر چند غلاموں نے جو صندل کے عطر دان لیے کھڑے تھے، نکلنے والوں کو عطر گلاب پیش کیا اور لوگوں نے وہ اپنے سینے اور منہ پر ملا۔ امیر جامدار کو یہ بات سخت ناگوار گزری مگر وہ مجبور تھا۔ یہ قاعدہ تھا کہ اگر لشکر کے ساتھ سلطان وقت یا اس کا ولی عہد ہوتا تھا تو وہ اپنے پاس حاضر ہونے والوں کو رخصت کے وقت سے خوشبو لگاتا تھا۔ یہ اس بات کی علامت سمجھی جاتی تھی کہ لشکر کی راہنمائی کون کر رہا ہے۔

شہزادہ محمد نے کہے بغیر جتا دیا تھا کہ لشکر کا سربراہ کون ہے۔ امیر جامدار غم و غصے میں کانپتا ہوا اپنے خیمے میں آیا اور اس نے قربان خاں کو اپنا منتظر پایا مگر اس نے قربان خاں سے کچھ کہے بغیر اپنی کلاہ اتار کر مسند پر پھینک دی اور اچانک آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔

''حضور! خیریت تو ہے؟'' قربان خاں تڑپ کر بولا۔

امیر جامدار مسند پر بیٹھ گیا اور ڈاڑھی نوچنے لگا۔ نتھنوں سے گرم گرم سانس نکل رہی تھی۔ گلوگیر لہجے میں ساری کہانی سنا کر بولا۔

''یہ کل کا لونڈا لشکر کا سربراہ بن بیٹھا ہے اور مجھ کو تمام لشکر کے سامنے ذلیل کر دیا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ زہر کھا کر مر جاؤں۔''

''آپ کو سلطان محترم سے شکایت کرنی چاہیے۔''

''تم پاگل ہو۔'' امیر جامدار نے جھلا کر کہا۔ ''دہلی بہت دور ہے۔ شکایت بعد میں کروں گا ابھی تو ایک مصیبت اور ہے۔'' قربان خاں اس کی صورت دیکھنے لگا۔

''بلبن نے کہا تھا کہ میں اس لڑکے کی حفاظت کروں۔'' امیر جامدار نے کہا۔ ''اور یہ بچہ اپنے بچپن کی وجہ سے میدانِ جنگ کی چالوں میں دخل دے رہا ہے۔ مغلوں کو تم جانتے ہو۔ اگر ان کو ذرا سا بھی موقع مل گیا تو وہ نہ جانے کیا کر بیٹھیں گے۔ شہزادے کو اپنی جان کی پروا ہو یا نہ ہو، مجھے اس کی فکر ستا رہی ہے۔ اس کو کچھ ہو گیا تو بلبن مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔''

قربان خاں نے چالاکی سے باتوں کا رخ موڑ دیا اور بہت جلد حسینہ کا ذکر چھڑ گیا۔ اس تذکرے نے امیر جامدار کی پریشانی تو کم کر دی مگر ایک نیا اضطراب اس کے دل کو بے چین کرنے لگا۔ حسینہ کی یاد بھی ایک عذاب سے کم نہیں تھی۔

قربان خاں نے اسے اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔ ''حضور! خدا کا فضل شاملِ حال ہے۔ فراش کے قتل کے الزام میں ایک ملزم قسمت نے وہاں بھیج دیا ہے۔ ملتان واپس جا کر ہم کامیاب ہوں گے۔ حسینہ کو اب آپ کے حرم سرا کی راحتوں کے سوا دنیا میں کہاں ٹھکانا مل سکتا ہے؟''

''میں بلبن کے پرچہ نویسوں (شاہی مخبروں) سے ڈرتا ہوں۔'' امیر جامدار نے کھسیانی ہنسی ہنس کر کہا۔

''آپ پر کیا الزام لگ سکتا ہے؟''

''یہی کہ میں نے اس کے شوہر کو قتل کرایا۔ آخر تم.....''

قربان خاں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے چپ کرا دیا۔ امیر جامدار گھبرا کر خیمے میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

''کوئی نہیں ہے حضور!'' قربان خاں نے سرگوشی کی۔ ''پھر بھی احتیاط شرط ہے۔ حادثے کا تذکرہ کبھی نہ کیجیے۔ کیا پتا کب کوئی سن لے۔''

اس کی خوفزدہ شکل اور دبے دبے لہجے پر امیر جامدار مسکرایا۔

''احتیاط اچھی چیز ہے اور اس لیے میں بھی پرچہ نویسوں کے خلاف بار بار اظہار کرتا ہوں۔ تم کو شرف الدین کوتوال کی باتیں یاد ہیں؟''

''کیا آپ اس کو پرچہ نویس سمجھتے ہیں؟''

''نہیں، لیکن شاید اس کو کچھ اور معلومات حاصل ہوگئی ہوں۔'' امیر جامدار نے فکرمند ہوکر کہا۔

''اس صورت میں فراش کے قتل اور اس کی بیوی کا میرے محل سرا میں داخلہ خطرناک شبہوں کو تقویت دے سکتا ہے۔''

''کوتوال کو کچھ نہیں معلوم حضور!'' قربان خاں نے سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔ ''دنیا میں آپ کا سچا وفادار میں ہوں۔''

امیر جامدار نے اس کو بغور دیکھا۔ فکرمندی کے آثار امیر جامدار کے چہرے سے ڈھلنے لگے۔ تھکن اور نیند کی وجہ سے اس نے جماہی لی اور قربان خاں فوراً رخصت لیتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

☆☆☆

سندھ کے کنارے سناٹا چھا گیا تھا۔ لشکر آرام کر رہا تھا۔ یہ سکوت ایک بڑے طوفان کا پیش خیمہ تھا، گو اس کی خبر کسی کو نہیں تھی۔ امیر جامدار کے دس ہزار سپاہیوں کی لشکر گاہ سے ملے ہوئے خیموں کی اس دنیا میں طوفان جنم لے رہا تھا جن میں شہزادہ محمد کا لشکر تھا۔

شہزادے کے حکم کے مطابق اس کے چار ہزار شہ سواروں نے شام ہی سے کھانا کھا کر فراغت حاصل کر لی تھی اور بہت جلد بستروں پر جا لیٹے تھے۔ جس وقت امیر جامدار اور دوسرے عہدیدار شہزادے کے خیمے میں مشورے کے لیے آئے تو سارا لشکر میٹھی نیند سو رہا تھا۔

آدھی رات کے بعد شہزادہ محمد نے تہجد کی نماز ادا کی اور اپنے بستر پر جا لیٹا۔ پہرے داروں کو ہدایت کی کہ وہ ٹھیک گھنٹا بھر بعد جگا دیں۔

پہرے داروں نے حکم کی تعمیل کی۔ شہزادہ اٹھا تو فوراً جنگی لباس پہن کر خیمے سے نکلا اور باری باری تمام سرہنگوں (سلاطین دہلی کی فوج میں سرہنگ کا عہدہ موجودہ فوج کے جونیئر کمیشنڈ آفیسروں کی طرح ہوتا تھا۔ ان کے اختیارات کم ہوتے تھے) کو جگا کر اٹھایا اور ان سے کہا۔

''سپیدۂ سحر نمودار ہونے سے پہلے تمام لوگ دریا عبور کر لیں اور یہ کام اس طرح ہونا چاہیے کہ مغلوں کی طرح امیر جامدار بھی بے خبر رہے۔ سارا سامان خیموں میں چھوڑ دیا جائے۔ ہر آدمی تین دن کا روزینہ ساتھ لے کر چلے۔''

سرہنگوں نے سر تسلیم خم کر دیے۔ وہ شہزادہ محمد کے خاص طور پر وفادار تھے اور اس کے اشارے پر جان دینے کو تیار رہتے تھے۔

سب سے پہلے تیز اور رواں دواں پانی میں شہزادہ محمد نے اپنے گھوڑے کو ڈالا۔ بہاؤ تیز تھا اور پانی ٹھنڈا تھا۔ تربیت یافتہ گھوڑے پانی کے بہاؤ اور ٹھنڈ کی رکاوٹوں پر غالب آ کر دوسرے کنارے تک پہنچ گئے۔ دور مغلوں کے خیمے زمین پر سیاہ بھوتوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔

شہزادہ محمد نے سرہنگوں کو ہدایت دے رکھی تھی۔ ایک سرہنگ نے دو سو سواروں کو گھوڑے سے اترنے کا اشارہ کیا۔ وہ اتر پڑے اور تیزی سے آگے بڑھے۔ مغل لشکر کا جو رخ دریا کی سمت تھا، وہاں الاؤ جل رہا تھا۔ پیدل چلنے والے خیموں کی آڑ لے کر چلتے رہے پھر انہوں نے بڑی پھرتی سے جھپٹ کر الاؤ کے گرد اونگھنے والے پہریداروں کو قتل کر دیا۔

اب وہ دریا کی طرف بڑھے۔ ریت میں لکڑیوں کے کندے گاڑ کر مغلوں نے کشتیوں کی رسیاں باندھ رکھی تھیں۔ سرہنگ نے اشارہ کیا اور تلواروں نے جو خون سے تر تھیں، چشم زدن میں رسیوں کو کاٹ دیا پھر آگے بڑھ کر کشتیوں کو دریا کی بپھرتی موجوں کے حوالے کر دیا گیا۔

سرہنگ نے تاریکی میں جب کشتیوں کو ہچکولے کھاتے اور ایک دوسرے سے ٹکراتے اور بہہ کر کافی دور نکلتے دیکھ لیا تو وہ مڑا اور اس کے تمام ہمراہی بھی پلٹے۔ شہزادہ محمد نے لشکر کو کئی حصوں میں بانٹ کر اِدھر اُدھر پھیلا دیا تھا اور خود وہ ان لوگوں کی آمد کا منتظر تھا جو مغلوں کو کشتیوں سے محروم کرنے گئے تھے۔

سرہنگ نے بہت آہستہ سے کہا۔ ''مغل بالکل غافل تھے۔ پہریدار مارے گئے اور ہم نے حسب الحکم کشتیوں کو بہاؤ پر آزاد کر دیا مگر یہ اچھا نہیں ہوا۔''

''میں سمجھ گیا۔'' شہزادے نے ندامت سے کہا۔ ''بہتر یہ ہوتا کہ ہم ان کشتیوں کو اپنے قبضے میں کر کے اس کنارے تک لے جاتے اور امیر جامدار بھی دریا پار کرنے میں پریشانی نہ اٹھاتا۔ اب جو ہونا تھا ہو چکا۔'' اس نے اپنی ناتجربہ کاری کا پہلی بار بڑی ندامت سے احساس کر لیا تھا۔ اب یہ ندامت بیکار تھی۔

اچانک زوردار تکبیروں سے سکوت چاک ہوگیا۔ مغل لشکر پر حملہ ہو چکا تھا۔ شہزادہ محمد نے تلوار کھینچی اور اللہ اکبر کی صدا بلند کی پھر کئی سمتوں سے یہ نعرہ پورے جوش و خروش کے ساتھ گرجتا ہوا اٹھا اور ایسا معلوم ہوا کہ کائنات سہم کر چلتے چلتے رک گئی ہے۔

شہزادہ محمد نے گھوڑے کو ایڑ لگا دی اور حملہ کر دیا۔ رقصِ شمشیر شروع ہو چکا تھا۔ مغل لشکر کے خیموں کے درمیان پرچھائیاں تیز تیز حرکت کر رہی تھیں۔ مغل بیدار ہو رہے

تھے اور لڑائی کا شور مچنے لگا تھا۔

چار پانچ ٹکڑیوں کے حملوں نے مغلوں کو بدحواس کر دیا تھا۔ ان کو ایسا لگا تھا جیسے وہ ہر سمت سے گھر گئے ہیں۔ حالانکہ حملہ آوروں نے لشکر گاہ میں داخل ہو کر ایک سیدھا محاذ بنانے کی کوشش ہی نہیں کی تھی بلکہ وہ اِدھر اُدھر پھیل کر مغلوں کو ہلاک کر رہے تھے۔

بہت سے مغل ہلاک ہو چکے تھے۔ نیند اور غفلت کی وجہ سے وہ یہ نہیں سمجھ سکے کہ لڑائی کا اصل رنگ کیا ہے؟ حملہ آور مارتے کاٹتے لشکر گاہ کے وسط تک پہنچے اور وہاں سے پھر گھوڑے موڑ کر چلے۔ جس طرح اندر آئے تھے، اسی طرح سے نکل کر جانا چاہا مگر مغل ہوشیار ہو چکے تھے۔ انہوں نے گھیرا ڈالنے کی کوشش کی۔

صبح کی دھندلی روشنی میں کوئی چیز پوشیدہ نہیں تھی۔ مغلوں نے اپنے بے شمار ساتھیوں کی لاشوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھا کہ رات کو اچانک موت کا پیام بن کر پانی کے پار آنے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ وہ مغلوں کے طویل و عریض لشکر کے ایک گوشے میں آسانی سے سما سکتے تھے۔ یہ دیکھ کر مغلوں کی ہمت بندھی اور وہ سنبھلنے لگے۔

پانسا بڑی تیزی کے ساتھ پلٹ گیا۔ لوٹ مار کے سامان سے بھرا ہوا مغل لشکر اتنا بڑا تھا کہ اس کو شہزادہ محمد کے بہادر شہ سوار پوری طرح برباد ہی نہیں کر سکتے تھے۔ صدہا خیمے تو سونے چاندی کے زیوروں، برتنوں اور ریشم کے کپڑوں سے بھرے ہوئے تھے۔ یہ وہ سامان تھا جو ہرات سے لے کر دریائے سندھ کے کناروں تک ہر جگہ تہذیب و تمدن کے مرکزوں کو لوٹ کر حاصل کیا گیا تھا۔

اسی طرح رسد اور خوراک، دواؤں اور ہتھیاروں کے ذخیرے بھی بے شمار خیموں میں جمع تھے۔ شہزادہ محمد کے سپاہی ان ذخیروں کو برباد نہیں کر سکے۔ ان کو اس کی نوبت ہی نہیں ملی۔

جیسے جیسے صبح کی روشنی تیز ہوتی گئی، مغل سنبھلتے گئے۔ شروع میں وہ نیند کی وجہ سے نہتے ہی اٹھے تھے اور خیموں سے بھاگ بھاگ کر بے ترتیبی سے نکلے تھے اس وجہ سے وہ ہندوستانی شہ سواروں کی خونخوار تلواروں کا لقمہ آسانی سے بنتے رہے مگر جب وہ سنبھلے اور گھوڑوں پر سوار ہو گئے تو پانسا پلٹ گیا۔

ہر سمت سے مغلوں کی یلغار بڑھنے لگی۔ شہزادہ محمد بڑے جوش سے لڑ رہا تھا۔ اسے اپنی جان کی پروا نہیں تھی مگر دل میں افسوس تھا۔ اپنے چہیتے اور وفادار غلاموں کو مغلوں کے ہجوم میں پھنسا دیکھ کر ان کی سلامتی سے ناامید ہو گیا تھا۔ جدھر نظر اٹھتی مغلوں کے چہرے نظر آتے جو وحشت، جوش اور غصے سے سیاہ ہو رہے تھے۔ سرہنگوں نے حالات کی نزاکت دیکھی اور لشکر کو لڑاتے ہوئے نکال لے جانے کی کوشش کرنے لگے۔ مغربی سمت بڑھنے کی جدوجہد جاری تھی۔ زمین پر لاشوں کا کھیت بچھ گیا تھا۔ خون کی بو اور زخمیوں کے کراہنے کی آواز کے ساتھ ہتھیاروں کی جھنکار اور رقصِ شمشیر کی خونیں پکار فضا میں گونج رہی تھی اور ہر لمحہ مغلوں کی چوطرفہ یورش سے شہزادہ محمد کے لشکر کے بہادر لقمۂ اجل بن رہے تھے۔

جب آفتاب افق پر ابھرا تو اس کی کرنیں ایسے چہروں پر پڑیں جو زندگی سے مایوس اور شہزادہ محمد کے لیے فکرمند ہو رہے تھے۔ وہ زخمی ہو چکا تھا۔ گو زخم ہلکے تھے مگر خون بہنے کی وجہ سے کمزوری آ رہی تھی۔ ہاتھ سست پڑنے لگے تھے۔ اچانک مغلوں نے گھڑسواروں کے ایک دستے کے ذریعے سیدھا حملہ کر کے ہندوستانی سپاہیوں کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کرنے کی کوشش کرنا چاہی۔ یورش کے اس زور میں شہزادہ محمد اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ بقیہ لشکر سے جدا ہو کر مغلوں کے نرغے میں پھنس گیا۔

مغلوں نے اسے پہچانا نہیں تھا پھر بھی وہ اس چھوٹے حصے پر ٹوٹ پڑے۔ بقیہ لشکر کو سرہنگ آگے بڑھاتے رہے۔ شہزادہ ان سے دور ہوتا گیا اور ایسا معلوم ہوا کہ وہ اب گرفتار ہو جائے گا۔

لیکن چند سو جانباز پھر پلٹے اور مغلوں کو مارتے کاٹتے اس کی مدد کو آ گئے۔ شہزادہ محمد کا ہاتھ شل ہو چکا تھا۔ تلوار ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ وہ نہتا ہو گیا۔ ہندوستانی جانبازوں نے اس کے گرد حلقہ ڈال لیا تھا۔

اسے چکر آنے لگے۔ پیر رکاب سے نکلے اور وہ بے قابو ہونے لگا۔ ایک جانباز ساتھی نے پھرتی سے اس کی کمر میں ہاتھ دے کر اپنے گھوڑے پر کھینچ لیا۔ اس کا چہرہ جانا پہچانا تھا۔

''داراب! تم کہاں!'' شہزادے نے نیم بے ہوشی میں بڑبڑا کر کہا۔

رقصِ شمشیر کی جھنکار میں جواب کیا سنائی دیتا پھر بے بیہوش شہزادے کو میدانِ جنگ میں گر کر گھوڑوں کی ٹاپوں میں روندے جانے سے بچا لیا گیا تھا مگر یہاں تو ہر سمت مغل تھے اور شہزادے کے وفادار غلاموں کو سرہنگوں نے گھیرے سے نکالنے کی کوشش میں خود کو فراموش کر دیا تھا۔

چند سو جانباز مغلوں کا مقابلہ مایوسی مگر استقلال سے کررہے تھے اور ان کے درمیان داراب نے بیہوش شہزادے کو اپنے سینے سے لگا رکھا تھا۔

☆☆☆

جب اسے ہوش آیا تو وہ ایک شاندار خیمے میں تھا۔ جراح زخموں پر مرہم کی پٹیاں چڑھا چکے تھے اور زہر مہرے کی ایک خوراک کی تلخی اور جلن نے ہونٹوں سے لے کر سینے تک آگ سی لگا رکھی تھی۔ جانے پہچانے اور فکرمند چہرے کھل اٹھے۔

''میں کہاں ہوں؟'' شہزادے نے نحیف و نزار آواز میں کہا اور اٹھنے کی ناکام کوشش کی۔ جلدی سے دو غلاموں نے سہارا دے کر پشت پر تکیے لگا دیے اور وہ نیم دراز ہوگیا۔

پھر اس نے سرہنگوں سے فتح کی مبارک بادسنی۔ وہ آگے بڑھ کر گرمجوشی سے اس کو عمر و اقبال کی درازی کی دعائیں دے کر بولے۔

''اللہ نے ہم سب پر فضل کیا اور مغل بھاگ گئے۔''

''خدا کا شکر ہے۔ مگر یہ کیسے ہوا؟''

''امیر جامدار نے عین وقت پر مدد کی۔''

شہزادے نے اس کو خیمے میں تلاش کیا۔ وہ نہیں تھا۔ دوپہر کے شفاف سورج کی کرنیں خیمے کے دروازے کے باہر پھیلی ہوئی تھیں۔ خوشی اور مسرت کے نعرے بلند ہورہے تھے۔

''حضور کے آنکھیں کھولنے پر سپاہی مسرت کا اظہار کررہے ہیں۔'' ایک سرہنگ نے بتایا۔

''جراحوں نے کہا تھا زخم معمولی ہیں مگر جانثار پریشان تھے۔''

''امیر جامدار کہاں ہیں؟'' شہزادے نے گھومتی نظروں سے گردوپیش کا جائزہ لیا۔ وہ تجربہ کار امیر کا شکریہ ادا کرنے کے لیے بے تاب تھا۔

''مغلوں کے تعاقب میں گئے ہیں۔''

اس کا لہجہ پست تھا۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ جراحوں کے میر سامان نے کمبل اٹھا کر پیروں پر ڈالا اور سب کو رخصت کا اشارہ کیا۔

بہت جلد خیمہ خالی ہوگیا اور پھر شہزادے کو گہری نیند نے اپنی آغوش میں لے لیا۔ آنکھ کھلی تو عصر کا وقت تھا۔ آرام کی نیند اور دواؤں کے اثر نے اس کو چاق و چوبند کردیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو پہلے کی طرح صحت مند محسوس کررہا تھا۔ اٹھ کر بیٹھا اور بلاتکلف خیمے سے باہر آیا۔ مغلوں کی لشکر گاہ میں جو مالِ غنیمت ملا تھا اس کی جانچ ہورہی تھی۔ سونے، چاندی، ریشم اور مخمل کی رنگ برنگی دنیا سامنے جلوہ گر تھی۔ یہ ایران، خراسان اور ہرات کے لاتعداد قصبوں اور آبادیوں کی لوٹ تھی جس کو مغل چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔

شہزادہ آہستہ آہستہ گھومتا رہا۔ کوئی چیز تھی جو اس کو بے چین کیے ہوئے تھی مگر سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا بات ہے؟ مالِ غنیمت سے بھرے ہوئے خیموں کا معائنہ کرتے کرتے اس نے سنا کہ امیر جامدار نے کس طرح دریا پار کرکے مغلوں پر دو طرف سے دھاوا کیا اور شہزادے کو گر کر مرنے سے بچالیا۔ بیان کرنے والوں نے امیر جامدار کی جرأت کا ذکر اعتراف و تعریف کے لہجے میں کیا اور شہزادے کا اس پر نمایاں اثر ہوا۔

''وہ ابھی تک واپس نہیں آئے؟'' اس نے پوچھا۔

''مغل بھاگ گئے تو امیر جامدار نے اپنی تازہ دم فوجوں کے ساتھ ان کا تعاقب ضروری سمجھا، شام تک آجائیں گے۔'' شہزادہ محمد نے سر ہلایا اور پوچھا کہ میدان جنگ میں شہید ہونے والوں کو کس جگہ سپردِ خاک کیا گیا ہے۔ لوگ اس کو ''گنجِ شہیداں'' لے گئے۔ مٹی کے ایک بڑے سے ٹیلے کے نیچے جو ابھی بالکل گیلا تھا وہ بہادر

کیا سمجھے

ایک شخص نے شادی کے خلاف ایک کتاب لکھی جس میں اس نے ثابت کرنے کی کوشش کی کہ شادی اس دور کی سب سے بڑی مصیبت ہے۔ کتاب ہاتھوں ہاتھ بک گئی۔

کتاب لکھنے والے شخص سے اس کے دوست نے پوچھا۔ ''اب کیا ارادہ ہے؟''

''بھائی شکر ہے کہ اب میرے پاس اتنے پیسے آگئے ہیں کہ میں بہ آسانی شادی کرسکتا ہوں۔ کیا سمجھے؟''

مثالی حکمران

شہنشاہ اورنگزیب کے بعد ہندوستان نے اتنا بڑا مسلمان پیدا نہیں کیا جس کے غیر متزلزل ایمان، راسخ اور اٹل ارادے نے دس کروڑ شکست خوردہ افراد کی مایوسیوں کو کامرانیوں میں بدل دیا۔

(مرسلہ: ریاض بٹ، حسن ابدال)

قیامت تک کے لیے میٹھی نیند سو رہے تھے جنہوں نے مغلوں کے دلوں پر شمشیر ہندوستان کی ہیبت بٹھادی تھی۔ شہیدوں کو اسی خون آلودہ لباس میں پہلو بہ پہلو دفن کر کے ایک ''گنج شہیداں'' بنادیا گیا تھا۔

یہاں فاتحہ پڑھتے وقت شہزادہ محمد کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور اس کا دل تڑپ کر رہ گیا۔ اس نے سوچا شاید میری ناتجربہ کاری اور جوش تھا جس نے ان بہادروں کو اس فانی دنیا سے رخصت ہونے پر مجبور کردیا۔

وہ اپنے خیمے کی طرف واپس چلا۔ افق پر غبار اٹھ رہا تھا۔ لوگ ادھر دیکھنے لگے اور سپاہیوں نے صف بندی کرلی۔ اندیشہ تھا کہ کہیں مغل پلٹ نہ پڑے ہوں۔ جو اس طرح کی بے جگری کے عادی تھے اور اکثر شکست کھا کر بھاگنے کے بعد اچانک نمودار ہوکر اپنی فتح پر خوش حریف کو بدحواس کر کے مار لیتے تھے لیکن یہ مغل نہیں تھے، امیر جامدار تھا۔ گرد و غبار سے اٹا ہوا وہ گھوڑے سے کودا۔ لباس پر خون کے دھبے تھے۔ چہرے پر کئی جگہ تلوار کے زخم لگے تھے۔ ان سے جو لہو بہا تھا وہ مہندی سے سرخ ڈاڑھی پر جم گیا تھا مگر شہزادے کو دیکھ کر سب کچھ بھول گیا۔

''خدا کا شکر ہے آپ کے زخم گہرے نہ تھے۔'' اس نے شہزادے کو گلے سے لگا کر کہا اور اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

''مغلوں کا کیا حشر ہوا؟'' شہزادے نے بے تابی سے پوچھا۔

امیر جامدار نے بڑے غرور سے شانوں کو جنبش دی اور بولا۔ ''وہ اچھا سبق سیکھ گئے ہیں۔ میں نے بہت دور تک ان کا تعاقب کیا۔ راستے میں ہر لمحے وہ تلواروں اور نیزوں کا شکار ہوکر گرتے رہے۔ فرار ہی میں کم از کم چار ہزار مغل مارے گئے ہیں اور میدانِ جنگ میں بھی۔''

اس نے ایک سرہنگ کو جواب طلب نظروں سے دیکھا تو وہ فوراً آگے بڑھا اور اس نے کمر سے لمبا کاغذ نکال کر پڑھنا شروع کردیا۔ معلوم ہوا کہ میدانِ جنگ میں پانچ ہزار مغلوں کی لاشیں ملی تھیں جن کے سر کاٹ کر دھڑ دفن کردیے گئے۔ دس ہزار خیمے ساتھ آئے جن میں لاکھوں کروڑوں کا مال بھرا ہوا ہے اور چار ہزار سات سو گھوڑے پکڑے گئے۔

''یہ ایک شاندار فتح ہے۔'' امیر جامدار نے قہقہہ لگا کر کہا۔ ''شہزادے! میں نے حکم دے دیا تھا کہ مغلوں کے سر کاٹ لیے جائیں تاکہ ہم ان کا مینار تعمیر کرسکیں جو صدیوں تک مغلوں کو ہماری ہیبت یاد دلاتا رہے گا۔''

''مجھے یہ رواج پسند نہیں۔'' شہزادہ محمد کا لہجہ ناگوار تھا۔ اس زمانے کا عام رواج تھا کہ قزاقوں، ڈاکوؤں اور دشمنوں کی لاشوں کے سر کاٹ کر بڑے بڑے میناروں کی بنیاد میں بھرتے تھے۔ اکثر یہ مینار کھوکھلے ہوتے اور ان کے اندر کھوپڑیاں بھری جاتیں۔ یہ رواج مغلوں اور ترکوں میں بہت زیادہ تھا۔ امیر جامدار نے بات ٹال دی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس معاملے میں شہزادہ محمد سے زیادہ گفتگو کرے۔ اندیشہ تھا کہ کہیں وہ کھل کر اس کی ممانعت نہ کردے۔ وہ شہزادے کو سکوت کے عالم میں چھوڑ کر رخصت ہوا اور اپنے خیمے میں پہنچ کر کپڑے اتارے بغیر قریبی دیہات کے بااثر لوگوں کو بلایا اور ان سے کہا۔

''کل کا دن چھوڑ کر پرسوں تک مینار تعمیر ہوجانا چاہیے۔ جتنے مزدور درکار ہوں، گاؤں سے پکڑو اور بے جھجک اجرت دو۔''

ان لوگوں نے تعمیلِ حکم کا وعدہ کیا۔ امیر جامدار نے ہزار ٹنکہ کی تھیلی دینے کا حکم دیا اور پھر قربان خاں سے مسکرا کر بولا۔

''میں بدایوں پہنچ کر خواجہ شمس اعجاز رقم سے مینار کے لیے سنگِ مرمر کی لوح پر کتبہ تحریر کرواؤں گا اور کسی اچھے شاعر سے قطعہ تاریخ کہنے کی فرمائش بھی کروں گا۔ یہ یادگار میرے نام کو صدیوں باقی رکھے گی۔''

''حضور کا نام تا ابد روشن رہے۔'' قربان خاں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

''.....اور اب کی بار ان شاء اللہ محل سرا میں.....'' اس نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا مگر شرارت سے مسکرایا ضرور۔

''مجھے بھی امید ہے کہ حسینہ میری ہوجائے گی۔'' امیر جامدار نے مسرت کے عالم میں کہا۔

''میری تقدیر کا ستارہ چمک رہا ہے۔ ہر میدان میں کامیابیاں قدم چوم رہی ہیں۔ امید ہے کہ پرچہ نویسوں کا پتا بھی لگ ہی جائے گا۔''

''وہ کس لیے حضور؟''

''میں چاہتا ہوں کہ کچھ رقم خرچ کر کے ان کے منہ بند کردوں۔ ممکن ہے کہ حسینہ کے بارے میں وہ کچھ معلوم کرلیں۔''

''آپ ان کو کتنی رقم عطا فرمائیں گے؟''

''ہزار، دس ہزار، ایک لاکھ ٹنکہ، وہ جتنا مانگیں۔''

قربان خاں کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ہونٹوں پر زبان پھیر کر ہاتھ بڑھایا اور لرزتے لہجے میں کہا۔

''ایک لاکھ ٹنکہ عنایت کیجیے۔''

''تم کو.....؟'' امیر جامدار نے حیرت سے کہا۔ ''کیا تم پرچہ نویسوں کو جانتے ہو قربان خاں؟ تم نے کب پتا لگایا کہ بدایوں میں پرچہ نویس کون کون ہے؟''

''پانچ آدمی ہیں۔ چار پرچہ نویس، ایک ان کا منشی۔'' قربان خاں نے جھک کر دھیرے سے کہا۔ ''پچاس ہزار تو میر منشی لے گا۔ بقیہ رقم چاروں میں تقسیم کر دی جائے گی اور سب کے منہ بند ہو جائیں گے۔''

''مگر.....وہ ہیں کون؟'' امیر جامدار نے رک کر پوچھا۔

ایک شبہ اس کے دل میں آتا تھا۔ قربان خاں نے نظروں میں شبہ چمکتے دیکھا اور مونچھوں پر تاؤ دے کر ہنستا ہوا بولا۔

''ہاں حضور! میں ہی پرچہ نویسوں کا منشی ہوں۔ ساری خبریں لکھ کر بھیجنا میرا ہی کام ہے اور میں آپ کا نمک خوار ہوں سرکار!''

قربان کا لہجہ بڑا خوشامدانہ تھا۔ امیر جامدار کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ یہ سوچ کر حیران رہ گیا کہ اس کا خاص مصاحب کارپرداز.....قربان خاں، بلبن کے محکمۂ جاسوس کا ایک رکن اور پرچہ نویسوں کا میر منشی تھا۔

☆☆☆

ملتان پہنچ کر شہزادہ محمد نے ساحر فراش کے قتل کے مقدمے کو یاد کیا اور اسے اچانک یاد آیا کہ میدانِ جنگ میں اسے جس نے بچایا تھا وہ مقدمے کا ملزم دارا اب تھا۔

''وہ کس طرح بھاگ نکلا؟'' شہزادے نے پوچھا۔

بختیار خلجی نے بتایا کہ اس کو قید خانے میں لے جایا جا رہا تھا۔ اچانک اس نے زور لگا کر ہتھکڑی توڑ ڈالی اور بھاگا تو پھر ہاتھ نہیں آیا۔

''اس نے تو میری جان بچائی ہے۔''

''تب تو میں اسے معاف کر دیتا شہزادے۔'' بختیار خلجی نے ہنس کر کہا۔

''بہر طور، اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کا سپاہی قتل کا مجرم تھا لیکن اس نے آپ کی جان بچا کر نمک حلالی کا جو ثبوت دیا ہے، اس کا معاوضہ بھی ضروری ہے۔''

شہزادہ محمد نے کچھ نہیں کہا۔ اسے اندازہ تھا کہ سلطان غیاث الدین بلبن یہ بات کبھی پسند نہ کرتا۔ اس کے بے لاگ انصاف میں یہ ذاتی باتیں رکاوٹ نہیں بن سکتی تھیں۔

شہزادہ محمد نے لمبی سانس لی اور اس کے خوبصورت چہرے پر افسردگی چھا گئی پھر وہ شیخ صدر الدین جہاں کی خانقاہ میں حاضر ہونے کے ارادے سے اٹھا۔

''آپ نہیں چلیں گے؟'' بختیار خلجی نے امیر جامدار سے پوچھا۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ چونک پڑا، بولا۔

''کون.....؟ میں.....؟'' وہ کھسیانی ہنسی ہنس کر بولا۔ ''نہیں، میں نہیں جاؤں گا۔ میں نے ان کی پیشگوئی کو جھٹلایا تھا، اب سامنے جاتے شرم آتی ہے۔''

بختیار خلجی کے اصرار کے باوجود امیر جامدار خانقاہ میں حاضری دینے پر تیار نہیں ہوا بلکہ ملتان کے قلعے میں مقیم رہا۔ اس کو قربان خاں کا انتظار تھا جو حسینہ سے ملنے گیا ہوا تھا۔

امید و بیم کی عجیب کشمکش تھی۔ امیر جامدار اتنا بے چین تھا کہ اپنے اوپر قابو رکھنا دشوار ہو رہا تھا۔ حالانکہ قربان خاں نے قسم کھا کر یقین دلایا تھا کہ اب دنیا کی کوئی طاقت حسینہ کے حصول میں رکاوٹ نہیں بن سکتی۔

جب قربان خاں آیا تو اس کے چہرے پر مسرت ناچ رہی تھی۔ ''حضور کو مژدہ مبارک ہو۔ حسینہ کا عندیہ اثبات میں نصیب ہوا ہے۔''

امیر جامدار اچھل ہی پڑا۔ خوشی کے مارے چہرہ سرخ ہو گیا۔ کلاہ کج کر کے مسند پر اکڑ کر بیٹھ گیا اور اشتیاق سے پوچھا۔ ''میں اس سے کب مل سکوں گا؟''

''ابھی نہیں حضور!'' قربان خاں نے مسکرا کر کہا۔

امیر جامدار کا چہرہ فوراً پھیکا پڑ گیا تو اس نے جلدی سے وضاحت کی۔ ''حسینہ نے کہا ہے کہ وہ عدت گزارنے کے بعد بدایوں آنے کا ارادہ رکھتی ہے۔''

''مگر اس نے مجھے.....میرا گھر.....یعنی میری بیوی ہونا قبول کر لیا؟''

''بسر و چشم میں نے عرض کیا تھا کہ وہ اپنی شرافت کی وجہ سے شوہر کو چھوڑنا نہیں چاہتی مگر اس کو اپنے بدصورت اور غریب شوہر سے کوئی محبت ہی نہیں تھی بلکہ ایک طرح کی نفرت تھی۔ اللہ اس کی مغفرت کرے۔ بڑا بدمزاج اور سخت گیر تھا۔ سنا ہے کہ حسینہ کو مارتا پیٹتا بھی تھا۔''

''اس مصیبت سے حسینہ کو تم نے نجات دی ہے۔'' امیر جامدار نے ہنس کر کہا۔

''ایک بات عرض کرنا بھول گیا۔'' قربان خاں نے نظریں نیچی کر کے کہا۔ ''حسینہ ماں بننے والی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ وہ کسی حال میں اپنے بچے کی جدائی گوارا نہیں کرے گی۔ حضور سوچ لیں۔''

ناگواری کے آثار امیر جامدار کے چہرے پر ابھرے۔ ''یہ تم نے بری خبر سنائی۔'' وہ ہونٹ چباتا ہوا

بولا۔ ''کیا میں ایک فراش کے لڑکے کو اپنی اولاد کی طرح پرورش کروں؟ بڑی بے عزتی کی بات ہے۔''

''میں نے حسینہ کی شرط بیان کی۔'' قربان خاں نے بے پروائی سے کہا۔ ''اب آپ جو مناسب سمجھیں کریں۔''

امیر جامدار ہونٹ چباتا رہا اور قربان خاں کا منہ تک رہا تھا پھر اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر بڑبڑایا۔ ''ایک صورت ممکن ہے بشرطیکہ تم راضی ہوجاؤ۔'' امیر جامدار کے ہونٹوں پر بڑی سفاک مسکراہٹ ابھری۔ ''تم دوسرا قتل بھی تو کرسکتے ہو۔ بچے کی پیدائش کے بعد اسے ختم کردینا۔''

''نہیں حضور!'' قربان خاں ہکلاتا ہوا بولا۔

''ایک لاکھ ٹنکہ اور دوں گا۔''

یہ الفاظ قربان خاں کو بدل دینے کے لیے کافی تھے۔ اس کی سانس تیز چلنے لگی۔ آنکھوں میں لالچ کی چمک نے خونریزی اور جرم و گناہ کے راستے پر ایک قدم اور آگے بڑھنے کا اقرار کیا اور امیر جامدار نے اطمینان کی سانس لی۔

☆☆☆

امیر جامدار دہلی میں بڑی شان و شوکت کے ساتھ پہنچا۔ اس کے لشکر کے زرق برق لباس اور لہراتے پرچم مغلوں کو ایک اور شکست فاش دینے کا افسانہ بڑے غرور سے سنا رہے تھے۔ یوں تو ہر دوسرے تیسرے سال مغل، بلبن کی عظیم الشان سلطنت کے جاہ و جلال سے ٹکراتے اور ناکامی کی ذلت اٹھاتے تھے مگر اس بار فتح مندی کا غلغلہ بلند تھا۔

امیر جامدار کی شہرت اور فتح کو مبالغے کا رنگ دینے والے وہ چہل گانی سردار تھے جن کو بلبن نے بے اثر کرکے دہلی میں ایک طرح سے بے دست و پا قیدی بنا رکھا تھا۔ وہ اپنے اپنے محلوں میں پڑے رہتے تھے۔ سلطنت و سیاست میں ان کی دخل اندازیاں محض یاد بن چکی تھیں۔ امیر جامدار کے استقبال کی پُرزور تیاریاں انہوں نے اس لیے کیں کہ ایک چہل گانی امیر کی عظمت و شہرت سے ان کی جماعت کو کھویا ہوا وقار حاصل ہو رہا تھا۔

سلطان غیاث الدین بلبن نے چہل گانی امیروں کو مسکرا کر خوش آمدید کہا۔ وہ صندل کے تخت پر دوزانو بیٹھا تھا۔ پورا دربار آراستہ تھا۔ لشکر کے سالار، علماء قاضی اور ارکانِ سلطنت حاضر تھے۔ ایک سمت دو جلاد بھی بھاری بھاری تیغے کندھے پر رکھے کھڑے تھے۔ ان کی کمر میں چرمی تازیانے مڑے ہوئے لگے تھے اور پیروں کے نزدیک چمڑے کا وہ گول گدا پڑا تھا جس پر سزائے موت کے وقت مجرموں کو بٹھایا جاتا تھا۔

جلادوں نے چہل گانی سرداروں کو دیکھا پھر ان کی سرخ اور ہیبت ناک آنکھیں امیر جامدار پر جم گئیں اور اس کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہونے لگے۔ دل کڑا کرکے اس نے اپنی زبان کھولی اور مہم کے حالات بیان کیے اور چہل گانی امیر بیچ بیچ میں واہ واہ کرتے رہے۔ بلبن نے متانت سے سنا اور بات ختم ہونے پر پوچھا۔

''اس عظیم الشان کارنامے کا معاوضہ کیا ہوسکتا ہے؟ ہمارے دوست نے نہ صرف مغلوں کو شکست دی ہے بلکہ میرے لڑکے کی جان بھی بچائی ہے جس نے نادانی سے خود کو ہلاکت میں ڈال دیا تھا۔ ہم اپنے دوست کے ممنونِ احسان ہیں۔''

چہل گانی امیروں کے چہرے چمکنے لگے اور امیر جامدار کا اضطراب جاتا رہا۔ تعریفوں نے اس کو حوصلہ دیا تھا اس لیے وہ اٹھ کر بولا۔

''ملک و قوم کو بچانے کا معاوضہ کیسا سلطانِ محترم! میں نے جو کچھ کیا اپنا فرض سمجھ کر کیا۔ آپ کی خوشنودی میرے لیے کافی ہے۔''

''کتنے اچھے الفاظ ہیں۔'' بلبن نے سنجیدگی سے کہا۔

اس کے اشارے پر چار غلام آگے بڑھے۔ انہوں نے امیر جامدار کے سامنے پہنچ کر وہ کشتی کھولی جو ایک غلام کے سر پر تھی۔ طلا کار کناروں کا خلعت نکالا گیا اور غلاموں نے تیزی اور سلیقے سے امیر جامدار کو خلعت پیش کی پھر اس کے بازوؤں پر موتیوں کے جوشن باندھے گئے۔ گلے میں زمرد کی ایک مالا ڈالی گئی اور امیر حاجب تاج الدین محمد نے کھڑے ہوکر اعلان کیا۔

''سلطان محترم نے اپنے دوست بدایوں کے صوبیدار اور ملوک چہل گانی کے معزز رکن امیر رفیق جامدار کو ایک کروڑ ٹنکہ کا انعام عنایت فرمایا ہے۔ یہ رقم ان کو فوراً ادا کی جائے۔'' اور یہ کہہ کر اس نے ایک کاغذ امیر جامدار کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس پر سلطان بلبن کے دستخط اور مہر خاص سے شاہی خزانے کے مہتمم اعلیٰ کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ ایک کروڑ ٹنکہ کی رقم کے برابر سونا، چاندی یا جواہرات، جو چیز امیر جامدار یا ان کے وارث پسند کریں، فوراً ادا کردیں۔

نہ جانے کیوں امیر جامدار کے ہاتھ سے کاغذ گر پڑا۔

''میں یا میرے وارث۔'' وہ دل ہی دل میں بولا۔

جسم سے پسینا پھوٹنے لگا تھا مگر لوگ اس کے حال سے بے خبر بلبن کی فیاضی اور سخاوت کی تعریفیں کررہے تھے اور اس کو دعائیں دے رہے تھے۔

بلبن نے بھاری آواز میں اچانک کہا۔ ''امیر! میں

نے تمہارے احسان کا معاوضہ ادا کر دیا نا؟''

''جی ہاں!'' وہ ہکلاتا ہوا بولا۔ اس کی نگاہوں میں خوف جھلک رہا تھا۔ وہ بلبن کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے زخمی ہرن شکاری کو دیکھتا ہے۔ وہ بے بسی کے عالم میں بھی فرار کے راستے ڈھونڈ رہا تھا۔

''احسان کا تقاضا میں نے پورا کر دیا۔'' بلبن کی بارعب آواز میں فولاد کی کاٹ آ گئی تھی۔ ''اب انصاف کا تقاضا پورا ہوگا۔''

اس نے تالی بجائی۔ ایک گوشے میں دو مرمریں ستونوں کے درمیان پڑا ہوا ریشمی پردہ ہٹ گیا۔ دو بوڑھی کنیزوں کے بیچ میں ایک عورت بڑھی اور آہستہ آہستہ تخت کے دائیں طرف آ کر کھڑی ہوگئی۔ وہ سر سے پیر تک سیاہ چادر میں پوشیدہ تھی۔

بلبن نے قاضی القضاۃ سے کہا۔ ''آپ کے نزدیک یہ جائز ہے کہ ایک بیوہ عورت کی جانب سے سلطان وقت اس کی وکالت کرے جبکہ عورت کا کوئی ولی بھی موجود نہیں؟''

''جائز ہے سلطان محترم!''

''تو میں یہ کہتا ہوں کہ امیر جامدار نے اپنے فراش کو اس لیے قتل کرا دیا کہ اس کی خوبصورت بیوی کو اپنے نکاح میں لا سکے۔ مظلوم کا خون انصاف کے لیے چیخ رہا ہے۔ دنیا اور دنیا کے حقیقی مالک کے قانون کے مطابق فیصلہ کیجیے۔''

''سلطان محترم کو اپنے تخت سے نیچے اتر کر وکالت کرنا چاہیے۔'' قاضی القضاۃ نے سخت لہجے میں تنبیہہ کی۔ بلبن نے اس حکم کی فوراً تعمیل کی۔

''کیا یہ وہی عورت ہے؟'' قاضی القضاۃ نے دریافت کیا۔

''میں یہ عرض کروں گا کہ میں نے اس کو اپنے خاص حکم سے طلب کیا ہے۔'' بلبن نے ذرا مسکرا کر کہا۔ ''اس بے چاری کا یہ قصور نہیں کہ اس نے عدت کے ایام میں قدم گھر سے باہر نکالا۔ اس کا قصوروار میں ہوں۔''

''یہ جرم ہے اور آپ مجرم ہیں۔'' قاضی القضاۃ نے بے خوفی سے کہا۔

بلبن نے سر جھکا کر اقرارِ جرم کیا اور بولا۔ ''اس سلسلے میں جو کفارہ ہو، وہ میں ادا کروں گا محترم! پہلے ایک اہم ترین مسئلے کا تصفیہ فرمایا جائے تو مناسب ہے۔''

قاضی القضاۃ نے امیر جامدار کو دیکھا۔ اس کا چہرہ خون کھنچ جانے سے زرد پڑ گیا تھا۔ سرخ ڈاڑھی کے بالوں پر رخساروں سے پسینا گر رہا تھا۔ جرم کا اقرار چہرے پر موجود تھا مگر اچانک اس کی زبان کھلی تو وہ چیخ کر بولا۔

''یہ جھوٹ ہے۔ میں حسینہ کو نہیں جانتا۔''

اور بلبن کے تبسم نے اس کو بت بنا دیا۔

''تم اس کا نام جانتے ہو میرے دوست؟'' اس نے سوال کیا۔

''یہ جرم کا ثبوت نہیں۔'' قاضی القضاۃ نے فیصلہ کیا اور امیر جامدار لمبی سانس لے کر سنبھلا۔ چہل گانی امیروں کے حیرت زدہ چہروں پر ناراضگی جھلک رہی تھی۔ امیر جامدار نے پھر کہا۔

''یہ جھوٹ ہے۔ میں اس ذلیل عورت سے دل نہیں لگا سکتا۔ یہ سازش ہے اور اس کا مقصد مجھے بدنام اور رسوا کرنا ہے۔''

بلبن نے اشارہ کیا اور سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی عورت نے ایک پوٹلی زمین پر پھینک دی۔ ایک غلام نے بڑھ کر اسے اٹھایا اور کھول کر الٹ دیا۔ لوگوں نے موتیوں کے ہار، بازو بند، آویزے اور دوسرے زیور دیکھے جن پر جواہرات جڑے تھے۔

''کیا یہ تحفے تم نے اسے نہیں بھیجے تھے؟''

امیر جامدار نے بلبن کی آواز سنی اور اپنی جگہ سے کھڑے ہونے کی کوشش چاہی مگر دماغ چکرا گیا۔ منہ سے چیخ نکلی اور اس نے اپنا خنجر کمر سے کھینچ کر چاہا کہ سینے میں مار لے لیکن قریب کے لوگوں نے ہاتھ سے خنجر چھین لیا۔

''میں نے اس کے شوہر کو خود قتل نہیں کیا۔'' وہ اچانک چیخ کر بولا۔

''یہ درست ہے تم نے قتل نہیں کیا مگر قتل کا سبب بنے، قتل کو چھپایا، قاتل کو پناہ دی، اس کی سرپرستی کی اور اس کو ایک لاکھ ٹنکہ انعام دیا۔''

سارے الزام امیر جامدار نے سنے اور سر جھکا لیا۔ آنکھوں سے آنسو دامن پر گر رہے تھے اور وہ بری طرح رو رہا تھا۔

بلبن نے قاضی القضاۃ سے سوال کیا۔ ''فرمایئے! اس بہادر اور جنگجو انسان کی کیا سزا ہے جو میدان جنگ میں وحشی دشمنوں کو خاک و خون میں ملا کر نمایاں فتح حاصل کرے لیکن جب اس کے نفس کے اندر نیکی اور بدی کی کشمکش ہو رہی ہو، وہ بدی سے شکست کھا کر گناہ کا ارتکاب کرے۔ میرا دوست ایسا ہی مجرم ہے۔''

سناٹا چھا گیا اور جب لوگ بولے تو امیر جامدار کی سفارش کرنے لگے مگر بلبن نے ان کو جھڑکا اور وہ چپ

ہو گئے۔ بلبن نے کہا۔

''دربار میں سفارش سنی جاسکتی ہے مگر میں اس وقت دربار میں نہیں ہوں۔ قاضی القضاۃ کے سامنے مدعی بن کر کھڑا ہوں۔ فیصلہ ان کو کرنا ہے اور وہ جانتے ہیں کہ ان کو کیا فیصلہ کرنا ہے جس سے انصاف کے تقاضے پورے ہوں۔''

لوگوں نے قاضی القضاۃ شیخ جمال الدین ناگوری کی سمت نظر کی۔ وہ اپنے عمامے اور سفید ڈاڑھی کی وجہ سے بارعب بزرگ معلوم ہوتے تھے۔ ان کی نیکی اور نرم دلی کی شہرت تھی۔ یہ امید بندھی کہ وہ نرمی سے کام لیں گے مگر انہوں نے سرد مہری سے فیصلہ کیا۔

''قاتل کے لیے کوئی رعایت نہیں۔ خون کا بدلہ خون ہے۔ انسان بھوکا اور غریب رہ کر تقدیر پر صبر کرسکتا ہے مگر بے انصافی کا احساس اس کو انسانیت سے محروم اور ایسی نامرادی کا شکار بنا دیتا ہے جو ابلیس کا مقدر ہے۔''

''لیکن میں نے قتل نہیں کیا۔'' امیر جامدار گڑگڑا کر بولا۔

''قتل کی معاونت بھی برابر کا جرم ہے۔'' قاضی القضاۃ نے کہا۔ ''مجرموں کو مقتول کے ورثاء کے حوالے کیا جائے۔ وہ چاہیں تو خون بہا... (سر دھان) لے کر معاف کردیں یا جلاد کے حوالے کردیں۔''

یہ حکم سن کر میدانِ جنگ کے شہ سوار اور سپہ سالار امیر جامدار نے سر جھکا لیا۔

بلبن کے اشارے پر اس کو زیرِ حراست لے لیا گیا۔ سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی عورت کو بوڑھی کنیزیں ریشم کے پردے کے پیچھے لے گئیں۔ دربار برخاست کردیا گیا۔

کافی مدت امیر جامدار نے قید خانے کے تاریک اور مرطوب حجرے میں بسر کی۔ اس کو اپنا لباس پہننے رہنے کی اجازت تھی اور سلطان بلبن کے دربار سے ہر روز اس کو اعلیٰ درجے کے کھانے بھیجے جاتے تھے مگر وہ چار مہینے کے اندر ہی گھل کر آدھا رہ گیا۔ کئی بار چہل گانی امیر اس سے ملنے آئے اور اسے بتایا کہ حسینہ نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا۔

''میں نے ایک کروڑ ٹنکہ کا نویسہ (کاغذ... چیک) اسے بھیج دیا ہے۔'' امیر جامدار نے ایک دن تڑپ کر کہا۔ ''اب اگر وہ چاہے تو میں اپنی جاگیر اور دولت بھی اسے دے سکتا ہوں۔'' یہ کہہ کر امیر جامدار کسی قریب المرگ انسان کی طرح اداس اور مایوس سا نظر آنے لگا۔

مشکل یہی تھی کہ حسینہ نے کوئی فیصلہ ہی نہیں کیا تھا اور نہ اس کی سمجھ میں کچھ آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ ایک کروڑ ٹنکہ کا کاغذ اس نے پھاڑ کر پھینک دیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ دولت اور غربت میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں کے درمیان زندگی جہنم بن سکتی ہے یا جنت ہوسکتی ہے۔

جنت کا تجربہ اسے نہیں تھا۔ اس نے ساحر فراش کے گرد زندگی کو جہنم پایا تھا اور امیر جامدار نے اس کے لیے ایک نیا جہنم تیار کرنا چاہا تھا۔

پھر ایک دن وہ آیا جب وہ ماں بن گئی۔ رحم اور محبت کا ایک سمندر تھا جس کی لہریں اس کے وجود میں موجیں مارنے لگیں۔

اس عالم میں اس کو بلبن نے طلب کیا اور شفقت سے کہا۔ ''بیٹی! میں تجھ سے ایک بات کی بھیک مانگتا ہوں۔ امیر جامدار کی جان بخش دے۔ اللہ معاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''

''میں نے اس کو معاف کیا۔'' یہ الفاظ سرخ ہونٹوں سے نکلے تو خود حسینہ کو ایسا محسوس ہوا کہ اس نے اپنے بچے کی طرح دنیا میں نیا جنم لیا ہے۔

''شاباش بیٹی! اس نے بھی اتنے دن امید و بیم کا عذاب بھگت لیا جتنے دن تو نے یہ عذاب برداشت کیا تھا۔ جب تو اپنے شوہر کی جان بچانے کے لیے قربان خاں کو دھوکا دیتی تھی اور امیر جامدار کے تحفے قبول کرلیتی تھی۔''

حسینہ کا سر جھکا ہوا تھا۔

''میں تیرے باپ کی حیثیت سے تیری شادی کررہا ہوں۔ یہی میرا کفارہ ہے۔'' بلبن نے مسکرا کر کہا۔ ''داراب نے اگر میدان جنگ سے واپس آکر حضرت شیخ صدرالدین جہاں کو اپنی بے گناہی کا یقین نہ دلایا ہوتا تو میں اپنے دوسرے پرچہ نویسوں کے ذریعے معاملے کی تحقیق کیسے کرسکتا تھا۔ حضرت شیخ کے خط نے مجھے اس طرف متوجہ کیا۔ داراب نے ان کی پناہ لی تھی۔''

نئی اور تیز مسرت کا احساس حسینہ کو خاموش رکھنے کے لیے کافی تھا مگر اس کے خوبصورت چہرے کی سرخی نے بلبن کو مسکرا کر نظر پھیر لینے پر مجبور کردیا۔

امیر جامدار کو رہا کردیا گیا اور وہ صوبیداری سے محروم ہوکر بدایوں آیا۔ اس کو احساس تھا کہ بلبن نے ہی یہ بڑا کام کیا ہے جو حسینہ سے معافی لے کر اس کی جان بچالی۔

وہ دل ہی دل میں بلبن کا شکر گزار تھا۔ اس کی ندامت اور خوف کا احساس اس وقت عروج پر پہنچا جب اس نے بدایوں کی فصیل پر قربان خاں اور اس کے چار ساتھی پرچہ نویسوں کے سر لٹکتے دیکھے۔

ماخذات

طبقات ناصری، طبقات اکبری۔ تاریخ اسلام، اکبر شاہ خان۔ تاریخ فرشتہ، سفر نامہ ابن بطوطہ

میکس ونٹر ہمیشہ کی طرح نرم لہجے میں بات کر رہا تھا۔ ''تم پریشان مت ہو ڈارلنگ! ہم اس کا دل نکال لیں گے۔ سنو، میں اس وقت زیادہ بات نہیں کر سکتا۔ آئی لو یو۔'' میکس نے اپنی میز پر رکھا ہوا فون بند کر دیا۔

''سوری! میری بیوی کا فون تھا۔ آج صفائی کرنے والی عورت نہیں آئی۔''

''کوئی بات نہیں۔'' سین نے کہا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ وہ کمپنی کا سی ای او تھا اور ایسی معمولی باتوں کو اہمیت نہیں دیتا تھا اور اگر اسے کوئی چھوٹا موٹا مسئلہ درپیش ہوتا تو وہ اسے دبا دیتا۔ اس نے کن انکھیوں سے میکس کو دیکھا۔ جیسے ہی سین کی مسکراہٹ رخصت ہوئی تو میکس کو احساس ہوا کہ اسے سین کو دیکھتے ہی کال منقطع کر دینا چاہیے تھی۔ اس نے سین کو بیس سیکنڈ انتظار کروایا۔ ربیکا جب بھی فون کرتی تھی تو میکس اس سے بات کرنے کے لیے وقت

اپنے مفاد، اپنے جذبات کا خیال کرنا اچھی بات ہے مگر... بشرطیکہ کسی کے رستے میں کانٹے بچھا کر یا آنکھوں میں خوابوں کی کرچیاں چبھو کر نہیں... اور اسے شاید ان باتوں کا کوئی خیال ہی نہ رہا تھا... البتہ قدرت کبھی کچھ نہیں بھولتی... خاص طور پر ڈیڑھ ہوشیار بن جانے والوں کو ان کی ہوشیاری کا مزہ ضرور چکھاتی ہے۔

خیالی کردار کو تخلیق کرنے والے ایک

زیرک مجرم کا فسانہ

ڈیڑھ ہوشیار

تنویر ریاض

PAKSOCIETY.COM

نکال لیتا تھا۔ چاہے وہ کتنا ہی مصروف کیوں نہ ہو۔ اس نے کبھی اس کی کال کو وائس میل پر نہیں جانے دیا۔ چاہے سین اس کے کیبن کے باہر منڈلا رہا ہو۔

سین نے میکس کے کیبن پر نظر دوڑائی، جیسے وہاں رکھے ہوئے سامان کی فہرست بنا رہا ہو۔ اسے کوئی کمی نظر نہیں آئی۔ میکس کی میز پر ہر چیز ترتیب سے رکھی ہوئی تھی۔ اس پر صرف چند کاغذات اور ربیکا کی ایک فریم شدہ تصویر رکھی ہوئی تھی۔

''شادی کی بھی اپنی ایک اہمیت ہے ونٹر!''

''میں اس کی تائید کروں گا۔'' میکس نے کہا۔ وہ سین کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''میں کبھی تمہاری بیوی سے نہیں ملا۔ وہ کمپنی کی کسی تقریب میں بھی نہیں آتی۔''

''ربیکا تھوڑی سی تنہائی پسند ہے۔ وہ اگلی تقریب میں ضرور آئے گی۔ یہ میرا وعدہ ہے۔''

سین نے مخصوص انداز میں آنکھیں گھماتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم نے گزشتہ ہفتے سینٹ پیٹرک ڈے کی پارٹی میں انجوائے کیا تھا؟''

''یقیناً۔'' اس کے سوال کا یہی جواب تھا۔ ہر سال سین ایک مقامی ہال میں بال روم کرائے پر لیتا۔ اس پارٹی میں متعدد انواع و اقسام کے کھانے، گرین بیئر کے علاوہ آئرش رقاصائیں اور مشکی باجا بجانے والے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے۔ اس پروگرام میں تمام ملازمین کی شرکت لازمی تھی۔

''میں نے سنا ہے کہ تم نے وہاں بہت اچھا وقت گزارا۔''

میکس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ سمجھ گیا کہ سین کا اشارہ کس جانب ہے۔ اس نے کچھ نہیں کہا۔ سین کو اس کی خاموشی پسند نہ آئی۔ اس نے قدرے تیکھی آواز میں کہا۔ ''غیر شادی شدہ ملازمین ڈیٹنگ کر سکتے ہیں لیکن شادی شدہ افراد کو یہ اجازت نہیں کہ وہ دوسری عورتوں کو بے وقوف بنائیں۔ کم از کم اس کمپنی میں ہم اسے برداشت نہیں کر سکتے۔ سمجھ گئے؟''

''میں کسی کو بے وقوف نہیں بنا رہا۔'' میکس نے کہا۔

''مجھ سے جھوٹ مت بولو۔'' سین نے ایک ایک لفظ چباتے ہوئے کہا۔

میکس کا سانس گلے میں اٹک گیا۔ اس کا باس کوئی دلیل، وضاحت یا عذر سننا نہیں چاہتا تھا۔ سین کا منہ بن گیا۔ اس نے ناراض ہوتے ہوئے کہا۔ ''اسکینڈل کسی بھی کاروبار کے لیے نقصان دہ ہوتے ہیں۔ بالخصوص ہمارے یہاں اس کی بالکل گنجائش نہیں۔ یہ کبھی نہ بھولنا ورنہ تمہاری ملازمت ختم ہو سکتی ہے۔''

میکس کو یوں لگا جیسے وہ دل ہی دل میں ہنس رہا ہے۔ سین نے بھی اس کے چہرے کے تاثرات پڑھ لیے۔ وہ اس کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ''تمہارے خیال میں یہ ایک تفریح ہے؟''

''نہیں، نہیں۔ بالکل نہیں۔'' میکس نے ہمیشہ کی طرح عقلمند بننے کی کوشش کی۔

''میں تمہیں کافی ہوشیار سمجھتا تھا لیکن اب معلوم ہوا ہے کہ ایسا کچھ نہیں ہے۔''

سین کے جانے کے بعد میکس بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ چھٹی ہونے پر عملے کے لوگ عام طور پر آپس میں باتیں کرتے اور راہداری میں گشت کیا کرتے تھے لیکن اس روز ان کا لہجہ مختلف اور عجیب تھا جیسے کھیاں بھنبھنا رہی ہوں۔

ٹونی اپنے کیبن سے باہر آئی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور منہ کھلا ہوا تھا جیسے چیخنا چاہ رہی ہو۔ اس نے کانفرنس روم کی طرف اشارہ کیا جو خالی تھا۔ ٹونی نے مختصر اسکرٹ پہن رکھا تھا۔ وہ بھی اس کے پیچھے کانفرنس روم میں چلا گیا اور دروازہ کھلا رکھا تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔

''سین نے آج تم سے کیا کہا؟'' ٹونی نے سرگوشی کی۔

''یہی کہ شادی شدہ ملازمین یہاں فلرٹ نہیں کر سکتے۔''

''ہمیں یہ سلسلہ ختم کر دینا چاہیے۔''

''ہم کچھ غلط نہیں کر رہے ٹونی!''

''میں ایک شادی شدہ شخص سے تعلق قائم نہیں رکھ سکتی۔ سین بہت ناراض ہو رہا تھا۔ ایک منٹ پہلے اس نے مجھے بہت برا بھلا کہا۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر میں نے تم سے ترکِ تعلق نہ کیا تو وہ مجھے فارغ کر دے گا اور ساتھ ہی تمہیں بھی۔'' وہ اپنا ہاتھ سر پر پھیرتے ہوئے بولی۔ ''ہمارا تعلق ختم ہو چکا ہے میکس!''

میکس کو وہ لمحات یاد آئے جب وہ پیار سے اپنی مخروطی انگلیاں اس کی گردن پر پھیرتی تھی۔ کیا وہ اسے یقین دلا سکتا ہے کہ وہ کس طرح اس کے دل و دماغ پر چھا گئی ہے۔ کیا وہ اس کا یقین کر لے گی؟ کیا وہ اس کا مذاق اڑائے گی اگر اس نے یہ کہا کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے؟ وہ جانے کے لیے مڑی۔

''اگر میں شادی شدہ نہ ہوتا تو؟''

ٹونی جاتے جاتے رک گئی۔ ''لیکن تم شادی شدہ ہو۔ تم نے چار سال پہلے ربیکا سے شادی کی تھی اور گزشتہ ماہ اپنی شادی کی سالگرہ بھی منائی۔ میں تم سے تعلق برقرار نہیں رکھ سکتی میکس!'' اس کے خوبصورت چہرے پر ملے جلے تاثرات تھے جن میں التجا، معذرت اور شرمندگی کی جھلک تھی۔ اس لمحے میکس کو یقین ہوگیا کہ وہ بھی اس سے محبت کرتی ہے۔

میکس اسے حقیقت بتانا چاہ رہا تھا۔ ''لیکن اگر میں شادی شدہ نہ ہوں تو؟''

ٹونی کو غصہ آ گیا۔ اس کے دانت بھنچ گئے اور آنکھیں مسکرائیں۔ ''گھر جاؤ میکس! اپنی بیوی کے پاس۔'' وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

راستے میں بہت رش تھا۔ میکس کو گھر پہنچنے میں کافی دیر لگی۔ اندھیرا پھیل چکا تھا اور اسٹریٹ لیمپ کی زرد روشنی میں سائے گہرے ہوگئے تھے۔ اس کا گھر بھی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ البتہ کچن میں ایک لائٹ جل رہی تھی۔ اس نے ربیکا کی خاطر اپنے آپ کو نارمل رکھنے کی کوشش کی۔ وہ گیراج کے راستے گھر میں داخل ہوا۔ اس نے اپنی کار ربیکا کی جیپ کے برابر کھڑی کی اور چہرے پر مسکراہٹ سجائے کچن میں داخل ہوا۔

ربیکا کی جوابی مسکراہٹ ٹونی کی طرح جاندار اور دل موہ لینے والی نہیں تھی لیکن وہ ہمیشہ اس کا موڈ اچھا کر دیتی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کو خوش کرنے کی ضرورت ہے۔

''لگتا ہے کہ آج کا دن اچھا نہیں گزرا؟'' ربیکا میں اس کے خیالات پڑھنے کی غیر معمولی صلاحیت تھی جیسے وہ اس کی شخصیت کا ہی ایک حصہ ہو۔

''بہت خوفناک۔ سین پاگل ہوگیا ہے۔ آج اس نے مجھے ملازمت سے برطرف کرنے کی دھمکی دی ہے۔''

''وہ کیوں؟ تم نے تو بہت زبردست کام کیا ہے۔ اس سوفٹ ویئر کو نصب کرنے پر تمہیں ایوارڈ ملنا چاہیے تھا۔ تم تو بہت ذہین ہو۔''

''سین بھی یہی کہا کرتا تھا، جب تک اس نے مجھے احمق نہیں کہا تھا۔'' اس نے اپنے آپ کو اسمارٹ محسوس نہیں کیا۔ ''تم نے محسوس کیا کہ مجھے انقلابِ ایران جیسا معاملہ تمہیں نہیں بتانا چاہیے تھا۔''

''یقیناً۔ اس کا تعلق قومی سلامتی سے تھا۔ تمہیں احساس ہے کہ ہر بات مجھے بتا سکتے ہو۔''

ربیکا کا کوئی دوست نہیں تھا جسے وہ اعتماد میں لے کر کچھ بتاتی۔ میکس مسلسل یہی سوچ رہا تھا کہ سین کو ٹونی کے ساتھ اس کے تعلق کا کیسے پتا چلا۔ وہ ایک علیحدہ کمرے میں تھے جہاں آس پاس کوئی اور نہیں تھا۔ کیا ٹونی نے ان کی ملاقات کے بارے میں اپنی کسی دوست کو بتا دیا تھا؟

ربیکا نے اس کے گال پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔ ''چلو۔ پہلے ہم ڈنر کرتے ہیں پھر تم مجھے اپنے مسائل بتانا۔''

''یہ بہت ہی اچھا ہوگا۔''

وہ پہلے ہی بہتر محسوس کر رہا تھا۔ ڈنر پر انہوں نے سین اور اس کی مشکل شخصیت کے بارے میں گفتگو کی۔ صفائی والی عورت اولیگا کے نہ آنے پر بھی ربیکا پریشان تھی۔ اس پر بھی بات ہوئی۔ گو کہ ان کے درمیان زبان کا مسئلہ تھا اس کے باوجود ربیکا اسے پسند کرتی تھی۔ ''وہ میری بہن کی طرح ہے۔ بہت ہی سچی اور کھری۔''

رات کو بستر پر لیٹتے ہوئے اس نے اپنے آپ کو قائل کیا کہ اسے اپنے مسائل کا حل تلاش کرنا چاہیے۔ ٹونی کا تصور بلائے بغیر اس کے دماغ میں آ گیا۔

اس نے جیسے ہی اپنا سر تکیے پر سے اٹھایا، ربیکا بولی۔ ''کیا وہ عورت ٹونی ہے؟''

''نہیں۔'' وہ کہہ سکتی تھی کہ میکس جھوٹ بول رہا ہے۔ وہ اندر کا حال جانتی تھی۔ وہ ایک کمپیوٹر ہیکر کی طرح تھی۔ میکس کو اسے ٹونی کے بارے میں بتا دینا چاہیے تھا۔

''جب تم سینٹ پیٹرک ڈے کی پارٹی سے واپس آئے تو مجھے تمہارے اندر سے اس کی مہک آ رہی تھی۔'' ربیکا ناراض نہیں بلکہ رنجیدہ نظر آ رہی تھی۔

''میں..... میں.....'' اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہے۔

''میکس! میں جانتی ہوں کہ تمہیں کیا چاہیے۔ ٹونی تمہیں خوش نہیں رکھ سکتی، جس طرح میں کرتی ہوں۔''

وہ اسے یقین دہانی نہیں کرا سکا۔ وہ بول نہیں سکتا تھا۔ الفاظ اس کے حلق میں پھنس کر رہ گئے تھے۔

''تم ہم دونوں کو ساتھ نہیں رکھ سکتے؟''

''میں جانتا ہوں۔'' میکس نے نرم لہجے میں کہا۔ ''مجھے افسوس ہے۔ تم ہر لحاظ سے مکمل تھیں۔''

وہ جانتی تھی کہ ان کا ساتھ ختم ہو چکا ہے اور پلک جھپکتے میں وہ چلی گئی۔

☆☆☆

ٹونی نے وہی کہانی دہرائی جس انداز میں اس نے اسے ترتیب دیا تھا۔ سپاٹ اور غیر جذباتی۔ حالانکہ وہ بھی ایک دکھاوا تھا۔ ماریا اسے اسکول کے زمانے سے جانتی تھی۔

''تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتیں۔ تمہیں اس شخص کی بہت پروا ہے۔ تم اس سے محبت کرتی ہو۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟''

ٹونی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''وہ شادی شدہ ہے۔''

''تمہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

ٹونی نے مشروب کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اعتراف ہے کہ مردوں کے معاملے میں میرا تجربہ کچھ خوشگوار نہیں ہے لیکن میکس..... ! وہ بالکل مختلف ہے۔''

کسی نے ریکارڈ پلیئر پر اسٹرنجر ان پیراڈائز لگا دیا۔ اسے سنتے ہی ٹونی پر جوش ہوگئی۔ ''میکس نے اشارہ دیا ہے کہ اس کی شادی زیادہ دیر قائم نہیں رہے گی۔ ممکن ہے کہ میرے دل میں ایسی خواہش ہو۔ اگر ہم یونہی ملتے رہے تو سین دونوں کو فارغ کر دے گا۔''

اس نے باقی ڈرنک حلق میں اتارا اور بارٹینڈر کو ایک اور گلاس لانے کا اشارہ کیا۔ اسے یہ بار پسند تھا۔ وہ ایک پُروقار جگہ تھی۔ شیلف میں شراب کی بوتلیں اور گلاس سلیقے سے رکھے ہوئے تھے۔

''میکس بہت پیارا ہے۔'' ٹونی نے کہا۔ کیا وہ ٹال رہی تھی؟ وہ زیادہ غور و فکر کے بعد اس سے بہتر الفاظ استعمال کر سکتی تھی۔ ''کمپنی کے بہت سے مرد بورنگ اور میل جول کے قابل نہیں۔ میکس ان سے مختلف ہے۔ وہ خوش شکل اور اپنے کام میں ماہر ہے۔ گو کہ تھوڑا سا تنہائی پسند ہے لیکن ٹیکنیکل لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ وہ کمپنی کی پارٹیاں پسند نہیں کرتا۔ گو کہ جانتا ہے کہ اسے ان میں شرکت کرنی پڑے گی۔ بہر حال میں اسے پسند کرتی ہوں اور یہی سچ ہے۔''

''اوہ! میں تمہاری دلچسپی محسوس کر سکتی ہوں۔'' ماریا نے کہا۔ ''تم اس کی بیوی کے بارے میں کیا جانتی ہو؟''

ٹونی نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا اور فرش پر رکھے ہوئے بیگ میں سے ایک فائل نکالی جس پر جلی حروف میں ''ربیکا'' لکھا ہوا تھا۔ ماریا نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

''تم کمپیوٹر کے لوگ ہر چیز تلاش کر سکتے ہو۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟''

ٹونی نے فائل کھولی۔ پہلے صفحے پر ربیکا کے ڈرائیونگ لائسنس کی فوٹو کاپی لگی ہوئی تھی۔ اس پر ایک پچیس سالہ لڑکی کی تصویر چسپاں تھی۔ اس کے بال براؤن، سادہ نقوش، براؤن آنکھیں، پتلے ہونٹ اور ٹھوڑی پر ایک گڑھا تھا۔

''ان کی شادی چار سال پہلے شکاگو میں ہوئی جہاں میکس ان دنوں کام کرتا تھا۔ وہ بک کیپر تھی۔'' اگلے صفحے پر ربیکا کا برتھ سرٹیفکیٹ اور میونسپل سیکورٹی کارڈ تھا۔

''اس نے لونگ آئی لینڈ آنے کے بعد ملازمت چھوڑ دی تھی۔''

''تمہارا کہنا ہے کہ وہ بہت کم گھر سے باہر جاتی ہے۔ ممکن ہے کہ وہ کھلے مقامات پر جانے سے ڈرتی ہو۔''

''میکس کا کہنا ہے کہ وہ بہت شرمیلی ہے۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ ان میں مکمل ہم آہنگی ہے یا مجھ پر فریفتہ ہونے سے پہلے وہ ایسا سمجھتا ہو۔'' پھر اس نے اپنے فون میں وقت دیکھا۔

''اوہ، بہت دیر ہوگئی۔ میں یہ ڈرنک ختم کر لوں پھر تم مجھے گھر چھوڑ دینا۔''

ماریا کے چہرے پر ایک بناوٹی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''میکس یہیں قریب ہی رہتا ہے، فیڈرل لین پر۔ میں نے اس کا گھر دیکھا ہے۔ چلو وہاں سے گزرتے ہیں۔''

''چھوڑو۔ ہم وہاں کیا دیکھیں گے۔ وہ اس وقت بستر میں ہوں گے۔ اس کے علاوہ میں کئی مرتبہ ویک اینڈ پر وہاں سے گزری ہوں۔ میں نے اس کی بیوی کو کبھی نہیں دیکھا۔'' وہ حیران ہوئی تھی کہ اس مکان میں کیا ہو رہا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ ربیکا کبھی نظر نہیں آئی۔

☆☆☆

میکس لیونگ روم میں اکیلا بیٹھا باہر سے آنے والی تیز ہوا کا شور سن رہا تھا۔ اس کے سامنے کافی کی میز پر مشروب کی بوتل رکھی ہوئی تھی اور اس کے ہاتھ میں آدھا بھرا ہوا گلاس تھا۔ وہ ایک اعتدال پسند شخص تھا اور کبھی کبھار تنہا بیٹھ کر ڈرنک کر لیا کرتا تھا۔ وہ اس تنہائی کا عادی تھا۔

''میں نے ایسا کیوں کیا؟'' اس نے اپنے آپ یا شاید ربیکا سے پوچھا۔

''تم جانتی ہو کہ اس کی وجہ سے مجھے کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا؟''

ربیکا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ یقیناً جا چکی تھی۔

''میں تنہا رہنا چاہتا تھا۔ اس احساس کے ساتھ کہ تم گھر پر میرا انتظار کر رہی ہو۔ میں اپنے آپ کو دوسری مصروفیات سے دور رکھ سکتا تھا۔ مجھے دفتر میں ہونے والے فلرٹ پسند نہیں تھے اور نہ ہی دفتر کی آوارہ لڑکیوں کے ساتھ تعلق رکھ سکتا تھا۔ کبھی احمق لوگ مجھے اپنے ساتھ بیئر پینے یا سوفٹ بال کھیلنے کے لیے لے جانا چاہتے تھے۔ تم نے مجھے ان سب سے بچایا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ تمہاری وجہ سے مجھے مالی طور پر بہت فائدہ ہوا۔ شادی شدہ ہونے کی وجہ سے مجھے دوسرے ملازمین کے مقابلے میں ڈیڑھ گنا تنخواہ ملتی تھی جس میں میرج الاؤنس، مکان کا کرایہ اور

تفریحی الاؤنس شامل تھا جس کی وجہ سے مجھے اپنے آپ کو شادی شدہ ظاہر کرنا پڑا۔ میرا خیال ہے کہ صرف اولیگا ہی جانتی تھی کہ میں کیا کر رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں بہت ہوشیار ہوں۔“

اس نے مشروب کا ایک اور گھونٹ لیا جس نے اس کے معدے میں آگ لگا دی۔ ”لیکن اب مجھے وہ مل گئی ہے جو زندگی سے بھرپور ہے اور اس نے میری زندگی بدل دی ہے۔“

اولیگا کے غائب ہوجانے کے بعد وہ صحیح معنوں میں تنہا ہوگیا تھا۔ وہ اس کے گھر کی صفائی کرتی اور اس کے بننے سنورنے میں مدد کرتی۔ اس کا تعلق مقامی روسی آبادی سے تھا جو بروکلین کے علاقے برائٹن بیچ میں آباد تھی۔ وہ علاقہ باہر کے لوگوں کے لیے نوگو ایریا تھا کیونکہ وہاں کئی جرائم پیشہ افراد غیر قانونی سرگرمیوں مثلاً منشیات کی خرید وفروخت، انسانی اسمگلنگ اور جوئے کے اڈے وغیرہ میں ملوث تھے۔ انہیں پوشیدہ رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ وہاں باہر کے لوگوں کو نہ آنے دیا جائے۔ کمپیوٹر کا ماہر ہونے کے باوجود میکس کے پاس کسی غیر قانونی تارکِ وطن کو تلاش کرنے کا کوئی طریقہ نہیں تھا۔ اولیگا نے اسے صرف اتنا بتایا تھا کہ ایک گروہ کا سرغنہ بریئو اسے امریکا لے کر آیا تھا۔

اولیگا کا غائب ہونا اس کے حق میں بہتر ثابت ہوا۔ اس کا مقصد پورا ہوگیا تھا۔ اس کی میز پر اولیگا کی ایک فریم شدہ تصویر رکھی ہوئی تھی۔ اسی طرح ریکا کے ڈرائیونگ لائسنس پر بھی اس کی تصویر چسپاں تھی۔ فائل میں بھی ریکا کے بجائے اسی کے فنگر پرنٹس تھے۔ ریکا کے جانے کے بعد اب اسے اولیگا کی ضرورت نہیں تھی۔

باہر سڑک پر ایک کار گزر رہی تھی۔ وہ ایک لمحے کے لیے رکی پھر آگے بڑھ گئی۔ اس نے گلاس ہاتھ میں پکڑتے ہوئے کہا، جیسے وہ مائیکروفون ہو۔ ”اب میری زندگی مختلف ہوگی۔ پہلے سے بہتر۔ پہلی بار مجھے کسی سے محبت ہوئی ہے۔“

اگلی صبح وہ مسکراتا ہوا ٹونی کے کیبن میں داخل ہوا۔

”اندازہ لگاؤ کہ میں کیا کہنے والا ہوں؟“

ٹونی کی آنکھیں سرخ ہورہی تھیں۔ اس کی نیند پوری نہیں ہوئی تھی یا اس نے بہت زیادہ شراب پی لی تھی۔ میکس جانتا تھا کہ اسے ڈرنک کرنا اچھا لگتا ہے۔

”میکس!“ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ سین ہمیں دیکھ سکتا ہے۔“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”سنو۔ میں کام کر رہی ہوں۔ پلیز! مجھے تنہا چھوڑ دو۔“

انمول موتی

دنیا۔ دنیا پر افسوس ہے۔ وہ تو گویا حزن وملال کے لیے بنائی گئی ہے۔ اے غافل انسان، دنیا سے تجھے کیا لینا۔ صرف نو گز کپڑا اور تین گز زمین۔

خبردار۔ اپنے رب کے سامنے اپنے بُرے اعمال کے کھوٹے سکے لے کر جانے کی جرأت نہ کرنا۔ تیرا رب تمام پرکھنے والوں سے زیادہ پرکھنے والا ہے۔

ہمت۔ کم ہمت اور بے حوصلہ لوگ مصائب سے جلد گھبرا جاتے ہیں لیکن عالی ہمت ان پر غالب آجاتے ہیں اور جس میں ہمت نہیں، وہ حرماں نصیب ہے۔

زمانہ۔ ہمیں زخمی کرتا ہے پھر ہماری چارہ گری بھی کرتا ہے۔ کبھی خوش بختی لاتا ہے، کبھی بدبختی لاتا ہے۔

نیکی۔ کسی کے ساتھ نیکی کرو لیکن صلہ نہ مانگو کیونکہ اصل نیکی وہ ہے جو بے غرض ہوکر کی جائے۔

قناعت۔ اصل قناعت یہ ہے کہ جو پاس ہو اس سے بے نیاز رہو اور جو پاس نہ ہو اس کی خواہش نہ کرو کیونکہ بیجا خواہش وہ بوری ہے جو کبھی بھی نہیں بھرتی۔

محبت۔ محبت کرو لیکن ان لوگوں سے کرو جو ناشکرے نہ ہوں۔

(مرسلہ: ریاض بٹ، حسن ابدال)

”وہ چلی گئی۔“ اس نے کہا۔ ”میرا مطلب ہے کہ ریکا جاچکی ہے۔“

ٹونی حیرت سے بولی۔ ”ریکا؟“

”ہاں، میں نے اسے تمہارے بارے میں بتایا تو وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔ ہماری علیحدگی ہوگئی ہے۔ میں بہت جلد اسے طلاق دے دوں گا۔“

وہ اسے گھورتے ہوئے بولی۔ ”کیا تم مذاق کر رہے ہو؟“

میکس کو اس ردعمل کی توقع نہیں تھی۔ وہ بے چین نظر آنے لگی۔ اس سے نظریں نہ ملا سکی۔

”یہ ہمارے حق میں بہتر ہوا۔“ میکس نے کہا۔ ”اب ہم آزادی سے مل سکتے ہیں۔“

”مجھے کام کرنا ہے۔ تمہاری شادی ختم ہونے کا افسوس ہوا۔“ اس نے سرد لہجے میں کہا۔

میکس اس کی آواز سن کر دنگ رہ گیا۔ وہ اپنی میز پر

TAGPK.COM

واپس آ گیا اور سوچنے لگا کہ وہ ایسا سلوک کیوں کر رہی تھی؟ اسے کیا ہو گیا ہے؟ اس نے دن کا بقیہ حصہ بے چینی کے عالم میں گزارا۔ اس کا کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔

تین بجے کے قریب اس نے دیکھا کہ ربیکا کی تصویر ابھی تک اس کی میز پر موجود ہے۔ وہ اپنی براؤن آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے فریم میں لگی ہوئی تصویر ردی کی ٹوکری میں پھینک دی۔ پانچ بجے چھٹی ہونے سے پہلے اس کے فون کی گھنٹی بجی۔ اس کا یہ نمبر کسی کے پاس نہیں تھا۔ اس فون پر وہ صرف ربیکا کی کال سنتا تھا۔ اس نے اسکرین پر دیکھا۔ ٹونی نے ایک پیغام بھیجا تھا۔ اسے یہ نمبر کیسے ملا؟ وہ ڈیٹا آپریشن میں تھی اس لیے کچھ بھی معلوم کر سکتی تھی۔ ''چھٹی کے بعد ملتے ہیں۔ مجھے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔''

یہ پیغام دیکھ کر میکس خوشی سے پاگل ہو گیا۔ اس کے خوابیدہ جذبات بیدار ہو گئے، آنکھوں میں چمک آ گئی، چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی جیسے اس کی لاٹری نکل آئی ہو۔ اس نے ٹونی کو جوابی پیغام بھیجا اور ملنے کی جگہ بتا دی۔

ان کی ملاقات بندرگاہ پر واقع ایک پرسکون ریستوران میں ہوئی۔ ٹونی دروازے کے پاس ہی ایک میز پر بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر اٹھی اور پُرجوش انداز میں اس سے لپٹ گئی۔

''میں صبح کے رویے پر معافی مانگتی ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''دراصل یہ سب غیر متوقع تھا اور مجھے اس کو سمجھنے میں کچھ وقت لگا۔''

''یہ اچھا ہوا۔ اب ہمارے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔''

اس کے بعد انہوں نے پُرتکلف ڈنر کیا اور اپنے پسندیدہ مشروب سے لطف اندوز ہونے لگے پھر الگ الگ کاروں میں فیڈرل لین کی طرف روانہ ہو گئے۔ میکس کے گھر میں وہ گیراج کے راستے اندر گئے اور بیڈروم میں جا کر ایک دوسرے میں گم ہو گئے۔ ٹونی کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا کہ وہ میکس کے ساتھ ربیکا کی جگہ اس کے بستر میں تھی۔

صبح وہ غسل کرنے باتھ روم گئی اور باہر آ کر بولی۔

''اس کی سب چیزیں غائب ہیں۔ صابن، شیمپو، ٹوتھ پیسٹ۔'' وہ تاریک بیڈروم میں برہنہ کھڑی تھی پھر اس نے الماری کا پٹ کھولا اور بولی۔ ''اس کے کپڑے بھی غائب ہیں۔ وہ اپنی سب چیزیں لے گئی ہے۔''

میکس نے اپنی الماری سے ایک بڑا تولیا نکال کر اسے دیا جسے اس نے اپنے جسم کے گرد لپیٹ لیا۔ ''اگر وہ واپس آ گئی؟ اس نے اپنا ذہن تبدیل کر لیا تو کیا ہو گا؟''

''وہ کبھی واپس نہیں آئے گی۔'' میکس نے اسے یقین دلایا۔

''گیراج میں ایک جیپ کھڑی ہے۔ کیا وہ اس کی نہیں ہے؟''

''اسے اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' میکس نے کہا اور سوچنے لگا کہ اسے جیپ کے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟ ضرور اس نے انشورنس ریکارڈ چیک کیا ہو گا۔

''میں یقین دلاتا ہوں کہ یہ شادی ختم ہو چکی ہے۔''

ٹونی اس کے بستر پر چڑھ کر بولی۔ ''یہ میرے نئے سفر کا آغاز ہے۔''

میکس اسے اپنے قریب کرتے ہوئے بولا۔ ''میں خوش قسمت ہوں۔''

''تم نے مجھے خوش کر دیا ہے۔'' ٹونی سرشاری کے عالم میں بولی۔

میکس نے محسوس کیا کہ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہا ہے۔ وہ اسے اپنی شادی کے بارے میں بتانا چاہ رہا تھا۔

''میرا خیال تھا کہ ربیکا میرے لیے موزوں تھی اور شاید ایسا ہی تھا۔ مجھے کسی عورت کی ضرورت تھی۔ میری زندگی میں کئی عورتیں آئیں جو تکلیف دہ، ضرورت مند اور متلون مزاج تھیں پھر ربیکا مجھے مل گئی۔ وہ بہت اچھی اور میرا خیال رکھنے والی تھی۔ میں نے سوچا کہ مجھے جو چاہیے تھا، وہ مل گیا۔ پھر تم مجھے مل گئیں، تب مجھے احساس ہوا کہ ربیکا تمہارے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھی۔''

ٹونی نے کچھ نہیں سنا۔ وہ اس کے سینے پر سر رکھ کر سو رہی تھی۔ اس کے خراٹوں کی آواز سن کر میکس نے قہقہہ لگایا۔ ربیکا کبھی خراٹے نہیں لیتی تھی۔

چھ ہفتے بعد وہ دونوں میکس کی کار میں دفتر جا رہے تھے۔ انہوں نے زیادہ وقت میکس کے گھر میں گزارا کیونکہ ٹونی کے فلیٹ میں بہت بے ترتیبی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ اولیگا غائب نہ ہوتی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ دوسری صفائی کرنے والی عورت کہاں ملے گی لیکن اس نے خود ہی گھر کو صاف ستھرا رکھا ہوا تھا۔

''آج بیئر پینے کا موڈ ہے۔'' ٹونی نے کہا۔ وہ میکس کے برابر بیٹھی اس کی ران سہلا رہی تھی۔ میکس کو اچھا لگا۔ اب اس کا رویہ بہتر ہو گیا تھا ورنہ صبح وہ اس پر ناراض ہو رہا تھا کہ جلدی کار میں بیٹھ جائیں کیونکہ انہیں کام پر جانے میں

ملک بھر میں جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ملنے میں اگر دشواری ہے تو مندرجہ ذیل نمبرز پر ہمارے نمائندوں سے رابطہ کیجیے۔

کراچی	03002680248	گجرات	03016215229	منڈی بہاؤالدین	03460827027
لاہور	03004009578	وزیرآباد	03456892591	سیالکوٹ	0524568440
ملتان	03006301461	لالہ موسیٰ	03216203640	میرپور AK	03460397119
[illegible]	03213060477	خانپور	03337472654	اٹک سٹی	057210003
[illegible]	03447475344	کوہاٹ	03325465062	دیپالپور	03004059957
[illegible]	03005930230	ساہیوال	03446804050	لیہ	03002373988
[illegible]	03337805247	پاک پتن	03006946782	قصبہ ڈنگہ	03083360600
فیصل آباد	03006698022	مظفرآباد	03469616224	عارف والا	03008758799
راولپنڈی	03335205014	بوروالہ	03347193958	لورالائی	03023844266
نواب شاہ	03003223414	وہاڑی	03136844650	کوٹلہ ارب علی خان	03016299433
سکھر	03009313528	تونسہ شریف	03346712400	جلالپور پیروالا	03338303131
رحیم یارخان	03055872626	ڈیرہ غازی خان	03336481953	ہری پور	03321905703
بہاولپور	0622730455	بہاولنگر	03336320766	چکوال	03348761952
گوجرانوالہ	03316667828	بنوں شہر	03329776400	وہوا	03346383400
جہلم	03235777931	رائے ونڈ	03004719056	حافظ آباد	03006885976
سیالکوٹ	03008711949	ہڑپہ	03317400678	کوہاٹ	03325465062
جھنگ	0477626420	ڈیرہ اسماعیل خان	03349738040	ایبٹ آباد	0992335847
بھکر	03337979701	چشتیاں	03348761952	چوکی	03454678832
منڈی بہاؤالدین	0331-7619788	منچن آباد	0301-7681279	مانسہرہ	0333-5021421
ڈسکہ	0300-9463975	سمبڑیال	0333-8604306	کوٹ رادھا کشن	03004992290
حجرہ شاہ مقیم	03006969881	ٹوبہ ٹیک سنگھ	0315-6565459	قصور	0300-6575020

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63، فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، مین کورنگی روڈ، کراچی فون: 35895313

E-mail:jdpgroup@hotmail.com

TAGPK.COM

دیر ہو رہی تھی۔ بہت زیادہ شراب پینے کے بعد وہ سست ہو جاتی تھی اور وہ اسے سنبھالنے کی کوشش کرتا تھا۔

''سین ہمیں ایک ساتھ دیکھ کر غصے سے پاگل ہو جائے گا۔'' ٹونی نے کہا۔

میکس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بوسہ دیا۔ ''فکر نہ کرو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

جب اس نے پارکنگ لاٹ کی طرف گاڑی موڑی تو اسے دفتر کے داخلی دروازے کے باہر کاؤنٹی پولیس کی تین گاڑیاں کھڑی ہوئی نظر آئیں۔ کچھ باوردی پولیس والے دروازے کے قریب کھڑے ہوئے تھے۔

''یہاں کیا ہو رہا ہے؟'' ٹونی نے وہاں ... موجود ایک ملازم سے پوچھا۔

''مجھے نہیں معلوم۔'' اس لڑکی نے اپنا مختصر اسکرٹ درست کرنے کی کوشش کی۔ ''شاید کسی نے بم سے اڑانے کی دھمکی دی ہو۔''

''کیوں؟ کمپنی نے تو حالیہ دنوں میں کسی کو نہیں نکالا۔''

جب وہ بیرونی دروازے پر پہنچے تو پولیس والوں نے میکس کو گھیر لیا۔ سادہ لباس میں ایک پولیس آفیسر نے اپنا تعارف سراغ رساں فرینک کے طور پر کرایا اور میکس سے اس کا نام پوچھا۔

''اوکے مسٹر ونٹرز! تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔ تم سے کچھ پوچھ گچھ کرنی ہے۔''

میکس کے پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگے۔ ''کس سلسلے میں؟''

''ہمیں تمہاری بیوی کی لاش ملی ہے۔''

میکس کو لگا کہ وہ گہرے پانی میں ڈوبتا جا رہا ہے۔

''کیا؟'' اسے اپنی آواز سمندر کی تہ سے آتی محسوس ہوئی۔

وہ آہستہ سے ٹونی کی جانب مڑا۔ اس نے سرد مہری سے اسے دیکھا۔

سین بھی باہر آ گیا۔ ''کیا تم نے اپنی بیوی کو قتل کر دیا ونٹرز؟''

''کیا؟'' میکس نے دوبارہ کہا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ کئی پولیس والوں نے اسے زبردستی اسکواڈ کار میں بٹھا دیا اور تمام گاڑیاں وہاں سے روانہ ہو گئیں۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' اس نے سراغ رساں فرینک سے پوچھا جو پچھلی سیٹ پر اس کے ساتھ ہی بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

پولیس اسٹیشن پہنچ کر اسے ایک کمرے میں لوہے کی میز پر بٹھا دیا گیا جہاں اسے ڈیڑھ گھنٹے انتظار کرنا پڑا پھر کمرے کا دروازہ کھلا اور فرینک اس کے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔ دو باوردی پولیس والے دیوار کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ سراغ رساں نے ایک بڑے سائز کی تصویر اس کے سامنے رکھی۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ یہ ربیکا ہے۔

اس تصویر میں ایک عورت کی مسخ شدہ لاش نظر آ رہی تھی۔ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے اور وہ کیچڑ میں لت پت گھاس پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے گلے میں چیرا لگایا گیا تھا اور اس کے نیچے زمین سیاہ ہو گئی تھی۔ اس کا پھولا ہوا جسم اور مسخ شدہ چہرے کی وجہ سے اس کی شناخت ناممکن تھی۔ میکس نے اس تصویر کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ اس کی ٹھوڑی پر ڈمپل اور آنکھیں بہت قریب تھیں۔

''یہ تمہاری بیوی ہے مسٹر ونٹرز! اس کی لاش گزشتہ روز پرندے دیکھنے والوں کو گریٹ ساؤتھ بے میں ملی۔ یہ وہاں تین ہفتوں سے پڑی ہوئی تھی اور جانور اسے نوچ رہے تھے۔ ہمیں یقین نہیں کہ تم نے اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرائی ہوگی۔''

''اولیگا!'' اس نے نیچی آواز میں کہا۔

''اس کی انگلیوں کے نشانات وہی ہیں جو اس نے شکاگو میں ملازمت کے وقت ریکارڈ کرائے۔''

''بالکل۔''

''میں تمہیں سن نہیں سکتا۔ تم اونچی آواز میں بولو۔'' فرینک نے فوٹو پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں بتاؤ کہ کیا ہوا تھا مسٹر ونٹرز!''

میکس نے سوچا کہ وہ وکیل کو بلانے کے لیے کہے لیکن پولیس کو غلط فہمی ہو گئی تھی۔ اسے اس غلطی کی نشاندہی کرنا تھی۔

''میں نہیں جانتا کہ کیا ہوا۔ یہ میری بیوی نہیں ہے۔''

فرینک تیوری چڑھاتے ہوئے بولا۔ ''یہ تمہاری بیوی نہیں ہے؟ ہم نے تمہارے گھر کی تلاشی لی ہے۔ اس کی انگلیوں کے نشانات اب بھی وہاں موجود ہیں۔ اس کی لاش کے پاس تمہارے گھر کی چابیاں ملی ہیں جس کے ٹیگ پر تمہارا نام اور پتا لکھا ہوا ہے اور تم کہتے ہو کہ یہ تمہاری بیوی نہیں ہے؟''

''تم..... تم نہیں سمجھ رہے۔ میں نے اسے بنایا تھا۔ میری شادی نہیں ہوئی۔''

''ہمارے پاس تمہارے میرج سرٹیفکیٹ کی کاپی ہے اور تمہارے ٹیکس گوشوارے اور دیگر قانونی دستاویزات سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تمہاری بیوی تھی۔ ربیکا ونٹرز!''

''لیکن وہ کاغذات جعلی ہیں۔ آج کل یہ بہت

آسان ہے۔

''اس کی موت چھ ہفتے پہلے ہوئی جب تم نے اس عورت کو کام پر رکھا جو بہت پرکشش تھی۔ تمہیں کون الزام دے سکتا ہے؟''

''میں جانتا ہوں جب ٹونی میری زندگی میں آئی تو میں نے اسے بتایا کہ ربیکا مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔ میں نے ہر ایک سے یہی کہا۔ اصل حقیقت یہ تھی کہ میں نے ہی اسے غائب کیا۔ دراصل اس کا پہلے سے کوئی وجود نہیں تھا۔''

''اوہ نہیں۔ پھر انگلیوں کے نشانات اور چابیوں کے بارے میں کیا کہو گے؟''

''وہ مرنے والی عورت ہماری ملازمہ اولیگا ہے۔ میں نے اس کی تصویر اور انگلیوں کے نشانات ربیکا کے نام پر استعمال کیے۔ ہاں اس کے پاس میرے مکان کی چابیاں ہوتی تھیں۔''

''اولیگا.....! کیا تم اس کا پورا نام اور پتا بتا سکتے ہو؟'' فرینک نے کہا۔

''نہیں..... اس کے پاس ایک پری پیڈ سیل فون تھا لیکن اس نے بھی کام کرنا چھوڑ دیا۔ اس سے رابطہ کرنے کا وہی واحد ذریعہ تھا۔ اس کا کسی نہ کسی طرح روسی گینگسٹرز سے تعلق تھا۔ وہ یہاں غیر قانونی طور پر رہ رہی تھی۔ یقیناً انہوں نے ہی اسے قتل کیا ہوگا۔''

''اوہ، روسی جرائم پیشہ؟ دفتر کے لوگوں کا کہنا ہے کہ تمہاری بیوی دن میں کئی مرتبہ تمہیں فون کیا کرتی تھی۔ کیا وہ اولیگا تھی؟''

''نہیں۔ وہ میں ہی کرتا تھا۔ میں اپنے آئی فون سے دفتر کے نمبر پر فون کرتا۔ یکطرفہ کال۔ میں چاہتا تھا کہ لوگ مجھے بیوی سے باتیں کرتے ہوئے سنیں۔''

''تم نے ایسا کیوں کیا؟''

''ربیکا کا فرضی کردار تخلیق کرنے سے مجھے بہت آسانی ہوگئی تھی۔ اس نے مجھے دوسرے لوگوں کے ساتھ تعلق قائم کرنے سے بچالیا۔ ان میں وہ لڑکیاں شامل تھیں جو مجھ سے فلرٹ کرتیں اور وہ کولیگ جو مجھے تفریح کے لیے لے جانا چاہتے تھے۔ میرے پاس ان فضول کاموں کے لیے وقت نہیں تھا۔ میں یہ ظاہر کرنے کے لیے اسے فون کرتا جیسے وہ گھر پر ہے۔ یہ کھیل میں اپنے ساتھ ہی کھیل رہا تھا۔ کبھی کبھی تو مجھے یقین آنے لگتا کہ وہ ایک حقیقت ہے۔ جو کچھ میں نے کہا، یہی سچ ہے۔''

فرینک نے دوسرے آفیسرز کی طرف دیکھا۔ ان کے چہروں پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے میکس پر نظریں جمادیں۔ ''ہم نے سنا ہے کہ تم بہت اسمارٹ ہو۔ کیا تمہیں اندازہ ہے کہ تم کتنی بڑی مشکل میں پھنس گئے ہو؟''

ایک باوردی پولیس آفیسر نے میکس کے سامنے قلم اور پیڈ رکھ دیا۔ فرینک نے کہا۔ ''مسٹر ونٹرز! تم لکھ کیوں نہیں دیتے کہ تم نے ربیکا کے ساتھ کیا کیا اور کیوں؟ مجھے یقین ہے کہ تمہارے پاس اس کو قتل کرنے کی وجوہات ہوں گی۔''

میکس چلّاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔ ربیکا کا کوئی وجود نہیں ہے پھر میں کسے قتل کرتا؟''

فرینک کھڑا ہوگیا اور اپنا ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولا۔ ''خاموش ہوجاؤ۔ تم اپنا کیس خراب کررہے ہو۔'' وہ دروازے پر گیا اور اسے کھول دیا۔

میکس نے چلانا بند کردیا لیکن بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''میں نے ربیکا کو تخلیق کیا تھا۔ میں بے گناہ ہوں اور اسے ثابت کرسکتا ہوں۔ وہ ایک فریب تھا۔ کیا تم لوگ یہ بات نہیں سمجھ سکتے؟''

''ہم صرف یہ سمجھ سکتے ہیں مسٹر ونٹرز کہ تمہارے حق میں یہی بہتر ہے کہ تم ہمیں سچ بتادو۔''

کھلے ہوئے دروازے سے میکس نے دیکھا کہ ٹونی ایک لیڈی سراغ رساں کے ساتھ جارہی ہے۔ وہ رکی اور میکس کو دیکھ کر اس نے منہ پھیرلیا۔ خاتون سراغ رساں نے اس کا بازو پکڑلیا۔

''ٹونی! یقین کرو کہ میں نے کچھ نہیں کیا۔ کیا تم بھی یقین نہیں کروگی؟'' وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی اور اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔

میکس دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اپنی بے گناہی ثابت نہیں کرسکتا لیکن وہ پولیس اسٹیشن میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک ایسے جرم کی پاداش میں جو اس نے کیا ہی نہیں تھا۔

میکس نے اپنا سر لوہے کی میز پر رکھا۔ اس کے کندھوں میں لرزش شروع ہوئی تو فرینک نے اس کی طرف ٹشو پیپر کا باکس بڑھادیا لیکن جب میکس نے اپنا سر اٹھایا تو وہ رو نہیں رہا تھا بلکہ قہقہے لگا رہا تھا۔

''میں واقعی اسمارٹ ہوں۔'' وہ ہسٹریائی انداز میں بولا۔ ''بہت زیادہ ہوشیار۔'' پھر اس کے قہقہے رک گئے اور اس نے دیوار پر نظریں جمادیں۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اسے ہوشیار ہونے کی اتنی بڑی قیمت ادا کرنا ہوگی۔

⌘⌘⌘

سنہری یادوں کا سفر

یادیں سدا انسان کے ساتھ رہتی ہیں چاہے وہ خوشگوار ہوں یا

ناخوشگوار...... کبھی یہ دل میں کسک جگاتی ہیں تو کبھی امید کی کرنیں

پھیلاتی ہیں...... ایسی ہی خوب صورت باتوں اور حسین یادوں کا

ایک سفر آج سے تقریباً پچاس سال پہلے

گھر کے ہر فرد کے لئے

ماہنامہ

پاکیزہ

کراچی

کی صورت شروع ہوا۔ پاپولر ادب کی دنیا میں ایک قندیل روشن ہوئی جو دست بدست چلتی نکھرے اور معطر اجالوں کی پیامبر بنی...... بقول حبیب جالب

اسے بجھا نہ سکے گی ہوا زمانے کی
جلا چلے ہیں لہو سے جو ہم چراغِ سحر

الحمدللہ ہم اب گولڈن جوبلی کی طرف گامزن ہیں

انہی سنہری یادوں میں آپ کا بھی روپہلا اور سنہرا خوب صورت سا حصہ کتنا ہے؟ ہمیں بھی بتائیں...... یہ سلسلہ آپ جیسے باذوق قارئین ہی کے لیے تو ہے۔

1...... ماہنامہ پاکیزہ سے پہلا تعارف......؟

2...... پاکیزہ تحریروں سے کوئی تین ایسی باتیں کیا سیکھیں جو آج بھی زندگی کا حصہ ہیں......؟

3...... سینئر یا دورِ حاضر کے پسندیدہ قلم کار کہ جن کی تحریریں پڑھنے کو آج بھی بے چین رہتی ہیں......؟

4...... کوئی فرمائشی سلسلہ ہے تو ضرور بتائیں۔

TAGPK.COM

قسط :24

زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تندوتیز آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنونِ حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابلِ شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے والے اس پُرعزم نوجوان کو حرفِ غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جارہے تھے... اس کی زندگی جو المیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... بے خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قراریوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تارِ عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چُور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ ہر وار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ وارداتِ قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہو سکی...

اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی حیرت انگیز داستان

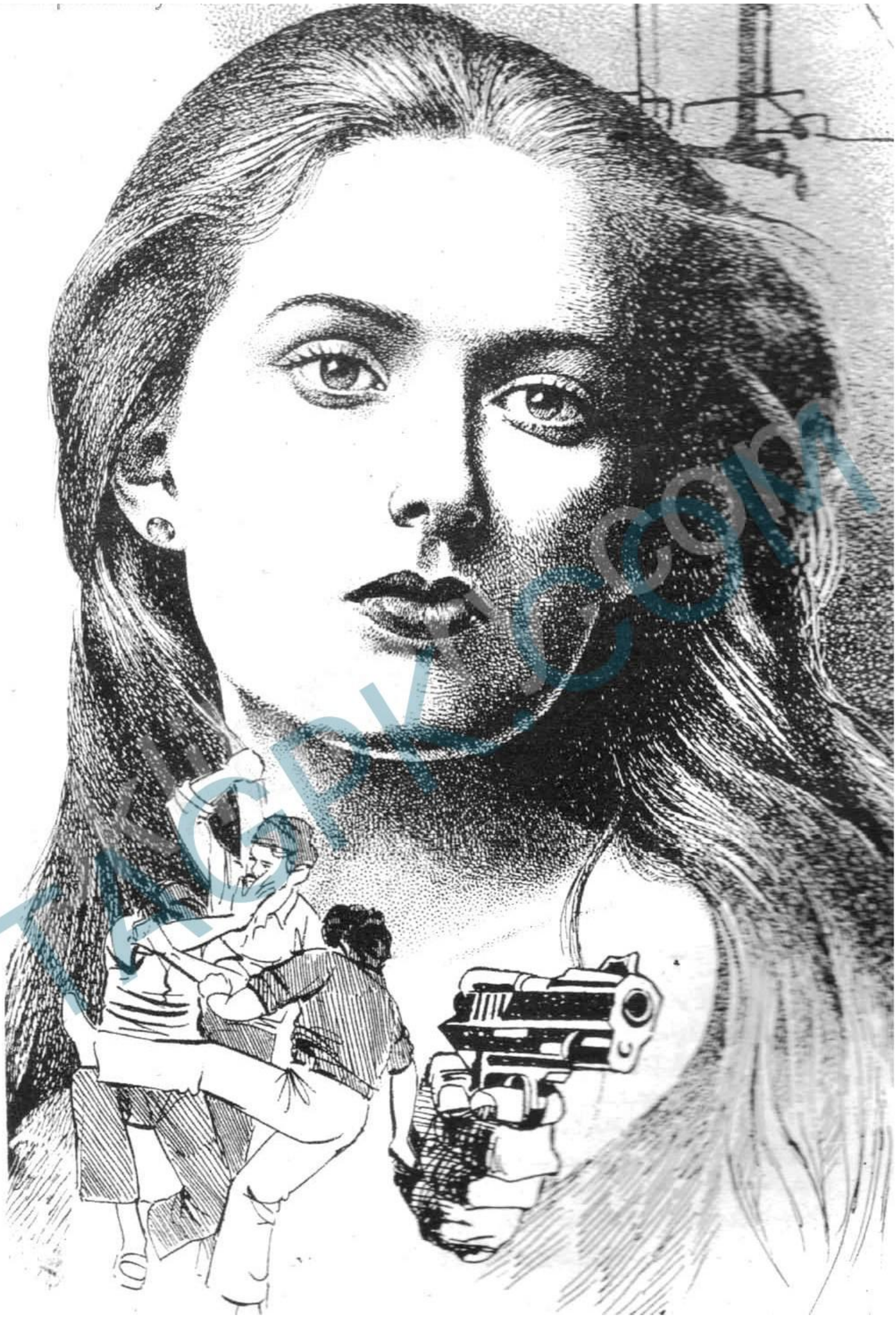

معاذ ایک ذہین لیکن متلون مزاج لڑکا یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارشل آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک ادارہ جوائن کیا ہوا ہے۔ معاذ کے والد سرکاری افسر ہیں اور اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ ایک شام معاذ انسٹی ٹیوٹ سے واپس آرہا تھا تو وہ چند لڑکوں کو سڑک پر کھڑی ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ لڑکی یونیورسٹی ہی میں پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ اپنی نڈر فطرت کے باعث وہ اس معاملے میں کود پڑتا ہے اور بشریٰ نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ بشریٰ ماس کمیونی کیشن کی طالبہ ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم وغیرہ لکھتی ہے۔ اس ویران جگہ بھی وہ ایک زیر تعمیر رہائشی منصوبے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہی آئی تھی۔ معاذ بشریٰ کو بہ حفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے اور خود اس واقعے کو فراموش کر دیتا ہے لیکن جن رئیس زادوں سے اس نے ان کا شکار چھینا تھا، وہ اس واقعے کو فراموش نہیں کرتے اور موقعے کی تلاش میں رہتے ہیں۔ یہ موقع انہیں یونیورسٹی ٹرپ کی صورت میں مل جاتا ہے اور ایک جنگل کی سیر کے دوران وہ فوٹو گرافی کے شوق میں سب سے الگ تھلگ ہوجانے والے معاذ کو بے خبری میں گھیر کر بری طرح زدوکوب کرتے ہیں اور بلندی سے اسے دھکا دے دیتے ہیں۔ معاذ کے واپس نہ آنے پر انتظامیہ کے افراد، پولیس اور ریسکیو ذرائع کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر معاذ کو ہوش آتا ہے تو وہ خود کو ایک جوگی کی جھونپڑی میں پاتا ہے۔ اپنی حالت سے اسے اپنے شدید زخمی ہونے کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ جوگی اپنی خاص جڑی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ معاذ کا موبائل جنگل میں ہی کہیں گر جاتا ہے اور جوگی کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا جس سے باہر کی دنیا سے رابطہ کیا جاسکے۔ وہاں رہتے ہوئے جوگی کی شخصیت اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے۔ جوگی بھی اسے پسند کرنے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں قدرت کچھ خاص صلاحیتوں سے نواز کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ معاذ سے خاصی بات چیت کے بعد وہ اسے پراسرار علم سکھانے کی ہامی بھر لیتا ہے اور معاذ واقعی اس سے یہ علم سیکھنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ ادھر جائے وقوعہ سے ملنے والے معاذ کے کیمرے سے جب تصویریں نکلوائی جاتی ہیں تو بہت سے قدرتی مناظر کی تصویروں میں سے ایک ایسی تصویر بشریٰ کی نظر میں آجاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے پیچھے سے ایک چہرہ جھانکتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ کافی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی لڑکا ہوتا ہے جو اس کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اصل میں وہ لڑکا کامران اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے پروجیکٹ کے غیر قانونی ہونے کے سلسلے میں بشریٰ تحقیق کر رہی تھی۔ بشریٰ کے اپنے والد جرنلسٹ ہوتے ہیں اور حق گوئی ان کے خون میں شامل تھی۔ اس انکشاف کے بعد وہ پولیس سے رابطہ کرتی ہے۔ اس کی پاداش میں بشریٰ کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بے آبرو کر کے مار دیا جاتا ہے جبکہ باپ صدمے سے جان دے دیتا ہے۔ اس سب میں باذل نامی غنڈے کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بشریٰ انتقام لینے کی ٹھان لیتی ہے۔ ان تکلیف دہ دنوں میں ہی معاذ واپسی کا ارادہ کرتا ہے تاہم دوسرے ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ ڈاکو اسے پہچان کر اس کا سودا عرفان اللہ اور یزدانی سے کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ کو وقاص نامی ایک لڑکا وہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ ادھر باذل اچانک بشریٰ کو چھاپ لیتا ہے اور اسے بے آبرو کر دیتا ہے۔ معاذ کو واپس لانے کے لیے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہوئے اس کے بھائی کو اغوا کرلیا جاتا ہے اور اسے واپس آنے کا پیغام دیا جاتا ہے۔ معاذ دشمنوں کے پاس خود حاضر ہوجاتا ہے۔ وہ لوگ کسی دوسری پارٹی سے اس کا سودا کر کے اسے ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ قید میں معاذ سے معلومات لی جاتی ہیں، نہ بتانے پر اس کے بھائی کا ایک گردہ نکال لیا جاتا ہے۔ مجبوراً معاذ کو سب بتانا پڑتا ہے۔ ادھر بشریٰ بھی انتقام کی آگ میں جلتی ہوئی سونیا خان سے مل جاتی ہے اور اس کی ٹریننگ شروع ہوجاتی ہے۔ معاذ کو بچانے والا لڑکا وقاص اپنے گرو کے ساتھ ایک پارٹی میں جاتا ہے۔ وہاں اسے معاذ کے حوالے سے مشکوک ایک شخص نظر آتا ہے۔ وہ اس کے پیچھے جاتا ہے مگر اسے گھیر لیا جاتا ہے۔ بہرحال وقاص کو تنبیہہ کے ساتھ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ادھر معاذ کے دوست عالم شاہ کے بہنوئی کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ کئی فنون میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ اسے ہپناٹائز کر کے اس کے دماغ پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم وہ فیضو سے حاصل انوکھے علم کی بدولت ان کا معمول نہیں بنتا۔ بشریٰ، کامران کو چھاپنے کا پروگرام بناتی ہے۔ ادھر عالم شاہ سراغ لگا لیتا ہے کہ اس کے بہنوئی کا قتل کس نے کیا۔ وہ قاتل کو گھیرتا ہے اور اپنے تئیں اسے گولیاں مار کر قتل کر دیتا ہے۔ تاہم وہ بچ جاتا ہے۔ عالم شاہ اس کے بعد ڈاکوؤں کے سردار چاچڑ کو چھاپتا ہے اور اسے کیفر کردار تک پہنچاتا ہے۔ اس کے پیچھے پولیس لگ جاتی ہے۔ عالم شاہ اور اس کا نوکر سرمد، باذل کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ ادھر معاذ جاسوس ماتھر کو ہپناٹائز کر کے اس کے ذریعے اسے نکالنے والوں پر حملہ کروا دیتا ہے تاہم ان کی فائرنگ سے ماتھر مارا جاتا ہے اور الزام معاذ پر نہیں آتا مگر معاذ سے کام لینے والوں کو اس پر شک گزرتا ہے۔ عالم کی بہن سجل شاہ کے نومولود بیٹے کو اغوا کرلیا جاتا ہے اور اغوا کا الزام لطیف سومرو پر آتا ہے۔ عالم

شاہ وہاں موجود ایک زخمی شخص کی مدد سے باذل کی قید سے چھٹکارا پالیتا ہے۔ ادھر بشریٰ دبئی پہنچ جاتی ہے۔ وہاں وقاص اسے باربی کے روپ میں پہچان لیتا ہے اور ان دونوں کے درمیان اعتماد کا رشتہ قائم ہوجاتا ہے۔ وہ سلطان کو مارنا چاہتی ہے تاہم وقاص اسے ایسا کرنے سے روکتا ہے۔ ادھر عالم شاہ، باذل کی قید سے نکل کر اس کا پیچھا کرتا ہے تاہم وہاں اچانک فائرنگ اور دھماکے ہونے لگتے ہیں۔ وہ وہاں معاذ کو دیکھتا ہے۔ صداقت شاہ، لطیف سومرو کو گھیرنے کے لیے اس کی خفیہ بیوی اور بچے کا کھوج لگاتے ہیں اور بچے کو اغوا کرلیتے ہیں۔ لطیف سومرو مجبور ہوجاتا ہے۔ معاذ کو اس کے گھر والوں سے ملنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ عالم شاہ کو اس کے والد انڈیا روانگی کا عندیہ دیتے ہیں۔ ادھر معاذ بھی ایک مشن پر سونیا کے ساتھ انڈیا روانہ ہوتا ہے تاہم کچھ لوگ سکھ یاتریوں سے بھری بس کو یرغمال بنالیتے ہیں۔ معاذ اور سونیا تہ خانے کے تمام افراد کو ٹھکانے لگادیتے ہیں تاہم باہر موجود دیگر اغوا کاروں سے مقابلہ ہوتا ہے اور معاذ زخمی ہوجاتا ہے۔ صداقت شاہ کے انڈیا میں موجود رشتے دار کے ہاں شادی ہوتی ہے۔ عالم شاہ، سجل اور سرمد انڈیا روانہ ہوجاتے ہیں۔ ائرپورٹ سے گھر روانگی پر راستے میں کچھ لٹیرے انہیں لوٹ لیتے ہیں۔ عالم شاہ ایکشن میں آنا چاہتا ہے تاہم اجالا نامی عالم شاہ کی کزن اس کا راستہ روک لیتی ہے۔ گھر پہنچنے پر پولیس کی ریڈ ہوتی ہے اور وہ عالم شاہ اور سرمد کو لے جاتے ہیں۔ ادھر بشریٰ اور وقاص باذل کو اسپتال میں مارنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ بچ جاتا ہے۔ معاذ اور سونیا پناہ کی تلاش میں ہوتے ہیں اور بالآخر اپنے سہولت کاروں سے مل جاتے ہیں۔ عالم شاہ اور سرمد کو تشدد کا نشانہ بنا کر ویرانے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ وہ لوگ واپس اپنے میزبانوں کے ہاں پہنچ جاتے ہیں۔ شادی کے دوران انہیں پتا لگتا ہے کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں اجالا اور اس کا عاشق شامل ہوتے ہیں۔ وہ چھپ کر ان کی باتیں سن رہا ہوتا ہے کہ اسے چھاپ لیا جاتا ہے۔ تاہم وہاں مارا ماری ہوتی ہے اور اجالا کا عاشق مارا جاتا ہے۔ پولیس ان کے پیچھے پڑجاتی ہے۔ ان کے کزن انہیں اپنے دوسرے خفیہ بنگلے پر پہنچادیتے ہیں جہاں کچھ لوگ ان پر حملہ کردیتے ہیں۔ وہ وہاں سے بحفاظت نکل جاتے ہیں۔ ادھر معاذ کو سونیا اپنے ساتھ نئے مشن پر لے کر جاتی ہے جس میں ایک ریلوے لائن کو دھماکے سے اڑانا ہوتا ہے۔ معاذ ایسا نہیں چاہتا اس لیے وہ ٹرین کی آمد سے قبل بارودی دھماکا کردیتا ہے۔ وہ زخمی ہوجاتا ہے اور اسے ہندو سادھو اپنی کٹیا میں لے جاتا ہے جہاں اس کی اچھی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ سونیا کے آدمی معاذ کو تلاش کرتے ہیں مگر ناکام ہوجاتے ہیں۔ ادھر عالم شاہ اور سرمد خفیہ ذریعے سے بارڈر پار کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ دھر لیے جاتے ہیں اور ''را'' کی قید میں پہنچ جاتے ہیں۔ انہیں تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ ادھر بشریٰ باذل کو مارنے کی کوشش میں خود نشانہ بن جاتی ہے۔ معاذ سادھو کی مدد سے ایک انڈین ہیروئن کے گھر پہنچ جاتا ہے۔ وہیں اسے عالم اور سرمد کی گرفتاری کا پتا چلتا ہے۔ ادھر سجل کو اس کا شوہر ذہنی اذیت دیتا ہے۔ معاذ ڈاکٹر فردوس سے ملتا ہے اور اسے سجل کی مدد کرنے کا کہتا ہے۔ عالم اور سرمد قید سے فرار کا سوچتے ہیں اور دھر لیے جاتے ہیں جس کی پاداش میں انہیں مزید تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ معاذ، وشنا کے ذریعے عالم اور سرمد کو رہائی دلوانا چاہتا ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ اس کا پیچھا کرتا ہے تاہم وشنا کی گاڑی حادثے کا شکار ہوجاتی ہے۔ علینہ اور وقاص وغیرہ کو لالہ عیسیٰ ملک سے باہر نکال دیتا ہے اور ہر ممکن احتیاط کی ہدایت کرتا ہے لیکن علینہ پاکستان میں ثوبیہ سے رابطہ کرتی ہے جو ان کے لیے مصیبت بن جاتا ہے۔ ثوبیہ پر تیزاب پھینک دیا جاتا ہے۔ ادھر معاذ، سجل کے لیے پریشان ہوتا ہے اور اسے وہاں سے نکالنا چاہتا ہے۔ معاذ، وکرم نامی شخص کے خلاف کارروائی کرتا ہے مگر خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ ادھر وقاص، علینہ اور اس کے گھر والوں کو مار دیا جاتا ہے۔ معاذ سمجاش نامی شخص کے خلاف کارروائی کرتا ہے تاہم وہ مارا جاتا ہے اور معاذ بھی زخمی ہوجاتا ہے اور اپنا نشان وہاں چھوڑ دیتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس معاذ کو دیوانا نامی شخص سے مدد لینے کا کہتی ہے۔ معاذ اس کے ساتھ مل کر موہن نامی ''را'' کے ایجنٹ کو اغوا کرتا ہے تاہم ٹھکانے پر پہنچ کر کمرے میں داخل ہونے پر کوئی اس کے سر پر ریوالور کی نال رکھ دیتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

''کون..... کون ہو تم؟'' وہ اندھیرے کمرے میں کنپٹی سے لگی پسٹل کی زد میں کھڑا تھا پھر بھی لہجے کو پُرسکون رکھتے ہوئے سوال کیا۔

''دیوا کے ٹھکانے پر دشمن تو تمہیں مل نہیں سکتا۔'' یکدم ہی لائٹ جل گئی اور دیوا ہنستا ہوا اس کے سامنے آگیا۔

''اچھا، تو یہ آپ ہیں۔'' وہ جواباً فقط اتنا ہی کہہ سکا۔ حقیقتاً اسے یہ سب بہت عجیب لگا تھا۔ دیوا کی جو حیثیت تھی اس کے مطابق اس سے ایسے بچکانہ مذاق کی امید نہیں رکھی جاسکتی تھی۔

''ایسے ہی تمہاری بہادری کا امتحان لے رہا تھا۔'' دیوا نے آرام سے کہا اور خود کمرے میں رکھے صوفے کی طرف بڑھ گیا۔

''امتحان میں پاس ہوا ہوں یا فیل؟'' معاذ نے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائی۔

''سو فیصد پاس ہو بابا۔'' اس نے ایک بار پھر قہقہہ لگایا لیکن نہ جانے کیوں معاذ کو اس کا یہ انداز مصنوعی لگا۔

''کس سوچ میں پڑ گئے؟ آؤ، یہاں بیٹھو۔ تھوڑی گپ شپ لگاتے ہیں۔'' دیوا نے اس کے انداز کو محسوس کیا اور نرم لہجے میں اپنے ساتھ بیٹھنے کی دعوت دی۔

''ٹینشن مت لو۔ کام چل پڑا ہے۔ جلد کوئی اچھی خبر سنو گے۔'' معاذ اس کے مقابل بیٹھ گیا تو اس نے اسے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔

''موہن سے انفارمیشن اگلوالیں گے آپ؟ سنا ہے یہ ایجنٹس بڑے سخت جان ہوتے ہیں۔ جان دے دیتے ہیں، زبان نہیں کھولتے۔ پھر اس کا غیاب بھی مسئلہ بن سکتا ہے۔ کہیں وہ لوگ چوکنے نہ ہو جائیں۔'' اس نے دیوا کے رویے کو ذہن سے جھٹکا اور موہن سے متعلق اپنے خدشات بیان کرنے لگا۔

''ہم نے اس کی زبان کھلوانی ہی کب ہے۔ اس کی زبان تو اس کی پتنی کھلوائے گی۔''

''کیا مطلب؟'' اسے دیوا کے جواب نے حیران کر دیا۔

''مطلب یہ کہ اس کی پتنی بھی ہمارے قبضے میں ہے اور اس کی سلامتی کے لیے اسے ہمارے ساتھ کوآپریٹ کرنا پڑے گا۔'' دیوا نے اسے اطلاع دی تو وہ چپ سا ہو گیا۔ مقاصد کے حصول کے لیے عورتوں اور بچوں کو یرغمال بنانا اس کے لیے ناپسندیدہ فعل تھا لیکن وہ دیوا سے اختلاف بھی نہیں کر سکتا تھا۔

''مجبوری ہے دوست! جب انسان کے اپنے تلوے جل رہے ہوں تو وہ صحیح غلط سوچنے کے چکر میں نہیں پڑتا۔ کبھی کبھی خود کو بچانے کے لیے دوسرے کے سینے پر چڑھ کر کھڑے ہو جانا ہی واحد حل ہوتا ہے۔'' اس کے اظہار کیے بغیر بھی وہ اس کی ناپسندیدگی کو بھانپ گیا۔

''شاید ایسا ہی ہو لیکن میں کبھی اس انداز میں نہیں سوچ سکا۔''

''ان باتوں کو جانے دو اور جو ہم کر رہے ہیں، ہمیں کرنے دو۔''

''جی ٹھیک ہے۔'' اس نے بحث نہیں کی۔

''اب تم آرام کرو۔ جلد ہی گڈ نیوز سناؤں گا۔'' دیوا کمرے سے جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ معاذ خاموشی سے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس کے یوں ملاقات کرنے کا سبب اسے سمجھ نہیں آیا تھا لیکن کوئی شے تھی جو مسلسل دماغ میں کھٹک رہی تھی۔

''ایک منٹ.....'' اس نے جاتے ہوئے دیوا کو روکا۔

''میں سوچ رہا تھا کہ جب آپ نے اسٹریٹجی بدل دی ہے تو میرا یہاں رک کر موہن کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنا بے کار ہے۔ آپ لوگ موہن اور اس کی بیوی کے معاملات سنبھالیے۔ میں اس دوران اپنے کچھ ضروری کام نمٹا لیتا ہوں۔ فائنل ایکشن سے پہلے ہم دوبارہ آپس میں مل کر ڈسکشن کر لیں گے۔''

''ایز یو وش۔ میرے کو کوئی آبجیکشن نہیں ہے۔'' دیوا نے اس کی بات توجہ سے سنی اور بے نیازی سے شانے اچکاتے ہوئے جواب دیا۔

''تو پھر ابھی میں چلتا ہوں۔'' معاذ وہاں سے جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

''اوکے، گڈ بائے۔'' دیوا نے اسے اجازت دے دی۔ وہاں سے نکل کر وہ سیدھا سجل سے ملنے جا پہنچا۔ وہ اپنے بیٹے کو کارپٹ پر بٹھائے ایک خالی ڈبے اور چھوٹی سی ڈنڈی کی مدد سے کھلانے میں مصروف تھی۔ ڈنڈی کو خاص انداز سے ڈبے پر مارنے سے ایک ردھم میں آواز پیدا ہو رہی تھی اور بچہ اس آواز پر خوش ہو کر تالیاں بجا رہا تھا۔ سجل کی دروازے کی طرف پشت ہونے کی وجہ سے وہ اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن اسے یقین تھا کہ بچے کی کھلکھلاہٹ نے اس کے چہرے پر بھی ہنسی کے پھول کھلا رکھے ہوں گے۔

''السلام علیکم!'' سجل کو اپنی آمد سے باخبر کرنے کے لیے اس نے کھنکھارتے ہوئے اسے سلام کیا۔

''وعلیکم السلام! آپ کب آئے؟ مجھے پتا ہی نہیں چلا۔'' چادر نما بڑے سے دوپٹے سے اس کا سر پہلے ہی ڈھکا ہوا تھا۔ اس کی آواز سن کر دوپٹے کا پلو تیزی سے نقاب کی شکل میں پھیلایا اور آہستہ سے بولی۔

''میں بس ابھی آیا ہوں۔ شلپا نے دروازہ کھولا تھا۔ آپ کو شاید مصروف ہونے کی وجہ سے بیل کی آواز سنائی نہیں دی۔''

''ہاں، بس وہ اعظم کھیل کے موڈ میں تھا تو میں اس کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔'' وہ بولتی ہوئی اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی لیکن اگلے ہی لمحے ڈگمگا سی گئی۔ معاذ بے اختیار دو قدم آگے بڑھا مگر وہ اس کے سہارا دینے سے پہلے ہی قریبی دیوار تھام کر خود کو سنبھال چکی تھی۔

''مجھے آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔'' معاذ

''میں ٹھیک ہوں۔ ایک دم اچانک کھڑے ہونے سے ذرا چکر سے آگئے تھے۔ ویسے پریشانی کی کوئی بات نہیں۔'' معاذ کی آنکھوں میں دکھائی دیتی بے پناہ اپنایت سے نظر چراتے ہوئے اس نے آہستہ سے جواب دیا اور ایک قریبی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''ڈاکٹر نے آپ کا چیک اپ کیا تھا؟'' وہ اس کی وضاحت سے مطمئن نہیں تھا۔

''جی ہاں۔ چیک اپ ہوا تھا اور میں دوائیں بھی پابندی سے لے رہی ہوں۔ اللہ نے چاہا تو یہ جو معمولی تکلیف ہے، یہ بھی جلد ٹھیک ہوجائے گی۔'' وہ اس کی تسلی کروانے کی پوری کوشش کررہی تھی۔

''کہیں کوئی بھی مسئلہ ہو، بالکل بھی تکلف سے کام مت لیجیے گا۔ ایسا نہ ہو کہ کل کو مجھے عالم کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے کہ میں نے اس کی بہن اور بھانجے کا ٹھیک سے خیال نہیں رکھا۔''

''شرمندہ تو میں ہوں کہ میری وجہ سے آپ کو اتنی زحمت اٹھانا پڑ رہی ہے۔ ایک ایسے وقت میں جبکہ ہمارے خونی رشتے ہمارا ساتھ چھوڑ گئے ہیں، آپ کی اتنی مہربانیاں مجھے مقروض کرتی جارہی ہیں۔'' پلکوں کی چلمن کے پیچھے آنسوؤں کی چمک ابھری تو وہ بے چین ہوگیا۔

''ایسا بالکل نہیں سوچیں۔ میں یہ سب اپنی خوشی سے کررہا ہوں۔''

''میں جانتی ہوں۔'' سجل بے ساختہ ہی بولی تو وہ چونک گیا اور بے اختیار اس کی طرف دیکھنے لگا کہ کیا سچ مچ وہ اس کے دل کی بے قراری سے واقف ہے لیکن اب وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھی اور ذرا سے رخ موڑے خالی ڈبے اور ڈنڈی کی مدد سے کھیلتے اعظم کو دیکھ رہی تھی۔

''معذرت چاہتا ہوں۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ اعظم کے لیے کھلونوں کا بھی انتظام کرنا چاہیے تھا۔'' اس کا گریز دیکھ کر اس نے اسے کھوجنے کی کوشش ترک کردی۔

''آپ نے جتنا کیا ہے، وہ بھی بہت زیادہ ہے۔ کھلونوں کا کیا ہے۔ نہیں بھی ملیں تو بچے کسی بھی دستیاب شے کو اپنا کھلونا بنا لیتے ہیں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن اعظم کے پاس کھلونے ہونے چاہئیں۔ میں دوبارہ آؤں گا تو کھلونے لیتا ہوا آؤں گا۔'' اس نے اپنا فیصلہ سنایا۔

''جیسی آپ کی مرضی۔ ابھی تو یہ بتائیں کہ ادا سائیں اور سرمد لی آزادی کے معاملے کا کیا بنا؟'' وہ گفتگو کا رخ بدل گئی۔

''کوششیں جاری ہیں۔ ان شاء اللہ جلد آپ خوشخبری سنیں گی۔''

''اللہ سائیں جلد از جلد وہ وقت لائے کہ میں اپنے ادا سائیں کو آزاد دیکھوں۔'' سجل نے تڑپ کر دعا کی تو اسے بے ساختہ علینہ یاد آئی۔ وہ بھی تو اس سے ایسی ہی شدید محبت کرتی تھی۔

''میں چلتا ہوں۔ آپ اپنا خیال رکھیے گا اور ڈاکٹر کی ہر ہدایت پر عمل کیجیے گا۔'' علینہ کا خیال آتے ہی دل ایسا بے قرار ہوا تھا کہ اس کے لیے وہاں رکنا مشکل ہوگیا تھا۔ کچھ مصروفیات تھیں اور کچھ احتیاط کے تقاضے کہ وہ گھر والوں کی خیر خبر لینے کے لیے دوبارہ پاکستان رابطہ ہی نہیں کرسکا تھا۔ ثوبیہ سے آخری بار جو بات چیت ہوئی تھی، اس سے یہی اندازہ ہوا تھا کہ وہ لوگ ازخود کہیں روپوش ہوگئے ہیں لیکن بہرحال اس کے برعکس خدشات بھی دل میں موجود تھے۔

''اتنی اچانک کہاں جارہے ہیں؟ میں نے تو ابھی آپ کو چائے کافی کے لیے بھی نہیں پوچھا۔'' سجل اس کے یوں اچانک جانے کا سن کر حیران و پریشان ہوئی۔

''نیکسٹ ٹائم آؤں گا تو پی لوں گا۔ ابھی اچانک ایک کام یاد آگیا ہے۔'' اس نے جھک کر کھیل میں مصروف اعظم کے رخسار پر تھپکی دی اور وہاں سے روانہ ہوگیا۔ راستے ہی سے کالے خان کو کال کرکے مشرا کو بلوانے کی بھی فرمائش کردی کہ پاکستان میں محفوظ رابطہ کرنے کے لیے کمپیوٹر پر بے پناہ دسترس رکھنے والا وہ دھان پان سا لڑکا ناگزیر تھا۔

''مشرا آگیا؟'' رادھا دیوی کے گھر پہنچتے ہی اس نے کالے خان سے سوال کیا۔

''بس، آتا ہی ہوگا۔ آپ بتائیں موہن کا کیا ہوا؟'' کالے خان اس سے اس کام کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین تھا جس کے لیے وہ گھر سے نکلا تھا۔

''لے آئے ہیں اسے۔ آگے کا پلان ابھی طے کرنا ہے۔ میں نے سوچا اس سے پہلے ایک بار گھر والوں سے بات کرلوں۔ آنے والے وقت میں کیا حالات ہوں، کیا معلوم۔''

''شبھ شبھ بولیے۔ اوپر والے نے چاہا تو آگے بھی سب اچھا ہوگا۔''

''ان شاء اللہ تعالیٰ! لیکن خیال رکھنا کالے خان کہ اگر مجھے کچھ ہوجاتا ہے تو تمہیں سجل کا بہت خیال رکھنا ہے اور پوری پوری کوشش کرنی ہے کہ اسے پاکستان میں اسے اپنوں تک پہنچادو۔'' اس کے ساتھ بہت اندیشے تھے۔

''تسلی رکھیے، سب ٹھیک ہوجائے گا۔ میرا ایمان ہے کہ اگر آپ غلط راستے پر نہیں ہیں تو زندگی میں چاہے کتنی ہی مشکلات کیوں نہ آئیں، آخر کار ایک دن سب ٹھیک ہوجاتا ہے۔'' کالے خان نے اسے دلاسا دیا پھر پوچھنے لگا۔

''کھانے کے سلسلے میں کیا ارادہ ہے آپ کا۔ ابھی کھائیں گے یا کچھ دیر بعد؟''

''آج بھی تمہارے ہاتھ کا پکا زہر مار کرنا پڑے گا تو پھر رہنے دو۔'' چہرے پر بے چارگی کے تاثرات سجاتے ہوئے اس نے کالے خان کو جواب دیا۔

''آج میں نے ایک فوڈ چینل سے ریسپی دیکھ کر کھانا پکایا ہے تو امید ہے کہ کچھ نہ کچھ ٹھیک بن ہی گیا ہوگا۔ اگر پھر بھی آپ کو پسند نہ آئے تو باہر سے منگوالیں گے۔'' کالے خان نے قطعی برا منائے بغیر اسے جواب دیا۔

''ان سارے چکروں میں پڑنے سے بہتر ہے کہ تم جلد از جلد کوئی نیا کک تلاش کرو۔'' اس نے کالے خان کو نصیحت کی۔

''وہ تو میں کر ہی رہا ہوں لیکن کوئی قابل اور اعتبار والا بندہ ملے بھی تو۔''

''گل خان کو اس جاب کے لیے کیوں نہ بلالیں۔ اس کو پکانے میں مہارت بھی ہے اور بندہ بھی بہت وفادار ہے۔ جب سے شکیل کے ہاں سے نوکری چھوڑی ہے، اس کے پاس کوئی مستقل روزگار بھی نہیں ہے۔'' اسے اچانک ہی گل خان کا خیال آیا۔

''آئیڈیا تو اچھا ہے لیکن میں واضح کردوں کہ اس کی جاب اسی وقت پکی ہوگی جب رادھا اسے او کے کردے گی۔ وہ کبھی کبھی یہاں آتی ہے لیکن کک میں وہی رکھتا ہوں جس کے ہاتھ کا ذائقہ رادھا کو بھائے۔''

''مجھے معلوم ہے بھائی۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارا بس چلے تو اس دنیا میں موسم بھی رادھا دیوی کی مرضی سے تبدیل ہوا کریں۔''

''اب ایسی بھی بات نہیں ہے۔'' کالے خان اس کی بات سن کر جھینپ گیا۔ اسی وقت مشرا کی آمد ہوگئی تو معاذ کو اس کے ساتھ مزید چھیڑ چھاڑ کرنے کا موقع نہ مل سکا۔

''آج مجھے بھی کال کرنے کا یہ طریقہ سمجھادو۔'' مشرا لیپ ٹاپ گود میں رکھے بیٹھا تھا وہ بھی اس کے ساتھ آبیٹھا۔

''کوشش کرتا ہوں لیکن بہت کمپلیکیٹڈ ہے۔ ایک بار میں شاید ہی سمجھ آسکے۔'' اس نے قدرے نخوت سے جواب دیا لیکن معاذ پوری استقامت سے اپنے ارادے پر ڈٹا رہا۔ مجبوراً مشرا کو اسے گائیڈ کرنا پڑا۔ طریقہ کار واقعی پیچیدہ تھا اور کچھ مشرا بھی جان بوجھ کر جلدی جلدی سب کرتا جارہا تھا اس لیے پوری طرح اس کے پلّے نہ پڑسکا۔ کال مل گئی تو وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بات کرنے کے لیے بے چین ہوگیا۔

''ہیلو!'' دوسری طرف سے سنائی دیتی مردانہ آواز بلاشک وشبہ فراز کی تھی۔ وہ اس کی آواز سن کر جھجک گیا۔

''ہیلو! کون بات کررہا ہے؟'' اس کی طرف سے خاموشی پر فراز نے پوچھا۔

''جی، وہ میں علینہ کی دوست انعم بات کررہی ہوں۔ ثوبیہ آپی سے بات ہوسکتی ہے کیا؟'' اسے خیال آیا کہ وہ وائس چینجر کی مدد سے کال کررہا ہے تو اپنا مدعا بیان کیا۔

''انعم.....!'' فراز کچھ چونکا ہوا محسوس ہوا۔

''جی، انعم..... کراچی سے۔''

''مجھے خود تمہاری کال کا انتظار تھا انعم! مجھے ثوبیہ نے تمہارے متعلق بتایا تھا۔'' فراز کی اگلی بات مزید معنی خیز تھی۔

''وہ خود کہاں ہیں؟'' اس نے اپنے اندر بے چینی سی محسوس کی۔

''اسپتال میں۔''

''کیا ڈیوٹی پر ہیں؟''

''نہیں۔ ایڈمٹ ہے۔ اسے تیزاب گردی کا نشانہ بنایا گیا ہے۔'' فراز کی آواز بھرا سی گئی۔

''کب؟ کیسے؟'' وہ اس اطلاع کو سن کر تڑپ اٹھا۔

''علینہ سے چوری چھپے رابطہ رکھنے کی پاداش میں۔ انہوں نے میری پریوں سی بہن کو نشان عبرت بنادیا اور اب شاید ہمیں اس بات کا بھی خمیازہ بھگتنا پڑے کہ ہم تمہیں یہاں کی ساری خبریں پہنچا رہے ہیں۔'' فراز پھٹ پڑا جبکہ وہ اپنی جگہ گنگ رہ گیا۔ فراز کے الفاظ سے ظاہر تھا کہ وہ جانتا ہے کہ انعم کے پردے میں کون اس سے مخاطب ہے۔

''مجھے بہت افسوس ہے میرے بھائی! بلکہ سچ پوچھو تو میں بے انتہا شرمندہ ہوں۔'' اس کے منہ سے بہ مشکل الفاظ نکل رہے تھے۔ یہ احساس کہ اس کے دامن میں لگی آگ نے دوسروں کی ہنستی بستی زندگیاں راکھ کرنا شروع کردی ہیں، بڑا ہی تکلیف دہ تھا۔

جانتا ہوں کہ تم تو خود بے قصور اس مصیبت میں مبتلا ہو۔'' اس کے شکستہ لہجے نے فراز کو سنبھلنے پر مجبور کر دیا۔

''بے قصور تو ہوں لیکن یہ احساس مجھے چین نہیں لینے دیتا کہ میری وجہ سے میرے اپنے مصائب میں مبتلا ہیں۔'' اس کی آواز بھرا سی گئی۔

''بعض اوقات حالات پر انسان کا اختیار نہیں رہتا اور نہ چاہتے ہوئے بھی اسے عظیم دکھوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔'' فراز کو ابھی اسے بدترین اطلاع بھی دینی تھی اس لیے اپنے طور پر پیش بندی کی کوشش کر رہا تھا۔

''ثوبیہ نے تو مجھے بتایا تھا کہ علینہ سمیت سب گھر والے اچانک غائب ہو گئے ہیں پھر اس کی علینہ سے کب اور کیسے بات ہوئی؟'' اس نے مزید حالات جاننے کی کوشش کی۔

''علینہ نے خود رابطہ کیا تھا۔ وہ سنگاپور میں تھی لیکن اس وقت اس نے ثوبیہ کو یہ سب نہیں بتایا تھا۔ اس بات کا علم ہمیں اس وقت ہوا جب کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔''

''کیا مطلب؟'' فراز کے الفاظ پر اس کا دل دھک سے رہ گیا اور بے ساختہ ہی آواز بلند ہو گئی۔

''علینہ، خاور ماموں، سعد..... کوئی بھی نہیں رہا۔ ان سب کو اس وقت بم دھماکے میں اڑا دیا گیا جب وہ دشمنوں سے بچنے کے لیے سمندری راستے سے سنگاپور سے فرار ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔'' یہ سب بتاتے ہوئے فراز کی آواز بھیگ گئی لیکن اس کا ذہن اس اطلاع کو قبول کرنے کو تیار نہیں تھا اس لیے چیخ کر بولا۔

''کیا بکواس کر رہے ہو فراز؟ علینہ اور باقی لوگ سنگاپور کیسے جا سکتے تھے؟ کون لے گیا تھا انہیں وہاں؟''

''لالہ عیسیٰ اور اس کا منہ بولا بیٹا وقاص عرف وکی۔ مجھے بہت زیادہ تفصیلات نہیں معلوم، بس اتنا پتا ہے کہ وہ لوگ تمہارے گھر والوں کی مدد کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ملنے والی اطلاعات اور ثوبیہ کی علینہ سے ہونے والی بات چیت سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وکی سے علینہ کا نکاح ہو گیا تھا۔ وہ بے چارہ بھی ان سب کے ساتھ مارا گیا ہے۔'' فراز ایسے حوالے دے رہا تھا جنہیں جھٹلانا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اسے وقاص عرف وکی بھولا نہیں تھا۔ وہی تھا جس نے اسے عرفان اللہ اور یزدانی کی قید سے نکال کر اپنے پاس پناہ دی تھی اور پورے خلوص سے چاہتا تھا کہ وہ اس دلدل سے نکل جائے جس میں اسے زبردستی پھنسا دیا گیا ہے یعنی اسے سعد کی زندگی بچانے کے لیے وقاص کے خلوص کو ٹھکرا کر اپنے صیاد کے پاس واپس جانا پڑا تھا اور اب اسے بتایا جا رہا تھا کہ وہی مخلص سا وقاص اور اس کی فیملی کے سارے لوگ مارے گئے ہیں۔ ابو، سعد، علینہ..... کوئی بھی نہیں بچا۔

''معاذ.....!'' اس کی طرف سے مسلسل خاموشی پر فراز نے اسے پکارا۔ حالات جس نہج پر آ گئے تھے، ساری احتیاطیں بے کار تھیں اس لیے فراز نے اسے اس کے نام سے ہی پکارا تھا۔

''کیا سچ مچ کوئی نہیں بچا۔ ابو، سعد، علینہ..... کوئی ایک بھی؟'' الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے لبوں سے نکلے۔

''کوئی نہیں بچا میرے بھائی، سب ختم ہو گیا۔'' فراز کے لیے خود پر قابو پانا ممکن نہیں رہا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ خود اس کا یہ حال تھا کہ رونے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔ غم و غصے کی انتہا پر پہنچ کر اس نے سب سے پہلے اپنے سامنے رکھے لیپ ٹاپ کو ہی اٹھا کر دیوار پر دے مارا پھر زور زور سے چیختے ہوئے جو ہاتھ آیا اٹھا کر پھینکتا چلا گیا۔ اس وقت اس کے منہ سے جو آوازیں نکل رہی تھیں، وہ کسی شیر کی دہاڑ سے مشابہ تھیں۔ شور سن کر کالے خان اور مشرا بھاگے آئے۔ کمرے کی حالت دیکھ کر دونوں دنگ رہ گئے۔

''معاذ.....'' کالے خان نے اسے پکارا لیکن اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے اپنے پیاروں کے چہرے گھوم رہے تھے اور یہ خیال دل کو نوچ رہا تھا کہ وہ سب ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر سمندر برد ہو چکے ہیں۔

''کیا ہو گیا ہے معاذ.....'' وہ پکارے جانے پر متوجہ نہ ہوا تو کالے خان اس کے قریب چلا آیا اور اس کا بازو تھام کر پریشانی سے پوچھا۔ لیکن اسے تو اپنا ہوش ہی نہیں تھا۔ زور سے چیخا اور کالے خان کو پرے دھکیل دیا۔ وہ بے چارہ بے خبری میں دور جا کر گرا۔

''آپ ٹھیک ہیں؟'' مشرا لپک کر کالے خان کے قریب آیا اور سہارا دے کر کھڑا کرتے ہوئے پوچھا۔

''میں ٹھیک ہوں مگر سمجھ نہیں پا رہا کہ انہیں کیا ہوا ہے۔'' کالے خان نے تشویش سے معاذ کی طرف دیکھا جو اب دیوار پر لگی ایک پینٹنگ اتار کر پھینک رہا تھا۔ انداز ایسا تھا جیسے دنیا کی ہر شے کو نیست و نابود کر دینا چاہتا ہو۔

''اسے تو لگتا ہے کہ پاگل پن کا دورہ پڑا ہے۔ کیا یہ کسی قسم کے ذہنی مرض میں مبتلا ہے؟'' دھان پان سا مشرا اس کے جنون کو دیکھ کر خوفزدہ سا تھا۔

باس ہی نہیں۔ مجھے لگتا ہے فون پر انہوں نے کوئی بہت ہی بری خبر سنی ہے جب ہی خود پر قابو نہیں رکھ پا رہے ہیں۔'' کالے خان کو نتیجہ اخذ کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔

''لیکن اس طرح تو یہ خود کو اور دوسروں کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔'' مشرا نے اسے تشویش زدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے تبصرہ کیا اور عین اسی وقت معاذ لہرتا ہوا نیچے گرا۔ اذیت کی انتہا پر کھولتے دماغ کو ریلیف دینے کے لیے طاری ہونے والی یہ بے ہوشی قدرت کی طرف سے کی جانے والی مہربانی تھی۔ کالے خان اس کے گرتے ہی دوڑ کر اس کے قریب پہنچا اور اس کا سر اپنے زانو پر رکھ کر رخساروں کو تھپتھپاتے ہوئے اسے پکارنے لگا۔ قریب مشرا بھی آیا لیکن اتنا چوکنا تھا کہ جیسے ڈر ہو کہ معاذ ابھی ہوش میں آ کر اس پر حملہ کر دے گا۔

''انہیں اٹھا کر بیڈ پر لٹانے میں میری مدد کرو۔'' کالے خان نے جب دیکھا کہ وہ ہوش میں نہیں آ رہا ہے تو اس نے مشرا سے درخواست کی۔ مشرا با دل ناخواستہ اس کی مدد کروانے لگا۔ دراز قد اور ورزشی جسم کے مالک معاذ کو اٹھا کر بستر پر لٹانا ان دونوں کے لیے ایک کٹھن کام تھا جو انہوں نے کسی نہ کسی طور انجام دے ہی لیا۔

''میں ڈاکٹر کو کال کرتا ہوں۔'' ہانپتے ہوئے کالے خان نے ماتھے پر آیا پسینا صاف کرتے ہوئے کہا تو مشرا نے جلدی سے اس کی تائید کی اور بولا۔

''جی، جی۔ جلدی سے ڈاکٹر کو بلوائیں۔ ایسا نہ ہو کہ ہوش میں آ کر اسے دوبارہ دورہ پڑ جائے اور آپ مشکل میں پڑ جائیں۔ میں تو اب یہاں سے جانے لگا ہوں۔ ایک پارٹی کو ٹائم دے رکھا ہے۔ دیر سے پہنچا تو میرا لاس ہو جائے گا۔'' انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ یہاں رکنے سے خوفزدہ ہے۔

''ٹھیک ہے، تم جاؤ۔'' کالے خان کو بھی پتا تھا کہ دماغی طور پر بے حد تیز یہ لڑکا مزاجاً بزدل ہے اس لیے اسے اجازت دے دی۔ اس کے جانے کے بعد کالے خان نے پہلے ڈاکٹر کو کال کی پھر بکھرے ہوئے کمرے کو سمیٹنے لگا۔ اس کام کے دوران وہ گاہے گاہے معاذ پر بھی ایک فکر بھری نظر ڈال لیتا تھا۔ ڈاکٹر کی آمد تک وہ ٹوٹ کر ادھر اُدھر بکھر جانے والی اشیا کے ٹکڑے سمیٹ چکا تھا لیکن بہرحال کمرا اپنی سابقہ حالت میں نہیں آیا تھا۔

''کیسے بے ہوش ہوئے ہیں یہ؟'' ڈاکٹر آیا تو معاذ کا معائنہ کرتے ہوئے کالے خان سے پوچھنے لگا۔

''کچھ ٹھیک سے نہیں معلوم۔ میں ایک مہمان کے ساتھ دوسرے کمرے میں تھا۔ یہ کسی سے فون پر بات کر رہے تھے۔ اچانک ہمیں ان کے چیخنے چلّانے اور سامان کے ٹوٹنے پھوٹنے کی آوازیں سنائی دیں تو یہاں آئے اور پھر یہ میری نظروں کے سامنے ہی اچانک بے ہوش ہو گئے۔'' اس نے تفصیل بتائی۔

''نروس بریک ڈاؤن۔ لگتا ہے انہیں کوئی بری خبر سننے کو ملی ہے لیکن شکر کریں کہ کوئی شدید نقصان نہیں ہوا۔ وقتی بے ہوشی ہے۔ ابھی ہوش میں آ جائیں گے۔'' ڈاکٹر بولنے کے ساتھ ساتھ اپنا کام بھی کرتا جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں معاذ کسمسانے لگا۔

''یہ ہوش میں آ رہے ہیں۔'' کالے خان دیکھ کر خوش ہو گیا لیکن اگلا ہی لمحہ پریشان کن تھا۔ معاذ نے آنکھیں کھولنے سے پہلے ہی چیخنا چلّانا شروع کر دیا تھا۔

''ابو...... کہاں جا رہے ہیں آپ؟ لہریں بہت تیز ہیں۔ سمندر میں آگے نہ جائیں۔ سعد، علینہ! رک جاؤ۔ میں کہتا ہوں رک جاؤ ورنہ ڈوب جاؤ گے۔'' چیخنے کے ساتھ ساتھ وہ یوں ہاتھ پیر چلا رہا تھا جیسے کسی کو پکڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔

''مسٹر معاذ! آنکھیں کھولیے۔ آنکھیں کھول کر دیکھیے۔ یہاں کوئی سمندر نہیں ہے۔'' ڈاکٹر نے اس کے رخسار تھپتھپاتے ہوئے اسے پکارا تو آخر کار اس نے آنکھیں کھول دیں لیکن اس کی آنکھوں میں اجنبیت تھی اور خالی الذہنی کی کیفیت میں یوں آس پاس دیکھ رہا تھا جیسے اپنی وہاں موجودگی پر حیران ہو۔

''اب آپ کیسا فیل کر رہے ہیں مسٹر معاذ؟'' ڈاکٹر نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

''میں ٹھیک ہوں۔ مجھے کچھ نہیں ہوا۔ کیا کچھ ہوا تھا؟'' وہ اٹھ کر بیٹھتے ہوئے ڈاکٹر کی وہاں موجودگی پر حیرت کا شکار نظر آ رہا تھا۔

''آپ کو تھوڑے سے چکر آ گئے تھے اور آپ بے ہوش ہو کر گر گئے تھے۔'' ڈاکٹر نے اسے جواب دیا۔

''لیکن کیوں؟ میں بے ہوش کیوں ہوا تھا؟'' وہ الجھا۔

''شاید آپ کو کمزوری ہو گئی ہے یا پھر آپ بہت زیادہ ذہنی دباؤ کا شکار ہو گئے تھے۔'' ڈاکٹر نے محتاط الفاظ میں اسے جواب دیا۔

''ذہنی دباؤ...... لیکن کیوں؟'' وہ سوچ میں پڑ گیا اور پھر یکدم ہی اس کے چہرے کی رنگت متغیر ہو گئی۔

''کیا بات ہے معاذ صاحب؟ کیا ہوگیا ہے؟'' کالے خان نے اس کی بھنچی ہوئی مٹھیاں دیکھیں اور تیزی سے اس کے قریب بیٹھ کراس کے گرد اپنا بازو پھیلا دیا۔

''سب ختم ہوگیا کالے خان! سب تباہ ہوگیا۔ ظالموں نے میرے پورے خاندان کو ختم کر دیا۔'' سہارا پا کر وہ بکھرنے لگا۔ کالے خان نے بے ساختہ اسے سینے سے لگالیا۔

''مار ڈالوں گا میں ان سب کو۔ تباہ و برباد کردوں گا۔ میرے گھر کو اجاڑنے والے اب خود بھی سکھ سے نہیں رہ پائیں گے۔'' بولتے بولتے اس کا جسم اینٹھنے لگا تھا۔ ڈاکٹر نے اس کی یہ کیفیت دیکھی تو تیزی سے ایک انجکشن تیار کر کے اس کے بازو میں لگا دیا۔ دھیرے دھیرے اس کے جسم کا تناؤ کم ہونے لگا۔ آواز دھیمی ہوکر پستی میں ڈھلی اور پھر معدوم ہوگئی۔ ڈاکٹر کے اشارے پر کالے خان نے اسے آہستہ سے تکیے پر لٹا دیا۔

''شدید ڈپریشن ہے۔ ان کی حالت سنبھلنے تک بہت زیادہ خیال رکھنا ہوگا۔ بہتر ہوگا کہ کوئی ایسا شخص ان کے ساتھ رہے جس سے انہیں جذباتی سہارا مل سکے۔'' ڈاکٹر نے اس کی کیفیت بیان کرنے کے ساتھ ساتھ تجویز بھی پیش کی۔

''میں خیال رکھوں گا ڈاکٹر صاحب!'' کالے خان نے جواب دیا۔ ڈاکٹر کو وہاں سے رخصت کرتے ہوئے اس کے چہرے پر گہری سوچ کے سائے تھے۔

☆☆☆

''معاذ کی تلاش میں کتنے فیصد کامیابی حاصل ہوسکی ہے آپ لوگوں کو؟ میں اب تک کی مکمل رپورٹ سننا چاہتی ہوں۔'' سونیا اپنے سامنے موجود دونوں مردوں کے مقابل ٹانگ پر ٹانگ رکھے کرسی پر براجمان تھی اور نہایت سنجیدہ لہجے میں ان سے دریافت کر رہی تھی۔

''ہم اسے مسلسل تلاش کررہے ہیں۔ ائرپورٹس، ریلوے اسٹیشن اور لاری اڈوں پر ہمارے لوگ پھیلے ہوئے ہیں۔ امید ہے کہ ہم کہیں نہ کہیں اسے ٹریس کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے کیونکہ یہ تو طے ہے کہ وہ دہلی میں ہی ہے۔''

''وہ کیسے؟ آئی مین آپ اس کے دہلی میں ہی موجود ہونے پر اتنے شیور کیسے ہیں؟'' اس نے چونک کر سوال کیا۔

''ہم نے اس کے دوست عالم شاہ کے حوالے سے کام کیا ہے۔ ہمیں شک تھا کہ وہ عالم شاہ اور اس کے ملازم کی آزادی کے سلسلے میں کچھ ہاتھ پاؤں چلاسکتا ہے۔''

''انٹرسٹنگ......تو پھر کیا نتیجہ نکلا؟'' وہ کرسی پر سیدھی ہوکر بیٹھی۔

''عالم شاہ کے آس پاس تو ہمیں اس کی موجودگی کے نشانات نہیں ملے لیکن ابھی حال ہی میں ہونے والے ایک واقعے نے ہماری توجہ کھینچ کر ہمیں معاذ کی ایک جھلک دکھا دی۔''

''کہاں؟ کیسے؟'' وہ بے چین ہوئی۔

''عالم شاہ کی بہن...جس کا نکاح اس کے کزن فیصل سے ہوا تھا، اچانک ہی اسپتال سے اپنے بچے سمیت غائب ہوگئی۔ اس کے غائب ہونے پر اس کے شوہر اور سسرال والوں نے واویلا مچایا تو پولیس نے انکوائری کی اور آخر ایک ایسی فوٹیج حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی جس میں ایک ڈاکٹر کو پسٹل کے زور پر لڑکی اور اس کے بچے کو اسپتال سے باہر لے جاتے ہوئے صاف دیکھا جاسکتا ہے۔ ہم نے اس فوٹیج کا تجزیہ کیا تو پتا چلا کہ ڈاکٹر کے بہروپ میں وہ معاذ تھا۔''

''آر یو شیور؟'' وہ رپورٹ سن کر حیران ہوئی۔

''یس میم! ہمیں نائنٹی پرسنٹ سے زیادہ وشواس ہے کہ وہ معاذ ہی تھا۔ پولیس کی چھان بین سے بھی ثابت ہوگیا ہے کہ فوٹیج میں نظر آنے والا ڈاکٹر اسپتال کے عملے میں شامل ہی نہیں تھا۔''

''لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معاذ نے اس لڑکی کو اغوا کیوں کیا؟ اسے کچھ کرنا تھا تو اپنے دوست کی آزادی کے لیے کرتا۔'' اس نے اعتراض کیا۔

''ہم نے اس پر ورک کیا ہے میم! کھوج لگانے سے پتا چلا ہے کہ اس لڑکی سجل کے سسرال والوں کا اس کے ساتھ برتاؤ ٹھیک نہیں تھا۔ یہاں تک معلوم پڑا ہے کہ اس کے ساتھ مار پیٹ کی گئی تھی جس کی وجہ سے وہ زخمی ہوگئی تھی لیکن جھوٹا بہانہ بنایا گیا کہ وہ سیڑھیوں سے گر کر زخمی ہوئی ہے۔''

''ہمارا اندازہ ہے میم کہ معاذ نے سجل کو اغوا نہیں کیا بلکہ اسے اس کے سسرالی ظلم سے بچایا ہے۔'' دوسرے نے پہلے والے کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بتایا۔

''اس کا تو ایک ہی مطلب ہے کہ معاذ کو یہاں کوئی مضبوط سپورٹ حاصل ہے۔ اس کے پاس کوئی محفوظ ٹھکانا ہوگا تب ہی تو وہ اس لڑکی کو اپنے ساتھ لے کر گیا ہے۔''

''بالکل میم! یہ پوائنٹ تو شروع سے ہمارے ذہنوں میں ہے۔ اگر اس کے پاس سپورٹ نہیں ہوتی تو وہ یہاں سروائیو کیسے کرتا؟ جس طرح وہ سارے انتظامات کے ساتھ سبھاش کے گھر میں گھسا اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس کے پاس کوئی مضبوط سپورٹ ہے لیکن ہم ابھی تک اسے

TAGPK.COM

پناہ دینے والے کو تلاش نہیں کر پائے ہیں۔ ہم نے اس پوائنٹ پر بھی کام کیا ہے کہ اس کے کوئی رشتے دار یا دوست وغیرہ یہاں رہتے ہوں لیکن ایسا کوئی کلیو نہیں ملا ہے۔ اب ہمارے پاس بس ایک آس رہ گئی ہے۔''

''وہ کیا؟'' ایک ایک لفظ بغور سنتی سونیا نے فوراً سوال کیا۔

''سجل نامی اس لڑکی کے سر میں ٹیومر ہے تو آئی ہوپ وہ لوگ اس کے علاج کے لیے اسی ڈاکٹر یا کسی دوسرے نیوروسرجن سے کونٹیکٹ کریں گے۔ اس وقت ہم دہلی کے تمام اچھے نیوروسرجنز پر فوکس کیے ہوئے ہیں۔ جیسے ہی انہوں نے ان میں سے کسی سے کونٹیکٹ کیا، ہمیں خبر مل جائے گی۔''

''گڈ! یہ اچھا قدم ہے لیکن ہم صرف اسی پر ڈیپینڈ نہیں کر سکتے۔'' سونیا نے ان کی کوشش کو سراہنے کے ساتھ ساتھ متنبہ بھی کیا۔

''آئی نو میم! اس کے علاوہ ہم جو دوسرا اسٹیپ لینے جا رہے ہیں وہ یہ ہے کہ ہم معاذ کی تصویریں پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے ہر طرف پھیلا دیں گے۔ جنتا سے کہا جائے گا کہ یہ شخص خطرناک ذہنی مریض ہے جو کسی کو بھی، کسی سے نشانہ بنا سکتا ہے۔ اتنی عوام میں سے کہیں تو کوئی اسے پہچان کر ہمیں خبر دے گا نا۔'' اس کی دوسری تجویز کو سن کر سونیا کانپ گئی اور فوراً بولی۔

''نہیں۔ تم لوگ ایسا نہیں کرو گے۔''

''وہ کیوں میم؟''

''احمقو.....! وہ میرے ساتھ انڈیا آیا تھا اور میرے ساتھ مل کر یہاں کارروائیاں بھی کی تھیں۔ ذرا سوچو کہ وہ سب لوگ جو اس عرصے میں کسی نہ کسی طور متاثر ہوئے تھے، اگر اس کو پہچان کر ہمارے پیچھے چلے آئے تو ہمارے لیے نئی مصیبت نہیں کھڑی ہو جائے گی کیا؟'' اس نے انہیں ڈپٹا۔

''سوری میم! اس بارے میں تو ہم نے سوچا ہی نہیں تھا۔'' جلدی سے معذرت کی گئی۔

''اٹس اوکے۔ ابھی تم لوگ جاؤ۔ میں سوچ کر بتاؤں گی کہ آگے کے لیے کیا پلان ہے۔'' اس نے انہیں چلتا کیا لیکن خود اس کا ذہن سوچوں سے آزاد نہ ہو سکا۔ اسے معلوم تھا کہ معاذ ہاتھ آ گیا تو اس کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا جائے گا اور پتا نہیں ایسا کیوں تھا کہ وہ اس کے ساتھ کچھ برا ہونے کا سوچتی تو اس کا دل ڈوبنے لگتا تھا۔ وہ دل جو کبھی بہت سخت ہوا کرتا تھا اور کئی کئی لوگوں کو ایک ساتھ موت کے منہ میں گراتے ہوئے نہیں کانپتا تھا، معاذ کو کچھ ہو جانے کے خیال سے سہم سا جاتا تھا۔

''میرے اندر کی عورت آخر کیوں جاگ گئی ہے۔ میں عورت کے بجائے اس شیطانی سسٹم کا ایک پرزہ ہی بنی رہتی تو اچھا تھا۔'' اپنی اس کیفیت پر خود ہی جھنجلاتی وہ کرسی سے اٹھ کر کھڑکی تک گئی اور وہاں سے نیچے جھانکنے لگی۔ نیچے سڑک پر گاڑیوں کا سیلِ رواں بہہ رہا تھا۔

''ممکن ہے ان گاڑیوں میں سے کسی ایک میں وہ بھی سفر کر رہا ہو۔'' اس کے ذہن میں خیال آیا تو ساتھ ہی وہ واقعہ بھی یاد آ گیا جب اسے ایک گزرتی گاڑی میں معاذ کی موجودگی کا گمان ہوا تھا۔ وہ اس گاڑی کا پیچھا کرنا چاہتی تھی لیکن سبھاش نے معاذ کے دکھائی دینے کو اس کی نظر کا دھوکا اور الوژن قرار دے کر اس کا ساتھ نہیں دیا تھا اور نتیجتاً اپنی زندگی گنوا بیٹھا تھا۔

''کہاں ہو معاذ! ایک بار میرے سامنے آ جاؤ تاکہ میں تمہیں ان سب سے چھپا دوں۔'' زیرِ لب اسے پکارا تو یوں لگا کہ کوئی دراز قامت سایہ اس کے پہلو میں آ کھڑا ہوا ہے۔ یہ سایہ کچھ عرصے سے اس کے ساتھ ساتھ رہنے لگا تھا اور جب سے ایسا ہونے لگا تھا، اس کے لیے وہ دنیا اجنبی ہوتی جا رہی تھی جس کو وہ اب تک جیتی آئی تھی۔ یہ تبدیلی اور اس کا انجام کبھی کبھی اسے خوفزدہ کر دیتا تھا لیکن وہ اس تبدیلی کو آنے سے روکنے پر قادر نہیں تھی۔

☆☆☆

گھپ تاریکی سے اجالے کا سفر طے کرتے ہوئے اس کی حسِ شامہ نے ایک انوکھی خوشبو کو موصول کیا تو وہ چونک گیا۔ یہ خوشبو.....؟ یہ خوشبو دنیا میں سب سے الگ تھی۔ اس لیے ذہن میں سوال ابھرتے ہی جواب بھی حاضر ہو گیا۔

''سجل.....!'' اس نے ایک جھٹکے سے آنکھیں کھولیں تو اسے اپنے بے حد قریب پایا۔ وہ اس کے بستر کے بالکل قریب کھڑی اس کے جسم پر پھیلی چادر کو ٹھیک کر رہی تھی۔

''آپ یہاں کیسے سجل.....؟'' حیرت سے سوال کیا۔

''آپ کی طبیعت کی خرابی کی اطلاع ملی تو چلی آئی۔ اب کیسا محسوس کر رہے ہیں آپ؟'' اس نے نرمی سے جواب دیتے ہوئے اس کی خیریت دریافت کی اور غیر محسوس طور پر بستر سے دور ہٹ کر کرسی پر جا بیٹھی۔

''میں.....'' اس نے سجل کے سوال کا جواب دینا چاہا تو پہلی بار اپنے منہ اور حلق میں کھلی کڑواہٹ کا احساس ہوا

اور ساتھ ہی ایک جھماکے سے وہ سب یاد آ گیا جس نے اسے ہوش وخرد سے بیگانہ کر دیا تھا۔

''آپ جس تکلیف سے گزر رہے ہیں، اس کے سامنے دنیا کے سارے الفاظ ہیچ ہیں۔ اس لیے میں صرف یہ کہوں گی کہ جو ہوا اس پر مجھے بے حد افسوس ہے۔'' دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں پھنسائے وہ جو کچھ کہہ رہی تھی وہ محض رسمی الفاظ نہیں ہیں، اسے سمجھانے کے لیے اس کی آنکھوں میں جھلملاتے آنسو کافی تھے۔ معاذ نے ایک نظر اس کی نم آنکھوں کو دیکھا اور سر جھکا لیا۔ یہ صرف اس کی موجودگی کا اعجاز تھا کہ اس بار اس کے غم نے جنون کی شکل اختیار نہیں کی تھی لیکن درد تو تھا اور بے حد تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس درد کی شدت اس کی ایک ایک رگ کو کاٹتی جا رہی ہو۔

''آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ آپ کو آرام کرنا چاہیے تھا۔ یہاں کیوں چلی آئیں؟'' جسم و جاں میں اتنی بے قراری تھی کہ دل چاہتا تھا گریبان چاک کر کے دیوانوں کی طرح چیخیں مارتا سڑکوں پر بھاگتا پھرے۔ اپنے اس جنون سے گھبرا کر ہی اس نے خود پر سے توجہ ہٹا کر اس کی طرف مبذول کی۔

''میں ٹھیک ہوں اور آرام کر کر کے تھک چکی ہوں۔ اس لیے آپ اس بات کے لیے قطعی پریشان نہ ہوں کہ یہاں آنے سے مجھے کوئی تکلیف یا زحمت پہنچی ہے۔'' اسے نہایت رسان سے جواب دے کر وہ دروازہ کھلنے کی آواز پر اس طرف متوجہ ہوئی۔ کالے خان ٹرالی دھکیلتا اندر آ رہا تھا۔

''کیا لائے ہیں خان بھائی؟''

''معاذ صاحب کے لیے سوپ اور آپ کے لیے چائے اور ہلکے پھلکے اسنیکس ہیں۔'' کالے خان نے مسکرا کر جواب دیا۔

''لے جاؤ یہ سوپ۔ مجھے کچھ نہیں کھانا پینا ہے۔'' معاذ نے روکھے لہجے میں اسے حکم دیا۔

''آپ بہت دیر سے بھوکے ہیں۔ آپ نے کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ پلیز! یہ تھوڑا سا سوپ لے لیں تاکہ آپ کو دوا دی جا سکے۔'' کالے خان نے ملتجی لہجے میں اسے سمجھایا۔

''کون سی دوا.....؟ کون سی دوا دو گے تم مجھے جس سے میرے غم کا علاج ہو جائے۔ کیا اس دنیا میں آج تک ایسی کوئی دوا ایجاد ہوئی ہے؟'' وہ کالے خان پر پھٹ پڑا۔ سجل نے اس کا یہ انداز ملاحظہ کیا اور کالے خان کو چپکے سے چلے جانے کا اشارہ کیا۔

''انسان غم کا علاج نہیں کر سکتے۔ وہ صرف آپ کے ساتھ آپ کا غم بانٹ سکتے ہیں۔ میں اور خان بھائی بھی یہی کوشش کر رہے ہیں۔''

''میں جانتا ہوں لیکن اس وقت مجھے خود پر قابو نہیں ہے۔'' وہ اس کے ٹوکنے پر شرمندہ سا ہو گیا۔

''کوئی بات نہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ جس نے درد دیا ہے، وہ اس درد کا مداوا بھی ضرور کرے گا۔'' اس نے سوپ کے پیالے کا ڈھکن ہٹاتے ہوئے بڑے یقین سے کہا۔

''مداوا تو اب بس صرف اسی ایک صورت میں ہو سکے گا کہ میں اپنے پیاروں کے قتل میں ملوث ہر شخص کو جہنم واصل کر ڈالوں۔'' اس کے چہرے پر شدید نفرت جھلکی۔

''اس کام کے لیے تو آپ کو بہت سی توانائی درکار ہوگی۔ کھا پی کر جان بنائیے تاکہ آپ کی جان اس بستر سے چھوٹے۔'' سوپ کی کچھ مقدار ایک چھوٹے پیالے میں منتقل کرتے ہوئے اس نے نرمی سے سمجھایا اور پیالے میں چمچ رکھتے ہوئے اسے اس کی طرف بڑھایا لیکن وہ ویسے ہی بیٹھا رہا۔

''پلیز، لیجیے نا۔ بہت خلوص سے آپ کے لیے بنایا ہے۔'' اس نے اصرار کیا تو وہ مزید انکار نہیں کر سکا۔ جو چلے گئے تھے، ان کے غم میں وہ اسے مایوس نہیں کر سکتا تھا جو اس کا غم بانٹنے کے لیے بنا کسی رشتے کے یہاں تک چلی آئی تھی۔

''اعظم کہاں ہے؟ اسے ساتھ نہیں لائیں؟'' اس نے ایک بار پھر خود پر سے دھیان ہٹانے کی کوشش کی۔

''وہ سو رہا تھا۔ میں شلپا کو ہدایت دے آئی ہوں۔ اٹھے گا تو وہ اسے سنبھال لے گی۔'' اس نے معاذ کے سوال کا جواب دیا پھر آہستہ سے ٹوکا۔

''پلیز! پی لیجیے نا۔ ٹھنڈا ہو گیا تو بدمزہ ہو جائے گا۔''

''جی، لے رہا ہوں۔'' معاذ نے ایک گہرا سانس لیا اور سوپ سے بھرا چمچہ منہ کی طرف لے گیا۔ خوراک کا پہلا چمچہ منہ میں گیا تو اسے احساس ہوا کہ اس کا پیٹ بالکل خالی تھا۔

''کیسا ہے سوپ؟'' سجل کو نہ تو اتنی باتیں کرنے کی عادت تھی اور نہ ہی وہ کسی سے اس قدر بے تکلف ہوتی تھی لیکن معاذ کا غم بانٹنے کی دلی خواہش اسے بولتے رہنے پر مجبور کر رہی تھی۔

''اس سوپ کو پی کر مجھے اپنی امی کی یاد آ گئی۔ ان کے ہاتھ میں بے حد ذائقہ تھا۔ جو بھی بناتی تھیں، لاجواب ہوتا تھا۔ بریانی بنانے میں تو ان کا کوئی ثانی ہی نہیں تھا۔'' اسے کتنا ہی بہلانے کی کوشش کی جاتی لیکن اس وقت صورتِ حال یہ تھی کہ اپنوں کے چہرے مسلسل اس کی نظروں کے سامنے گھوم رہے تھے۔

''ماں کی تو بات ہی دنیا میں سب سے جدا ہوتی ہے۔ ماں کی صورت دیکھ کر ہی دل میں ٹھنڈک پڑ جاتی ہے۔ میں بھی شدت سے اس دن کی منتظر ہوں جب پاکستان واپس جاؤں گی اور اپنی اماں سائیں سے ملوں گی۔''

''ان شاء اللہ وہ دن بہت جلد آئے گا۔ میں پوری کوشش کر رہا ہوں عالم اور سرمد قید سے آزاد ہو جائیں تاکہ آپ کے پیروں میں پڑی نادیدہ زنجیریں ٹوٹ سکیں۔'' اس کے جواب سے ظاہر تھا کہ سجل اس کی توجہ پلٹانے کی کوشش میں کامیاب ہو چکی ہے۔

''مجھے بہت ضروری ایک جگہ پہنچنا ہے۔'' اسے یاد آ گیا تھا کہ دیوا کے ہاں راکا موہن مہمان تھا۔

''لیکن آپ کی طبیعت؟'' سجل نے اسے جلدی جلدی سوپ ختم کرتے دیکھ کر ٹوکا۔

''میرے مرض کا اب ایک ہی علاج ہے۔ اپنے ان دشمنوں کو نیست و نابود کر ڈالنا جنہوں نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا ہے۔ میں اب جیوں گا تو صرف اس لیے کہ مجھے ان پر جینا حرام کرنا ہے۔'' اس کے لہجے میں ایسا عزم اور اٹل پن تھا کہ سجل کی کچھ کہنے کی ہمت نہ ہو سکی۔

''کالے خان.....!'' سوپ کا پیالہ خالی کر کے ٹرالی میں واپس رکھتے ہوئے اس نے کالے خان کو پکارا اور خود بستر چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ سجل بھی مضطرب سی کھڑی ہو گئی۔ چادر کے نقاب سے جھانکتی اس کی آنکھوں سے ظاہر تھا کہ وہ اس موقع پر کچھ کہنے کی خواہش رکھتی ہے لیکن کہنے کی ہمت نہیں کر پا رہی۔

''انہیں ان کی رہائش گاہ پر چھوڑ آؤ اور خیال رکھنا کہ آئندہ کسی انتہائی ضرورت کے بغیر انہیں وہاں سے باہر نہ نکلنا پڑے۔ ان کا تحفظ میری جان سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔ انہیں کوئی نقصان پہنچا تو میں کسی اور کو تو کیا، خود کو بھی معاف نہیں کروں گا۔'' کالے خان کی آمد کے ساتھ اس نے اسے جو ہدایات دینی شروع کیں، ان میں سخت تنبیہہ تھی۔ وہ سمجھ سکتا تھا کہ کالے خان نے اسے سنبھالنے کی خاطر سجل کو یہاں بلوایا تھا اور یہ سچ تھا کہ سجل کی موجودگی نے اسے بے حد سنبھالا دیا تھا لیکن وہ یہ کیسے گوارا کرتا کہ کسی بھی وجہ سے اس کا تحفظ خطرے میں پڑ جائے۔

''آپ میرے لیے اتنے پریشان نہ ہوں۔ نہ ہی خان بھائی کو کچھ کہیں۔ انہوں نے تو مجھے صرف آپ کے گھر والوں کے بارے میں اطلاع دی تھی۔ یہاں آنے کا فیصلہ میں نے ایک اخلاقی فریضہ سمجھتے ہوئے خود کیا تھا۔'' اسے معاذ کی آنکھوں میں بولتے جذبے اور خاموشی میں چھپی داستان سے پہلے ہی ڈر لگتا تھا۔ آج اس کے الفاظ سے بھی اس کی شدتیں جھلک پڑیں تو کچھ اور بھی خائف ہو گئی لیکن لہجے سے کچھ ظاہر کیے بغیر سنجیدہ اور سپاٹ لہجے میں اسے ٹوک ڈالا۔

''آئندہ ایسا کوئی فریضہ ادا کرنے کی کوشش مت کیجیے گا۔ آپ کو اندازہ نہیں لیکن مجھے معلوم ہے کہ ان حالات میں چپے چپے پر آپ کی تلاش جاری ہوگی۔ اگر آپ پکڑی گئیں تو اب تک کی ساری بھاگ دوڑ رائگاں چلی جائے گی اور ایسا میں ہونے نہیں دوں گا۔'' سجل کے لہجے کی بیگانگی اسے بری طرح چبھی تھی اس لیے خود بھی خفگی سے بولتا چلا گیا۔

''آپ میرے ساتھ آیئے سجل بی بی! میں خود آپ کو آپ کی قیام گاہ تک چھوڑ کر آتا ہوں۔'' کالے خان نے یہ صورت حال دیکھی تو خود درمیان میں دخل دے بیٹھا۔

''جی بالکل، چلیے۔'' اس نے فوراً اپنے قدم دروازے کی طرف بڑھائے۔

''اپنا خیال رکھیے گا سجل!'' معاذ بے ساختہ ہی پیچھے سے پکارا تو وہ پل بھر کو ٹھٹک کر رکی پھر سر کو اثبات میں جنبش دیتی ہوئی باہر نکل گئی۔

''میں بھی جا رہا ہوں۔ کب تک واپسی ہوگی، کہہ نہیں سکتا لیکن تم جتنی جلدی ممکن ہو سکے، میرا ایک کام کر دینا۔'' اس نے کالے خان کو کام کی نوعیت سے آگاہ کیا۔

''ٹھیک ہے۔ پہلے میں سجل صاحبہ کو ڈراپ کر دوں، پھر آپ کا کام دیکھوں گا۔'' کالے خان نے گو اسے انکار نہیں کیا تھا لیکن اس کے لہجے سے ظاہر تھا کہ وہ بھی اس کے رویے سے تھوڑا سا ہرٹ ہوا ہے۔

''زندگی پہلے ہی خفا ہے یار! اب تم تو خفا نہ ہو۔'' اس نے بے ساختہ ہی کالے خان کے بازو پر ہاتھ رکھ کر محبت سے کہا تو وہ مسکرا دیا اور دھیرے سے اس کا ہاتھ تھپک کر باہر نکل گیا۔

☆☆☆

''اس کو کیا ہوا ہے؟'' اس کے سینے میں ایسی آگ جل رہی تھی کہ ایسے لگتا تھا سامنے آنے والے ہر دشمن کو ادھیڑ کر رکھ دے گا۔ دل میں نفرت کا ایک طوفان لیے ہی وہ دیوا کی طرف گیا تھا اور جاتے کے ساتھ موہن سے ملاقات کی خواہش کی تھی لیکن اس سے سامنا ہونے پر بری طرح ٹھٹک گیا تھا۔ وہ اس حالت میں بستر پر لیٹا ہوا تھا کہ اس

کے ہاتھ پیروں پر پلاسٹر چڑھا ہوا تھا اور چہرے پر بھی زخم دکھائی دے رہے تھے۔

''بھاگنے کی کوشش میں اوپر سے گر کر ہاتھ پیر تڑوا بیٹھا ہے۔'' دیوا نے مختصراً اس کے سوال کا جواب دیا۔ چہرے سے بھی وہ کچھ ناخوش دکھائی دیتا تھا۔

''کوئی کام کی بات بتائی اس نے؟'' معاذ نے اس کے چہرے کے تاثرات کو نوٹ کیا اور سنجیدگی سے پوچھا۔

''بڑا ڈھیٹ بندہ ہے۔ ہم سمجھتے تھے پتنی کا دیوانہ ہے۔ اسے بچانے کی خاطر زبان کھول دے گا لیکن سالے نے صاف جواب دے دیا کہ چاہے میری اور میری پتنی کی چمڑی ادھیڑ دو، تمہاری بات نہیں مانوں گا۔''

''بیوی کہاں ہے اس کی؟''

''وہیں اپنے گھر میں۔ ہماری دو ٹرینڈ عورتیں سائے کی طرح اس کے ساتھ ہیں۔ آس پاس میں مشہور کر دیا ہے کہ اس کی موسی کی لڑکیاں ہیں اور کچھ دن رکنے کے لیے آئی ہیں۔ دفتر والوں کو یہی اطلاع ہے کہ موہن بائک سے گر کر زخمی ہے اس لیے چھٹی پر ہے۔ موبائل بھی حادثے میں خراب ہونے کا بہانہ بنایا ہے۔''

''ہمم.....'' معاذ نے ساری تفصیل سن کر ایک پُرسوچ ہنکارا بھرا پھر بستر پر آنکھیں بند کیے لیٹے ہوئے موہن کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ابھی یہ اٹھانے سے اٹھ جائے گا؟ میرا مطلب ہے بے ہوشی کی تو کوئی دوا نہیں دے رکھی ہے؟''

''بے ہوش نہیں ہے، بس نیند کی دوا دے رکھی ہے۔ ایک الٹے ہاتھ کا دیں گے تو آنکھیں کھول دے گا۔''

''اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں اکیلے میں اس کی زبان کھلوانے کی ایک کوشش کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے دیوا سے فرمائش کی۔

''اعتراض کیسا۔ اصل میں تو یہ تمہارا لفڑا ہے۔ ہماری سیفٹی کا دھیان کرتے ہوئے تم جیسے چاہو، اس کیس کو ہینڈل کر سکتے ہو۔'' دیوا نے خوش دلی سے اسے جواب دیا اور وہاں موجود اپنے دونوں بندوں کو ساتھ آنے کا اشارہ کرتے ہوئے باہر نکل گیا۔ ان لوگوں کے باہر چلے جانے کے بعد معاذ نے سب سے پہلے اس کمرے کا دروازہ اندر سے بند کیا پھر کیمرے کی موجودگی کا اندازہ لگانے کے لیے پورے کمرے میں نظریں دوڑائیں۔ کسی خفیہ کیمرے کی موجودگی کے آثار نہ پا کر وہ موہن کی طرف متوجہ ہوا۔

''موہن..... موہن۔'' پہلے اس نے موہن کے رخساروں کو تھپتھپا کر اسے دھیمی آواز میں پکارا لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا تو اندر کے غصے کو باہر نکلنے کا راستہ مل گیا۔

''موہن.....!'' بلند اور سخت لہجے میں پکارنے کے ساتھ ہی اس نے پوری قوت سے موہن کے دائیں رخسار پر ایک تھپڑ جڑ دیا۔ وہ ہڑبڑا کر جاگا اور بے ساختہ ہی اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی لیکن بستر سے بندھے ہوئے ہاتھ پیروں کی وجہ سے وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔

''موہن.....!'' اس بار معاذ نے اسے ایک خاص ردھم سے پکارا اور بستر پر ذرا سا جھکتے ہوئے اپنی آنکھیں اس کی آنکھوں میں گاڑ دیں۔ موہن عجیب کھوئی کھوئی سی نظروں سے اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ اس کے آگے کا مرحلہ معاذ کے لیے زیادہ دشوار نہیں تھا۔ فیضو کے سکھائے ہوئے علم کی مدد سے اس نے ''را'' کے ایک اہم اہلکار کو زبان کھولنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ممکن تھا کہ موہن مکمل ہوش میں ہوتا تو اسے یہ کامیابی حاصل نہ ہوتی لیکن نیند کی گولیوں کے زیر اثر وہ ایسی حالت میں پھنس گیا تھا کہ معاذ کی آنکھوں سے نکلتی مقناطیسی لہروں کی کشش کے مقابلے میں کوئی مزاحمت کرنے کے لائق نہیں تھا۔ معاذ اس سے جو سوالات کرتا گیا، وہ بلا تامل ان کے جوابات دیتا چلا گیا۔ ہر ضروری سوال کرنے کے بعد اس نے موہن کو پُرسکون نیند سو جانے کی تاکید کی اور خود تھکا تھکا سا ایک کرسی پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا۔ اس وقت اس کے دماغ کی حالت اچھی نہیں تھی۔

''مجھ سے جانے کیوں کوتاہی ہو جاتی ہے۔ اگر فیضو چاچا کی ہدایت کے مطابق روزانہ بلاناغہ ستارہ بینی کی مشق کرتا رہوں تو ایسے مواقع پر میرا یہ حال نہ ہو۔'' اس نے اپنی حالت محسوس کر کے خود کو گھرکا لیکن حقیقت یہ تھی کہ مستقبل میں بھی پابندی سے مشق کرنے کے امکانات کم ہی تھے۔ اس کی متحرک اور مشکل پسند فطرت ایسی آسانیوں کی طرف مشکل ہی سے جاتی تھی۔ وہ عمل کا بندہ تھا اس لیے پراسرار علوم سے زیادہ اپنے قوت بازو پر ہی انحصار پسند کرتا تھا۔

☆☆☆

''کہاں بھگایا ہے سجل کو؟ کون تھا وہ جو اسے اسپتال سے نکال کر لے گیا؟'' گھر کی بیٹھک میں عدالت سجی تھی اور فردوس اس عدالت کے روبرو کھڑی اپنے شوہر کو خود پر چیختا چلاتا دیکھ رہی تھی۔

''آپ مجھ پر اتنا بڑا الزام کس بنیاد پر لگا رہے ہیں؟ آپ جانتے ہیں کہ سجل کو اغوا کیا گیا ہے اور میں تو اس دن

سرے سے اسپتال ہی نہیں گئی تھی۔'' فردوس کے لیے یہ باز پرس غیر متوقع نہیں تھی اس لیے بڑے اعتماد سے جلیل کے سوال کا جواب دیا۔

''ہمیں بچہ مت سمجھو فردوس! ہم اتنے بے وقوف نہیں ہیں کہ یہ بات نہ سمجھ سکیں کہ اس روز تم جان بوجھ کر اسپتال نہیں گئی تھیں۔'' اس بار شکیل نے تفتیش میں حصہ ڈالا اور جلیل کے لگائے گئے الزام کو درست ثابت کرنے کے لیے دلیل دی۔ الزام تراشی ان کے انداز میں بھی تھی لیکن فرق صرف یہ تھا کہ وہ جلیل کی طرح چیخنے چلانے کے بجائے سرد لہجے میں گفتگو کررہے تھے۔

''ڈیوٹی چارٹ میں اپنی مرضی سے ترتیب نہیں دیتی۔ آپ جس سے چاہے پوچھ سکتے ہیں کہ اس دن میری ڈیوٹی نہ ہونے میں میرا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔'' اس نے خود کو ہر سوال کے جواب کے لیے تیار کررکھا تھا۔

''آپ تو ڈیوٹی کے بغیر بھی اس کے بستر کی پٹی سے لگی بیٹھی رہتی تھیں پھر اس دن ایسا کیا تھا کہ آپ اپنی لاڈلی کی تیمارداری کے لیے اسپتال جانے کے بجائے گھر میں بیٹھی رہیں۔'' اس کا جواب سن کر فیصل نے تیز لہجے میں طنز کا تیر چلایا۔

''پہلے اس کی حالت زیادہ خراب تھی اس لیے میں اسے فل ٹائم دے رہی تھی۔ بعد میں وہ کچھ بہتر ہوگئی تو میں نے ضروری سمجھا کہ کچھ وقت اپنی بچیوں پر بھی صرف کروں۔ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ صرف اسی دن ہی نہیں بلکہ اس سے پہلے ہی سے میں نے سجل کی دیکھ بھال کی ذمے داری صبیحہ آپا سے بانٹ لی تھی اور یہ اتفاق ہی تھا کہ جس وقت یہ واقعہ پیش آیا، سجل کے پاس صبیحہ آپا ٹھہری ہوئی تھیں۔''

''کیا یہ بھی اتفاق تھا کہ تم نے عین اسی دن اعظم کو سجل سے ملاقات کے لیے لے جانے کی ذمے داری اجالا کو سونپی اور اغوا کار کو سجل کو بچے سمیت اسپتال سے لے جانے کا موقع مل گیا؟'' جلیل اور فیصل کے لہجے کی تندی اتنی خطرناک نہیں تھی جتنا خوف وہ شکیل کے سرد و سپاٹ لہجے اور وجود میں اتر جانے والی نظروں سے محسوس کررہی تھی۔

''آخر میں سجل کو کیوں اور کس لیے اغوا کرواؤں گی؟ اس سے مجھے حاصل ہی کیا ہے؟'' اس نے اپنے خوف کو جھنجلاہٹ کے پردے میں چھپانے کی کوشش کی اور اس کوشش میں اس کی آواز قدرے بلند ہوگئی۔

''تمیز سے بات کرو جاہل عورت! کیا تمہیں ہوش نہیں ہے کہ تم کس سے بات کررہی ہو؟'' جلیل کو تو اسے بے عزت کرنے کا موقع چاہیے ہوتا تھا۔

''سوری! میرا مقصد شکیل بھائی سے بدتمیزی کرنا نہیں تھا لیکن خود پر لگائے گئے غلط الزام پر احتجاج کرنا تو میرا حق بنتا ہے نا؟'' اس کی آواز فوراً پست ہوگئی لیکن اپنا دفاع کرنا بہرحال وہ نہیں بھولی۔

''حفظِ مراتب کو فی الحال جانے دو جلیل اور مجھے اپنی بیگم سے یہ سوال پوچھنے دو کہ کیا اس دن اعظم کو اجالا کے ساتھ اسپتال بھیجنا بھی محض اتفاق ہی تھا؟'' شکیل کسی صورت جواب حاصل کیے بغیر اسے بخشنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

''اگر آپ اس اتفاق کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں تو پھر اجالا اور صبیحہ آپا سے جاکر پوچھیے کہ جب وہ سجل کی تیمارداری کے لیے اسپتال میں موجود تھیں تو اسے چھوڑ کر کینٹین میں بیٹھی دعوت کیوں اڑا رہی تھیں۔ ان کا بھی فرض تھا کہ اس کے ساتھ ساتھ ہی رہتیں۔'' اس کے چہرے کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ اسے ان بھائیوں کی عدالت میں کھڑے ہوکر جواب دینا قطعی پسند نہیں آرہا تھا۔

''بکواس کرتی ہے جاہل عورت! الزام لگاتی ہے میری بہنوں پر۔'' اس کے صاف جواب نے جلیل کو ایک بار پھر ہتھے سے اکھاڑ دیا اور وہ اس کے بال اپنی مٹھی میں جکڑ کر اسے بری طرح جھٹکے دینے لگا۔

''میں کسی پر کوئی الزام نہیں لگا رہی۔ میں صرف اپنی پوزیشن کلیئر کررہی ہوں۔ آپ خود ہی بتائیں کہ اگر اجالا اور صبیحہ آپا، سجل کے ساتھ رہتیں تو کیا وہ سب اتنی آسانی سے ہوسکتا تھا، جو ہوا؟ کیا آپ کو ان دونوں کے منظر سے غائب ہوجانے میں بھی میرا کوئی کردار نظر آرہا ہے؟'' تکلیف کے باوجود اس نے اپنا مقدمہ لڑنا جاری رکھا۔

''تم کچھ بھی کہو فردوس! مجھے معاملہ اتنا سیدھا دکھائی نہیں دے رہا۔ سجل کے اس طرح غائب ہوجانے میں تمہارا کوئی کردار ہو یا نہیں مگر میں یہ سمجھتا ہوں کہ تمہیں کچھ نہ کچھ علم ضرور ہے اور میں تم سے وہ کچھ نہ کچھ جاننا چاہتا ہوں۔''

''آپ ایک بالکل بے بنیاد بات کررہے ہیں۔'' اس نے شکیل کی اندر تک اتر جانے والی نظروں سے آنکھیں چرائیں اور جلیل سے مخاطب ہوکر بولی۔

''پلیز! میرے بال چھوڑ دیں۔ مجھے تکلیف ہورہی ہے۔''

''اگر تو نے شکیل بھائی کے سوالوں کا سیدھا

جواب نہیں دیا تو میں تیری کھال بھی اتار سکتا ہوں۔'' جلیل نے بڑی بے دردی سے اس کے بالوں کو ایک اور زوردار جھٹکا دیا۔

''بات کو سمجھو فردوس! تم اس خاندان کی بہو ہو اور خاندان کے مفادات کا خیال رکھنا تمہارا فرض ہے۔ سجل کے اس طرح غائب ہونے سے ہمارے لیے مسائل بڑھ جائیں گے۔ ابھی تو میں نے کسی نہ کسی طرح پولیس والوں کو گھر کی عورتوں سے دور رکھا ہوا ہے لیکن اگر انہیں شک ہو گیا کہ اس معاملے میں گھر کی کوئی عورت شامل ہے تو وہ کسی رعایت سے کام نہیں لیں گے۔ تم نے فلموں میں پولیس کے مجرموں پر تشدد کے جتنے سین دیکھے ہوں گے، انہیں کم سے کم چار سے ضرب دو گی تو اصل حالات کو سمجھ سکو گی۔ پولیس والوں کے ٹارچر کو برداشت کرنا عادی مجرموں کے لیے بھی آسان نہیں ہوتا، تم تو پھر ایک کمزور عورت ہو۔'' جلیل کے طرزِ عمل سے مکمل چشم پوشی کرتے ہوئے شکیل نے اسے سمجھانے بلکہ کسی حد تک ڈرانے کا سلسلہ جاری رکھا۔

''مجھ پر شک کیا ہی کیوں جا رہا ہے؟ صرف اس لیے کہ اس بے حس خاندان میں، میں وہ واحد فرد تھی جو اس مظلوم لڑکی سے ہمدردی رکھتی تھی؟ میں نے اس کے زخم زخم وجود پر مرہم رکھنے کی کوشش کی تھی یا پھر اس لیے کہ میں اسے یہاں سسک سسک کر مرتا ہوا نہیں دیکھ سکی تھی اور اس کے نیم مردہ جسم کو اٹھا کر اسپتال لے گئی تھی۔'' غصے کے باعث اس کی آواز خاصی بلند ہو گئی تھی۔

''آواز نیچی رکھو، ورنہ گلا دبا دوں گا۔'' جلیل سے اس کا زور سے بولنا برداشت نہیں ہوا اور ایک بار پھر بالوں کو جھٹکا دیا۔

''دبا دیں گلا ورنہ آنے والے کل میں آپ میری زبان کو بند نہیں رکھ سکیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ میں خود ہی پولیس کے سامنے پیش ہو جاؤں اور بیان دوں کہ سجل کو اپنے شوہر فیصل اور دیگر سسرالی رشتے داروں سے شدید جانی خطرہ ہے۔ فیصل شادی کے بعد اسے متعدد بار تشدد کا نشانہ بنا چکا ہے۔ وہ اس پر باپ سے وراثت میں حصہ لینے پر زور دیتا رہا ہے اور اب بھی مجھے شک ہے کہ اس نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے سجل کو اغوا کروا کر کسی خفیہ جگہ پر رکھا ہوا ہے تاکہ بلا روک ٹوک بذریعہ تشدد اس سے اپنا مطالبہ تسلیم کروا سکے۔''

جلیل جس طرح اپنے بھائیوں کے سامنے اسے تشدد کا نشانہ بنا رہا تھا اور وہ بغیر کسی ردِعمل کے یہ سب ہوتا

موسم کی دلربا ادائیں

جنوری 2022ء

کے شمارے کی رونقیں

سرخ رات

نئے سال کی پہلی رات کا امتحان..... بے نشان، بے خطا جرم ساز کی فتنہ انگیز کارروائیاں..... **امجد رئیس** جیسے قلمکار کی ایک اور ناقابلِ فراموش داستان

شعلہ زن

بے بسی کے اندھیروں میں ڈوبتی لڑکی کی دردناک داستانِ حیات..... **روبینہ رشید** کے قلم کی جادوگری

الاؤ

مسیحاؤں کے بھیس میں شاطر مجرموں کا کھیل..... زندہ انسانوں کے لیے دہکتے الاؤ کی صورت موت تیار کی جا رہی تھی..... **ڈاکٹر عبدالرب بھٹی** کے قلم سے نیا سنسنی خیز سلسلہ

سرورق کے رنگ

پہلا رنگ

وقت کی راسیں ان کے ہاتھوں میں تھیں۔ احساسِ برتری کے خمار نے منزل کو دور کر دیا۔ **اسما قادری** کی کاوش

دوسرا رنگ

نئے سال کے حالات و واقعات میں رنگا سرورق، **حسام بٹ** کے قلم سے

چینی نکتہ چینی

آپ کے تبصرے... مشورے... محبتیں... شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کتھائیں

دیکھ رہے تھے، اس چیز نے فردوس کے اندر غم و غصہ بھر دیا تھا اور اس غصے کی کیفیت میں جو اس کے دل میں آ رہا تھا، بولتی چلی جا رہی تھی۔

''تیری یہ مجال کہ ہمارے گھر میں کھڑی ہو کر ہمیں ہی دھمکیاں دے۔ میں تجھے اس لائق ہی نہیں چھوڑوں گا کہ تُو کہیں جا سکے اور ہمارے خلاف زبان کھول سکے۔''

فردوس کی جرأت نے جلیل کو چراغ پا کر دیا اور اس کے رخساروں پر متعدد طمانچے رسید کرنے کے ساتھ اسے دھکا دے کر نیچے گرا دیا۔ نیچے گرانے کے بعد وہ اس پر چڑھ کر بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھوں سے اس کے گلے پر دباؤ ڈالنے لگا۔ اس منظر نے کھڑکی کی جھری سے سب کچھ دیکھتی شاہدہ کے جسم میں کپکپی پیدا کر دی اور وہ خوف کی شدت سے ہانپتی کانپتی مدد کے لیے بھاگی۔ اس کا پہلا ٹکراؤ ہی اجالا سے ہوا۔

''کیا ہو گیا ہے؟ تمہارے چہرے پر ایسے ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں؟'' اجالا نے اس کے چہرے پر ثبت خوف کو دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔

''وہ..... بی بی.....!'' شاہدہ کے منہ سے بہ مشکل الفاظ ادا ہو رہے تھے۔

''کیا ہوا ہے؟ کیا کوئی بھوت دیکھ لیا ہے؟'' اجالا نے اسے جھنجوڑا۔

''وہ جلیل صاحب..... وہ..... وہ فردوس بی بی کو بری طرح مار رہے ہیں۔ وہ انہیں جان سے مار دیں گے۔'' آخر کار شاہدہ صورتِ حال بیان کرنے میں کامیاب ہو ہی گئی۔

''کیا.....؟'' یہ سن کر اجالا کی بھی سٹی گم ہو گئی پھر وہ تیزی سے حرکت میں آئی۔ ''کہاں ہیں وہ؟ آؤ چلو میرے ساتھ۔''

''شکیل صاحب کی بیٹھک میں جی۔'' شاہدہ نے بتایا اور ہانپتی کانپتی اس کے ساتھ چل پڑی۔ صورتِ حال ایسی تھی کہ اجالا کو کمرے کے دروازے پر پہنچ کر دستک تک دینے کا خیال نہ آیا اور اس نے ایک جھٹکے سے دروازے کو چوپٹ کھول دیا۔ شاہدہ البتہ نظروں میں آنے سے بچنے کے لیے دروازے کے ایک طرف ہو گئی تھی۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' اجالا نے کمرے میں قدم رکھا اور اندر کا منظر دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ فردوس نیچے قالین پر ہوش و حواس سے بیگانی، بے حرکت پڑی تھی اور جلیل اس حالت میں اس سے چند قدم دور کھڑا ہوا تھا کہ اس کی سانس اس کے سینے میں نہیں سما رہی تھی۔ چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور اس کے ایک ایک بازو کو شکیل اور فیصل نے جکڑ رکھا تھا۔

''بھابی کو کیا ہوا ہے؟'' کمرے میں موجود نفوس نے اس کے پہلے سوال کا جواب نہیں دیا لیکن وہ دوسرا سوال کرتی ہوئی گھٹنوں کے بل فردوس کے قریب بیٹھ گئی تھی۔

''بھابی..... بھابی اٹھیں۔'' اس نے کچھ گھبرا کر فردوس کو آوازیں دینا شروع کیں اور دھیرے دھیرے اس کے رخساروں کو تھپتھپایا۔ اس عمل کے دوران وہ فردوس کے رخساروں پر چھپے انگلیوں کے نشانات دیکھ چکی تھی پھر اس کی گردن پر موجود نشانات بھی اس کی نظر میں آ گئے۔

''کیا..... کیا ہوا ہے انہیں؟ کیا یہ مر گئی ہیں؟'' وہ کچھ خوفزدہ سی ہو کر پیچھے ہٹی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے بھائیوں کو دیکھتی ہوئی مستفسر ہوئی۔

''کچھ نہیں ہوا ہے۔ صرف بے ہوش ہے۔'' شکیل نے اسے جواب دیا اور فیصل کو اشارہ کیا کہ وہ جلیل کو لے کر وہاں سے چلا جائے۔ فیصل اس کے اشارے کو سمجھتے ہوئے فوراً حرکت میں آ گیا جبکہ شکیل نے اجالا کے ساتھ ہی فردوس کے قریب بیٹھتے ہوئے اس کی کلائی کی نبض پر ہاتھ رکھا۔

''مری نہیں، زندہ ہے۔ نبض چل رہی ہے۔''

''مگر مجھے تو ایسا لگ رہا ہے کہ انہیں سانس نہیں آ رہی۔'' اجالا کو بڑے بھائی کے بیان نے مطمئن نہیں کیا۔

''ایسا کچھ نہیں ہے۔ تم خوامخواہ پریشان مت ہو۔ میں ڈاکٹر کو کال کرتا ہوں۔'' سپاٹ سے لہجے میں اسے جواب دیتے ہوئے شکیل خود بھی قدرے پریشانی کا شکار ہو چکے تھے۔ بے شک فردوس کی نبض چل رہی تھی لیکن اس کی رفتار بے حد سست تھی۔

''کیا انہیں جلیل بھائی نے مارا ہے؟'' شکیل کے کال سے فارغ ہونے کے بعد اجالا نے دریافت کیا۔

''فضول باتوں میں وقت ضائع مت کرو۔ میری اپنے ایک جاننے والے ڈاکٹر سے بات ہو گئی ہے۔ وہ اپنی ایمبولینس بھجوا رہا ہے۔ ہم فردوس کو اس کے اسپتال میں شفٹ کر دیں گے۔''

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اس گھر میں کیا ہو رہا ہے؟ ابا جی نے تو کبھی یہ رویہ نہیں اپنایا پھر ان کے بیٹوں میں یہ عادت کہاں سے آ گئی کہ اپنی بیویوں کو عزت دینے کے بجائے انہیں ٹھوکروں میں رکھنے لگے۔'' وہ فردوس کی ہتھیلیوں کو سہلاتی روتی بھی جا رہی تھی اور بولتی بھی جا رہی تھی۔

''خاموش رہو۔ اگر یہ بکواس کسی اور کے سامنے کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔'' شکیل نے اسے سرد لہجے میں دھمکایا تو اسے اپنے لب سینے پڑے۔ وقت کے پلٹا کھا جانے نے اسے یوں خاموش ہوجانا بھی سکھا دیا تھا۔ اب وہ، وہ اجالا نہیں رہی تھی جس کی تیوری کے بل پورے گھر کو ہلا ڈالتے تھے۔ ایک طرف سیل والے معاملے نے اس کی نظریں سب کے سامنے جھکا دی تھیں تو دوسری طرف نیاز شاہ کی عدم موجودگی نے اس کی حیثیت بدل دی تھی۔ ان چند دنوں میں ہی اس نے جان لیا تھا کہ مردوں کے اس معاشرے میں عورت بس اسی وقت تک سر چڑھی ہوتی ہے جب تک اسے سپورٹ کرنے والا مرد طاقتور مقام پر ہو۔ اس کی حکمرانی بھی اپنے ابا جی کے بل پر تھی۔ وہ منظر پر نہیں رہے تھے تو سارا منظر ہی بدل گیا تھا۔

''میرے خیال میں ایمبولینس آگئی ہے۔ تم یہ رونا دھونا بند کرو اور اسے کوئی چادر اوڑھا دو تاکہ طریقے سے اسپتال شفٹ کیا جاسکے۔'' چند منٹ گزرے تو شکیل نے باہر ایمبولینس کے سائرن کی آواز سن کر اسے حکم دیا۔ اس نے حکم کی تعمیل کی۔ فردوس کو ایمبولینس میں منتقل کرنے کے لیے شاہدہ سمیت دیگر ملازماؤں کو بلانا پڑا تھا۔ ملازمین کے ساتھ ساتھ گھر کی خواتین کو بھی خبر ہوگئی تھی۔ سب آنکھوں میں تجسس لیے یہ سارا منظر دیکھ رہی تھیں۔

''نسرین! تمہیں میرے ساتھ اسپتال چلنا ہوگا۔ عورت کا معاملہ ہے۔ اس لیے کسی عورت کا ساتھ ہونا ضروری ہے۔'' شکیل نے اپنی بیگم کو حکم دیا اور خود گاڑی کی چابیاں اٹھالیں۔ اس عرصے میں فردوس کو ایمبولینس میں منتقل کرکے آکسیجن لگا دی گئی تھی۔

''میں بھی ساتھ چلوں بھائی؟'' اجالا نے اجازت طلب کی۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تمہاری بھابی تجربہ کار ہیں۔ وہ زیادہ بہتر طور پر فردوس کی دیکھ بھال کرسکتی ہیں۔'' شکیل نے رکھائی سے جواب دیا۔ حقیقتاً فردوس کے لمحہ بہ لمحہ نیلے پڑتے چہرے نے انہیں بھی تشویش میں مبتلا کردیا تھا۔ ایسے میں انہیں خدشہ تھا کہ کہیں اجالا کو ساتھ لے جانے سے معاملہ خراب نہ ہوجائے۔ اپنی بیگم کو تو وہ راستے میں بریف کردیتے تو وہ ان کی منشا کے خلاف کسی کے سامنے زبان سے ایک لفظ نہ نکالتیں۔

''گھر سے باہر کوئی بات نہ نکلنے پائے۔ اگر میں نے کہیں سے کچھ بھی سنا تو ایک ایک کی کھال اتار کر رکھ دوں گا۔'' ایمبولینس کے پیچھے روانہ ہونے سے قبل شکیل سب کو دھمکانا نہیں بھولے تھے۔ اتفاق سے یہ وقت بھی ایسا تھا کہ فردوس کی بچیوں سمیت گھر کے بیشتر بچے اپنے اسکولز اور کالجز میں تھے اس لیے تھوڑی سی کوشش سے بات کو گھر سے باہر نکلنے سے روکا جاسکتا تھا۔

ان کی اسپتال روانگی کے بعد گھر میں چہ میگوئیوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ خواتین نے اجالا سے تفصیلات جاننا چاہیں لیکن وہ کسی کو کچھ بھی بتائے بغیر اپنے کمرے میں بند ہوگئی اور یہ طے تھا کہ جب اجالا کچھ نہ بتانا چاہے تو کوئی اس سے اگلوا نہیں سکتا تھا۔ سارے واقعے کی اصل چشم دید گواہ شاہدہ نے تو منہ سے بھاپ بھی نہیں نکالی تھی کہ اسے کسی بات کا علم ہے۔ وہ خود کو دیگر ملازماؤں کی طرح انجان ظاہر کرتی ہوئی معمول کے کام کاج نمٹا رہی تھی لیکن اندر سے بے حد خوفزدہ ہوچکی تھی۔ اسے احساس ہورہا تھا کہ سجل والے معاملے میں اس نے جو کردار ادا کیا تھا، وہ اس کے لیے مصیبت بھی بن سکتا تھا۔ فردوس کے حکم پر وہ اس موبائل فون کو سم سمیت تلف کرچکی تھی جس کے ذریعے معاذ سے رابطہ رہتا تھا پھر بھی اندیشے اندر ہی اندر لرزا رہے تھے۔ فردوس کا حال دیکھ کر وہ سوچنے پر مجبور ہوگئی تھی کہ اگر شک کا کانٹا اس پر آرکا تو پھر اس کا انجام کیا ہوگا؟ اسے اپنے ساتھ تو ذرہ برابر رورعایت کی گنجائش دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

''آج کی رات چھٹی دے دیں بی بی! جی عجیب طرح سے گھبرا رہا ہے۔ گھر اور بچوں کی یاد بھی آرہی ہے۔'' مسلسل ذہنی تناؤ نے اسے اتنا ستایا کہ وہ شام ڈھلے نسرین سے چھوٹی بہو شازیہ کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور لجاجت سے اس سے درخواست کی۔

''لیکن آج تو تمہاری چھٹی کا دن نہیں ہے پھر نسرین بھابی بھی گھر پر موجود نہیں ہیں۔ تمہارے بے وقت چھٹی کرنے سے وہ ناراض نہ ہوجائیں۔'' شازیہ نے تذبذب کا مظاہرہ کیا۔

''وہ کیوں ہوں گی ناراض؟ کیا آپ کا کوئی اختیار نہیں ہے؟ آپ بھی تو ان کی طرح اس گھر کی بہو ہی ہیں نا۔'' شاہدہ برسوں سے گھریلو ملازمہ کے طور پر کام کررہی تھی اور اسے معلوم تھا کہ کون سا کام نکلوانے کا کیا گر تھا۔ یہاں بھی اس نے شازیہ کو ذرا سا چڑھا کر اپنا مقصد آسانی سے پورا کرلیا۔

''اچھا ٹھیک ہے۔ چلی جاؤ لیکن دھیان رکھنا کہ کل صبح گیارہ بجے تک واپس آجاؤ۔'' شازیہ نے اپنے اختیار کو

ثابت کرنے کے لیے نہ صرف اجازت دے دی بلکہ نخوت سے اگلا حکم بھی صادر کیا۔

''آجاؤں گی بی بی! آپ فکر ہی نہ کریں۔'' شاہدہ کو اجازت ملی تو گویا پر لگ گئے۔ ایک رات کی چھٹی گزارنے کے لیے اسے کوئی ساز وسامان تو ساتھ لے جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس لیے اپنا بوسیدہ سا بٹوا سنبھال کر فوراً ہی گھر سے روانہ ہوگئی۔ امراء کا علاقہ ہونے کی وجہ سے آس پاس سے کوئی سواری ملنے کا امکان نہیں تھا۔ جلد از جلد منزل پر پہنچنے کی خواہش میں وہ تیز تیز قدم اٹھاتی اپنی دھن میں آگے بڑھتی جارہی تھی۔ اس لیے اس گاڑی پر قطعاً دھیان نہیں دے سکی جو کسی سانپ کی طرح رینگتی اس کے قریب آئی اور بہت احتیاط سے اسے ہلکے سے سائڈ ماری۔ گاڑی کا یہ ہلکا سا دھکا ہی شاہدہ کو لڑکھڑا کر سڑک پر گرانے کے لیے کافی تھا۔

''ہائے ربا۔ مرگئی میں۔ میرے گوڈے گٹے ٹوٹ گئے۔'' شاہدہ اس ٹکراؤ سے اس قدر دہشت زدہ ہوئی کہ از خود اٹھنے کی کوشش کرنے کے بجائے وہیں سڑک پر پڑی دہائیاں دینے لگی۔

''سوری! میں ذرا جلدی میں تھی اس لیے تم پر نظر نہیں پڑی۔ کیا زیادہ چوٹ آئی ہے؟'' گاڑی اسے ٹکر مارنے کے بعد بھاگی نہیں تھی بلکہ چند قدم آگے جا کر رک گئی تھی اور اس میں سے ایک الٹرا ماڈرن اور خوب صورت عورت اتر کر اس کے قریب کھڑی جھک کر اس سے پوچھ رہی تھی۔

''میرا گوڈا بہت درد کر رہا ہے بی بی! لگتا ہے ٹٹ (ٹوٹ) ہی گیا ہے۔'' ایک امیر عورت کو اپنی غلطی پر نادم پا کر شاہدہ نے موقع سے فائدہ اٹھانے کا سوچا اور مزید شور مچایا۔ اس کے حساب سے اس کے لیے ایک اچھی بات یہ تھی کہ ایک دو راہ گیر جو اسی کی طرح ملازم پیشہ دکھائی دیتے تھے، اس طرف متوجہ ہو کر قریب آ کھڑے ہوئے تھے۔

''آؤ، میری گاڑی میں بیٹھو۔ میں تمہیں کسی اچھے ڈاکٹر کے پاس لے چلتی ہوں۔'' عورت اس کے شور مچانے پر قدرے خوفزدہ دکھائی دی اور پریشان سے لہجے میں اسے پیشکش کی۔

''صرف علاج معالجہ نہ کروایئے گا بیگم صاحبہ! غریب کو ہرجانے میں کچھ روپے بھی دے دیجیے گا۔ بے چاری اب نہ جانے کتنے دنوں تک کام پر نہیں جا سکے گی اور اس کے آپ کی طرح پیسے والے مالکوں نے کام سے نہ بھی نکالا تو اس کی پگار ضرور کاٹ لیں گے۔'' راہ گیروں میں سے ایک نے کسی مزدور لیڈر کی طرح تقریر جھاڑنے والے انداز میں اسے نصیحت کی۔

''سب ہو جائے گا بھیا! آپ انہیں سہارا دے کر گاڑی میں بٹھانے میں میری مدد کریں، بلکہ رکیں، میں گاڑی ریورس کر کے یہیں لے آتی ہوں تاکہ آسانی رہے۔'' عورت نے خود ہی تجویز پیش کی اور فوراً ہی اس پر عمل بھی کر ڈالا۔ دونوں راہ گیروں نے شاہدہ کو سہارا دے کر کھلے دروازے سے اگلی پسنجر سیٹ پر بٹھایا اور خود پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھنے کی کوشش کی لیکن دروازہ لاک ہونے کی وجہ سے اپنی اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے۔

''مدد کا شکریہ بھائی صاحب!'' ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان عورت نے تمسخرانہ لہجے میں کہا اور تیزی سے گاڑی آگے بڑھا لے گئی۔ ہائے اوئی کرتی شاہدہ نے اس کے انداز کی اس تبدیلی کو محسوس کیا اور چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''مجھے معلوم ہے کہ تمہیں زیادہ چوٹ نہیں آئی ہے لیکن تم میرے گلے پڑنے کے لیے مچل رہی تھیں تو میں نے سوچا تمہاری یہ اچھا پوری کر دوں۔'' وہ عورت جو کچھ دیر قبل حادثے پر خوفزدہ اور پریشان دکھائی دے رہی تھی، اب بالکل مختلف لہجے میں شاہدہ سے مخاطب تھی۔ اس کے انداز کی اس تبدیلی پر شاہدہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو یہ دیکھ کر لرز گئی کہ عورت کے بائیں ہاتھ میں لمبی نال والا پسٹل موجود ہے۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟ کبھی کبھی شکاری خود بھی جال میں آ پھنستا ہے۔'' عورت نے گویا اس کی کیفیت سے حظ اٹھایا۔

''میں آپ کی گل سمجھی نہیں بی بی! کیسا شکار اور کون شکاری؟'' سوال کرتے ہوئے اس کی آواز کانپنے لگی۔

''سمجھ کر تمہیں کرنا بھی کیا ہے۔ بس اتنا جان لو کہ مجھے تم سے کچھ کام تھا اور آج قسمت سے تم میرے ہاتھ آ گئی ہو۔'' ڈرائیونگ کرتی عورت جو کہ سونیا تھی، زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ بولتی شاہدہ کو مزید ہراساں کر گئی۔ معاذ کی تلاش میں اس نے جن نکات پر غور کیا تھا، اس میں سے سب سے اہم اسے یہی لگا تھا کہ معاذ نے سجل کو اسپتال سے ایسے ہی اغوا نہیں کر لیا ہوگا۔ اندر کا کوئی بندہ رہا ہوگا جو اسے سجل کے متعلق اطلاعات فراہم کرتا رہا ہوگا۔ اس اندر کے فرد کے متعلق جاننے کے لیے اس نے ایک ملازم کے ذریعے ہی سیندھ لگائی تھی۔ ملازم کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق گھر میں دو ہی افراد سجل کے قریب تھے۔ ایک

اس کی جیٹھانی ڈاکٹر فردوس اور دوسری ملازمہ شاہدہ۔ ان دو افراد میں سے اس نے شاہدہ کا انتخاب کیا تھا کیونکہ اس کا تجربہ تھا کہ عموماً گھر کے راز ان ملازمین کے ذریعے ہی باہر نکلتے ہیں۔

شاہدہ کے انتخاب کے بعد دوسرا مسئلہ شاہدہ تک رسائی کا تھا۔ معلومات کے مطابق باہر کے کام کاج کے لیے مرد ملازمین ہی کو ذمے داری سونپی جاتی تھی۔ ملازمائیں صرف اپنی ہفتہ وار چھٹی والے دن گھر سے باہر نکلتی تھیں یا اس صورت میں کہ گھر کی خواتین شاپنگ یا کسی دوسری ضرورت کے لیے انہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہیں۔ سونیا نے شاہدہ کو اس کی چھٹی والے دن ہی چھاپنے کا فیصلہ کیا تھا اور اس کے لیے ابھی اسے درمیان کے تین دن انتظار کرنا تھا لیکن اچانک اسے اطلاع ملی کہ آج شاہدہ اتفاقی چھٹی لے کر اپنے گھر جانے کا ارادہ باندھ رہی ہے۔ اس نے اپنی طبیعت کی خرابی کا عذر تراشتے ہوئے چھٹی لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ اطلاع دینے والے کو یقین نہیں تھا کہ اسے چھٹی ملے گی یا نہیں لیکن سونیا نے پچاس فیصد امکان کی بنیاد پر ہی کوشش کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا اور اس کا یہ فیصلہ درست ثابت ہوا تھا۔

''آپ مجھے کہاں لے جارہی ہیں جی؟'' شاہدہ کو اتنا تو اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ اسے کسی اسپتال لے جانے کا ارادہ نہیں رکھتی۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ راستے میں پڑنے والے دو تین اسپتالوں میں سے کسی ایک کا رخ کرسکتی تھی لیکن اس نے ایسا نہیں کیا تھا تو صاف ظاہر تھا کہ اس کے کچھ اور ہی عزائم تھے۔ ان عزائم کو نہ سمجھنے کے باوجود شاہدہ کو اس سے اتنا خوف آرہا تھا کہ وہ خود کو لگنے والی چوٹوں کی تکلیف بھی فراموش کرچکی تھی۔

''پریشان مت ہو۔ میں تمہیں کسی غلط جگہ نہیں لے جارہی ہوں۔ مجھے تم سے بس اپنے چند سوالات کے جواب چاہئیں۔ تم جواب دے دو گی تو میں تمہیں واپس تمہارے گھر بھجوانے کے ساتھ ساتھ انعام بھی دوں گی۔'' اس کی پریشانی دیکھتے ہوئے سونیا نے اس کے ساتھ نرمی اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔

''کیسے سوالات جی؟ اگر آپ میرے مالکوں کا کوئی راز جاننا چاہتی ہیں تو جان لیں کہ میں ایسا ہرگز نہیں کروں گی۔ میں نمک حرام نہیں ہوں۔'' شاہدہ کی چھٹی حس مسلسل خطرے کا الارم بجارہی تھی اور اسے خود ہی ادراک ہوگیا تھا کہ... شکل ہی سے بے حد امیر کبیر دکھتی عورت کو اس جیسی معمولی ملازمہ سے کس نوعیت کا کام ہوسکتا ہے اس لیے پیش بندی کے طور پر پہلے ہی اعلان کردیا تھا۔

''جب تم تنجل کے متعلق معاذ کو اطلاعات فراہم کرتی تھیں، اس وقت تمہاری یہ وفاداری کہاں تھی؟'' سونیا نے اندھا تیر چلایا تھا جو ٹھیک نشانے پر جا کر لگا اور ردعمل میں شدید گھبراہٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے شاہدہ نے چلتی گاڑی کا دروازہ کھول کر اترنے کی کوشش کی لیکن اسے دروازہ لاک ہونے کی وجہ سے اس کوشش میں قطعی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

''میری مرضی کے بغیر تم ہرگز بھی اس گاڑی سے باہر نہیں نکل سکتیں اس لیے بہتر ہوگا کہ آرام سے بیٹھی رہو۔'' سونیا نے اسے تنبیہہ کی۔

''میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ تم مجھے کہیں نہیں لے جاسکتیں۔'' شاہدہ کی حالت بند کمرے میں قید بلی کی سی ہوگئی اور اس نے اپنے انجام کی فکر کیے بغیر سونیا پر حملہ کردیا۔ اس کا حملہ ایک حماقت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس جیسی عام عورت سونیا جیسی عیار اور مکار حسینہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ اس نے ایک ہی وار میں شاہدہ کے حملے کو پسپا کردیا اور وہ اپنی کھوپڑی پر پسٹل کے دستے کی ضرب کھا کر ''ہائے'' کی آواز نکالتے ہوئے بے ہوش ہوگئی۔

ہوش میں آنے پر اس نے خود کو رسیوں سے جکڑا ہوا پایا تو دہشت کا گراف کچھ اور بلند ہوگیا۔ اس بلندی کو اوج تک پہنچانے میں وہاں سجے تشدد کے آلات نے مزید کردار ادا کیا اور کسی لرزے کے مریض کی طرح اس کے جسم کا ایک ایک عضو کانپنے لگا۔

''کیسی ہو شاہدہ؟ ان بندشوں سے تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں پہنچ رہی؟'' الفاظ ہمدردی لیے ہوئے تھے لیکن پوچھنے والی کا لہجہ اتنا سرد و سپاٹ تھا کہ وہ کم فہم عورت بھی ان الفاظ میں خیر سگالی نہ ڈھونڈ سکی۔

''مجھے معاف کردیں بی بی! میں غریب، کمی کمین عورت ہوں۔ میں نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا۔ آپ مجھے یہاں سے جانے دیں۔'' اگر وہ حرکت کرنے کے قابل ہوتی تو ہوا میں چابک کو ایک خاص انداز میں چٹخاتی سونیا کے قدموں میں جا گرتی۔

''معافی ہی معافی ہے بس تم مجھے میرے سوالوں کے درست جوابات دے دو۔'' وہاں وہی ایک مطالبہ تھا۔ اگلے چند منٹوں میں اس نے ثابت کردیا کہ شاہدہ کے پاس سچ بولنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے لیکن سچ نے بھی اسے آگے

بڑھنے میں بہت زیادہ مدد نہیں دی تھی۔ ہاں اتنا ضرور ہوا تھا کہ اسے معلوم ہوگیا تھا کہ اس معاملے میں فردوس کا بھی کردار تھا۔ اس کے علاوہ وہ شاہدہ سے اس کی ضائع ہوجانے والی اس سم کا نمبر حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی تھی جس کے ذریعے وہ معاذ سے رابطے میں رہتی تھی۔

''تمہارے اندر ڈیسنٹنگ پینٹنگ کا کافی کام نکل آیا ہے۔ یہ پیسے رکھ لو۔ تمہارے کام آئیں گے لیکن یاد رکھنا کہ اگر کسی کے سامنے منہ سے ایک لفظ بھی نکلا تو اس کا انجام تمہارے ساتھ ساتھ تمہارے بچوں کو بھی بھگتنا پڑے گا۔''

دل ہی دل میں اپنے آئندہ کا لائحہ عمل طے کرتے ہوئے اس نے ادھ موئی پڑی شاہدہ کو مخاطب کیا۔

''مجھے میرے بچوں کی قسم جی، کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔ بس یہی کہوں گی کہ کسی گڈی نے ٹکر ماردی تھی۔''

''اپنی بات پر قائم رہ کر اپنا ہی بھلا کروگی۔ کسی گڑبڑ کی صورت میں یاد رکھنا کہ میرے ہاتھ اتنے لمبے ہیں کہ میں تمہیں پاتال میں سے بھی کھینچ لاؤں گی۔'' سونیا نے اسے مزید دھمکایا۔ کچھ دیر بعد وہ اسے ایک اسپتال کے قریب اتار کر اپنے ٹھکانے پر واپس آئی تو خود اپنے رویے پر حیران تھی۔ اصولاً معلومات کے حصول کے بعد اسے شاہدہ کو ہلاک کردینا چاہیے تھا لیکن وہ خلافِ معمول اس پر رحم کھا گئی تھی۔ رحم کھانے جیسا مثبت رویہ سونیا خان میں کیسے پیدا ہوگیا تھا، اس سوال کے جواب میں اس کے اندر ایک گہری خاموشی تھی۔ ایسی خاموشی جس کی کوکھ سے کوئی بڑا ہنگامہ جنم لینے کے لیے بے چین تھا۔

☆☆☆

''میں ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہوں۔ گرنے سے سخت چوٹیں آئی ہیں۔ تھوڑے دن اور دفتر سے چھٹی کروں گا۔''

''نہیں، نہیں۔ چھٹا والی کوئی بات نہیں ہے۔ یوں بھی لمبے سے سے چھٹی نہیں لی تو سوچ رہا ہوں آرام کے بہانے ہی گھر میں رہ کر پتنی کے شکوے بھی دور کردوں گا۔''

''بالکل، بالکل۔ پورے ویک کی چھٹی مل جائے تو اچھا ہے کوشش کروں گا کہ کل صبح تمہیں رٹن ایپلیکیشن بھی بھجوادوں۔''

ریکارڈنگ میں سنائی دینے والی آواز بلاشک وشبہ موہن کی تھی۔ دیوا آنکھوں میں حیرت لیے یہ ریکارڈنگ سن رہا تھا۔

''یہ تو تم نے چمتکار کردیا ہے۔'' اس کی حیرت لفظوں میں ڈھلی۔

''چمتکار کہیں یا جو بھی لیکن یاد رکھیں کہ ہمارے پاس بہت زیادہ مہلت نہیں ہے۔ موہن سے حاصل کردہ معلومات میں آپ کو دے چکا ہوں اور ان معلومات کی روشنی میں ہمیں جلد از جلد کوئی اسٹیپ لینا ہوگا کیونکہ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ موہن کتنے عرصے تک ہمارے قابو میں رہے گا پھر ہمیں یہ بھی خیال رکھنا ہوگا کہ کہیں اس کے محکمے والے ہی اس کے غیر معمولی رویے پر نہ چونک جائیں۔''

''اپن سمجھتے ہیں ان سب باتوں کو۔ میرے لوگوں کو تھوڑا سا ہوم ورک اور کرلینے دو پھر بس ایکشن ہی لینا ہے لیکن اب تم کو بھی تھوڑا دھیان کرنا ہوگا۔''

''کیا مطلب؟'' اس نے دیوا کی بات کی وضاحت چاہی۔

''مطلب، اب آنا جانا اور فون کالز سب بند۔ مشن کمپلیٹ ہونے تک اب تم کو بالکل خاموشی سے ادھر ہی رہنا ہے۔''

''ایسے تو پیچھے والے پریشان ہوجائیں گے۔ کم از کم ایک بار اطلاع دینے کے لیے تو مجھے ان سب سے رابطہ کرنے دو۔'' وہ بے چین ہوا۔

''نہیں۔ اب ایک بار بھی نہیں۔ پہلے ہی تم بڑی غلطیاں کرچکے ہو۔ اب میں تمہیں مزید غلطی کا چانس نہیں دے سکتا کیونکہ غلطی کا مطلب ہے ناکامی۔'' دیوا کے بے لچک لہجے میں کچھ ایسا تھا جس نے اسے سوچنے پر مجبور کردیا۔ واقعی وہ جذبات میں پہلے ہی غلطیاں کرچکا تھا۔ اپنی ان غلطیوں کے باعث اگر گرفت میں آجاتا تو عالم شاہ اور سرمد کی آزادی کے مشن کے ساتھ ساتھ اپنے پیاروں کے قاتلوں کو انجام تک پہنچانے کی خواہش بھی ادھوری رہ جاتی۔

''موبائل.....'' دیوا نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس نے خاموشی سے موبائل نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

''اب جا کر سوجاؤ۔ اگر قدرتی طریقے سے نیند نہ آئے تو گولیاں بھی مل سکتی ہیں کھانے کے لیے۔ مقصد صرف یہ ہے کہ صبح تمہیں بالکل فریش ہونا چاہیے۔'' دیوا نے اسے مشورہ دیا تو وہ بنا حیل وحجت وہاں سے اٹھ گیا۔ اس بار بھی اسے رہائش کے لیے وہی پہلے والا کمرا دیا گیا تھا۔ کمرے میں آکر ادھر سے ادھر ٹہلتے ہوئے وہ مختلف سمتوں میں سوچتا رہا۔ کبھی اپنے بچھڑ جانے والے پیاروں کی صورت نظروں کے سامنے لہراتی تھی اور دل پر ایک گھونسا سا لگتا تھا۔ کبھی سجل کا خیال آتا تھا کہ اگر اسے کچھ ہوگیا تو وہ اس دیارِ غیر میں ایک چھوٹے بچے کے ساتھ اپنی بقا کی جنگ کیسے لڑے گی اور کبھی ''را'' کے جبڑوں میں ہاتھ ڈال کر عالم شاہ اور سرمد کو

ان کے قبضے سے نکال لینے کے خیال سے جسم میں بجلیاں کوندنے لگتی تھیں۔ سوچ کی جو بھی سمت تھی، طبیعت کو بے چین کردینے والی تھی۔ آخرکار اس نے دیوا کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اپنے لیے نیند کی گولیاں منگوائیں۔ ایک گلاس دودھ کے ساتھ لی جانے والی ان گولیوں نے اس پر جادو کا سا اثر کیا اور آخرکار وہ پُرسکون نیند سوگیا۔ صبح آنکھ کھلتے ہی ایک آدمی دیوا کا پیغام لے کر آگیا۔ اس کی راہنمائی میں وہ ایک ہال نما کمرے میں پہنچا تو وہاں نصب ورزش کی مشینوں نے اس کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ وہ بھی پہلے سے وہاں موجود لوگوں کے ساتھ شامل ہوگیا۔ اس شدید جسمانی مشقت نے اسے ذہنی طور پر بھی پُرسکون ہونے میں مدد دی۔ سینے میں جو غم و غصے کی آگ بھڑک رہی تھی، اس کا بغیر کسی منطقی سدباب کے بجھ جانا تو ناممکن تھا لیکن اعصابی کشیدگی میں خاصا فرق آیا تھا اور وہ خود کو عملی اقدامات کے لیے بہتر حالت میں محسوس کررہا تھا۔ ورزش کے بعد دیوا نے اسے اپنے ساتھ ناشتا کرنے بلالیا۔

''موہن کی طرف سے کوئی پرابلم تو نہیں ہے؟'' ناشتے کے دوران اس نے دیوا سے دریافت کیا۔

''سب ٹھیک ہے۔ بہت شانتی سے ہے وہ۔ اگر گڑبڑ کرنے کی کوشش کی بھی تو اندر باہر موجود میرے لوگ سنبھال لیں گے۔ جو دو لڑکیاں اس کے گھر پر رکھ چھوڑی ہیں، وہ باری باری نرس بن کر اس کی دیکھ بھال کررہی ہیں۔ میں نے انہیں حکم دے رکھا ہے کہ موہن کی پتنی پر سخت نظر رکھیں اور اسے موقع نہ دیں کہ وہ اس سے کوئی ایسی بات کہہ سکے جو اسے پٹڑی سے اتاردے۔'' دیوا بہت مطمئن تھا حالانکہ جب اس نے موہن کو اس کے گھر پہنچانے اور حالات معمول پر دکھانے کی تجویز دی تھی تو دیوا کو اس سلسلے میں کچھ تحفظات تھے۔ اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ موہن کا دماغ اس حد تک معاذ کے قبضے میں ہے کہ وہ اس کی دی گئی ہدایات کے برخلاف کچھ کرنے کا سوچ بھی نہیں سکے گا لیکن اب عملی طور پر سب دیکھ لینے کے بعد اسے اطمینان ہوگیا تھا۔

''آپ کے بھائی کبھی آپ سے ملنے نہیں آتے؟'' ناشتا کرتے ہوئے اس کی نظر دلیپ کی تصویر پر پڑگئی اور زیرگفتگو موضوع کو چھوڑ کر بے ساختہ سوال کر بیٹھا۔

''تم اس سے ملنا چاہتے ہو؟'' دیوا نے ترنت سوال کے جواب میں سوال کیا۔

''نہیں، بس کبھی یہاں دیکھا نہیں تو ایسے ہی خیال آگیا تھا۔'' معاذ نے بات بنائی۔

''میری آنکھوں میں دیکھتے تو دکھائی دے جاتا۔''

''بڑا فلمی سا جواب ہے۔'' وہ دیوا کا جواب سن کر ہنسا لیکن اندر ہی اندر اسے ایک جھرجھری سی آئی تھی۔

''ہماری سچائی کو فلمی جواب سمجھتے ہو۔ بڑے بھولے ہو۔'' دیوا گنگنانے کے انداز میں بولا پھر یکدم ہی بات کو بدلتے ہوئے اس سے پوچھا۔ ''یہ تو بتاؤ کہ انڈیا میں کیسے آئے تھے؟ مطلب ال لیگل طریقے سے یہاں آنے کے لیے کون سا راستہ اپنایا تھا؟''

''سکھ یاتریوں کا بہروپ بھر کر انہی کے ساتھ آیا تھا۔'' اس نے سچ بتایا۔

''کہیں یاتریوں کی اس بس میں تو نہیں تھے جسے کچھ آتنک وادیوں نے ہائی جیک کرلیا تھا؟''

''نہیں۔ اس میں نہیں تھا۔'' اس بار سچ بولنا ممکن نہ ہوسکا۔

''ساتھ میں کوئی ساتھی بھی ہوگا؟''

''ساتھ کوئی تھا لیکن میرا ساتھی نہیں تھا۔'' دیوا کے سوال پر سونیا کا چہرہ آنکھوں کے سامنے لہرایا تو پورے وجود میں تنفر کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ سونیا سے ملاقات اس کی زندگی کا وہ بدترین واقعہ تھا جس کے بعد سب کچھ تباہ ہوتا چلا گیا تھا اور آج یہ حال تھا کہ اسے لگتا تھا وہ بالکل تہی دامن رہ گیا ہو۔

''ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ کوئی ساتھ ہو اور ساتھی نہ ہو؟'' ناشتا تقریباً نمٹ چکا تھا اور اب وہ دونوں چائے کی پیالیاں سامنے رکھے گفتگو میں مصروف تھے۔

''دھوکے اور فریب کے ساتھ زبردستی ساتھ مل جانے والے ساتھی کہلانے کے تو حقدار نہیں ہوتے۔''

''واہ بھئی، کیا بات کی ہے۔ اس بات پر تمہیں کوئی تحفہ دینے کو دل چاہتا ہے۔'' دیوا اس کی بات پر پھڑک اٹھا۔

''میرے دوست کی آزادی سے بڑھ کر میرے لیے کوئی تحفہ نہیں ہوسکتا۔''

''وہ تو ہمارے درمیان طے شدہ معاملہ ہے۔ آؤ میرے ساتھ چلو۔ میں تمہیں تمہاری پسند سے تحفہ دینا چاہتا ہوں۔'' دیوا کے اصرار نے اسے اپنی جگہ سے اٹھنے پر مجبور کردیا۔ کچھ دیر بعد وہ اسے مختلف راہداریوں سے گزارتا ہوا ایک زیرزمین کمرے میں لے گیا۔ وہاں پہنچ کر معاذ کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ اس کمرے میں چھوٹے بڑے ہتھیاروں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ ڈراموں اور فلموں وغیرہ سے ہٹ کر اس نے زندگی میں پہلی بار اتنی بھاری تعداد میں اسلحہ

دیکھا تھا۔

''ان میں سے جو چاہو اور جتنے چاہو لے لو۔'' دیوا نے کمرے میں پھیلے ہتھیاروں کی سمت اشارہ کرتے ہوئے فراخ دلی سے پیشکش کی تو اس نے انکار نہیں کیا۔ زندگی جس نہج پر چل پڑی تھی، اسے چاہتے اور نہ چاہتے ہوئے بھی ہاتھوں میں ہتھیار اٹھانا تھے۔

''گڈ چوائس۔'' اس نے ان ہتھیاروں میں سے اے کے فورٹی سیون اور لمبی نال کا ایک بریٹا منتخب کیا تو دیوا نے اسے داد دی پھر اپنے ساتھ سائے کی طرح چپکے چلے آنے والے اپنے ساتھی کو مخاطب کر کے بولا۔

''ان ہتھیاروں کو اچھی طرح چیک کر کے اور تیل وغیرہ دے کر ریڈی کرو۔ مشن پر صاحب یہی ہتھیار استعمال کریں گے۔''

''ٹھیک ہے جناب!'' اس شخص نے فوراً آگے بڑھ کر معاذ کے ہاتھ سے ہتھیار لے لیے۔

''آج رات لینے جا رہے ہیں ہم تمہارے دوستوں کو۔ برات کے ساتھ جانے والی تام جھام تم نے دیکھ لی ہے۔ بس اب بیٹھ کر اپنے رب سے پرارتھنا کرو کہ کامیابی ہمارے قدم چومے۔'' دیوا نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اطلاع دی تو اس کے اندر جوش و جذبات کی لہریں ٹھاٹھیں مارنے لگیں۔ آج پہلی بار وہ ایسے کسی معرکے میں حصہ لینے جا رہا تھا جس میں مرنے اور مار دینے والی لگن اس کے ساتھ تھی۔

☆☆☆

''بہت عرصہ ہوا، آپ ملاقات کے لیے نہیں آئے؟''

''بزنس، سیاست اور سوشل ویلفیئر کی کشتیوں میں بیک وقت پیر رکھ کر زندگی کا سفر کرنے والے بندے کے پاس اپنے لیے وقت نہیں بچتا تو کسی سے کیا ملاقاتیں کرتا پھرے۔'' عرفان اللہ نے فون پر شکوہ کناں تاج بائی عرف تاجور کو تحمل سے جواب دیا۔

''کبھی وہ وقت ہوا کرتا تھا جب آپ ساری دنیا چھوڑ کر ہمارے پاس بھاگے چلے آتے تھے۔'' اس نے یاد دلایا۔

''وقت ہی تو بدل گیا ہے جانِ من! پہلے آتش جوان تھا اور سر پر ذمے داریوں کا بوجھ نہیں تھا۔ اب مجھے یاد رکھنا پڑتا ہے کہ میرے بگڑے کام سنوارنے کے لیے سر پر میرا باپ موجود نہیں ہے بلکہ میں خود ایک باپ ہوں جسے اور بہت ساری ذمے داریاں سنبھالنے کے ساتھ ساتھ اولاد کے پیدا کیے مسائل سے بھی نمٹنا پڑتا ہے۔''

''اتنے رنجیدہ اور پریشان کیوں ہیں؟ سچ پوچھیں تو آپ پر یہ انداز بالکل سوٹ نہیں کرتا۔'' تاج بائی وہ عورت تھی جس کی زندگی رنگا رنگ کے مردوں سے معاملات کرتے گزری تھی اور عرفان اللہ سے تو اس کا تعلق سب سے زیادہ گہرا اور پرانا تھا اس لیے فون پر بھی ان کی کیفیت محسوس کرنے میں اسے کوئی دقت نہیں ہوئی۔

''میں سلطان کی طرف سے پریشان ہوں۔ بہترین علاج کے باوجود اس کی حالت سنبھلنے میں نہیں آ رہی۔ ڈاکٹرز بیرونِ ملک لے جانے کی بھی اجازت نہیں دے رہے کہ ان کے مطابق سلطان کی حالت ایسی نہیں ہے کہ وہ سفر کر سکے۔ اب تم خود بتاؤ کہ ایک ایسے وقت میں جبکہ اولاد کو میرا سہارا بننا چاہیے، اولاد بستر پر پڑی ہے تو میرے دل پر کیا گزر رہی ہوگی۔'' انہوں نے اپنا دکھڑا رویا۔

''باذل ہے نا، جو بھی کام ہو، جو بھی مسئلہ ہو، اس سے کہیے۔'' تاج بائی نے جھٹ سے مشورہ دیا۔

''باذل ہی سے کہتا ہوں لیکن سلطان کے مسائل کو بھول تو نہیں سکتا۔ آفٹر آل اسی نے میری جگہ سنبھالنا ہے لیکن افسوس کہ اس کے لیے اس کی تیاری بالکل نہیں ہے۔''

''میرا باذل اتنا باصلاحیت ہے پر آپ اسے کوئی مقام دینے کو تیار ہی نہیں۔'' تاج بائی نے موقع دیکھ کر بات نکالی۔

''کیا کمی ہے باذل کو؟ سب کچھ اس کے اختیار میں ہے۔ سیاہ کرے یا سفید، میں اس سے سوال نہیں کرتا۔ میرا ایک ایک آدمی اس کے حکم کے آگے ہاتھ باندھے کھڑا رہتا ہے۔ شہزادوں کے ٹھاٹ باٹ سے زندگی گزار رہا ہے۔'' انہوں نے ایک ایک کر کے اپنی عنایتیں گنوانا شروع کر دیں۔

''میں مانتی ہوں کہ وہ شہزادوں کی سی زندگی گزارتا ہے لیکن وہ آپ کا ولی عہد تو نہیں ہے نا عرفان اللہ صاحب!'' تاج بائی کے اندر تڑپتی حسرت زبان پر آ گئی۔

''تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ہے؟ کیا تم نہیں جانتیں کہ تم جیسی ماؤں کی اولاد کو کبھی ولی عہدی نصیب نہیں ہوتی؟'' انہوں نے فوراً آنکھیں ماتھے پر رکھ لیں۔

''نسب تو باپ سے چلتا ہے نا عرفان اللہ صاحب!'' تاج بائی نے کمزور سے لہجے میں باور کروایا۔

''ہمارے ہاں نسب اس کا تسلیم کیا جاتا ہے جو نکاحی بیوی کی کوکھ سے جنم لے۔'' تاج بائی کو دوٹوک لہجے میں جواب دیتے ہوئے وہ آہٹ پر پلٹے تو باذل کو اپنے سامنے کھڑا پایا۔

''ابھی میں مصروف ہوں، بعد میں بات کریں

گے۔'' انہوں نے باذل کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے گفتگو کا اختتام کیا۔

''کیسے ہو؟'' فون بند کر کے وہ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور ساتھ ہی اس کے چہرے کو کھوجنے کی کوشش کی۔ اس کا چہرہ ہمیشہ کی طرح سپاٹ تھا۔ وہ اندازہ نہیں لگا سکے کہ اس نے تاج بائی سے کہا گیا ان کا جملہ سنا تھا یا نہیں۔

''میں ٹھیک ہوں۔ آپ نے مجھے کس سلسلے میں یاد کیا تھا؟'' اس نے اپنے مخصوص انداز میں سوال کیا۔

''ایک اہم کام ہے اور مجھے معلوم ہے کہ بس تم ہی اس کام کو نمٹا سکتے ہو۔ یوں سمجھو کہ اس کام کو ایک چیلنج کے طور پر ہمیں سونپا گیا ہے اور موقع دیا گیا ہے کہ ماضی میں کامی اور سلطان کی ناتجربہ کاری کی وجہ سے جو سبکی اٹھانا پڑی ہے، اس کی تلافی کر ڈالیں۔''

''کام کیا ہے؟'' اسے ان کی تمہید میں کوئی دلچسپی نہیں تھی کیونکہ وہ سارے حالات سے واقف تھا۔ اسے معلوم تھا کہ سیاسی اور فلاحی کاموں کے لیے فنڈنگ کرنے والے مطالبات بھی کرتے تھے اور آزمائشوں سے بھی گزارتے تھے۔

ایسی ہی ایک آزمائش کے نتیجے میں حیات یزدانی کا بیٹا کامران یزدانی عرف کامی اپنی جان سے چلا گیا تھا۔ اسے سرحد پار سے آئی ہوئی اسمگلنگ کی ایک کھیپ کے ساتھ خفیہ طور پر آنے والی ایک ڈیوائس نکال کر لانی تھی۔ وہ احمق اس مشن پر باربی نامی رقاصہ کو اپنے ساتھ لے گیا۔ نتیجے میں ڈیوائس بھی ہاتھ سے نکلی اور کامی بھی جان سے گیا۔ بعد میں انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ ڈیوائس اس پارٹی تک پہنچ چکی ہے جس نے انہیں یہ کام سونپا تھا لیکن نااہلی کے داغ کے ساتھ وہ شکوہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں رہے تھے۔

''لالہ عیسیٰ منظر سے غائب ہے۔ تمہیں اسے تلاش کرنا ہے۔'' عرفان اللہ نے اسے کام کی نوعیت سے آگاہ کیا۔

''صرف تلاش کرنا ہے یا ٹھکانے بھی لگانا ہے؟'' اس نے بے نیازی سے دریافت کیا۔

''فی الحال صرف تلاش کرنا ہے اور تم اس کام کو اتنا ہلکا نہ لو۔ لالہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔'' انہیں اس کی بے نیازی کھٹکی۔

''ہو جائے گا۔ اگر آپ کو کوئی اور کام نہ ہو تو میں جا سکتا ہوں؟ میری آج مہناز کے ساتھ ڈیٹ ہے۔'' کلائی موڑ کر وقت دیکھتے ہوئے اس نے انہیں بے خوفی سے اپنی مصروفیت سے آگاہ کیا۔ وہ کوئی اس کے اعلانیہ باپ نہیں تھے جو وہ انہیں ایسی کسی بات سے آگاہ کرتے ہوئے جھجکتا۔

''نہیں۔ کوئی اور کام نہیں ہے۔ بس تم اس کام کو دھیان سے کرنا۔ پہلے ہی ہمیں.....''

''سلطان اور کامی کی وجہ سے بہت سبکی اٹھانا پڑی ہے۔'' اس نے ان کا جملہ مکمل کیا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''ڈونٹ وری۔ مجھے معلوم ہے کہ میں سلطان اور کامی کی طرح غلطیاں کرنا افورڈ نہیں کر سکتا۔ مجھ میں اور ان میں فرق ہے۔ انہیں کبھی خود کو اہل ثابت کرنے کی فکر نہیں رہی لیکن مجھے ہر بار ثابت کرنا پڑتا ہے کہ میں اہل ہوں۔'' وہ وہاں سے نکلتے نکلتے انہیں بہت کچھ جتا کر نکلا تھا پھر بھی خون سر میں ٹھوکریں مار رہا تھا۔ کسی تاج بائی کا بیٹا ہو کر معاشرے میں رہنا آسان نہیں ہوتا۔ اس نے ساری زندگی بہت عیش و عشرت میں گزاری تھی اور کبھی کسی شے کے لیے نہیں ترسا تھا۔ اس کی زندگی میں بس ایک خلا تھا اور وہ یہ کہ اس کی ولدیت کے خانے میں لکھا شوکت عرف شوکی کا نام کبھی اس کے باپ کے طور پر تسلیم نہیں کیا گیا تھا اور جس پر باپ ہونے کا الزام تھا، اس نے کبھی اپنا نام ولدیت کے خانے میں لکھنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ اپنی زندگی کے اس خلا کو پُر کرنے کے لیے اس نے اتنے عجیب و غریب تجربات کیے تھے کہ خود ایک عجیب سی شخصیت بن کر رہ گیا تھا لیکن سکون اسے کسی صورت حاصل نہیں ہوا تھا۔ اب بھی اس نے سکون کے حصول کے لیے اپنی محبوبہ مہناز کے پاس جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس نے عرفان اللہ سے غلط بیانی کی تھی کہ اس کی آج مہناز کے ساتھ ڈیٹ ہے لیکن اب وہ وہیں جا رہا تھا۔

مہناز کا اور اس کا معاملہ بھی عجیب تھا۔ وہ برسوں سے اس کی محبوبہ کے عہدے پر فائز تھی۔ وہ ذائقہ بدلنے کے لیے جب چاہے اِدھر اُدھر منہ مار لیتا تھا اور پھر پلٹ کر مہناز کے پاس آ جاتا تھا لیکن کبھی مہناز کو بیوی کے عہدے پر ترقی دینے کا نہیں سوچا تھا۔ مہناز کو اس کی اس خصلت سے لاکھ تکلیف سہی لیکن اعتراض کی ہمت نہیں تھی اور نہ ہی وہ سوچ سکتی تھی کہ باذل کو چھوڑ کر کسی اور کا ہاتھ تھام لے۔ اسے معلوم تھا کہ جس دن اس نے ایسا سوچا، باذل اس کے جسم کا ریشہ ریشہ کر کے چیل کوؤں کو کھلا دے گا۔ حقیقتاً ان کا تعلق محبت سے زیادہ خوف کی بنیاد پر قائم تھا لیکن باذل کو اس بات کی پروا نہیں تھی۔ اس کے لیے یہ اطمینان کافی تھا کہ وہ جب چاہے اپنی من پسند عورت کو اپنے تصرف میں لا سکتا ہے۔ اب بھی وہ اسی یقین کے تحت اس کی طرف روانہ ہوا تھا۔

جس اپارٹمنٹ بلڈنگ میں مہناز رہائش پذیر تھی وہاں سیکیورٹی کا نظام سخت تھا اور باہر سے آنے والوں کو مکینوں سے تصدیق کے بغیر اندر آنے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی لیکن باذل پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ سب جانتے تھے کہ مہناز کے رہائشی اپارٹمنٹ کا اصل مالک وہی ہے۔ اب بھی وہ بنا روک ٹوک کے آسانی سے اوپر پہنچ گیا اور اپنے پاس موجود چابی سے دروازہ کھول کر بنا چاپ اندر داخل ہوا۔ سامنے لاؤنج میں ہی ایک دبلی پتلی سی لڑکی اس کی طرف پشت کیے جھاڑ پونچھ میں مصروف تھی۔ لڑکی کی بے خبری میں وہ وہیں کھڑا اس کے جسمانی خدوخال کو ناپنے لگا۔ یہ شاید اس کی نظروں کا ارتکاز تھا کہ لڑکی نے ایک دم پلٹ کر پیچھے دیکھا اور کچھ گھبرائے ہوئے سے انداز میں پیچھے ہٹی۔ اس نے بھی بے ساختہ اپنی نظروں کا زاویہ بدلا۔ زاویہ بدلنے کا سبب کسی قسم کی جھجک یا شرمساری نہیں بلکہ کراہت کا احساس تھا۔ لڑکی کا داغ دار چہرہ اور لقوے کے مریض کی طرح ٹیڑھا منہ اس کی حسن پرست طبیعت کو مکدر کر گیا تھا۔ طبیعت کے اس تکدر کو دور کرنے کے لیے اس نے اپنے بائیں پاؤں سے جوتا اتارا اور لڑکی کی طرف اچھال دیا۔ جوتا اڑتا ہوا جا کر لڑکی کے شانے پر لگا اور اس کے منہ سے بے ساختہ ہی ایک کھسکیائی ہوئی خوفزدہ آواز نکلی۔ اسی وقت ایک کمرے سے برآمد ہوتی مہناز نے یہ منظر دیکھا اور تیزی سے چلتے ہوئے اس کے قریب آئی۔

''واٹ آ سرپرائز ڈارلنگ! تم یوں اچانک بغیر بتائے ہی آ گئے۔'' اس کی حرکت کو مکمل نظر انداز کرتے ہوئے اس نے اپنی بانہیں اس کے گلے میں حمائل کیں۔

''مجھے کیا معلوم تھا کہ آتے کے ساتھ ہی یہ بھیانک سین دیکھنے کو مل جائے گا۔'' اس کا موڈ بدستور خراب تھا۔

''چھوڑو اسے۔ آؤ میرے ساتھ، اندر بیڈروم میں چلو۔'' اس بار مہناز نے اپنا بازو اس کی کمر کے گرد لپیٹتے ہوئے اسے خواب گاہ کی طرف دھکیلنے کی کوشش کی۔

''اے..... میرا جوتا ادھر لا اور میرے پاؤں میں پہنا۔'' مہناز کی کوشش کو ناکام بناتا وہ مضبوطی سے اپنی جگہ جما کھڑا رہا اور شانے پر ہاتھ رکھے سہمی کھڑی لڑکی کو سختی سے حکم دیا۔ اس کا حکم سن کر لڑکی مزید ہراساں نظر آنے لگی۔

''جوتا لے آؤ شیو! شاباش، آ جاؤ۔ اب صاحب کچھ نہیں کہیں گے۔'' مہناز نے باذل کے موڈ کو بہتر کرنے کے لیے لڑکی پر پیار سے زور ڈالا تو اس نے بے بس سے انداز میں جھک کر اپنے قریب ہی گرا جوتا اٹھایا اور ڈرتی جھجکتی باذل کے قریب چلی آئی۔ گھٹنوں کے بل اس کے قریب بیٹھتے ہوئے اس نے جوتا اس کے ننگے پاؤں کی طرف بڑھایا۔ اس نے پاؤں کو یوں ذرا سا فرش سے اوپر اٹھایا جیسے اسے جوتے میں ڈالنے کا ارادہ رکھتا ہو لیکن پھر یکدم اس کا پاؤں تیزی سے حرکت میں آیا اور لڑکی کے منہ پر اس زور سے پڑا کہ وہ کراہتی ہوئی پیچھے کی طرف الٹ گئی۔

''پلیز ڈارلنگ! بے ضرر ہے بے چاری۔ خاموشی سے اپنا کام کرتی ہے اور بغیر کوئی ڈیمانڈ کیے جو ملے اس پر گزارہ کر لیتی ہے۔ سچ، اس کی وجہ سے مجھے بہت آرام ہو گیا ہے۔ میرے صدقے ہی اسے برداشت کر لو۔'' مہناز بہت پیار سے اس کا غصہ قابو کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''تمہاری خاطر ہی برداشت کر رہا ہوں ورنہ ایسی بدشکل عورت کو کب کا اٹھا کر باہر پھینک چکا ہوتا۔'' اس نے لڑکی پر تحقیر بھری نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''تو مت دیکھو نا اس کی طرف۔ آؤ میرے ساتھ بیڈ روم میں چلو۔ وہاں تمہیں میرے سوا نہ کچھ دکھائی دے گا اور نہ سجھائی۔'' مہناز نے ناز سے اسے اپنی طرف متوجہ کیا تو اس کی آنکھوں میں مخصوص چمک لہرائی۔ بدصورت ملازمہ کے چکر میں واقعی اس نے مہناز پر توجہ نہیں دی تھی۔ کھلے گلے کے مہین سے گاؤن میں ملبوس وہ واقعی دعوتِ نظارہ دے رہی تھی۔

''کم آن مائی بے بی! میرے ہوتے ہوئے تمہیں کہیں اور دیکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ میرا بے داغ حسن ہے نا تمہارے ذوق پر پورا اترنے کے لیے۔'' اس کی نگاہوں کی تبدیلی کو محسوس کر کے وہ مزید اٹھلائی اور بازو پکڑ کر خواب گاہ کی طرف دھکیلنے لگی۔ اس بار باذل نے مزاحمت نہیں کی۔ ان دونوں کے بند دروازے کے پیچھے گم ہو جانے کے بعد نیچے لڑھکی پڑی لڑکی اٹھی اور پاؤں کی ٹھوکر سے پھٹ جانے والے اپنے ہونٹ سے بہتے خون پر دوپٹے کا پلو رکھا۔ اس پل ہونٹ سے بہتے خون کی سی سرخی اس کی آنکھوں میں بھی اتر آئی تھی۔ اس کا بس چلتا تو باذل کا پورا جسم خونم خون کر دیتی لیکن بس ہی تو نہیں چلتا تھا۔ دائیں ہاتھ کی فریکچر شدہ انگلیاں بغیر علاج کے خود بخود ہڈی جڑنے کے نتیجے میں ٹیڑھی میڑھی ہو چکی تھیں۔ ان ٹیڑھی میڑھی انگلیوں کے ساتھ وہ گھر کے معمولی کام تو نمٹا لیتی تھی لیکن اس لائق نہیں تھی کہ کسی ہتھیار کو گرفت میں لے کر استعمال کر سکتی۔ دائیں پاؤں کا لنگ بھی ایک امتحان تھا اور اس امتحان کو مزید

سخت بنانے کے لیے پیروں میں بیڑیاں بھی ڈال دی گئی تھیں۔ اب وہ ایک زرخرید غلام کی طرح اس اپارٹمنٹ کے طول وعرض میں خدمات تو انجام دے سکتی تھی لیکن یہاں سے باہر نکل کر آزاد فضا میں سانس نہیں لے سکتی تھی۔

☆☆☆

رات کی تاریکی میں وہ تین گاڑیاں بہت تیزی سے دہلی کے مضافات کی طرف دوڑتی چلی جارہی تھیں۔ ہر گاڑی میں کم سے کم تین سے چار نفوس موجود تھے لیکن ان کے درمیان موت کی سی گمبھیر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

چست سیاہ ملبوسات کے ساتھ وہ سارے کے سارے جان کی بازی لگانے کے لیے تیار تھے۔ ان کے سپاٹ چہرے ہر قسم کے تاثر سے آزاد تھے۔ اگر کوئی تاثر ہوتا تو بھی گاڑیوں کی بجھی ہوئی روشنیوں کے باعث دیکھا نہ جاسکتا جیسا کہ معاذ کے چہرے پر موجود تاثرات کو کوئی نہیں دیکھ پارہا تھا۔ ان سپاٹ چہروں کے درمیان اس کا چہرہ وہ واحد چہرہ تھا جو اندرونی جوش وجذبے سے تمتمارہا تھا اور وہ بار بار گردن گھما کر یوں راستے کے دائیں اور بائیں جانب دیکھتا تھا جیسے نشانیوں سے اندازہ لگانا چاہ رہا ہو کہ اب کتنا سفر باقی ہے لیکن اس مضافاتی علاقے کا بیشتر حصہ تاریک ہی تھا اور وہ گاڑیوں کی بجھی ہوئی روشنیوں کے ساتھ صرف ڈرائیورز کی مہارت کے سہارے آگے بڑھ رہے تھے۔

''ہم ٹارگٹ سے قریب ہیں۔ ٹھیک ایک منٹ بعد ساری گاڑیاں روک لی جائیں۔'' ہر گاڑی میں سوار افراد کے کانوں میں گونجنے والی ٹیم لیڈر کی آواز نے معاذ کو مزید الرٹ کردیا۔ اس مشن پر دیوا ان کے ساتھ نہیں تھا لیکن اس نے معاذ کو اطمینان دلایا تھا کہ وہ اس مشن پر اپنے بہترین آدمی اس کے ساتھ بھیج رہا ہے۔ وہ اس وقت ٹیم لیڈر والی گاڑی میں ہی سوار تھا۔ ٹھیک ایک منٹ بعد ان کی گاڑی رک گئی۔ اسے یقین تھا کہ باقی دونوں گاڑیاں بھی رک چکی ہوں گی لیکن وہ انہیں دیکھنے سے قاصر تھا۔

''اپنی پوزیشن بتاؤ۔'' گاڑی رکتے ہی ٹیم لیڈر نے حکم دیا۔

''نارتھ۔''

''ساؤتھ۔''

فوراً ہی پے درپے دو آوازیں گونجیں۔

''خاموشی سے اپنی اپنی پوزیشن پر پھیلنا شروع کرو لیکن یاد رکھنا کہ میرے حکم سے پہلے آگے نہیں بڑھنا ہے۔''

اپنے ساتھیوں کی پوزیشن جان لینے کے بعد اس نے نیا حکم

بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

ماہنامہ سرگزشت کراچی

شمارہ فروری 2022ء کی جھلکیاں

شکست

تاریخ کے دریچے سے حیران کردینے والی داستان

کہی ان کہی

پاکستانی سینما کے سنہری ایام کی یادیں، باتیں

جنگل پہاڑ ویرانے

برف کے ویرانے میں وہ بینائی سے محروم ہوکر بھٹک گیا تھا

مینارہ محبت

ایک بالکل الگ انداز کی سچ بیانی جو آنکھوں میں آنسو لادے

اس کے علاوہ

سفر کہانی ''اوسلو'' طویل لہورنگ داستان ''روسیاہ'' سیر پاکستان کے حوالے سے ''معجزے'' شکاریات کی دلچسپ کتھا ''مسیحا''

وہ سب کچھ جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں جو آپ کو پڑھنا چاہیے۔

جاری کیا۔ معاذ کے لیے یہ ایک انکشاف ہی تھا کہ ان کے ساتھ روانہ ہونے والی گاڑیوں نے کسی وقت خاموشی سے ان کا ساتھ چھوڑ دیا تھا اور اب ٹارگٹ کی مختلف سمتوں میں موجود تھیں۔

''سیکیورٹی کیمروں کی کیا پوزیشن ہے؟'' اس بار معاذ نے ٹیم لیڈر کی آواز اپنے ائرپیس کے بجائے براہِ راست سنی تھی۔ اب وہ یہاں سے دور بیٹھے اس کمپیوٹر ایکسپرٹ سے مخاطب تھا جس نے ان کی مطلوبہ عمارت کے سیکیورٹی کیمروں کو ہیک کرنے کی ذمے داری سنبھالی ہوئی تھی۔

''گڈ! ٹھیک بیس سیکنڈ بعد سارے کیمرے بند ہوجانے چاہئیں۔'' دوسری طرف کی رپورٹ سن کر اس نے نیا حکم جاری کیا اور اپنے ساتھ گاڑی میں موجود افراد کو حرکت میں آنے کے لیے اشارہ کیا۔ وہ سب تیار ہی تھے۔ ایک پل میں سیٹوں کے نچلے خلا میں موجود ان کے بیگ باہر نکلے اور ان کے کندھوں پر پہنچ گئے۔ گاڑی سے نکل کر باہر کے تاریک ماحول میں خود کو مدغم کرلینے میں ان کو کوئی مشکل پیش نہ آئی۔

''ایک، دو، تین.....'' دوسروں کے ساتھ حرکت کرتا معاذ دل ہی دل میں گنتی کررہا تھا۔ بیس کہتے ہی اس نے اپنے کان میں آواز سنی۔ ''ایکشن!''

وہ جانتا تھا کہ اس ایک لفظ کے بعد طاقتور جیمرز کام کرنا شروع کردیں گے جن کے باعث تمام مواصلاتی آلات کام کرنا بند کردیں گے۔ ان میں خود اس کے اور اس کے ساتھیوں کے آلات بھی شامل تھے۔ یعنی اب ان میں سے کوئی بھی ایک دوسرے سے مواصلاتی آلات کے ذریعے رابطہ نہیں کرسکتا تھا لیکن اندر والوں کو بیرونی مدد حاصل کرنے سے روکنے کے لیے یہ ایک اہم قدم تھا۔ خود ان کا لائحہ عمل طے شدہ تھا اور کسی مشکل یا ضرورت کے تحت ساتھیوں کو متوجہ کرنے کا طریقہ بھی طے تھا۔

''ایکشن'' کی آواز سنتے ہی اس سمیت تمام افراد نے اپنی اپنی طے شدہ پوزیشن سے پیش قدمی شروع کی۔ اس وقت وہ جس عمارت کو گھیرے ہوئے تھے وہ بظاہر قدیم طرز کا ایک گیسٹ ہاؤس تھا لیکن موہن کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق عالم اور سرمد کے علاوہ کچھ اور خاص مجرموں کو بھی یہاں رکھا گیا تھا۔ وہ لوگ اپنی اہم میٹنگز اور پلاننگز کے لیے بھی اس مقام کو استعمال کرتے تھے۔ ان کی کوشش ہوتی تھی کہ عمارت میں زیادہ گہما گہمی اور ہلچل نہ دکھائی دے لیکن سیکیورٹی سخت تھی۔ ان کے پاس چونکہ اس سیکیورٹی سے متعلق تمام تفصیلات موجود تھیں اس لیے پوری منصوبہ بندی اور تیاری کے ساتھ آئے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ سیکیورٹی کیمروں کے ایک ساتھ بند ہوتے ہی اندر تشویش کی لہر دوڑ جائے گی اور وہ ہر ممکنہ قدم اٹھانے کے لیے تیار ہوجائیں گے۔ ان کی اس تیاری کو دھوکا دینے کے لیے ان کے پاس لائحہ عمل موجود تھا۔

جب تک وہ اپنے ایک ساتھی کے ساتھ پنجوں کے بل دوڑتا ہوا عمارت کی باؤنڈری وال تک پہنچا، فضا میں دو دھماکوں کی آواز گونج چکی تھی۔ یہ آواز بہت بلند نہیں تھی لیکن آوازیں پیدا ہوتے ہی عمارت کے شمالی اور جنوبی حصوں میں دھوئیں کے بادل سے چھا گئے تھے۔ دھوئیں کے ان بادلوں کو دیکھتے ہی معاذ اور اس کے ساتھی نے عمارت کی بلند دیواروں پر کمندیں ڈالیں اور بندروں کی سی پھرتی سے اوپر چڑھتے چلے گئے۔ کمندیں ڈالنے کے لیے انہوں نے جو آنکڑے استعمال کیے تھے ان پر ربر کی تہ چڑھی ہوئی تھی اس لیے وہ دیواروں پر بچھے لوہے کے تاروں میں دوڑتی برقی رو سے محفوظ رہے تھے۔ دیوار کے پار جانے سے قبل انہوں نے برقی رو کے اس سلسلے کو منقطع کردیا۔ جس وقت وہ اس کام سے فارغ ہوکر اپنے ربر سول کے جوتوں کے باعث احاطے میں بے آواز کودے، شمالی اور جنوبی سمتوں سے فائرنگ کی آوازیں گونجنا شروع ہوچکی تھیں۔ حسب منصوبہ وہ ان لوگوں کی توجہ بانٹنے میں کامیاب ہوگئے تھے اور دھماکوں اور دھوئیں کے باعث یہ سمجھتے ہوئے کہ شمالی اور جنوبی سمتوں سے اندر داخل ہونے کی کوشش کی جارہی ہے، انہوں نے اپنا سارا زور اس طرف لگا دیا تھا۔ ان کی اس غلط فہمی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے معاذ اور اس کے ساتھی کے علاوہ دو دو افراد پر مشتمل دو مزید ٹیمیں بھی بالکل اسی طرح عمارت کے احاطے میں پہنچ چکی تھیں اور اب وہ سب اپنے اپنے طور پر اندر تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کررہے تھے۔

دھماکوں سے قبل اندرونی حصے میں کچھ روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں لیکن دھماکے ہوتے ہی پوری عمارت گہری تاریکی میں ڈوب گئی تھی۔ اس تاریکی کا مقابلہ کرنے کے لیے انہوں نے اپنے نائٹ ویژن چشمے آنکھوں پر چڑھا لیے تھے اور بہ احتیاط آگے بڑھتے جارہے تھے۔ اندرونی عمارت کے مرکزی دروازے تک پہنچنے میں انہیں کسی قسم کی دقت پیش نہ آئی لیکن جیسے ہی معاذ کے ساتھ

موجود شخص نے دروازے کی طرف ہاتھ بڑھایا، عمارت کی ایک کھڑکی سے گولیوں کی باڑ آئی۔ معاذ نے کسی خودکار ردِعمل کے مانند نیچے گرتے ہوئے اس کھڑکی کی طرف فائر کھول دیا۔ وہاں موجود شخص کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ اس کا ساتھی جو اسی کی طرح نیچے گر کر خود کو نشانہ بننے سے بچانے میں کامیاب ہوگیا تھا، اس موقع کا فائدہ اٹھا کر ایک بار پھر دروازے پر قسمت آزمائی کرنے لگا اور جب اسے لاک پایا تو گولیوں سے لاک کو اڑا ڈالا۔

کھڑکی والے کو آگے آکر مزید فائر کرنے کا موقع دیے بغیر جب تک معاذ اپنے ساتھی کے قریب پہنچا، ایک دوسرا ساتھی بھی ان سے آن ملا تھا۔ معاذ نے کھڑکی والے کو الجھائے رکھا جبکہ نیا آنے والا اس کے ساتھی کو اندر جانے کے لیے کور دینے لگا۔ یہ وہ لمحات تھے جب پوری عمارت کے اطراف میں ہلکی اور بھاری فائرنگ کی آوازیں گونج رہی تھیں اور کسی کو کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ آیا کس کا پلڑا بھاری ہے۔

عمارت کے اندر داخل ہونے کی کوشش کرنے والے اس کے ساتھی نے ٹوٹے لاک والے دروازے کو دھکیل کر قدم اندر رکھا ہی تھا کہ کہیں سے گولیوں کی بوچھاڑ آئی اور اس کے نچلے بدن کو چھید ڈالا۔ وہ بلند آواز میں چیختا ہوا نیچے گر گیا لیکن اسے گرانے والا بھی نہ بچ سکا اور اسے کور دینے والے ساتھی کی گولیوں کی زد میں آگیا۔ معاذ نے کھڑکی کی طرف ایک طویل برسٹ مارا اور پھرتی سے کھلے دروازے سے اندر داخل ہوگیا۔ موہن کا بتایا ہوا عمارت کا نقشہ پوری طرح اس کے ذہن میں محفوظ تھا۔ اردگرد سے چوکنا وہ اس راستے پر آگے بڑھتا چلا گیا۔ عمارت کے مختلف حصوں سے آتی ہلکی فائرنگ کی آوازوں سے ظاہر تھا کہ اس کے کچھ اور ساتھی بھی اندر داخل ہوگئے ہیں یا ہونے کی کوشش کررہے ہیں۔ بہرحال وہ جس راستے پر آگے بڑھ رہا تھا، وہاں اسے کسی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑ رہا تھا۔ یقینی طور پر ''را'' والے یہاں اپنی محدود نفری کے ساتھ موجود تھے اور اب وہ ساری کی ساری نفری حملہ آوروں سے نمٹنے کے لیے میدان میں اتری ہوئی تھی۔

''ہینڈز اپ۔'' وہ ایک گرل پر لگے تالے کو توڑ کر اس حصے میں داخل ہوا ہی تھا جہاں سے آگے موہن کی اطلاع کے مطابق قیدیوں کے کمرے تھے کہ کسی تاریک گوشے میں دبکے شخص نے اپنی گن پیچھے سے اس کی گردن پر رکھ دی۔ منزل کے اتنے قریب پہنچ کر گرفت میں آنے پر وہ اندر ہی اندر بل کھا کر رہ گیا لیکن گردن پر رکھی گن کی نال کے ساتھ کوئی حرکت کرنا حماقت ہوتی۔

''ہتھیار پھینک دو۔'' ابھی اس نے پہلے حکم پر عمل نہیں کیا تھا کہ گردن پر دباؤ ڈال کر دوسرا حکم دیا گیا۔ چاروناچار اسے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ہتھیار پھینک کر ہاتھ اٹھانے پڑے۔

''آگے بڑھو۔'' گن بردار نے اسے اسی طرف دھکیلا جہاں قیدیوں کے کمرے بنے ہوئے تھے۔ شاید وہ اسے ان کمروں میں سے کسی میں قید کرنا چاہتا تھا۔ موقع کا منتظر معاذ بظاہر بے بس اس کے حکم پر آگے بڑھنے لگا۔ نائٹ ویژن کی وجہ سے تاریکی کے باوجود اسے آگے بڑھنے میں دشواری کا سامنا نہیں تھا۔ ایک کمرے کے بند دروازے کے سامنے سے گزرتے ہوئے یکدم ہی اسے عقب سے اپنی زد میں لے کر آگے بڑھنے والا لڑکھڑا گیا۔ اس کے لڑکھڑانے کی وجہ پر غور کرنے کے بجائے وہ پھرتی سے ایک طرف ہوا اور بیلٹ کے ساتھ لٹکا بریٹا نکال کر اس پر فائر کردیا۔ گولی سیدھی اس شخص کی کھوپڑی میں گھسی اور وہ مٹی سے بھرے بورے کی طرح زمین پر ڈھیر ہوگیا۔

''ہے مین! ہیلپ می۔ دیکھو میں نے تمہاری ہیلپ کی ہے۔ تم بھی میری ہیلپ کرو۔'' ابھی وہ گولی چلا کر پلٹا بھی نہیں تھا کہ کسی نے اسے پکارا۔ آواز اس دروازے کے پیچھے سے آرہی تھی جس کے سامنے مرنے والے کی لاش پڑی تھی۔

''کون ہو تم؟'' اس نے بے ساختہ ہی تیزی سے سرگوشی میں پوچھا۔

''میں وہ ہوں جس نے دروازے کے نیچے سے چھڑی ڈال کر تمہارے دشمن کو لڑکھڑانے پر مجبور کیا۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو تم اس سے آسانی سے جان نہ چھڑا پاتے۔''

''لیکن تم نے اتنے اندھیرے میں یہ کیسے کیا؟'' وہ واقعی حیران تھا۔

''میرے کان بہت تیز ہیں۔ تم کہو تو تمہارے اندر داخل ہونے سے لے کر اس پہرے دار کے مرنے تک، ایک ایک پل کی تفصیل سنا سکتا ہوں لیکن آئی تھنک کہ تمہارے پاس اتنا ٹائم نہیں ہوگا۔ بہتر ہے کہ تم مجھے آزادی دلوا کر میرے احسان کا بدلہ چکاؤ اور اپنا مشن مکمل کرو۔'' کمال کا اعتماد تھا اس کے لہجے میں۔ معاذ اسے نظر انداز کرکے آگے نہ بڑھ سکا۔

''ٹھیک ہے۔ میں لاک توڑنے کے لیے گولی چلا رہا

ہوں۔ تم دروازے کے سامنے سے ہٹ جاؤ۔'' فیصلے پر پہنچتے ہوئے اس نے اپنے لمبی نال والے بریٹا کو سیدھا کیا اور فائر کر ڈالا۔

''دروازہ کھولو اور ہاتھ اٹھا کر باہر آجاؤ۔'' لاک ٹوٹتے ہی اس نے اندر والے کو حکم دیا۔

''یہ لو، دروازہ کھول دیا اور ہاتھ بھی اوپر اٹھا لیے لیکن باہر نہیں آسکتا۔ میرے پیروں میں پڑی بیڑیاں مجھے اس دروازے سے آگے نہیں آنے دیتیں۔'' کھلے دروازے کے اندر وہ ایک لحیم شحیم ہیولے کی صورت اس کے سامنے کھڑا تھا۔

''ٹائم کیوں ویسٹ کررہے ہو؟ جلدی سے ان بیڑیوں کو توڑو تاکہ میں یہاں سے جاسکوں۔'' ہیولے نے فرمائش کی۔

''تم تو ایسے فرمائش کررہے ہو جیسے میں تمہیں آزاد کروانے کے لیے ہی یہاں آیا ہوں۔'' وہ اس کے ٹوکنے پر بھنا گیا۔

''ارادہ بے شک تمہارا نہیں ہوگا لیکن کہیں اوپر سے اشارہ ہوا ہوگا کہ تم میری آزادی کا وسیلہ بنے یہاں موجود ہو۔'' ایسا پُریقین لہجہ تھا کہ معاذ کو کپکپی سی آگئی۔ بے ساختہ ہی اس نے اپنے پاس موجود ٹارچ نکال کر روشن کی اور اس شخص پر روشنی ڈالی۔ الجھی ڈاڑھی مونچھ اور بالوں والے چہرے پر موجود نیل اور ورم سے ظاہر تھا کہ یہاں اس کی خاطر خواہ خاطر مدارت کی جاتی رہی ہے لیکن پھر بھی وہ مسکرا رہا تھا اور مسکرا کر شوخی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے یکدم ہی اسے آزادی دلوانے کا فیصلہ کرلیا اور جب فیصلہ ہوگیا تو اس شخص کو بیڑیوں سے آزاد ہونے میں دیر نہیں لگی۔

''لگتا ہے تمہارے ساتھی پوری طرح غالب آگئے ہیں۔ بہتر ہے میں ان سے ٹکراؤ ہونے سے پہلے نکل جاؤں۔'' آوازوں پر کان لگائے وہ یوں دوستانہ انداز میں اس سے مخاطب تھا جیسے برسوں کی آشنائی ہو۔

''کون ہو تم؟'' اس کے لبوں سے سوال پھسلا۔

''مکمل تعارف کروانے کا موقع نہیں۔ کبھی دل چاہے یا کوئی ضرورت پڑے تو ممبئی میں مشہور ایڈیٹر غالب انبالوی سے مل کر کہہ دینا کہ جارو سے ملنا ہے۔ آئی ہوپ کہ وہ تمہیں مجھ تک پہنچادیں گے۔'' اس نے جواب دیا اور بالکل اچانک اپنے لحیم شحیم وجود کو بے پناہ پھرتی سے حرکت دیتے ہوئے مرنے والے کے نیچے پڑی گن تک رسائی حاصل کرلی۔ معاذ نے اضطراری طور پر بریٹا کا رخ اس کی طرف کرکے ٹریگر پر دباؤ ڈالا لیکن کسی انجانی قوت نے اسے مکمل دباؤ ڈالنے سے روکے رکھا۔

''گڈ بائے۔'' خود کو جارو کے نام سے متعارف کروانے والا اپنے بھاری تن وتوش کے ساتھ چھلاوے کی سی پھرتی سے اس کی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ اس کے نظروں سے اوجھل ہونے پر وہ گویا کسی ٹرانس سے باہر آیا اور عالم اور سرمد کو تلاش کرنے لگا۔ موہن کے مطابق انہیں ان کمروں میں سے ہی کسی ایک میں رکھا گیا تھا لیکن اتنے ہنگامے کے باوجود ان کی طرف سے کوئی ردعمل ظاہر نہیں ہوا تھا۔

''کیا ہوا؟ ملے وہ لوگ؟'' وہ تیسرے کمرے کا دروازہ کھول کر اس میں جھانک رہا تھا جب ٹیم لیڈر وہاں آیا اور اس سے عجلت میں پوچھا۔

''ابھی نہیں۔'' وہ اگلے کمرے کی طرف بڑھا۔

''جلدی کرو۔ اس ٹائم سب ہمارے کنٹرول میں ہے لیکن آس پاس سے کسی نہ کسی نے فائرنگ اور دھماکوں کی آواز سن کر پولیس کو انفارم کردیا ہوگا۔ ہماری نفری کم ہوچکی ہے۔ اگر پولیس نے گھیرا ڈال دیا تو ہمیں یہاں سے نکلنا مشکل ہوجائے گا۔'' ٹیم لیڈر نے اس سے اضطراری لہجے میں کہا اور خود بھی ایک بند دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ معاذ کی طرح ٹارچ روشن کرچکا تھا۔

''نفری کم ہوگئی ہے سے کیا مطلب؟''

''سریش اور رادھے شدید زخمی ہوئے ہیں۔ میں نے ایک گاڑی میں انہیں یہاں سے واپس بھجوادیا ہے۔''

''ہمم۔'' معاذ نے محض ہنکارا بھرا اور چوتھے کمرے کا دروازہ کھول کر روشنی اندر ڈالی۔ (مین سوئچ آف تھا یا سرکٹ میں کوئی گڑبڑ کی گئی تھی کہ جب سے وہ اس عمارت میں داخل ہوئے تھے، وہ مسلسل تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی اور انہیں روشنی کے لیے ٹارچوں کا سہارا لینا پڑ رہا تھا)۔

''اوہ، میرے خدایا!'' ٹارچ کی روشنی نے اسے جو منظر دکھایا، اسے دیکھ کر وہ بے حد کرب سے بڑبڑایا اور تیزی سے اندر داخل ہوا۔

ظلم وجبر کے سامنے سینہ سپر نوجوان کی داستان جو غلط کاروں کے لیے غضب ناک تھا باقی واقعات آیندہ ماہ پڑھیے

بلوچستان، ہزاروں بلکہ لاکھوں برس قدم تہذیب کی سرزمین جو اپنی روایت اور ثقافت میں ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی معلوم تاریخ ساٹھ ہزار سال قبل شروع ہوتی ہے۔

بلوچستان کے درّہ بولان سے تقریباً دس کلومیٹر کے فاصلے پر ایک .... مقام سے اس تہذیب کے آثار ملے ہیں۔ یہ چھ ہزار سال قبل مسیح یا اس سے بھی پہلے کے ہیں۔

اس زمانے میں بھی اس علاقے کے لوگ مویشی پالتے تھے۔ اس دور کے بنے ہوئے عورتوں کے زیورات بھی دستیاب ہوئے ہیں جن میں ہار، چوڑیاں اور جھمکے شامل ہیں۔ ان کو بنانے میں ..... چھوٹے چھوٹے منکوں کا استعمال کیا جاتا تھا۔ فیروزے، مونگے اور گھونگوں کے ہار بھی بناتے تھے۔

اس علاقے کی ایک قبر سے دو بڑے قدیمی موتی یا منکے ملے ہیں جو پانچ سے ساتھ ہزار سال پہلے کے ہیں۔

ٹوٹے دلوں اور بکھرے خوابوں کی دل گداز اور عبرت اثر روداد

حسن اور طاقت کے درمیان اکثر معرکہ آرائی نظر آتی ہے لیکن طاقت آزمانے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ کب جبر سے کسی کے دل کو فتح کیا گیا ہے۔ وہ بھی مجبور تھی اس کے ساتھ رہنے پر جس کے ساتھ رہنے کے لیے اس کا دل کبھی راضی نہ ہوا مگر... مجبوری ہر وہ کام کرواسکتی ہے جسے کرنے کے لیے کبھی گمان تک نہیں گزرتا۔

ہانی شہہ مرید

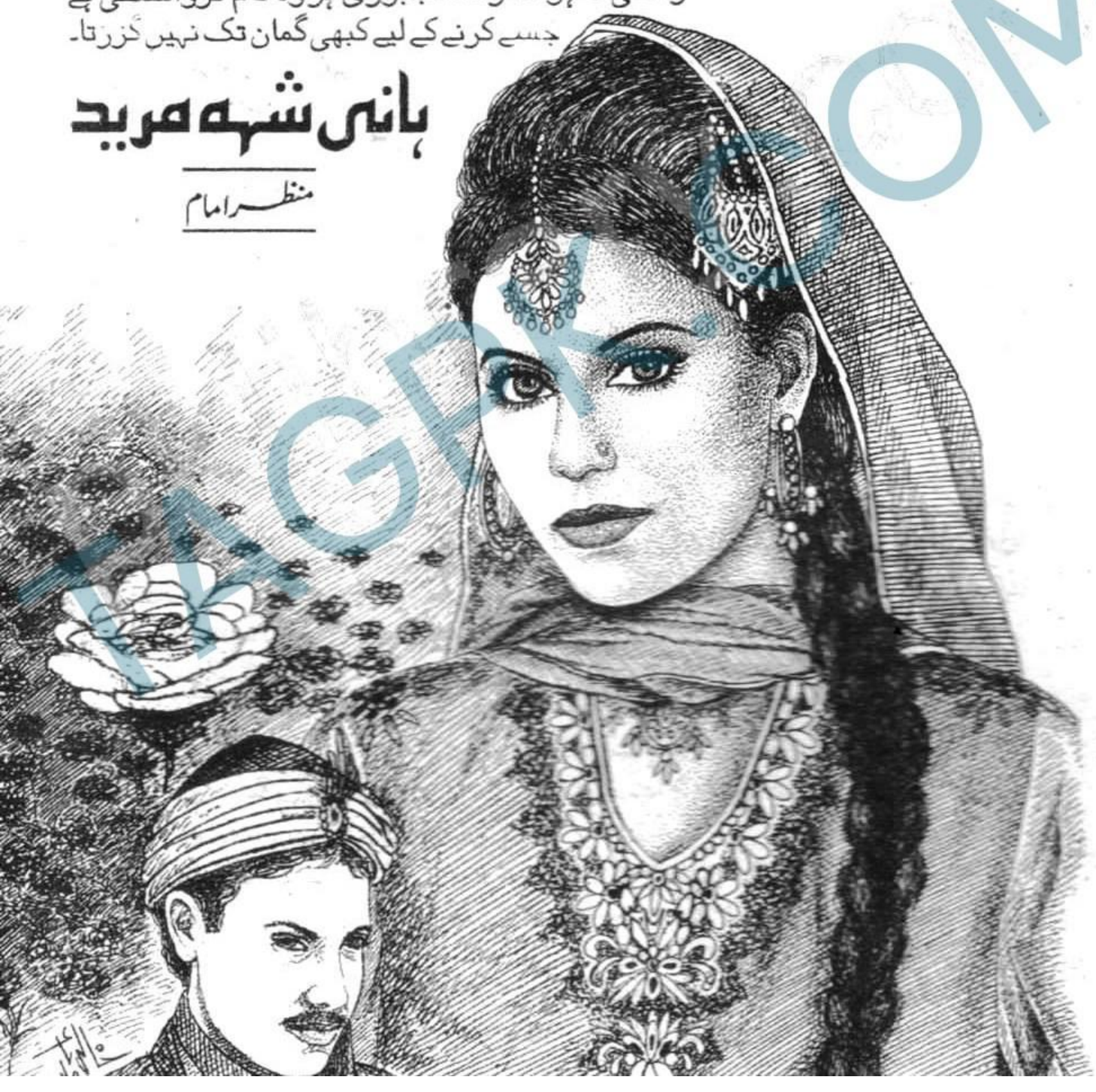

منظر امام

ماہرین کی تحقیق کے مطابق ایک موتی ایسا ہے جو افغانستان کے شمالی علاقے میں پایا جاتا ہے جس کا نام ''لاپس لزولی'' ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بلوچستان کے اس دور کے لوگ افغانستان میں تجارت کرتے تھے۔

مختصر یہ کہ بلوچستان کی تاریخ بہت پرانی ہے اور تہذیبی طور پر یہ خطہ ترقی یافتہ رہا ہے۔ بلوچستان رقبے کے لحاظ سے سب سے بڑا صوبہ ہے۔ اس کا کل رقبہ 347790 کلومیٹر ہے جو پورے پاکستان کا 47 فیصد ہے۔ اس کے شمال میں افغانستان، خیبر پختونخواہ، جنوب میں بحیرۂ عرب، مشرق میں سندھ اور پنجاب اور مغرب میں ایران ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ بلوچستان میں پتھروں کے دور سے بھی آبادی تھی۔ سکندر اعظم سے پہلے اس خطے پر مکمل طور پر ایران کے حکمرانوں کی حکمرانی تھی۔ اس دور میں اس علاقے کو ماکا کہا جاتا تھا۔

غرضیکہ یہ بہت قدیم تاریخ ہے۔ اس کو مختصر کرتے ہوئے ہم بلوچ قبائل تک آتے ہیں۔ یہاں ان قبائل کا ذکر اس لیے ضروری ہے کہ اس سے اندازہ ہوجائے گا کہ اس کہانی کے پس منظر میں ان قبائل کی کیا اہمیت ہے۔

یہ قبائل ہیں ایرو، اشکانی، بجارانی، بلیدی، بگٹی، چانڈیو اور رند وغیرہ۔ یہ کہانی چاکر اعظم کے عہد سے تعلق رکھتی ہے۔

چاکر اعظم ایک شان و شوکت والا سردار تھا۔ وہ صرف ایک نام نہیں تھا بلکہ ایک تہذیبی علامت تھا۔ وہ بلوچوں کی ثقافت کا ترجمان تھا۔ وہ علم اور شجاعت کا پیکر تھا۔ اس کا قول تھا۔ ''دشمن اگر بہادر ہے تو اس کو بھی عزت کی نگاہ سے دیکھو۔''

اس کا باپ میر سشیک بھی ایک بہادر سالار تھا۔ پورے رند علاقوں کا حکمران۔ اس کی موت کے بعد اس کے بیٹے چاکر نے باپ کی جگہ سنبھالی تھی۔

میر چاکر کا دور رندوں کی تاریخ کا سب سے سنہری دور تھا لیکن اس دور کا اختتام بہت برا ہوا۔ میر چاکر کے آخری دور میں نہ صرف وند بلکہ پوری بلوچ قوم اس طرح منتشر ہوئی کہ آج تک نہیں سنبھل سکی۔

میر چاکر نے قلات کو 1486ء میں فتح کیا۔ اس وقت اس کی عمر صرف سولہ برس تھی۔ 1488ء میں مٹھی پر قبضہ کیا۔ یہی وقت میر سشیک کی وفات کا ہے۔

اس کے بعد رندوں اور دوسری قوم کے درمیان ایک طویل اور ہولناک جنگ کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جو تیس برسوں تک جاری رہا۔ اس دوران ہزاروں کی تعداد میں لوگ مارے گئے۔

جنگ کا آغاز 1489ء میں ہوا اور 1519ء تک جاری رہا۔

1520ء میں میر چاکر ملتان کے لیے روانہ ہوئے اور 1523ء میں مستقل طور پر سانگھڑ میں قیام کرلیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب سلطنت دہلی کو شیر شاہ سوری سے خطرہ لاحق ہوگیا تھا اور ہمایوں کو فرار ہونا پڑا تھا۔ 1555ء میں میر چاکر، ہمایوں کے ساتھ مل کر شیر شاہ سوری کی فوج پر حملہ آور ہوئے اور اس کی فوج نے شیر شاہ سوری کی حکومت کا خاتمہ کیا۔

میر چاکر کا انتقال 1565ء میں ہوا تھا۔ مقبرہ سانگھڑ ہی میں ہے۔

یہ وہ پس منظر ہے جس سے شہہ مرید اور ہانی کا تعلق تھا۔

☆☆☆

باہر سے آئے ہوئے پہلوان نے شہہ مرید کی کمان اٹھالی تھی۔

لیکن وہ اس کمان کو تھوڑا ہی سا اٹھا پایا تھا۔ اس کوشش میں اس کے پورے جسم پر لرزہ طاری ہوگیا تھا۔ وہ بہت بری طرح پسینے سے بھیگا ہوا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ اس وقت نہ جانے کتنی نگاہیں اس پر مرکوز ہیں۔

جہاں سے وہ آیا تھا، وہاں اس کی بہادری اور طاقت کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے شہہ مرید کی وزنی کمان کے بارے میں سنا تھا کہ وہ ایسی کمان ہے جس کو سوائے شہہ مرید کے اور کوئی نہیں اٹھا سکتا۔

شہہ مرید چاکر اعظم کا سپہ سالار تھا۔ خوبصورت، طاقتور نوجوان جو اپنے قول اور تلوار کا دھنی تھا۔

اس کے فسانوں کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ وہ جب اپنی وزنی کمان سے کسی ہدف کو نشانہ لگاتا تو کہا جاتا تھا کہ ہدف خود اس کے چلائے ہوئے تیر کے سامنے آجاتا تھا۔

چاکر اعظم ہر سال یہ مقابلہ کروایا کرتا تھا۔ شہہ مرید کی کمان کو میدان میں رکھ کر یہ اعلان کیا جاتا کہ اگر کوئی بہادر اس کمان سے تیر چلا کر دکھادے گا تو اسے پچاس اونٹ انعام دیے جائیں گے۔

تیر چلا لینا تو بہت دور کی بات ہے، کوئی اس کمان کو اٹھا بھی نہیں پاتا تھا اور جب سارے کھلاڑی ہمت ہار جاتے اس وقت چاکر اعظم کے اشارے پر شہہ مرید مسکراتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھتا اور اپنی کمان سے تیر چلا کر ہدف کو نشانہ بنا کر دکھا دیتا۔

پورا میدان واہ واہ، سبحان اللہ کے شور سے گونج اٹھتا۔ یہ سلسلہ کئی برسوں سے جاری تھا۔

باہر سے آیا ہوا پہلوان اس کمان کو صرف اپنے شانے تک ہی اٹھا پایا تھا۔ اس کی ہمت جواب دے گئی۔ اس نے

وزنی کمان ایک طرف رکھ دی اور میر چاکر کے سامنے آکر گردن جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ ''نہیں سردار! میں شرمندہ ہوں۔ میں ناکام رہا۔''

میر چاکر نے پاس بیٹھے ہوئے ایک سردار سے کہا۔ ''اس کو انعام واکرام دے کر رخصت کر دو۔''

''کس بات کا انعام سردار؟'' پہلوان نے حیرت ظاہر کی۔ ''میں تو کچھ نہیں کر پایا۔''

''یہ ہماری روایت ہے۔ تم ہمارے مہمان ہو۔ ہم تمہیں خالی ہاتھ تو نہیں جانے دیں گے۔''

پہلوان نے گردن جھکالی۔ شہہ مرید اپنی جگہ سے اٹھ کر اس پہلوان کے پاس آ گیا۔ اس نے پہلوان کے شانے کو تھپک کر کہا۔ ''دوست! اتنے برسوں میں تم پہلے آدمی ہو جو میری کمان کو اپنے کندھے تک اٹھا پایا ہے۔''

اس حوصلہ افزائی پر پہلوان کا چہرہ چمک اٹھا۔ وہ خوش ہو گیا تھا۔ شہہ مرید اسی مزاج کا آدمی تھا۔

وہ پہلوان جس وقت اس کی کمان اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا، اس وقت شہہ مرید اس کی کامیابی کی دعائیں کر رہا تھا۔

اس کے ساتھ بیٹھے اس کے دوست نے حیرت سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے شہہ مرید! تم اس کے لیے دعائیں کر رہے ہو جو تمہاری کمان اٹھانے آیا ہے؟''

''ہاں بھائی، کیونکہ وہ مہمان ہے۔ بہت دور سے آیا ہے۔ اگر وہ کمان نہیں اٹھا پایا تو اس کا دل ٹوٹ جائے گا۔''

اور وہی ہوا۔ وہ کمان نہیں اٹھا پایا۔ شہہ مرید اپنی جگہ سے اٹھ کر پہلوان کی حوصلہ افزائی کے لیے اس کے پاس چلا گیا تھا۔

شہہ مرید جب اپنی نشست کی طرف واپس جانے لگا تو اس کی نگاہ ایک طرف چلی گئی۔ اس مقابلے کو دیکھنے کے لیے بہت سی عورتیں بھی آئی ہوئی تھیں جنہوں نے اس طرح پردہ کر رکھا تھا کہ صرف ان کی خوبصورت آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔

ان سیکڑوں آنکھوں میں دو ایسی آنکھیں بھی تھیں جن میں صرف شہہ مرید کے جلوے رقص کناں رہتے۔ ان آنکھوں نے صرف ایک چہرے کو اپنی نگاہ کی دیواروں پر سجا رکھا تھا اور وہ چہرہ تھا شہہ مرید کا۔

وہ آنکھیں ہانی کی تھیں۔ ہانی جو اس کی محبوبہ بھی تھی اور منگیتر بھی۔ وہ خود بھی ایک سردار کی بیٹی تھی۔

شہہ مرید نے ہانی کو ہزاروں آنکھوں کے درمیان پہچان لیا تھا۔ ''تجھے اے زندگی ہم دور سے پہچان لیتے ہیں۔''

اس وقت میر چاکر کی آواز شیر کی دہاڑ کی طرح پورے میدان میں گونجنے لگی۔ وہ آج کی اس تقریب کی مناسبت سے تقریر کر رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''بلوچوں کی روایت اور بہادری کی قسم۔ ان سنگلاخ پہاڑوں کی قسم جہاں ہمارے شیر دل چرواہے ہمارے لیے خوراک کی جستجو میں اپنے مویشیوں کو لے کر گھومتے رہتے ہیں، جو سورج کی تمازت اور طوفانوں کے تھپیڑے برداشت کرتے ہیں۔ میں ان سبھوں کو سلام کرتا ہوں۔

''میں چاکر ہوں ان ساتھیوں کا جنہوں نے ہر حال میں میرا ساتھ دیا۔ میں چاکر ہوں ان بہو بیٹیوں کا جنہوں نے اپنے آنچل پھیلا کر میرے لیے دعائیں کیں۔ میں ان سب سے وعدہ کرتا ہوں کہ آج کے بعد بلوچوں کی عظمت پہلے سے زیادہ ہو جائے گی۔ آج آس پاس کے تمام علاقوں میں میری یہ آواز گونج رہی ہوگی کہ اب ہماری سرزمین پر کسی دشمن کے ناپاک قدموں کی گنجائش نہیں ہے۔

''ہم ہزاروں سال سے اپنی روایتوں کی حفاظت کرتے چلے آئے ہیں اور آنے والے ہزاروں برسوں تک بلوچستان کی وادیوں میں بلوچوں کی بہادری اور عظمتوں کے گیت گائے جاتے رہیں گے۔ ہمیشہ یاد رکھنا کہ ہماری روایات کیا ہیں۔ مجھے ان بہادروں کا انتقام بھی پیارا ہے جو ہمارے اونچے محلوں پر حملہ کرنے کی ہمت رکھتے ہوں۔ یاد رکھو، ہم وہ قوم ہیں جن کے لیے سکندر اعظم جیسے بہادر نے کہا تھا کہ ''جنگ میں اتر جانے کے بعد بلوچ کو روکنا شیر کے منہ میں ہاتھ ڈالنے کے برابر ہے۔''

یہ ہم ہیں جن کے لیے محمود غزنوی جیسے سورما نے کہا ہے۔ ''بلوچ اگر متحد ہو جائیں تو پوری دنیا پر ان کی حکومت ہو سکتی ہے۔''

آج بلوچوں کی روایتی پگڑی میرے سر باندھی گئی ہے۔ میں ایک بار پھر اپنی قسم دہراتا ہوں کہ جب تک میری سانسیں چل رہی ہیں تب تک میں بلوچوں کے مفادات کی حفاظت کرتا رہوں گا۔''

شہہ مرید کے پاس بیٹھے دوست نے سرگوشی کی۔ ''شہہ مرید! چاکر پھر کسی مہم پر جانے والا ہے؟''

''ہو سکتا ہے۔'' شہہ مرید نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ''ہمارا گھر تو گھوڑوں کی پشت پر ہوتا ہے جس کو ہم ساتھ ساتھ لیے پھرتے ہیں۔''

''کیا تم کو خیال نہیں آتا کہ ایک جگہ رک کر بیٹھ جاؤ، اپنا گھر بنا لو؟''

''کیوں نہیں۔ میں بھی انسان ہوں لیکن ہانی کی محبت

مجھے مہمیز کرتی رہتی ہے کہ شہہ مرید بس، تھک کر بیٹھنا نہیں، چلتے رہو کیونکہ جسے تم منزل سمجھتے ہو وہ منزل نہیں، منزل کا سراب ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ میر چاکر خوش نصیب آدمی ہے کہ اسے تم جیسا سپہ سالار ملا ہے۔''

''نہیں دوست! صرف میں ہی نہیں بلکہ میر چاکر کے جاں نثاروں میں جو بھی ہیں وہ تلواروں کی چھاؤں میں زندگی بسر کرتے چلے آئے ہیں۔ ان کے گھوڑوں کے سموں سے چنگاریاں نکلتی ہیں۔ ان کی آنکھوں کے شعلے دشمنوں پر بجلیاں گراتے ہیں لیکن مجھے تو کسی اور کی نگاہوں نے جلا کر خاکستر کر دیا ہے۔''

''میں سمجھ گیا۔ تم اپنی منگیتر ہانی کی بات کر رہے ہو؟''

شہہ مرید مسکرا دیا۔ میدان میں اب سازندے آ کر قدیم روایتی گیت گانے لگے تھے۔ (یہ زمانہ جنگ و جدل کا تھا۔ بلوچوں کے مختلف قبیلے ایک دوسرے سے الجھے رہتے۔ ان کے بہادر اپنی اپنی تلوار کے جوہر دکھایا کرتے۔ شہہ مرید سپہ سالار تھا اس لیے جنگوں کی زیادہ تر ذمے داری اس کے سپرد تھی۔ اس کی تلوار ہر وقت مصروف رہتی تھی۔ اس کی کمان سے نکلے ہوئے تیر اپنے ہدف کے تعاقب میں رہتے تھے۔ ان سب کے باوجود اس کے دل میں ایک نرم سا پھول بھی لگا ہوا تھا۔ ہانی کی محبت کا پھول، جس کی خوشبو اسے ہر دم سرشار رکھتی تھی)۔

☆☆☆

دونوں ایک دوسرے سے اتنی محبت کرتے تھے کہ جب تک ایک دوسرے کو دیکھ نہیں لیتے، انہیں سکون نہیں ملتا تھا۔

اگرچہ یہ ان کی روایت کے خلاف تھا لیکن ہانی سب سے چھپ کر شہہ مرید سے ملنے آجایا کرتی تھی۔ چاند کی مدھر چاندنی میں جب صحرا دور دور تک چاندنی اوڑھے لیٹا رہتا، اس وقت وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھ کر چاند کو دیکھا کرتے۔

اس رات بھی ان دونوں کی اس صحرا میں ملاقات طے ہوگئی تھی۔ شہہ مرید بہت پہلے سے آ کر بیٹھ گیا تھا لیکن ہانی ابھی تک نہیں آئی تھی۔

اس سفید دودھیا چاندنی میں دور دور تک منظر دکھائی دے رہا تھا۔ صحرا کی ہوا بہت خوشگوار ہوگئی تھی۔

شہہ مرید کی بے قراری میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ہانی ابھی تک نہیں آئی تھی۔ پھر دور سے چاندنی میں، چاندنی میں ہی لپٹا ہوا کوئی آتا دکھائی دیا۔

وہ ہانی ہی ہو سکتی تھی۔ وہ اپنی سفید چادر میں چاندنی ہی کا کوئی حصہ دکھائی دے رہی تھی۔ وہ شہہ مرید کے پاس آ گئی۔ شہہ مرید اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''ہانی! جب تمہیں آنے میں دیر ہوتی ہے تو میرے سینے میں طوفان اٹھنے لگتا ہے۔ جیسے وقت سے بہت پہلے قیامت آ گئی ہو۔''

''شہہ مرید! میرا اس طرح تمہارے پاس آنا قیامت ہی ہوتی ہے۔'' ہانی نے کہا۔

''کیسی قیامت؟''

''یہی کہ ہم اپنی روایتوں سے ہٹ کر ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔''

شہہ مرید نے ہانی کا ہاتھ تھام لیا۔ ''ہانی! محبت کرنے والوں کے اپنے اصول اور اپنی روایتیں ہوتی ہیں۔ وہ ان ہی کی پاسداری کرتے ہیں۔ مذہب عشق کی کتاب زمانے کی کتابوں سے بہت الگ ہوا کرتی ہیں۔''

''اوہو، تم تو شاعر ہوتے جا رہے ہو۔''

''محبت شاعری کا ہنر سکھا دیتی ہے ہانی!''

دونوں ایک طرف آ کر بیٹھ گئے۔ ہوائیں اس وقت دونوں کو مبارک باد دیتی ہوئی گزر رہی تھیں۔ ہوتا بھی یہی ہے کہ جب دلوں کے درمیان خلوص اور سچائی ہو تو پورا ماحول، قدرت کے سارے مظاہر ان کے ساتھ ہو جاتے ہیں۔

ہانی کی آواز بہت خوبصورت تھی۔ وہ جب شہہ مرید کی فرمائش پر کوئی گیت سناتی تو صحرا میں دور تک اس کی آواز کے جلترنگ بجنے لگتے تھے۔

''ہانی! کیا آج کوئی گیت نہیں سناؤ گی؟'' شہہ مرید نے پوچھا۔

''نہیں شہہ مرید! میں بہت اداس ہوں۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' ہانی نے کہا۔

''ڈر لگ رہا ہے؟ کس سے؟ کیا مجھ سے؟''

''نہیں شہہ مرید! اپنے خوابوں سے۔'' ہانی نے جواب دیا۔

''کیسے خواب؟''

''شہہ مرید! میں کئی دنوں سے عجیب سے خواب دیکھ رہی ہوں۔ ان خوابوں نے پریشان کر دیا ہے۔''

''ہانی! اگر خواب تمہیں پریشان کر رہے ہیں تو یقین کرو کہ شہہ مرید تمہاری آنکھوں سے نیندیں چرا کر تمہیں بے خواب کر دے گا۔ ویسے کس قسم کے خواب ہیں؟''

''شہہ مرید!'' ہانی کا لہجہ کھویا کھویا سا تھا۔ ''میں کئی دنوں سے یہ دیکھ رہی ہوں کہ میں کسی حویلی میں قید ہوں اور

خصوصی تحاریر سے مرصع سالِ نو کا دلکش شمارہ

گھر کے ہر فرد کے لئے

ماہنامہ

پاکیزہ

کراچی

دلشاد نسیم نے رقم کیں **صراطِ عشق** کی کٹھن مسافتیں

سعدیہ ہما شیخ کے چشم کشا ناولٹ

میں نے خوابوں کے رنگ دیکھے ہیں کا منطقی انجام

مایہ ناز قلمکار **ناہید سلطانہ اختر، قانتہ رابعہ، افتخار شوق** کی خاص الخاص کاوشیں

فریدہ سیفی کی دل و دماغ کو جھنجوڑنے والی تحریر..... **عہدِ ازل**

شمع ہدایت میں پڑھیے

اختر شجاعت کا پُر روح مقالہ

غصہ..... مذمتِ الٰہی

ادارے سے دیرینہ وابستگی رکھنے والی

قابلِ قدر قلمکار..... **پروین زبیر** کی مسحور کن گفتگو

پڑھیے **وہ آئے بزم میں.....**

ماہنامہ پاکیزہ کی گولڈن جوبلی تقریبات کے حوالے سے مرتب کردہ خصوصی **سروے، سنہری یادوں کا سفر** جس میں تمام قارئین و قلمکار حصہ لے سکتے ہیں

اس کے علاوہ

فرحی نعیم، تسلیم شیخ، نصرت جبین، ریحانہ اعجاز، زارا ہنجرا، زینیا حسن، زرتاشیہ نعمان و دیگراں کی انمول تحریریں

پُرتنوع سلسلوں سے سجا، خوب صورت تراشوں پر مبنی، شعر و شاعری سے مرصع اور حسن و صحت کے متعلق متن سے آراستہ ماہنامہ پاکیزہ صرف آپ جیسے باذوق قارئین کے لیے.....

TAGPK.COM

تم مجھے چھوڑ کر جا رہے ہو۔ میں تمہیں پکار رہی ہوں، بلا رہی ہوں لیکن تم میری بات نہیں سنتے پھر ایک بار مڑ کر میری طرف دیکھتے ہو۔ تمہاری آنکھوں میں بھی آنسو ہیں لیکن تم چلے جاتے ہو۔ چلے جاتے ہو۔''

شہہ مرید ہنسنے لگا لیکن اس ہنسی میں پریشانی کا رنگ بھی تھا جیسے وہ خود کو اور ہانی کو مطمئن کرنے کے لیے ہنس رہا ہو۔ ''ہانی! تم نے ایسا خواب کیوں دیکھ لیا؟ کیا میں تم کو چھوڑ سکتا ہوں؟''

''خوابوں پر کس کا بس چلتا ہے شہہ مرید!''

''ایسے خواب مت دیکھا کرو۔ اگر محبت میں خلوص کا جذبہ ہو تو وہ بُرے خواب کو بھی اچھی تعبیر میں بدل دیتی ہے۔''

ہوا کی رفتار اچانک تیز ہوگئی۔

صحراؤں میں ہواؤں کے ایسے ہی تیور ہوا کرتے ہیں۔ ذرا سی دیر میں تیز چلتی ہوئی ہوائیں غضب ناک طوفانوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔

اس وقت بھی ایسا ہی ہوا۔ ہوائیں طوفان میں بدل گئیں۔ صحرا کی ریت نے اڑ اڑ کر نگاہوں کے سامنے ایک چادر سی پھیلا دی۔

شہہ مرید نے بہت مضبوطی سے ہانی کا ہاتھ تھام رکھا تھا اس کے باوجود ہانی کے قدم اکھڑ گئے۔ وہ بگولوں کی زد میں آکر بہت دور نکل گئی۔

شہہ مرید اسے آوازیں دینے لگا۔ ہانی بھی آوازیں دے رہی تھی، پکار رہی تھی۔ اس طوفان میں اسے اپنا وہ بھیانک خواب یاد آنے لگا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح چاروں طرف ہاتھ چلا رہی تھی۔ پھر شہہ مرید کا ہاتھ اس کے ہاتھ سے ٹکرایا۔

''ہانی!'' اس نے شہہ مرید کی آواز سنی۔

''ہاں، شہہ مرید!''

''بس میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام لو۔ یہ طوفان کچھ دیر میں ختم ہو جائے گا۔''

وہ طوفان ختم ہوگیا لیکن محبت کرنے والوں کی راہ میں ایک دوسرا طوفان بھی تھا جو اس عارضی طوفان سے کہیں زیادہ شدید تھا۔

☆☆☆

شہہ مرید اور ہانی ایک دوسرے کی محبت میں مگن تھے لیکن ہوتا یہ ہے کہ وقت کبھی کبھی بہت بے رحم ہو جاتا ہے۔ وہ خوابوں کے محل کو ذرا سی دیر میں مسمار کر دیتا ہے، ارمانوں کو کچل کر رکھ دیتا ہے اور ایسے ایسے لوگ محبت کرنے والوں کی راہ میں دیوار بن جاتے ہیں جن کے لیے تصور بھی نہیں ہوتا کہ وہ بھی ایسا کر سکتے ہیں۔

ہانی کی محبت میں صرف شہہ مرید ہی گرفتار نہیں تھا بلکہ خود میر چاکر بھی اس کے عشق میں مبتلا تھا لیکن اس کا رتبہ اور مقام ایسا تھا کہ وہ کھل کر اپنے عشق کا اظہار نہیں کر سکتا تھا، صرف بے چین رہا کرتا۔

وہ اس وقت اپنی بیٹھک میں تھا۔ جب اس کے ایک خاص ملازم میرو نے آکر خبر دی۔ ''سردار! ان دونوں کی محبتیں رنگ لانے والی ہیں۔''

''کن دونوں کی بات کر رہے ہو؟''

''شہہ مرید اور ہانی کی۔ اگلے مہینے ان دونوں کی شادی ہونے والی ہے۔''

میر چاکر تڑپ کر رہ گیا۔

اس احساس نے اسے ادھ موا کر دیا تھا۔ اس نے جس سے محبت کی تھی وہ کسی اور کی ہونے والی تھی۔ وہ نڈھال سا ہو کر ایک طرف بیٹھ گیا۔

میرو اس کی حالت دیکھ کر اس کے پاس آگیا۔ ''کیا ہوا سردار! خیریت تو ہے نا؟''

''میرو!'' میر چاکر دھیرے سے بولا۔ ''میں ایک کمزور انسان ہوں۔ سردار ہوتے ہوئے بھی بہت بے بس ہوں۔ میری تلوار تو گردنیں اڑانے میں دیر نہیں کرتی لیکن اس مقام پر آکر میری ساری شان اور میرا سارا دبدبہ اس ریت کی طرح ہوگیا ہے جو ہمارے صحراؤں میں ہوا کے ساتھ ساتھ اڑتی پھرتی ہے۔ تم جانتے ہو میں نے ہانی کو کب دیکھا تھا؟''

میر چاکر اس وقت ایک عام انسان کی طرح محبت کے جذبے کے سامنے ڈھیر ہوگیا تھا۔

وہ دھیمے لہجے میں بتا رہا تھا۔ ''میں اور شہہ مرید ایک بار شکار سے واپس آرہے تھے۔ بہت تیز دھوپ تھی۔ ہمارے سامنے دور دور تک پھیلا ہوا صحرا تھا۔ ہمارے پاس پانی بھی ختم ہو چکا تھا۔ ہم دونوں کے گھوڑوں نے جہاں تک ممکن ہو سکا، ہمارا ساتھ دیا پھر دونوں کے گھوڑے پیاس سے مر گئے۔ ہمارے پاس سواری بھی نہیں رہی تھی۔ ہمیں پیدل ہی صحرا کو عبور کرنا تھا پھر مجھے یاد آیا کہ صحرا کے اس حصے میں وہ گاؤں یا بستی ہے جہاں میری منگیتر مومل اور شہہ مرید کی منگیتر ہانی رہتی ہے۔ ہمیں کسی طرح اس بستی تک پہنچنا تھا اس لیے ہم چلتے رہے..... چلتے رہے۔''

میر چاکر بولتے بولتے اس طرح رک گیا جیسے وہ اپنے پچھلے دنوں کو یاد کر رہا ہو۔

''پھر کیا ہوا سردار؟'' میرو نے پوچھنے کی ہمت کی۔

''میرو! مجھ سے زیادہ شہہ مرید کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ اس کے پیروں میں چھالے پڑ گئے تھے۔ اس کی سانسیں پیاس کی شدت سے الجھنے لگی تھیں۔ وہ بار بار اپنے گلے پر ہاتھ پھیر کر نحیف آواز میں پانی پانی پکار رہا تھا۔ میں نے اسے تسلی دینے کے لیے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ بہرحال ہم دونوں کسی نہ کسی طرح اس بستی تک پہنچ ہی گئے جو ان دونوں کی بستی تھی یعنی موہل میری منگیتر اور ہانی شہہ مرید کی منگیتر۔''

''سردار! کیا آپ کے ساتھ اور لوگ نہیں تھے؟'' میرو نے پوچھا۔

''ہاں اور لوگ بھی تھے لیکن اس صحرا میں ہم دونوں ان سے بچھڑ گئے تھے اس لیے اس بستی تک ہم دونوں ہی پہنچے تھے۔ یہ اتفاق تھا کہ ہم نے کچھ فاصلے پر ہی موہل اور ہانی کو دیکھ لیا۔ ان دونوں کے پاس پانی کی چھاگلیں بھی تھیں۔ اب ہم میں چلنے کی ہمت اور طاقت نہیں رہی تھی۔ ہم نڈھال ہو کر ایک طرف گر پڑے۔ ہمیں دیکھ کر ہانی دوڑتی ہوئی میرے پاس آ گئی جبکہ موہل شہہ مرید کی طرف چلی گئی تھی۔ ہم نے پانی مانگا تو اس وقت ہانی نے عقلمندی کی۔ اس نے قطرہ قطرہ کر کے پانی میرے سوکھے ہوئے حلق میں ٹپکایا جبکہ موہل نے اپنی نادانی میں شہہ مرید کو بہت سا پانی پلا دیا۔ تم تو جانتے ہو میرو کہ اس موقع پر پانی ایک ساتھ نہیں پلایا جاتا۔''

''یہ بات تو ہے سردار!'' میرو نے اس کی تائید کی۔

''ایسے پیاسے کو ایک دم پانی نہیں پلایا جاتا۔''

''وہی ہوا۔ پانی پینے کے بعد شہہ مرید کی حالت غیر ہو گئی تھی جبکہ میں ہانی کی عقلمندی کی وجہ سے بالکل ٹھیک رہا۔''

''سردار! آپ تو ایک طاقتور انسان ہیں۔ آپ کی قوتِ ارادی بھی بہت مضبوط ہے پھر آپ کی ایسی حالت کیوں ہے؟''

''بے وقوف، انسانی جسم میں ایک عضو ایسا بھی ہے جو سب سے طاقتور ہے اور سب سے کمزور بھی۔ اس کو دل کہتے ہیں۔ اگر اس کو قابو میں کر لو تو پوری دنیا کو قابو میں کر سکتے ہو۔ اگر اس کے آگے جھک جاؤ تو پھر تنکے کی طرح ہوا کا ایک جھونکا بھی اڑا کر لے جاتا ہے۔ میری شان و شوکت، میرا سارا دبدبہ اس جذبے کے آگے ڈھیر ہو گیا ہے جس کو محبت کہتے ہیں۔''

''سردار! اب میں سمجھا۔ یہ جذبہ انسان کو واقعی کمزور کر دیتا ہے۔''

''میرو! میں بس یہی سوچتا رہتا ہوں کہ اب کیا ہوگا؟''

''سردار! میں آپ کو مزے کی بات بتاؤں؟ آپ نے شہہ مرید کا اعلان سنا ہے؟''

''کون سا اعلان؟''

''اس کا اعلان ہے سردار کہ جو بھی جمعے کی محفل میں اس کو خوش کر دے گا وہ اس کو منہ مانگا انعام دے دے گا۔''

''تو پھر اس سے کیا ہوگا؟''

''سردار! میرے پاس ایک گانے والا آیا ہوا ہے۔ اس کی آواز ایسی ہے جیسے صحرا میں اونٹوں کے قافلے گھنٹیاں بجاتے ہوئے جا رہے ہوں۔ وہ جب گاتا ہے تو اڑتے ہوئے پرندے تک زمین پر اتر کر اسے سننے لگتے ہیں۔''

''تیری بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے میرو۔'' چاکر نے الجھ کر کہا۔

''سنتے تو رہیں سردار! میں اس گانے والے کو شہہ مرید کے پاس بھیج دوں گا۔ شہہ مرید اس سے خوش ہو کر اس سے اپنے قول کے مطابق پوچھے گا کہ اسے کیا چاہیے پھر وہ ہانی کا سوال کر دے گا اور وہ گانے والا ہانی کو آپ کے حوالے کر دے گا۔''

''کیا بکواس ہے میرو۔ تُو مجھے سازش کے لیے کہہ رہا ہے۔ چاکر نے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ جنگ کے میدان میں حاصل کیا ہے، سازش کبھی نہیں کی۔''

''میں جانتا ہوں سردار لیکن یہ تو سوچیں اگر ہانی کے لیے شہہ مرید سے جنگ کریں گے تو تاریخ کیا کہے گی۔ سب الزام آپ پر آ جائے گا۔ اس لیے اس معاملے میں جذبات سے نہیں، سمجھ داری سے کام لیں اور آپ جو بھی کریں گے وہ سازش نہیں، حکمتِ عملی ہوگی۔ سازش اور حکمتِ عملی میں بہت فرق ہوتا ہے سردار۔''

میرو کی باتوں نے چاکر کے اندر ایک طوفان سا برپا کر دیا تھا۔ اس نے چاکر کو ایک ایسی راہ دکھا دی تھی جس راہ پر چلنے کا چاکر نے کبھی تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔ میرو نے کہا۔

''محبت اور جنگ میں سب چلتا ہے سردار اور آپ شہہ مرید سے زبردستی کچھ چھین نہیں رہے ہیں بلکہ وہ اپنی مرضی سے کسی کو دے رہا ہے۔ اب یہ اس تحفہ لینے والے کی مرضی ہے کہ وہ اس انعام کو اپنے پاس رکھے یا کسی کو بھی دے دے۔ اس میں کون سی سازش ہوئی سردار؟''

میرو کی آواز نے چاکر کو چونکا دیا۔ وہ پوچھ رہا تھا۔

''کیا سوچ رہے ہیں سردار؟''

''ٹھیک ہے میرو۔'' چاکر نے اس کی طرف دیکھا۔ ''بھیج دے اس گانے والے کو۔''

☆☆☆

نہ جانے کیوں آج شہہ مرید کو ہانی بہت یاد آرہی تھی۔ حالانکہ پرسوں ہی اس سے ملاقات ہوچکی تھی۔ اس کے باوجود ایک بے کلی سی تھی۔ وہ ہانی کے لیے اپنے لکھے ہوئے اشعار گنگنا رہا تھا۔ ''چاند کی روشنی جب چاند سے سفر کرتی ہوئی ہماری زمین پر اترتی ہے تو ہانی کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ جب ستارے آنکھیں کھول کھول کر اس کو دیکھتے ہیں تو اس وقت ہانی ریت کی چادر پر اترا اترا کر چلتی ہے۔ خدا نے اس کو اپنے باکمال ہاتھوں سے بنایا ہے۔ اس لیے وہ اتنی خوبصورت ہے۔''

اسی وقت باہر سے کسی کے گانے کی آواز اس کے وجود میں ٹھنڈک بن کر اترنے لگی۔ وہ اپنے ملازم کو آواز دینے لگا۔ ''بارک..... بارک۔''

بارک اس کے پاس آکر کھڑا ہوا۔ ''حکم سردار!''

''بارک! یہ کس کی آواز ہے جس نے شہہ مرید کے دل کو تڑپا دیا ہے۔''

''ایک گانے والا آیا ہے سردار۔ بہت خوبصورت آواز ہے اس کی۔'' بارک نے بتایا۔

''ہاں بارک! ایسا لگ رہا ہے جیسے وہ آواز صحرا سے اٹھتی ہوئی ہماری چوکھٹ پر آکر کھڑی ہوگئی ہو۔ میں نے ایسی خوبصورت آواز پہلے نہیں سنی۔ جاؤ اس کو بلا کر لے آؤ۔ ایسی مدھر آواز کے مالک کو چوکھٹ پر کھڑا نہیں رہنا چاہیے۔''

بارک گانے والے کو بلا کر لے آیا جو شہہ مرید کے سامنے آکر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوگیا تھا۔

''سردار! یہ بالاچ ہے۔'' بارک نے بتایا۔

''خوش آمدید بالاچ! بہت خوبصورت آواز ہے تمہاری۔'' شہہ مرید نے کہا۔

''شکریہ سردار! فن سے محبت کرنے والوں کی آواز میں خدا خوبصورتی ڈھال دیتا ہے۔''

''کہاں سے آرہے ہو؟''

''بہت دور سے سردار! یہ سن کر اس حویلی کے دروازے تک آیا ہوں کہ یہاں سے کوئی خالی ہاتھ نہیں جاتا۔''

''بالاچ! تمہاری آواز میں جادو ہے۔ تم اپنی آواز کا جادو جگاؤ، شہہ مرید تمہیں خالی نہیں جانے دے گا۔''

''جو حکم سردار۔'' بالاچ نے کہا۔

اس نے اپنے گیت چھیڑ دیے۔ کیا آواز تھی اس کی۔ شہہ مرید کی پوری حویلی میں جیسے ترنم کی برسات ہوگئی تھی۔ بالاچ جب خاموش ہوا تو اس کی خاموشی کے بعد بھی شہہ مرید ایک کیف کے عالم میں بیٹھا رہا تھا۔

بالاچ اس کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔

''بالاچ تو نے میرا دل خوش کردیا ہے۔'' شہہ مرید نے کہا۔ ''سبحان اللہ! کیا آواز ہے تیری۔ میں تو تیری آواز کا مرید ہوگیا ہوں۔ مانگ کیا مانگتا ہے۔''

''سردار! بہتر یہی ہے کہ میں یہاں سے چلا جاؤں۔''

''کیا مطلب ہے تیرا؟''

''اس لیے سردار کہ جو میں مانگوں گا، وہ آپ نہیں دے سکیں گے۔''

شہہ مرید نے غصے سے اپنی تلوار کھینچ لی۔ ''کیا تُو یہ نہیں جانتا کہ تُو کس سے یہ کہہ رہا ہے؟ اگر تُو میرے دروازے پر نہیں آیا ہوتا تو میں تیری گردن اڑا دیتا۔ تو نے شہہ مرید کی توہین کی ہے۔''

''آپ شوق سے میری گردن اڑا سکتے ہیں سردار لیکن میں پھر بھی یہی کہوں گا کہ میں جو مانگوں گا وہ آپ نہیں دے سکیں گے۔''

شہہ مرید چیخ اٹھا۔ ''بدبخت انسان، بتا تجھے کیا چاہیے؟''

''آپ کی منگیتر ہانی۔'' بالاچ نے کہا۔

ایک قیامت سی آگئی۔ حویلی کے در و دیوار لرز اٹھے۔ شہہ مرید نے اپنی تلوار بلند کرلی۔ بالاچ سر جھکا کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کرلی تھیں۔ اب یہ لمحوں کا کھیل تھا۔ اس کی گردن الگ ہونے والی تھی۔ اس نے شہہ مرید جیسے انسان کی غیرت کو للکار دیا تھا۔ شہہ مرید کی تلوار اٹھی اور اس کی گردن کے پاس آکر رک گئی۔

''بدبخت! تُو نے یہ کیا مانگ لیا۔ بتا تجھے اور کیا چاہیے۔ میرے سارے گھوڑے اور مویشی لے جا۔ میری یہ حویلی تیرے حوالے ہے، سب کچھ تیرا ہے۔''

بالاچ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''مجھے جانے دیں سردار!'' اس نے اپنے ہاتھ جوڑ لیے۔ ''میں جانتا تھا کہ یہ قول نبھانا آپ کے بس کی بات نہیں ہے۔''

''خاموش!'' شہہ مرید دہاڑنے لگا۔ ''بدبخت، جا لے جا میری زندگی..... لے جا ہانی کو۔ میں اس کے گھر والوں سے کہہ بھی دوں گا۔ وہ میری زندگی تیرے حوالے کردیں گے۔ جا، دفع ہو یہاں سے۔ کاش! میں نے تیری آواز نہیں سنی ہوتی، کاش!''

☆☆☆

یہ کہانی ایک حیرت انگیز کروٹ بدل لیتی ہے۔

بالاچ نے ہانی کو حاصل کرلیا۔ وہ خود اس کے حسن

اور اس کی معصومیت دیکھ کر دنگ رہ گیا تھا لیکن وہ چاکر سے وعدہ کر چکا تھا کہ اگر اس نے ہانی کو حاصل کرلیا تو چاکر کے حوالے کردے گا۔

ہانی چاکر کے محل میں پہنچ گئی۔ اس کے وہ خواب سچ ہوگئے جن میں وہ خود کو شہہ مرید سے الگ ہوتے ہوئے دیکھا کرتی تھی۔

اس سے زیادہ بری حالت شہہ مرید کی تھی۔ وہ شہہ مرید، جس کے پاس ہانی ہوا کرتی تھی لیکن اب اسے کھودینے کے بعد خالی ہاتھ ہوگیا تھا۔ کچھ بھی نہیں رہا تھا اس کے پاس۔ اس نے اپنی محبت اپنے ہاتھ سے کسی اور کے حوالے کردی تھی۔

اب وہ ایک لٹے ہوئے بھکاری کی طرح ہوگیا تھا۔ اس کی بے قراری اس کے آہنی ارادوں کی چادر اوڑھ کر خود کو دوسروں کی نظروں سے پوشیدہ رکھنے لگی تھی۔

وہ ایک دلیر مرد تھا اور ایسے لوگ اپنی خلش ظاہر نہیں کرتے۔ اپنی تلوار کی جھنکار اور اپنے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آہنگ میں چھپا کر رکھتے ہیں۔ شہہ مرید نے اپنے کتوں اور اپنی جنگی مہارت کو اپنا ساتھی بنالیا تھا۔

زندگی ہانی کے لیے بہت دشوار ہوگئی تھی۔ وہ چند اجنبی دیواروں کے درمیان ایک بے محبوب زندگی گزار رہی تھی۔ وہ اپنے آپ سے باتیں کرتی رہتی۔ اس کے تصور میں شہہ مرید ہوتا جس سے وہ باتیں کیا کرتی۔

''میرے محبوب! تو نے مجھے اپنی ایک بے وجہ قسم کے لیے بیچ دیا ہے۔ تیرے لیے محبت کی اہمیت نہیں رہی۔ تیرا... قول ہی سب کچھ ہوگیا۔ کاش! قول دیتے وقت یہ تو سوچا ہوتا کہ انسان کو قول سے ہارا نہیں جاتا۔ یہ تو نے کیسی وفا نبھائی ہے۔ تو نے تو کہا تھا کہ صرف موت ہی ہمیں جدا کرسکتی ہے لیکن تو نے تو خود اپنے ہاتھوں مجھے کسی اور کے حوالے کردیا۔ کیوں کیا ایسا؟ کیا محبت اتنی کمتر چیز ہوتی ہے کہ ایک بول کے بدلے ہار دیا جائے؟''

اس وقت بھی اس کی وہی کیفیت تھی۔ وہ پاگلوں کی طرح کمرے میں گھومتی پھر رہی تھی۔ کسی کے قدموں کی چاپ نے اسے چونکا دیا۔ میر چاکر کمرے کے اندر داخل ہو رہا تھا۔ اسی شان اور دبدبے کے ساتھ جو اس کے مزاج کا خاصہ تھا۔ ہانی اسے دیکھ کر ایک طرف ہوگئی۔

''کیسی ہو تم؟'' چاکر نے پوچھا۔

''پنجرے کے قیدی سے اس کا حال نہیں پوچھتے۔'' ہانی نے جواب دیا۔

''لیکن تم یہاں قید تو نہیں ہو۔ یہ ساری حویلی تمہاری ہے۔''

''پنجرے کی تیلیاں سونے کی بنا کر پرندے کو خوش نہیں کیا جاسکتا ہے سردار!''

''لیکن ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب پرندہ اسی پنجرے کو اپنا سمجھ کر زندگی گزار دیتا ہے۔ ہانی! یہ سودا زبردستی کا نہیں ہے۔'' میر چاکر نے کہا۔

''سردار! اور زبردستی کس کو کہتے ہیں؟''

''ہانی! تم یہ نہیں سمجھو گی کہ میں نے یہ سب کچھ تمہارے ساتھ اس لیے کیا ہے کہ میری دستار دوسروں کے سامنے چاہے لاکھ بلند ہو لیکن محبت کے سامنے اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ قسم ہے اپنی شان اور عزت کی۔ میں کبھی کسی کے سامنے نہیں جھکا لیکن اس محبت نے میری گردن جھکا دی ہے۔ میں نے کبھی ہار نہیں مانی لیکن اس محبت نے میری فتوحات کے راستے میں پہاڑ کھڑے کردیے ہیں۔ ہانی! میں سب کچھ ہار گیا ہوں، تم پر اور تمہاری محبت پر۔ یہ دل کی بات ہے ہانی۔''

''سمجھ میں نہیں آتا کہ دل کی یہ بات اتنی جلدی کیسے ہوسکتی ہے کہ اس کے لیے چاکر جیسا سردار مجبور ہوگیا ہے۔''

''ہانی! یہ اتنی جلدی کی محبت نہیں ہے۔ یاد کرو اب سے کئی سال پہلے جب میں اور شہہ مرید تمہارے گاؤں میں تھکے ہارے پہنچے تھے۔ ہم پیاس سے نڈھال ہو رہے تھے۔ اس وقت تم اور مومل پانی لے کر اپنے گھروں کو جارہی تھیں۔''

''ہاں، یاد ہے سردار۔ اس وقت میں نے تمہیں اور مومل نے شہہ مرید کو پانی پلایا تھا۔''

''ہاں، اور اس وقت محبت کسی شریر بچے کی طرح سامنے آکر کھڑی ہوگئی تھی۔ میں تو اس وقت خود کو ہار چکا تھا ہانی۔ اسی وقت تمہارے لیے میں نے اپنے دل کے دروازے کھول دیے تھے۔''

''تمہیں فولاد کی چٹان سمجھا جاتا ہے لیکن اب پتا چلا کہ تم بہت کمزور انسان ہو۔''

''میں کمزور نہیں ہوں۔'' چاکر کی آواز بلند ہوگئی تھی۔ ''نہیں ہوں کمزور..... لیکن محبت نے میری ساری طاقت چھین کر کمزور کرکے رکھ دیا ہے اور میں اس وقت تک طاقتور نہیں ہوسکتا جب تک تمہاری محبت نہ مل جائے۔ مجھے اپنی زندگی گزارنے کے لیے تمہاری ضرورت ہے ہانی۔''

چاکر کمرے سے باہر چلا گیا۔ ہانی کھڑی رہ گئی۔ اس نے جو کچھ بھی سنا، اس کا تصور بھی اس نے نہیں کیا تھا۔

محبت کے اس مثلث میں تینوں ہی اپنی اپنی جگہ مجبور

تھے۔ ہانی بھی، شہہ مرید بھی اور چاکر بھی۔

شہہ مرید کا دل ہی اچاٹ ہوگیا تھا۔ اس نے اس گویے کو تلاش کرنے کی بہت کوشش کی جو اس کی ہانی کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ ہانی اس کے سردار کے پاس ہے۔ کسی نے اسے خبر بھی نہیں دی تھی۔

جنگیں تو ہوتی رہتی تھیں۔ ایک اور جنگ جب سامنے آئی تو میر چاکر نے شہہ مرید کو پیغام روانہ کردیا۔

شہہ مرید اپنے کمرے میں تھا جب بارک نے آکر بتایا۔ ''سردار! چاکر نے تمہیں بلایا ہے۔''

''وہ کیوں؟''

''سردار کو تمہاری ضرورت پڑگئی ہے۔ ایک جنگ چھڑ گئی ہے اور تم سردار کے سپہ سالار ہو۔ تم جب جنگ کے میدان میں ہوتے ہو تو تمہارا نام ہی سن کر دشمن فرار ہوجاتا ہے۔ پورے بلوچستان کے پہاڑ اور ریگستان اس بات کے گواہ ہیں کہ جب بھی تم نے تلوار اٹھائی ہے، وہ اس وقت واپس آئی ہے جب فتح مقدر ہوچکی ہو۔''

''بارک جاؤ۔ سردار کو بتادو کہ شہہ مرید اب تلوار کا آدمی نہیں رہا۔ اس نے جوگ لے لیا ہے۔ اب کوئی پہاڑ اس کی دہشت سے نہیں کانپے گا۔ کوئی ریگستان اس کے قدموں کے سامنے نہیں بچھے گا۔ وہ اب دنیا کے کسی کام کا نہیں رہا۔ اس نے اپنی تلواریں دیواروں پر سجادی ہیں اور اپنے تیروں کو کند کرلیا ہے۔''

''زندگی اس طرح تو نہیں گزرے گی سردار!''

''بارک! جس طرح گزارنے کا خواب دیکھا تھا، اس طرح تو نہیں گزری، اب اسی طرح گزرے گی، تڑپتے ہوئے۔ جاؤ، اپنے سردار کو بتادو۔''

بارک اور کچھ نہیں کہہ سکا۔ وہ سر جھکا کر شہہ مرید کے کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

بالاچ پر ایک جنونی کیفیت طاری تھی۔

اس کی انگلیاں لہولہان ہورہی تھیں۔ وہ ایک مدہوشی کے عالم میں ساز بجائے جارہا تھا۔ اچانک اس نے اپنے ایک دوست میرو کی آواز سنی۔ ''بالاچ! بند کرو اپنی دھنیں۔ تُو اس قابل نہیں رہا کہ کوئی ساز اٹھا سکے۔ تُو نے موسیقی کی توہین کی ہے۔''

''یہ کیا کہہ رہا ہے میرو؟'' بالاچ کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔

''ٹھیک ہی کہہ رہا ہوں۔ ارے موسیقی تو اجلے دلوں کے لوگوں کا کام ہے۔ جب گانے والے کے سُر فضا میں بکھرتے ہیں تو پرندے تک اڑانیں بھول کر سننے لگتے ہیں۔ ندیوں، دریاؤں میں بہتا ہوا پانی اپنا بہاؤ روک لیتا ہے۔ یہ سچے لوگوں کا کام ہے اور تُو نے سچائی کی توہین کی ہے۔ تُو نے شہہ مرید جیسے آدمی کو دھوکا دیا ہے۔ تُو نے اس کی محبت چھین کر کسی اور کے حوالے کردی ہے۔ تو نے سازش کی ہے اور سازش کرنے والا قدرت کے حسین نظاروں اور موسیقی کا ساتھی نہیں ہوسکتا۔ یہ تو گندے دل والوں کا تماشا ہے۔ خدا جانے تو کب سے ایسا ہوگیا۔ جانتا ہے قدرت نے تجھے سزا دینا شروع کردی ہے۔ خود دیکھ لے۔ پہلے تیرے گلے سے نور کی بارش ہوتی تھی، اب تیرے سارے سُر صرف بھونڈی آواز بن کر رہ گئے ہیں۔ پہلے ہم سب سانسیں روک کر تیری آواز سنتے تھے۔ اب تو گاتا ہے تو ہم سب اٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ بالاچ! تُو نے بہت برا کیا ہے، بہت برا۔''

''میرے دوست! اب تُو ہی بتا میں کیا کروں؟''

''بے چارہ شہہ مرید پورے بلوچستان میں اپنی محبت کو تلاش کرتا پھر رہا ہے۔ تُو اسے جاکر بتادے کہ اس کا محبوب کس کے پاس ہے۔''

''مجھے اس سے ڈر لگتا ہے۔''

''اگر یہی ڈر جرم کرنے سے پہلے ہوجائے تو یہ دنیا ہی جنت بن جائے۔ میں نے ایک راستہ بتادیا ہے۔''

اس کا دوست جانے لگا۔ بالاچ نے آواز دے کر اسے روک لیا۔ ''میرے دوست! تُو نے مجھے ایک راستہ بتادیا ہے۔ میں جارہا ہوں شہہ مرید کے پاس۔''

☆☆☆

محبت کی یہ کہانی سفر کرتی رہی۔ شہہ مرید اپنے خواب تلاش کرتا رہا۔ زندگی اس کے لیے کانٹوں کا بستر بن گئی تھی۔ اس نے دنیا سے اپنا ناتا توڑ لیا۔ اس نے اپنی تلوار ایک طرف رکھ دی۔ اس نے اپنی تیر کمان دیوار پر سجادی کیونکہ یہ سب گزرے دنوں کی یادیں تھیں۔

وہ اپنے آپ سے کہتا۔ ''شاید ایسی محبت کسی نے نہیں کی ہوگی جیسی میں نے کی تھی۔''

پھر دوسری آواز آتی۔ ''نہیں شہہ مرید! تُو جھوٹ کہتا ہے۔ محبت کرنے والے اپنی محبت کسی اور کے حوالے نہیں کرتے۔ اس کو بہت احتیاط سے ہتھیلی کے چھالوں کی طرح رکھتے ہیں۔''

''میں کیا کرتا۔ میرے قول نے مجھے مجبور کردیا تھا۔''

وہ بولنے لگتا۔

وہ آواز ہنستی، اس کا مضحکہ اڑاتی۔ ''یہ کیسا قول ہے کہ تُو نے ہانی کے جذبات کی بھی پروا نہیں کی۔ یہ بھی نہیں

سوچا کہ اس پر کیا گزر رہی ہوگی۔''

شہہ مرید پھر دھیمی آواز میں خود ہی کہتا۔ ''میں بہت شرمندہ ہوں۔ میں ایسا نہیں چاہتا تھا لیکن اس وقت شاید میں اپنی انا کے فریب میں تھا۔ بس یہ سوچتا رہتا کہ اگر میں اپنے قول سے پھر گیا تو پورا بلوچستان مجھ پر لعنت ملامت کرے گا۔ تاریخ مجھے کبھی معاف نہیں کرے گی اور اب .....اب تو شاید کوئی بھی مجھے معاف نہ کرے۔''

اسی لمحے بارک داخل ہو کر بتاتا ہے۔ ''سردار! بالاچ تم سے ملنا چاہتا ہے۔''

''کون بالاچ؟''

''وہی جس کے سامنے تم نے اپنا قول ہار دیا تھا۔''

شہہ مرید تڑپ اٹھا۔ ''بالاچ آیا ہے۔ پھر تو اس کے ساتھ ہانی بھی ہوگی۔'' وہ بولتے بولتے رک گیا۔ ''نہیں، میں اس سے نہیں ملوں گا۔ وہ ہانی کو واپس کرنے آیا ہوگا۔ اس کو بتا دو کہ شہہ مرید اپنی جان پر ظلم برداشت کر لے گا۔ راتوں کو جاگتا رہے گا، ریگستان کی ہوا کی طرح اِدھر اُدھر ہوتا رہے گا لیکن اپنا دیا ہوا قول واپس نہیں لے گا۔ اس سے کہہ دو کہ ہانی کو اپنے پاس ہی رکھے۔''

''سردار! وہ شاید اس لیے نہیں آیا ہے بلکہ ملنا چاہتا ہے تم سے۔''

''چلو، بھیج دو اس کو۔'' شہہ مرید نے کچھ سوچ کر کہا۔

''وہ اپنے ساتھ ہانی کی خوشبو لے کر آیا ہے۔ بلا لو اس کو۔''

بارک باہر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد بالاچ گردن جھکائے داخل ہوا۔ شہہ مرید کو دیکھتے ہی وہ سسک اٹھا۔ ''مجھے معاف کر دو سردار! میں نے تم کو دھوکا دیا ہے۔''

''دھوکا تو میری قسمت نے دیا ہے۔ یہ بتا ہانی کیسی ہے؟''

''میں نہیں جانتا سردار کہ وہ کیسی ہے؟ کس حال میں ہے؟''

''کیا بکواس کر رہا ہے۔ میں نے ہانی کو تیرے حوالے کیا تھا اور تُو یہ کہہ رہا ہے کہ تو نہیں جانتا کہ وہ کیسی ہے؟''

''سردار! اگر تم وعدہ کرو کہ مجھے سزا نہیں دو گے، میرا گناہ معاف کر دو گے تو میں سب کچھ بتا دوں گا۔''

''بتا، کیا کہنا ہے تجھے؟''

''سردار! میں نے تمہاری محبت کو اپنے لیے نہیں مانگا تھا۔''

''تو پھر کس کے لیے مانگا تھا؟''

''سردار چاکر کے لیے۔''

شہہ مرید نے اپنی تلوار کھینچ لی۔ ''تُو یہ کیا بکواس کر رہا ہے۔''

''میں تم سے جھوٹ نہیں بول رہا۔ تم چاہو تو میری گردن اڑا سکتے ہو۔ اگر چاہو تو مجھے اپنا قیدی بنا کر رکھ لو۔ ہانی کے لیے سردار چاکر کی طرف سے کہا گیا تھا کہ میں تمہارے پاس جا کر اپنا گانا سناؤں۔ پھر تم خوش ہو کر اپنا قول ہار دو گے اور میں ہانی کو تم سے مانگ کر سردار چاکر کے حوالے کر دوں گا۔''

''یہ کیا کر دیا تُو نے؟ اتنا بڑا ظلم کیا ہے۔ بتا کیا ہانی سردار چاکر کے پاس ہے؟''

''ہاں سردار! میں ایک غریب آدمی ہوں۔ مجھ سے یہ کام لیا گیا تھا۔ میں ہانی جیسی شہزادی کو لے کر کیا کرتا۔ سردار چاکر نے مجھے روپے بھی دیے تھے اور مجھ سے وعدہ بھی لیا تھا کہ میں یہ راز کسی کو نہیں بتاؤں گا۔''

''پھر مجھے تو نے کیوں بتا دیا؟''

''مجھے تمہاری حالت کا پتا چلتا رہا ہے سردار۔ تم ہانی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔ مر گئے تھے تم۔ اس کے علاوہ خدا کی طرف سے مجھے سزا بھی مل چکی ہے سردار۔ میرے نغمے کہیں کھو گئے ہیں۔ میرے سُر چھن چکے ہیں، میرا ساز بے کار ہو گیا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ سب اس لیے ہوا ہے کہ میں نے دو محبت کرنے والوں پر ظلم کیا ہے۔ اس لیے میں تمہارے پاس معافی مانگنے چلا آیا ہوں۔ اب یہ تمہاری مرضی کہ تم کیا فیصلہ کرتے ہو۔''

''چلا جا بدبخت انسان! تیری یہی سزا بہت ہے کہ تو زندگی بھر اپنے نغمے ڈھونڈتا رہے گا لیکن تیری آواز تیرا ساتھ نہیں دے گی۔ جا، دور ہو جا یہاں سے۔''

بالاچ اپنے آنسو پونچھتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس نے شہہ مرید کے سینے میں آگ لگا دی تھی۔ اس کو جاتا دیکھ کر بارک اسے روکنے کے لیے آگے بڑھا لیکن شہہ مرید نے اسے آواز دی۔ ''اسے جانے دے بارک۔ اس کو سزا مل چکی ہے۔''

بارک اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ساری داستان سن لی تھی۔

''بارک! میری تلوار مجھے دے۔ آج بہت دنوں کے بعد تلوار کی دھار آزمانے کا موقع مل رہا ہے۔''

''کس کے خلاف سردار؟''

''انجان بن کر مت پوچھ۔ اس کے خلاف جو میرا سب سے اچھا دوست تھا۔ اس کے خلاف جس نے سازش کر کے میری محبت مجھ سے چھین لی۔ جس کا میں سپہ سالار تھا۔ میری ہانی چاکر کے پاس ہے بارک۔''

''نہیں سردار! آج تمہارا وہاں جانا ٹھیک نہیں ہوگا۔ آج چاکر کی شادی ہے۔''

”چاکر کی شادی؟“ شہہ مرید بری طرح چونک گیا۔
”کس سے؟“
”موہل سے۔“ بارک نے بتایا۔
”واہ، کیسا دوست ہے؟“ شہہ مرید کا قہقہہ بہت تلخ تھا۔ ”اس نے میری محبت کو تو زنجیریں پہنا کر اپنی حویلی میں قید کر رکھا ہے اور اپنی محبت سے شادی رچا رہا ہے۔ نہیں بارک! میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ روک دوں گا اس شادی کو۔“
”نہیں سردار! اس وقت جوش سے نہیں، ہوش سے کام لو۔ شادی ہوجانے دو۔ اس وقت اس کی حویلی میں بہت سے بلوچ سردار جمع ہیں۔ یہ داستان ہر طرف پھیل جائے گی۔ شادی کے بعد اس معاملے کو دیکھ لیں گے۔“
لیکن شہہ مرید کچھ نہیں کرسکا۔ اس کی روایت اس کے پیروں کی زنجیر بن کر رہ گئی اور ایک دن وہ اچانک غائب ہوگیا۔
بارک نے اپنے آدمیوں کے ذریعے اسے پورے بلوچستان میں تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن وہ کہیں نہیں مل سکا۔
ہانی کو اس کے غائب ہوجانے کی اطلاع خود چاکر نے دی تھی۔
اس خبر کو سن کر ہانی اپنا دل تھام کر بیٹھ گئی۔ بہت دیر بعد اس نے چاکر کی طرف دیکھا۔
”سردار! میرے شہہ مرید کی بربادی کی ذمے داری صرف تم پر ہے۔ تم نے اس سے اس کی محبت چھین کر اسے برباد کردیا ہے۔“
”ہاں ہانی! مجھے بھی اس کا احساس ہے۔ میں نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا گناہ کیا ہے جس کے لیے میں خود کو بھی معاف نہیں کروں گا لیکن میں محبت کے سامنے مجبور ہوگیا تھا۔ خدا مجھے معاف کرے۔ آج میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ تم نے اپنی محبت کے ہتھیار سے چاکر جیسے پہاڑ کو ریزہ ریزہ کردیا ہے۔ تم شہہ مرید کی امانت تھیں اور میرا وعدہ ہے کہ تم اسی کی امانت رہوگی اور جیسے ہی وہ واپس آیا میں اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر اس سے معافی مانگ کر اس کی امانت اسے واپس کردوں گا۔ ہانی! مجھے معاف کردینا۔ معاف کردینا مجھے۔“
چاکر کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ پہاڑ پگھل گیا تھا۔

☆☆☆

لیکن شہہ مرید کا کچھ پتا نہیں چل سکا۔ وہ غائب ہوگیا تھا۔
کئی برس بیت گئے۔ ہانی اس کی راہ دیکھتی رہ گئی۔
پھر چھ یا سات برسوں کے بعد جشن کا دن آگیا۔
اس موقع پر رواج کے مطابق شہ سواری، تلوار بازی اور تیر اندازی کے جوہر دکھائے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ شہہ مرید کی کمان لا کر رکھی جاتی تھی اور اعلان کیا جاتا تھا کہ جو اس کمان کو اٹھا کر اس سے تیر چلا کر دکھائے گا اسے انعام سے نوازا جائے گا لیکن آج تک کوئی کامیاب نہیں ہوسکا تھا۔
لیکن اس سال چاکر کو خبر دی گئی۔ ”سردار! ایک درویش نے نہ صرف وہ کمان اٹھالی ہے بلکہ اس نے اس کمان سے تیر چلا کر سچا نشانہ بھی لگادیا ہے۔“
”کون ہے وہ درویش؟“
”پتا نہیں سردار۔“
”وہ سوائے شہہ مرید کے اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ مجھے اس کے پاس لے چلو۔“
چاکر نے پہلی ہی نگاہ میں اسے پہچان لیا تھا۔ وہ شہہ مرید ہی تھا۔ جسم پر ایک لانبا سا چوغہ جس میں پیوند لگے ہوئے تھے۔ ڈاڑھی بڑھی ہوئی لیکن آنکھوں میں بے پناہ کشش۔
”شہہ مرید!“ چاکر نے اسے مخاطب کیا۔ ”تم نے یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے۔“
”تم نے مجھے پہچان لیا سردار؟“
”ہاں، شہہ مرید! لیکن اتنے برسوں تک کہاں رہے؟“
”میں اپنے آقا کے قدموں میں پڑا ہوا تھا سردار۔“ شہہ مرید نے بتایا۔ ”اس سے بڑا آقا اور کون ہوسکتا ہے۔“
”کس آقا کی بات کررہے ہو؟“
”مدینے والے کی۔ کیا ان سے بڑا کوئی محبوب ہوسکتا ہے۔ میں وہیں سے آیا ہوں اور وہیں واپس بھی جارہا ہوں۔“
”لیکن شہہ مرید، وہ ہانی......“
”اب میرا محبوب کوئی اور ہے سردار! اگر تم نے ہانی سے شادی نہیں کی ہے تو اس کی شادی کسی اچھے سردار سے کردینا اور اس کو بتادینا کہ شہہ مرید کو آقا کی محبت بھی مل گئی ہے اور منزل بھی۔“
کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد پھر شہہ مرید کا کچھ پتا نہیں چل سکا۔ محبت کی اس داستان کا سفر عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی تک کا تھا۔
ہانی کی قبر بلوچستان میں ہے اور چاکر کی سکھر میں لیکن شہہ مرید کی قبر کا کچھ پتا نہیں ہے۔ وہ عشق کے راستے کا مسافر تھا اور اس راستے میں فنا بھی ہوگیا۔

⌘⌘⌘

سازباز

مرزا امجد بیگ

طمع و حرص میں مبتلا اکثر لوگ رشتوں کو بھی داؤ پر لگادیتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ قدرت اگر داؤ پیچ پر اتر آئی تو کیسے مقابلہ کرپائیں گے... قدرت کا اپنا کوئی وجود نہیں ہوتا، ہمیشہ کسی دوسرے کے وجود میں ظاہر ہوکر کھیل کھیلتی ہے... جیسے اس بار مرزا امجد کے روپ میں جب ان رشتوں کے بیوپاریوں نے بازی جمائی تو ہر موڑ پر بیگ صاحب کی دلیلوں نے شکست کی ایسی خاک چٹائی کہ فرار تو فرار سانس لینا بھی محال ہوگیا... کیونکہ جس دولت کے حصول کے لیے خوار ہوئے اس کے نتیجے میں ذلت کی وصولیابی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آسکا۔

مجرموں کی سازباز اور قدرت کی منصوبہ سازی کی دلچسپ معرکہ آرائی

یہ ان دنوں کا واقعہ ہے جب ہنڈی (حوالہ) کا کام عروج پر تھا اور سرکار کی جانب سے اس کاروبار پر کوئی واضح پابندی عائد نہیں تھی۔ ''نائن الیون'' کے بعد پوری دنیا میں رقم کی ترسیل کے معاملات کو خاصا ٹائٹ کردیا گیا ہے۔ ہنڈی کا کام آج بھی چل رہا ہے مگر ہاتھ پاؤں بچا کر بڑی احتیاط کے ساتھ۔ اس امر میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ کرنسی کی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقلی کا سب سے محفوظ اور معتبر ذریعہ اب بھی ''ہنڈی'' ہی ہے۔

اس تمہید کے بعد میں اصل قصے کی طرف آتا ہوں۔ یہ کہانی ''نائن الیون'' سے کئی سال پہلے کی ہے۔ میں حسبِ معمول اپنے آفس میں بیٹھا کلائنٹس کو ڈیل کررہا تھا کہ ایک شناسا کا فون آگیا۔ سیکریٹری نے میری اجازت سے وہ کال مجھے ٹرانسفر کردی۔

''ہیلو.....!'' میں نے ریسیور کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

''السلام علیکم بیگ صاحب! انور شیرازی عرض کررہا ہوں۔''

انور شیرازی سے میرے دیرینہ مراسم تھے۔ وہ ایک سماجی تنظیم کے روحِ رواں تھے۔ میں نے جواباً کہا۔ ''وعلیکم السلام شیرازی صاحب! آپ کی آواز کو میں بھلا کیسے فراموش کرسکتا ہوں۔ آپ کیسے ہیں جناب؟ کافی عرصے کے بعد یاد فرمایا۔ سب خیریت تو ہے نا؟''

''آپ تو جانتے ہی ہیں بیگ صاحب!'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''پولیس، ڈاکٹر اور وکیل کو انسان انتہائی ضرورت کے وقت ہی یاد کرتا ہے۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ اس وقت کسی مصیبت میں ہیں۔'' میں نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ ''بتائیں، میں آپ کے لیے کیا کرسکتا ہوں؟''

''الحمد للہ!'' اس کی اطمینان بھری توانا آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ''میں بہ خیر و عافیت ہوں۔ دراصل ایک معمولی انسان، غیر معمولی مشکل میں پڑ گیا ہے۔ کسی حوالے سے اس کا معاملہ مجھ تک پہنچا اور میں چاہتا ہوں اس مصیبت

TAGPK.COM

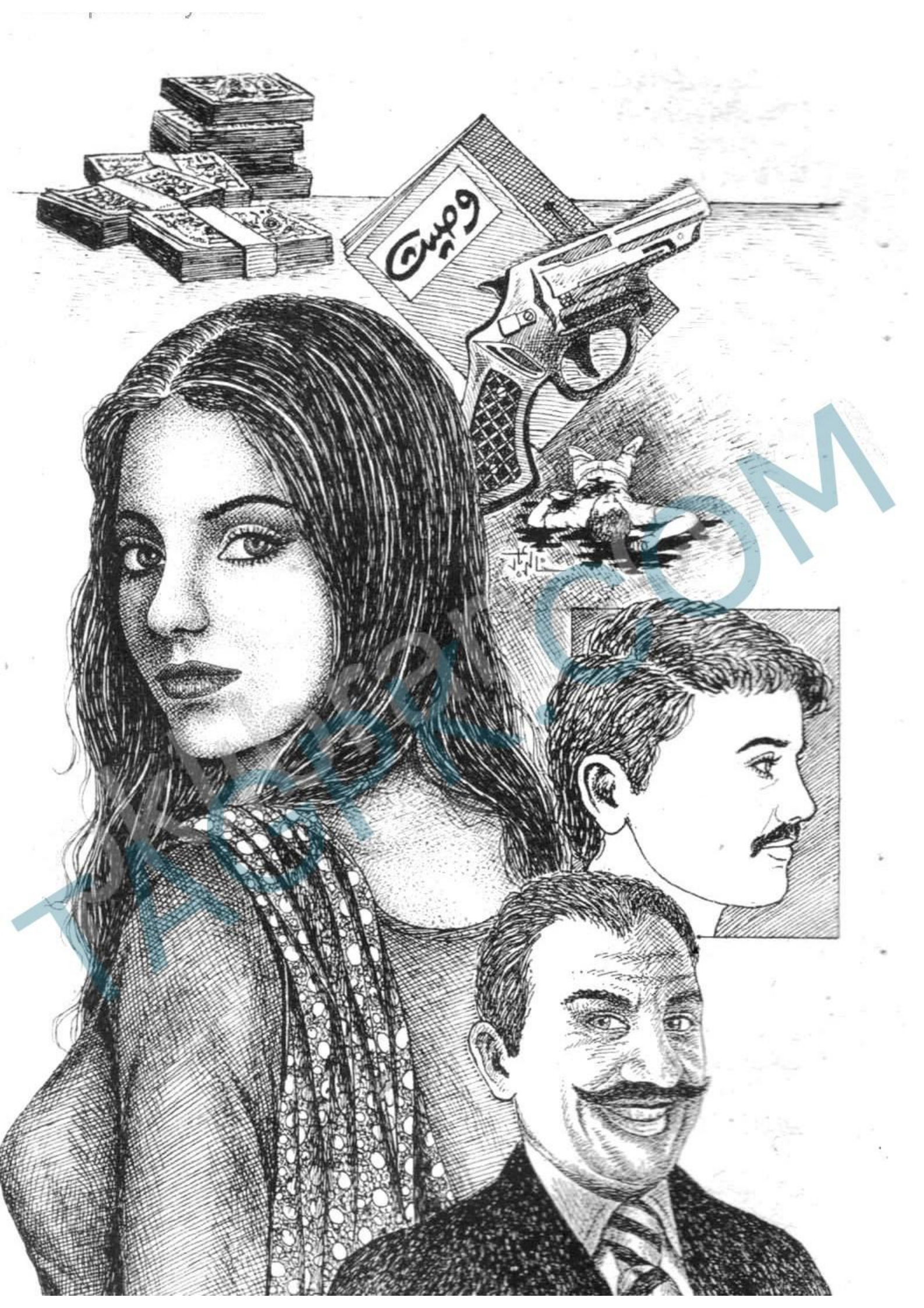
وصية

زدہ شخص کا کیس آپ کے سپرد کردوں۔ بس اتنی سی بات ہے۔''

''یہ اتنی سی بات نہیں ہے شیرازی صاحب!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا اور پوچھا۔ ''کیس کی نوعیت کیا ہے؟''

''فوجداری کا معاملہ ہے بیگ صاحب!''

''اوہ!'' میں نے متاسفانہ انداز میں کہا۔ ''میرے خیال میں فون پر بات کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ آپ ایک کام کریں۔ میرے آفس آجائیں پھر اطمینان سے تفصیلی گفتگو کرتے ہیں۔''

''اوکے۔'' انور شیرازی نے معتدل انداز میں کہا۔ ''میں کتنے بجے حاضر ہوجاؤں؟''

''آٹھ بجے کے بعد کسی وقت بھی مگر رات دس بجے سے پہلے۔'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔

''سمجھ گیا بیگ صاحب!'' وہ رسانیت بھرے لہجے میں بولا۔ ''میں آپ کی بتائی ہوئی ٹائمنگ کے اندر حاضر ہوتا ہوں۔ اللہ حافظ۔''

''خدا حافظ شیرازی صاحب!'' یہ کہتے ہوئے میں نے ریسیور رکھ دیا۔

انور شیرازی کا شمار ان افراد میں ہوتا تھا جو خدمتِ خلق کو اپنا نصب العین سمجھتے ہیں۔ اپنے اسی مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے ایک فلاحی ادارہ قائم کر رکھا تھا جہاں وہ رفاہی کاموں میں لگے رہتے تھے۔ انسان کی نیت صاف اور مقصد نیک ہو تو قدرت بھی بھرپور ساتھ دیتی ہے۔ شیرازی صاحب نے رفاہِ عامہ کا یہ مشن تن تنہا شروع کیا تھا اور کئی سال گزرنے کے بعد اب وہ شہر کے ایک معروف سماجی، فلاحی ادارے کے ہیڈ تھے۔ بعض خدا ترس، انسان دوست مخیر حضرات گاہے بہ گاہے عطیات کی صورت اس کارِ خیر میں اپنا حصہ ڈالتے رہتے تھے۔ انور شیرازی کے توسط سے اکثر و بیشتر میرے پاس کیس آتے رہتے تھے جن کے اخراجات کسی حد تک یا مکمل طور پر شیرازی صاحب ہی کے ذمے ہوتے تھے اور اس ذیل میں وہ مجھ سے بھی فیس میں اسپیشل ڈسکاؤنٹ مانگ لیا کرتے تھے۔

ٹھیک نو بجے رات میری میز پر رکھے ہوئے انٹرکام کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھا کر سپاٹ آواز میں کہا۔ ''یس!''

''سر! کوئی انور صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔'' میری سیکریٹری صبا فیروز نے بتایا۔ ''لیکن ان کے پاس اپائنٹمنٹ نہیں ہے۔''

''آپ کا مطلب ہے انور شیرازی؟'' میں نے استفسار کیا۔

''یس سر! انہوں نے اپنا نام یہی بتایا ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''ویٹنگ روم کی کیا سچویشن ہے؟''

''آج کے تمام اپائنٹمنٹ نمٹ چکے ہیں۔''

''اوکے۔'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ شیرازی صاحب کو اندر بھیج دیں۔''

وہ جلدی سے بولی۔ ''اوکے سر!''

اگلے ایک منٹ میں انور شیرازی میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔ ''بہت شکریہ بیگ صاحب! آپ نے اپنی مصروفیت میں سے میرے لیے وقت نکالا۔''

''آپ جیسے وقت کے پابند لوگوں کا خصوصی خیال رکھنا پڑتا ہے شیرازی صاحب!'' میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں نے آٹھ اور دس کے بیچ آنے کو کہا اور آپ اس دورانیے کے عین درمیان یعنی ٹھیک نو بجے تشریف لے آئے۔ یہ حیرت انگیز ہونے کے ساتھ ہی قابلِ ستائش بھی ہے۔''

''بیگ صاحب! اس دنیا کی سب سے انمول اور قیمتی شے ''ٹائم'' ہے مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ انسان اسے ضائع کرنے میں کسی غفلت یا کنجوسی سے کام نہیں لیتا۔''

''ویل سیڈ!'' میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''آپ نے ایک تلخ حقیقت بیان کردی ہے، خیر..... یہ بتائیں آپ ٹھنڈا لیں گے یا گرم؟''

''کسی تکلف کی ضرورت نہیں بیگ صاحب!'' وہ بے تکلفی سے بولا۔ ''یہ معاملات پھر کبھی سہی۔ فی الحال آپ پوری توجہ سے میری بات سنیں تاکہ میرا وہ مقصد پورا ہوجائے جس کی غرض سے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔''

''جی ضرور۔'' میں نے رف پیڈ اور قلم سنبھالتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''آپ نے فون پر کسی فوجداری کیس کا ذکر کیا تھا۔ مجھے اس مقدمے کی تاریخ اور جغرافیے سے آگاہ کریں۔ میں ہمہ تن گوش ہوں شیرازی صاحب!''

''کاشف علی پر ایک شخص کے قتل کا الزام ہے۔'' اس نے گمبھیر لہجے میں جواب دیا۔ ''اور دس لاکھ روپے لوٹ لے جانے کا بھی چارج ہے۔''

''مقتول کون ہے؟'' میں نے سوال کیا۔ ''اور دس لاکھ روپے کس کے تھے؟''

''مقتول کا نام یعقوب مجید ہے بیگ صاحب!'' اس نے بتایا۔ ''وہ ایک معروف کاروباری شخص تھا۔ ملزم کاشف

علی دراصل ہنڈی کے بزنس سے وابستہ ہے۔ بیرونِ ملک سے کسی پارٹی نے یعقوب مجید کے لیے ہنڈی کے ذریعے دس لاکھ روپے بھیجے جو ملزم، مقتول کو دینے کے لیے اس کے آفس پہنچا تھا۔ ملزم کے مطابق اس نے دس لاکھ روپے کی رقم بہ حفاظت مقتول کے سپرد کی اور اس کے آفس سے نکل آیا۔ لگ بھگ تین گھنٹے کے بعد پولیس نے کاشف علی کو گرفتار کرلیا۔ اس پر الزام عائد کیا گیا کہ اس نے مقتول کے آفس پہنچ کر اسے شوٹ کیا اور دس لاکھ روپے لے کر چلتا بنا۔'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر ڈھیلے ڈھالے انداز میں اضافہ کردیا۔

''بس، میں اتنا ہی جانتا ہوں بیگ صاحب!''

''یہ کب کا واقعہ ہے؟'' میں نے رف پیڈ پر قلم چلاتے ہوئے پوچھا۔

''چوبیس فروری سہ پہر۔'' اس نے بتایا۔

''اوہ..... آج ستائیس فروری ہے۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ پولیس نے اسے عدالت میں پیش کرکے ریمانڈ حاصل کرلیا ہوگا۔''

''آپ کا اندازہ صد فیصد درست ہے بیگ صاحب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اس وقت وہ پولیس کسٹڈی میں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ تھانے جاکر ایک بار کاشف سے ملاقات کرلیں تاکہ آپ کو اس معاملے کی تفصیلات سے آگاہی ہوسکے۔''

بات کے اختتام پر اس نے امید بھری نظر سے مجھے دیکھا تو میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ملزم سے ملاقات تو میں پہلی فرصت میں کروں گا شیرازی صاحب! لیکن ایک بات واضح کردوں کہ اس کیس میں اسی وقت ہاتھ ڈالوں گا جب مجھے یقین ہوجائے گا کہ ملزم کاشف علی کا قتل اور دس لاکھ کی چھینا جھپٹی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''بیگ صاحب! میں آپ کے اس اصول سے اچھی طرح واقف ہوں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''اور کاشف علی کے والد مرحوم حیدر علی سے میری دیرینہ شناسائی رہی تھی۔ میرا تجربہ اور مشاہدہ مجھے دھوکا نہیں دے سکتا۔ میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ کاشف کو کسی گہری سازش کے تحت اس مقدمے میں پھنسایا گیا ہے۔''

پھر شیرازی نے مجھے ملزم کے باپ حیدر علی کی زندگی کے آخری لمحات کا ایک دلخراش اور رونگٹے کھڑے کردینے والا واقعہ بھی سنایا۔ شیرازی کے بیان کے مطابق حیدر علی ایک سنار کی دکان پر کام کرتا تھا۔ ایک روز دو مسلح ڈکیت اس سنار کو لوٹنے آگئے۔ جب وہ لوگ گن پوائنٹ پر لاکھوں روپے کے زیورات اور کثیر نقدی سمیٹ کر جانے لگے تو حیدر علی اس شخص سے لپٹ گیا جس نے مال مسروقہ والا بیگ اٹھا رکھا تھا۔ دوسرے ڈاکو نے حیدر علی کو سنگین نتائج کی دھمکیاں دیں مگر حیدر علی اپنی جان کی پروا کیے بغیر اس ڈاکو کو اپنی جکڑ میں لیے رہا۔ اس صورتِ حال نے ''زیرِ حراست'' ڈاکو کے گن بردار ساتھی کو گولی چلانے پر مجبور کردیا۔ فائرنگ کے نتیجے میں حیدر علی موقع پر ہی جان کی بازی ہار گیا۔ اس نے جس ڈاکو کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا، اسے بھی ایک گولی لگی تھی۔ فائرنگ کرنے والے ڈاکو نے مالِ مسروقہ سمیٹا اور جائے وقوعہ سے فرار ہوگیا۔ اس کے زخمی ساتھی کو حراست میں لے کر پولیس کے حوالے کردیا گیا تھا اور حیدر علی نے فرض کی ادائیگی میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کردیا تھا۔''

''بہت ہی دل دہلا دینے والا اور لائقِ تحسین واقعہ ہے شیرازی صاحب!'' میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔ ''ایسی بہادری کی مثالیں بہت کم سننے اور دیکھنے کو ملتی ہیں۔''

''میں حیدر علی کے خون، کاشف علی سے کسی بھی صورت ایسے جرائم کی امید نہیں رکھتا جو الزام اس پر عائد کیے گئے ہیں۔ میں کاشف کی گارنٹی لیتا ہوں۔ باقی کے معاملات آپ دیکھ لیں۔''

''ٹھیک ہوگیا جناب! آپ کی شخصی ضمانت کے بعد کسی اور بات کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔'' میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''میں کل کسی وقت متعلقہ پولیس اسٹیشن جاکر کاشف علی سے ملاقات کرلوں گا۔ آپ فکر نہ کریں۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔''

''بیگ صاحب! آپ کو بھی فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔'' وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''اس کیس کے تمام تر عدالتی اخراجات میری تنظیم کے ذمے ہیں اور..... آپ کی رعایتی فیس بھی.....!''

میں نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

''شکریہ بیگ صاحب!'' وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ''اب آپ مجھے اجازت دیں۔ اللہ حافظ۔''

میں نے کہا۔ ''فی امان اللہ.....!''

☆☆☆

آئندہ روز میں کاشف علی سے ملنے متعلقہ تھانے پہنچ گیا۔ ایس ایچ او اس وقت تھانے میں موجود تھا۔ میں سیدھا اسی کے کمرے میں گیا اور قدرے بلند آواز میں کہا۔

''السلام علیکم انچارج صاحب!''

''وعلیکم السلام......!'' اس نے چونکتے ہوئے لہجے میں میرے سلام کا جواب دیا پھر طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''خیریت تو ہے نا وکیل صاحب! آج آپ اپنے دفتر کا راستہ بھول کر یہاں کیسے آگئے؟''

''چاہے بھول چوک ہی سے سہی، میں نے آپ کو یاد تو رکھا ہوا ہے نا۔'' میں نے بھی چبھنے والے انداز میں جواب دیا۔ ''آپ کو تو کبھی توفیق نہیں ہوئی کہ وٹنس باکس میں تشریف لا کر میری جرح کا سامنا کریں اور اسی بہانے آپ سے ملاقات بھی ہوجائے۔''

''آپ خوامخواہ کہیں کا بھی رخ نہیں کرتے۔'' وہ تکدر بھرے لہجے میں بولا۔ ''مطلب کی بات کریں جناب! ادھر کیسے آنا ہوا؟''

''ٹھیک ہے۔ جب آپ کی نظر میں لحاظ اور مروت کوئی معنی نہیں رکھتے تو میں بھی سیدھا پوائنٹ پر آتا ہوں۔'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں اپنے کلائنٹ کاشف علی سے ملنے آیا ہوں جو اس وقت آپ کی حوالات میں بند ہے۔''

''اوہ...... تو یہ بات ہے۔'' تھانیدار نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''وکیل صاحب! آپ کو اتنا تو معلوم ہوگا کہ وہ پندرہ روزہ ریمانڈ پر ہماری کسٹڈی میں ہے اور قانون کی رو سے ایسی صورتِ حال میں کسی بھی شخص کو ملزم سے ملنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔''

''تو ٹھیک ہے......'' میں نے میز پر رکھے ہوئے ٹیلی فون سیٹ کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے سپاٹ آواز میں کہا۔ ''یہ اجازت حاصل کرنے کے لیے میں آپ کے ڈیپارٹمنٹ کے کسی سینئر افسر سے بات کر لیتا ہوں۔''

''وکیل صاحب! آپ تو چھوٹے بچوں کی طرح پل بھر میں روٹھ جاتے ہیں۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''جب میں یہاں بیٹھا ہوں تو پھر اوپر کسی کو فون لگانے کی ضرورت کیا ہے؟''

''اوکے!'' میں نے تعاون آمیز انداز میں کہا۔ ''تو میں اپنے کلائنٹ سے مل لوں؟''

''ضرور مل لیں لیکن میں آپ کو ایک مشورہ دینا چاہوں گا اور وہ بھی بالکل مفت۔'' وہ معنی خیز نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

''کیسا مشورہ؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

وہ عیارانہ انداز میں بولا۔ ''آپ اس کیس میں ہاتھ نہ ڈالیں۔''

''وہ کس خوشی میں؟'' میں نے تیکھے انداز میں استفسار کیا۔

''اس کیس میں آپ کے لیے ذرا سا بھی مارجن نہیں ہے۔'' وہ رازدارانہ انداز میں بولا۔ ''ملزم کو سزا ہو کر رہے گی۔ آپ اپنے صاف شفاف ریکارڈ کو داغدار نہ کریں۔''

''اوہ......!'' میں نے مصنوعی پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''آپ کا مشورہ میری سمجھ میں آرہا ہے لیکن میرے ساتھ ایک مسئلہ ہے۔''

''کیسا مسئلہ وکیل صاحب؟'' اس نے ٹٹولنے والے انداز میں پوچھا۔

''دراصل میں کاشف علی کے کیس کی فیس وصول کر چکا ہوں۔'' میں نے اس کی مکاری کو اپنی چالاکی کی دھار پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''لہٰذا اس رقم کو حلال کرنے کے لیے ملزم کو نصف درجن تسلی دلاسے تو دینا ہی ہوں گے اور یہ سب اسی وقت ممکن ہو پائے گا جب میں اس سے ایک بھرپور ملاقات کرلوں گا۔''

''آپ کہہ تو ٹھیک ہی رہے ہیں وکیل صاحب!'' وہ رسان بھرے لہجے میں بولا۔ ''ہر پیشے کی اپنی مجبوریاں اور اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ بہرحال......'' اس نے لمحاتی توقف کیا پھر زیرلب مسکراتے ہوئے بولا۔

''رزقِ حلال عین عبادت ہے......!''

''اور عبادت کرنے سے کسی کو روکنا گناہِ کبیرہ...... ہیں نا؟'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر کہا۔

''اوئے نصیبے...... ذرا ادھر تو آ......!'' اس نے اپنے کانسٹیبل نصیب علی کو آواز لگائی پھر مجھ سے کہا۔ ''میں نے آپ کی بات رکھ لی ہے وکیل صاحب! آپ بھی تھوڑا خیال کرنا۔ جتنا بھی جلدی ممکن ہو، ملزم کو فارغ کردیں۔''

''آپ بے فکر ہوجائیں انچارج صاحب!'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''سمجھ لیں کہ میں نے آپ کی بات کو سر آنکھوں پر رکھ لیا ہے۔''

وہ ایسی نظر سے مجھے تکنے لگا جیسے بہ زبانِ خامشی کہہ رہا ہو۔ ''وکیل صاحب! آپ اتنے بھی سیدھے نہیں ہیں جتنا خود کو میرے سامنے ظاہر کررہے ہیں۔''

اسی وقت کانسٹیبل نصیبے نے وہاں آکر تھانہ انچارج کو سیلوٹ مارا۔ تھانیدار نے اس سے کہا۔

''ان وکیل صاحب کو ذرا اس قاتل [illegible] ملوادو جو ادھر حوالات میں بند ہے۔ اور ہاں [illegible] یہ ملاقات دس پندرہ منٹ سے زیادہ کی نہ ہو۔''

TAGRK.COM

''اوکے سر..... میں سمجھ گیا۔'' کانسٹیبل نے فرماں برداری سے کہا۔

حوالات کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے میں نے کانسٹیبل سے کہا۔ ''نصیبے! یہ سو روپے رکھ لو۔''

اس نے سو روپے والا کرارا نوٹ فوراً سے پیشتر اپنی پتلون کی جیب میں گھسایا، اس کے بعد شاطرانہ انداز میں مستفسر ہوا۔

''یہ کس لیے وکیل صاحب؟''

''تمہاری سمجھ داری کے نام۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں جناب!'' وہ الجھن زدہ انداز میں بولا۔ ''آپ میری کون سی سمجھ داری کا ذکر کر رہے ہیں؟''

''وہی سمجھ داری جو تم مجھے حوالاتی کے پاس پہنچانے کے بعد دکھاؤ گے۔'' میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''میں تھانے اس لیے نہیں آیا کہ اپنے مؤکل سے مصافحہ کر کے واپس چلا جاؤں..... مجھے اس سے تفصیلی بات کرنا ہے اور یہ موقع تم مجھے فراہم کرو گے۔''

وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''میں سمجھ گیا وکیل صاحب!''

کاشف علی کی عمر لگ بھگ تیس سال رہی ہوگی۔ وہ متناسب بدن کا مالک ایک صحت مند انسان تھا لیکن اس وقت اس کی حالت خاصی خستہ ہو رہی تھی۔ اس ''خستہ حالی'' میں یقیناً پولیس ہی کا ہاتھ تھا۔ تفتیش کے نام پر انہوں نے کاشف کی بے دریغ ''ضیافت'' کی ہوگی۔ وہ حوالات کے ٹھنڈے فرش پر کسی خزاں رسیدہ پتے کے مانند درماندگی کی تصویر بنا بیٹھا تھا۔

''اوئے اٹھ..... تیری ملاقات آئی ہے۔'' کانسٹیبل نے درشت لہجے میں کہا۔

کاشف نے حیرت بھری بے یقینی سے مجھے دیکھا اور بہ دقت اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے کانسٹیبل نصیبے کو وہاں سے جانے کا اشارہ کیا پھر آہنی سلاخوں کے نزدیک جا کر کاشف کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔

''میرا نام مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ ہے۔ تمہارے والد مرحوم کے ایک دیرینہ شناسا نے مجھے تمہارا وکیل مقرر کیا ہے اسی لیے میں تم سے ملنے آیا ہوں۔''

''بہت مہربانی آپ کی وکیل صاحب!'' وہ تشکرانہ نظر سے مجھے تکتے ہوئے بولا۔ ''میں تو سمجھ رہا تھا کہ تھانے سے میری لاش ہی باہر جائے گی۔''

''مایوسی گناہ ہے کاشف!'' میں نے حوصلہ بڑھانے والے انداز میں کہا۔ ''اگر تم نے کوئی جرم نہیں کیا تو ان شاء اللہ عدالت سے باعزت بری ہو جاؤ گے لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ میں تم سے جو بھی سوال کروں، اس کا تم نے صد فیصد درست جواب دینا ہے۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

میرے آخری جملے کا اس نے بڑا عجیب و غریب اور چونکا دینے والا جواب دیا۔ انتہائی ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس نے کہا۔

''وکیل صاحب! مجھے تو جھوٹ بولنا آتا ہی نہیں۔''

''زبردست!'' میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''لیکن سچ بولنے والوں کی زندگی بہت مشکل اور اذیت ناک ہو جاتی ہے۔ اصل میں ہم جس معاشرے کے پروردہ ہیں، وہ جھوٹ سننے کا اس قدر عادی ہو چکا ہے کہ اسی کو سچ مانتا ہے۔ ایسے میں اگر کوئی سچائی کے ساتھ کندھا ملا کر کھڑا ہو جائے تو اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں وکیل صاحب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''شاید میں اسی لیے ان حالات کا شکار ہوا ہوں کہ منافقت اور ریاکاری میرے بس کے کام نہیں ہیں۔''

بات کے اختتام پر وہ پژمردہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔ میں نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ ''کاشف! جھوٹ چاہے کتنا بھی توانا اور سچ کتنا بھی لاغر کیوں نہ ہو، ایٹ دی اینڈ آف دی ڈے..... فتح حق اور سچ ہی کی ہوتی ہے۔''

اس کے چہرے اور آنکھوں میں مجھے امید کی چمک دکھائی دی۔

آئندہ بیس پچیس منٹ میں کاشف سے میں نے اپنی مرضی اور ضرورت کی تمام باتیں معلوم کر لیں۔ اس کی فراہم کردہ معلومات نے مجھے اطمینان دلا دیا کہ وہ بے قصور ہے لہٰذا میں نے وکالت نامے، درخواستِ ضمانت اور دیگر اہم کاغذات پر اس کے دستخط لینے کے بعد اسے چند ہدایات دیں اور اس تشفی کے ساتھ وہاں سے لوٹ آیا۔

''کاشف علی! میں نے ابھی تمہیں جو کچھ سمجھایا ہے، اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لو اور یقین رکھو کہ میں تمہیں اس جھمیلے سے ضرور باہر نکال لاؤں گا..... اب ہماری ملاقات کمرائے عدالت میں ہوگی۔''

کاشف علی سے ہونے والی گفتگو کے حوالے سے میں سردست آپ کو کچھ نہیں بتا رہا۔ عدالتی کارروائی کے دوران

گا ہے بہ گا ہے یہ باتیں سامنے آتی رہیں گی۔ ایک اہم بات ذہن میں رہے کہ کاشف کی رگوں میں حیدر علی کا خون گردش کررہا تھا۔ وہ حیدر علی جس نے فرض کی ادائیگی میں اپنی جان کو داؤ پر لگا کر رتبۂ شہادت حاصل کیا تھا۔ ایسا پاکیزہ خون جرم کی راہ کا مسافر نہیں ہوسکتا.....!

کاشف کی بے گناہی کے لیے اتنا حوالہ ہی کافی ہے لیکن رسمِ عدالت کو نبھاتے ہوئے قانون کی نگاہ میں اسے بے قصور ثابت کرنا تقاضائے وقت تھا۔

☆☆☆

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے اس مقدمے کا چالان عدالت میں پیش کردیا۔ اس پیشی پر میں نے اپنے وکالت نامے کے ساتھ ہی ملزم کی ضمانت کی درخواست بھی داخلِ عدالت کردی تھی۔ جج نے عدالتی کارروائی کا آغاز کرتے ہوئے ملزم پر فردِ جرم عائد کردی۔

''کاشف علی!'' جج نے بھاری بھرکم آواز میں ملزم کو مخاطب کیا۔ ''پولیس کی تیار کردہ چارج شیٹ کے مطابق تم چوبیس فروری کی سہ پہر مقتول کے لیے بیرونِ ملک سے آئی ہوئی رقم مبلغ دس لاکھ روپے ڈیلیور کرنے مقتول کے آفس پہنچے۔ مقتول نے تمہیں چائے پلائی۔ تم نے دس لاکھ روپے اس کے حوالے کرنے کے بعد کسی کچی رسید پر مقتول کے دستخط کرائے اور جانے کے لیے اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ مقتول واقعتاً یہی سمجھا تھا کہ تم وہاں سے رخصت ہونے والے ہو لیکن تم نے اچانک گن نکالی اور چشم زدن میں ایک گولی مقتول کی کھوپڑی میں اتار دی۔ یہ آتشیں وار کاری ثابت ہوا اور مقتول اپنی کرسی پر بیٹھا بیٹھا اس دنیا سے کوچ کرگیا۔ تم نے دس لاکھ روپے کے کرنسی نوٹ اپنے بیگ میں رکھے اور جائے وقوعہ سے فرار ہوگئے۔ بعد ازاں شام چھ بجے پولیس نے تمہیں رمضانی بھائی کے آفس سے گرفتار کرلیا۔ تم پر ایک شخص کو موت کے گھاٹ اتارنے اور اس کے دس لاکھ روپے اڑا لے جانے کا الزام ہے۔ تم اپنے دفاع میں کچھ کہنا چاہو گے؟''

ملزم نے ایک گہری سانس خارج کی اور پُراعتماد لہجے میں بولا۔ ''سر! میں صحتِ جرم سے یکسر انکار کرتا ہوں۔ میں نے یعقوب مجید صاحب کی جان لی ہے اور نہ ہی ان کے دس لاکھ روپے لے کر جائے واردات سے فرار ہوا تھا۔ جب میں ان کے آفس سے نکلا تو وہ زندہ سلامت تھے اور دس لاکھ روپے کے کرنسی نوٹ ان کے سامنے میز پر رکھے ہوئے تھے۔ میں اس واقعے کے بارے میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتا۔ مجھے خوامخواہ اس معاملے میں پھنسایا گیا ہے۔''

ملزم نے میری ہدایات کی روشنی میں خاصا جاندار اسٹارٹ لیا تھا۔ میں نے ایک گہری اور اطمینان بھری سانس خارج کی تو جج نے میری طرف دیکھتے ہوئے اپنی مخصوص آواز میں کہا۔

''ڈیفنس.....!''

''جنابِ عالی! ملزم ایک طویل عرصے سے رمضانی بھائی کے پاس کام کررہا تھا اور آج تک اس نے اپنے سیٹھ رمضانی بھائی کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔'' میں نے اپنے مؤکل کی ضمانت کے حق میں دلائل دیتے ہوئے کہا۔ ''ہنڈی کا کاروبار بھروسے پر منحصر ہے اور رمضانی بھائی ملزم پر اندھا اعتماد کرتا تھا اسی لیے وہ لاکھوں روپے کی ڈیلیوری اور کلیکشن ملزم کے ہی ہاتھ سے کرواتا تھا۔ ملزم کا ریکارڈ بے داغ ہے۔ آج تک اس نے رمضانی بھائی کو دھوکا نہیں دیا۔ اس کے ہاتھوں ایک روپے کی خرد برد ہوئی اور نہ ہی کبھی کوئی کلائنٹ اس کی سروس سے غیر مطمئن ہوا۔ اس کیس میں ملزم کو ملوث کرنا کسی سوچی سمجھی سازش کا نتیجہ ہے اور وقت آنے پر میں یہ ثابت بھی کردوں گا۔ فی الحال.....''

میں سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''معزز عدالت سے میری درخواست ہے کہ ملزم کو ضمانت پر رہا کرنے کے احکامات صادر کیے جائیں۔''

''آئی آبجیکٹ یور آنر!'' وکیلِ استغاثہ نے خاصی تیز آواز میں کہا۔

جج کی گمبھیر آواز کرائے عدالت میں گونجی۔

''پراسیکیوشن.....!''

''یور آنر.....!'' وکیل استغاثہ نے جارحانہ انداز میں کہا۔ ''کسی شخص کا ایماندار ہونا اس امر پر دلالت نہیں کرتا کہ وہ زندگی میں کبھی بھی بے ایمانی نہیں کرے گا اور نہ ہی کسی شریف انسان کو یہ سرٹیفکیٹ جاری کیا جاسکتا ہے کہ وہ تاحیات قتل جیسے جرم کا ارتکاب نہیں کرے گا۔ اکیوزڈ باکس میں کھڑا یہ شخص ایک خطرناک مجرم ہے۔''

''مجھے سخت اعتراض ہے جنابِ عالی!'' وکیل استغاثہ کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی میں نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ ''میرے فاضل دوست نے عدالتی کارروائی کے آغاز ہی میں میرے مؤکل کو ایک خطرناک مجرم قرار دے دیا ہے۔ انہیں یہ معلوم نہیں کہ جب تک اکیوزڈ باکس میں کھڑے شخص پر عائد الزامات ثابت نہیں ہوجاتے، یہ ملزم کہلائے گا، مجرم نہیں۔''

جج نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''آبجیکشن سسٹینڈ!''

''ٹھیک ہے.....'' وکیل استغاثہ خفت بھری آواز میں بولا۔ ''ڈیفنس کا زور اس بات پر ہے کہ مجرم..... میرا مطلب ہے ملزم کو کسی گہری سازش کے تحت اس کیس میں پھنسایا گیا ہے۔ کیا ڈیفنس معزز عدالت کو یہ بتانا پسند کریں گے کہ ان کے مؤکل کے خلاف یہ مبینہ سازش کس نے کی تھی.....؟ خود مقتول نے یا رمضانی بھائی نے اور یا پولیس نے.....؟ آخر اس کا دشمن کون ہے؟''

''میں تُک بندی کا قائل ہوں اور نہ ہی الزام برائے الزام پر یقین رکھتا ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں اس سازشی عنصر کو معزز عدالت کے سامنے ضرور بے نقاب کروں گا بلکہ وہ نامعلوم شخص معلوم ہوجانے پر اپنی زبان سے بھری عدالت میں اقبالِ جرم کرے گا..... مگر اس لمحے سے کماحقہ فیض یاب ہونے کے لیے تھوڑا صبر میرے فاضل دوست! تھوڑا انتظار۔''

وکیل استغاثہ نے برہمی بھرے لہجے میں کہا۔ ''عدالت کا وقت بہت قیمتی ہے۔ اسے فضول قسم کے لایعنی انتظار میں ضائع نہیں کیا جاسکتا۔'' پھر وہ جج سے مخاطب ہوتے ہوئے بہ آوازِ بلند بولا۔

''یور آنر! ملزم مکاری سے کام لیتے ہوئے خود کو معصوم اور بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش کررہا ہے۔ معزز عدالت سے میری درخواست ہے کہ اس چالباز شخص کی درخواستِ ضمانت کو رد کرتے ہوئے اس کیس کو آگے بڑھایا جائے۔''

''جناب عالی! ہر سازش کی ایک سینٹر لائن ہوتی ہے۔ اس لائن کے اردگرد اصل کرداروں کی جگہ غیر متعلقہ کرداروں کو مہروں کی طرح سجا کر اپنا مقصد حاصل کیا جاتا ہے۔ اس کیس میں بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔'' میں نے معتدل انداز میں اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''میرے مؤکل کو قربانی کا بکرا بنایا گیا ہے۔ استغاثہ ایک خود ساختہ کہانی کے بل بوتے پر میرے مؤکل اور اس کیس کے ملزم کو ایک ناکردہ جرم میں فکس کرنے کے درپے ہے۔''

وکیل استغاثہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''یور آنر! ڈیفنس نے ملزم کی ضمانت کے ذیل میں ابھی تک زبانی جمع خرچ کے سوا اور کچھ نہیں کیا۔ استغاثہ کو ایک خود ساختہ کہانی کا نام دینے والے میرے لائق اور ذہین فاضل دوست کی اپنی کسی بات میں کہیں کوئی ربط اور وزن دکھائی نہیں دیتا۔ انہیں یہ تو سمجھ لینا چاہیے کہ عدالت سنی سنائی باتوں اور بے بنیاد قصوں پر یقین نہیں کرتی بلکہ ہر شے کا ٹھوس ثبوت مانگتی ہے۔''

''مناسب وقت آنے پر.....'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے چٹانی لہجے میں کہا۔ ''ہر ثبوت عدالت میں پیش کردیا جائے گا۔''

''یور آنر! ڈیفنس جب تک معزز عدالت کے اطمینان کی خاطر ملزم کی بے گناہی کا کوئی ناقابلِ تردید ثبوت مہیا نہیں کردیتے، ملزم کی ضمانت کو منظور نہ کیا جائے۔ ایسے معاشرتی ناسوروں کو آزاد چھوڑ دینا انصاف کے اصولوں کے منافی ہوگا۔ دیٹس آل یور آنر!''

''یہ عدالت ملزم کی درخواستِ ضمانت کو رد کرتے ہوئے ڈیفنس کو ہدایت دیتی ہے کہ آئندہ پیشی پر وہ اپنے موقف کی تائید میں موزوں دلائل اور ٹھوس ثبوت فراہم کرے۔'' جج نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''دی کورٹ از ایڈجارنڈ!''

آگے بڑھنے سے پہلے پوسٹ مارٹم رپورٹ کی بات ہوجائے۔ مذکورہ رپورٹ کے مطابق مقتول یعقوب مجید کی موت چوبیس فروری کی سہ پہر دو اور چار بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ موت کا سبب اعشاریہ تھری ایٹ کیلیبر کی وہ گولی تھی جو مقتول کی کھوپڑی میں گھس کر اس کی زندگی کا چراغ گل کرگئی تھی۔

ملزم کی فیملی میں صرف تین افراد تھے جن میں سے اس کا باپ حیدر علی دو سال پہلے ایک افسوسناک حادثے کا شکار ہوکر جنت مکانی بن چکا تھا۔ باقی بچے دو افراد یعنی کاشف علی اور اس کی والدہ جمیلہ بیگم۔ کاشف اس کیس میں پھنس گیا تھا اور جمیلہ بیگم گھر میں بیٹھی اپنے بیٹے کی رہائی کے لیے دعائیں کررہی تھی۔ ان کی رہائش پاک کالونی میں تھی۔ کاشف ہنڈی کا کاروبار کرنے والے جس شخص کے پاس ملازم تھا، اس کا آفس میکلوڈ روڈ کی ایک عقبی گلی میں تھا۔ مقتول اور رمضانی بھائی کے دفاتر ایک دوسرے سے واکنگ ڈسٹینس پر واقع تھے۔

درخواستِ ضمانت مسترد ہونے کے بعد میرے مؤکل اور اس کیس کے ملزم کاشف علی کو جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا گیا تھا۔

☆☆☆

اس کیس کی باقاعدہ سماعت لگ بھگ ایک ماہ کے بعد شروع ہوئی۔ اس روز کمرائے عدالت میں اچھا خاصا رش تھا اور حاضرین عدالت میں اتفاق سے انور شیرازی بھی موجود تھا۔ استغاثہ کی جانب سے نصف درجن گواہوں کی فہرست دائر کی گئی تھی لیکن میں یہاں پر صرف اہم گواہوں

اوران کے بیانات ہی کا ذکر کروں گا۔

جج نے کرسیِ انصاف پر براجمان ہونے کے بعد وکیل استغاثہ سے مخاطب ہوتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ ''پراسیکیوشن! کارروائی شروع کی جائے۔''

''جناب عالی!'' میں نے جج سے درخواست کی۔ ''قبل اس کے کہ استغاثہ کے گواہوں کا سلسلۂ آغاز ہو، میں معزز عدالت کی اجازت سے اس کیس کے تفتیشی افسر سے چند ضروری سوالات کرنا چاہتا ہوں کیونکہ کسی بھی کیس میں تفتیشی افسر کی حیثیت استغاثہ کے ایک گواہ ایسی ہوتی ہے۔''

''پرمیشن گرانٹیڈ!'' جج نے بھاری بھرکم آواز میں کہا۔

جج کے حکم پر انکوائری آفیسر نواز شاہ کو گواہوں والے کٹہرے میں آکر کھڑا ہونا پڑا۔ میں اس کے نزدیک پہنچا اور سپاٹ آواز میں کہا۔ ''آئی او صاحب! میں اپنی اس حرکت پر شرمندہ ہوں کہ آپ کو وٹنس باکس میں کھڑا کردیا لیکن آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ بعض اوقات یہ سب ناگزیر ہوجاتا ہے۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں وکیل صاحب!'' اس نے بے مروتی سے جواب دیا۔

''آپ عہدے کے اعتبار سے اسسٹنٹ سب انسپکٹر یعنی اے ایس آئی ہیں اور آپ کا نام نواز شاہ ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا میں آپ کو ''شاہ جی'' کہہ کر مخاطب کرسکتا ہوں؟''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' وہ اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''آپ کام کی بات کریں۔''

''ٹھیک ہوگیا۔'' میں نے بے پروائی سے کندھے اچکائے اور سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔ ''کیا اس کیس کا چالان آپ ہی نے تیار کیا ہے؟''

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' وہ برہمی سے بولا۔

''جب میں اس کیس کا انویسٹی گیشن آفیسر ہوں تو ظاہر ہے اس کی رپورٹ بھی میں ہی تیار کروں گا۔ کیا آپ کو اس پر کسی قسم کا کوئی شک ہے؟''

''شک تو بہت چھوٹا لفظ ہے شاہ جی!'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''مجھے آپ کی کارکردگی پر سخت افسوس ہے۔''

نواز شاہ کو توقع نہیں تھی کہ ڈیفنس کی جانب سے اس نوعیت کے سوالات بھی آسکتے ہیں۔ میرے جواب پر وہ آپے سے باہر ہوگیا اور بگڑے ہوئے لہجے میں مستفسر ہوا۔

''آخر آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟''

''آپ غصہ نہ کریں شاہ جی! یہ آپ کی صحت کے لیے اچھا ثابت نہیں ہوگا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں جو جاننا چاہ رہا تھا، وہ جان چکا کہ اس کیس کا چالان آپ نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے تیار کیا ہے۔ باقی جہاں تک آپ کے اس سوال کا تعلق ہے کہ میں آخر آپ سے کیا کہنا چاہ رہا ہوں تو.....'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک آسودہ سانس خارج کی پھر انتہائی سادگی سے اضافہ کردیا۔

''ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے..... آپ میرے سامنے موجود ہیں۔ میں نے آپ سے جو بھی کہنا ہے، وہ کہہ دیتا ہوں۔ آپ گزشتہ پیشی پر عدالت میں موجود تھے نا؟''

''بالکل موجود تھا۔'' اس نے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔ ''اور آئندہ بھی ہر پیشی پر آپ مجھے ادھر ہی پائیں گے۔''

''نوازش، کرم، شکریہ، مہربانی شاہ جی!'' میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اب میں سیدھا پوائنٹ کی طرف آتا ہوں۔''

اتنا کہنے کے بعد میں نے دانستہ ڈرامائی توقف کیا تو انکوائری آفیسر عجیب سی نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور نواز شاہ کے چہرے پر نگاہ جما کر بولنا شروع کیا۔

''گزشتہ پیشی پر معزز عدالت نے میرے مؤکل کو فردِ جرم سے آگاہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ پولیس کی تیار کردہ چارج شیٹ کے مطابق ملزم چوبیس فروری کی سہ پہر دس لاکھ روپے کی ڈیلیوری کرنے مقتول کے آفس پہنچا۔ اس نے رقم مقتول کے حوالے کرنے کے بعد کچی رسید پر دستخط کرائے اور بہ وقتِ رخصت مقتول کی کھوپڑی میں گولی اتار کر اسے موت کی نیند سلا دیا۔ بعدازاں وہ دس لاکھ روپے کی خطیر رقم سمیٹ کر وہاں سے چلتا بنا۔'' لمحے بھر کو تھم کر میں نے آئی او سے سوال کیا۔

''شاہ جی! اگر میں نے کچھ غلط کہا ہو تو مجھے روک دیں اور ٹوک دیں۔''

''بالکل! میں نے اپنی رپورٹ میں ایسا ہی لکھا ہے۔'' وہ زور دے کر بولا۔ ''میں آپ کو ٹوکنے یا روکنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ سو، آپ چلتے رہیں.....''

''اب مزید چلنے کی طلب نہیں رہی شاہ جی!'' میں نے آئی او کی آنکھوں میں بہت دور تک جھانکتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے منزل آچکی۔ اب تو ادھر ہی پڑاؤ ڈالنا ہوگا۔''

''آپ پہیلیاں کیوں بجھوا رہے ہیں وکیل صاحب!'' وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ ''جو بھی کہنا ہے،

صاف اور واضح الفاظ میں کہیں۔''

''اوکے!'' میں نے رسان بھرے لہجے میں کہا پھر کریدنے والے انداز میں پوچھا۔ ''شاہ جی! آپ نے کبھی ہنڈی کے ذریعے کہیں پیسا بھیجا ہے یا کسی کی بھیجی ہوئی رقم کو وصول کیا ہے؟''

''نن..... نہیں، بالکل نہیں۔'' وہ پوری قطعیت سے بولا۔

میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''اس کا کوئی خاص سبب؟''

''میں رقم کی منتقلی کے اس ذریعے کو غیر قانونی سمجھتا ہوں۔''

''بے شک آپ کا ایسا سمجھنا درست ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''لیکن قانون کا محافظ ہونے کے ناتے آپ پر لازم ہے کہ ہر قانونی اور ہر غیر قانونی کام کی مکمل معلومات رکھیں۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''آپ کہہ تو ٹھیک ہی رہے ہیں۔'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''لیکن یہ سمجھ نہیں آرہا کہ زیر سماعت کیس سے میری معلومات کا کیا تعلق ہے؟''

''بہت گہرا تعلق ہے شاہ جی!'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''کیونکہ آپ نے اپنی معلومات کی روشنی ہی میں اس کیس کا چالان تیار کیا تھا جس کے اندر ایک بہت بڑی تکنیکی خرابی ہے۔''

''کون سی خرابی وکیل صاحب؟'' اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

''یہ خرابی کہ.....'' میں نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔ ''ہنڈی کا کاروبار کچی یا پکی رسیدوں پر نہیں چلتا۔ یہ زبان اور بھروسے کا بزنس ہے جس میں بعض نمبرز کا عمل دخل ہے جیسا کہ.....'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس لی پھر ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔

''فون نمبر..... شناختی کارڈ نمبر..... سیکرٹ کوڈ..... وغیرہ ہم!''

''اوہ.....!'' وہ ایک مضمحل سی سانس لے کر رہ گیا۔

''کوئی بات نہیں۔ ایسا ہوجاتا ہے۔ آپ ٹینشن نہ لیں۔'' میں نے اپنایت بھرے انداز میں کہا۔ ''ہم دس لاکھ کی وصولی کے ذیل میں لکھی گئی کچی رسید اور اس رسید پر کیے گئے مقتول کے دستخط کا ذکر کرکے آلۂ قتل پر آجاتے ہیں۔''

بات کے اختتام پر میں اطمینان سے چلتے ہوئے اس چوبی میز کے پاس آیا جس کے اوپر آلۂ قتل ایک سیلوفین بیگ کے اندر بند پڑا تھا۔ میں نے وہ بیگ اٹھالیا اور واپس وٹنس باکس کے قریب پہنچ کر آئی او نواز شاہ سے پوچھا۔

''کیا اسی گن سے مقتول یعقوب مجید کی جان لی گئی ہے؟''

''جی بالکل!'' اس نے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔ ''پوسٹ مارٹم رپورٹ اس امر کی تصدیق کرتی ہے کہ مقتول کی کھوپڑی کے اندر دھنسنے والی اعشاریہ تین آٹھ کی وہ گولی اسی گن سے چلائی گئی تھی اور اسی گولی سے مقتول کی موت واقع ہوئی تھی۔''

''اس حوالے سے تو مجھے بھی کوئی شک نہیں ہے شاہ جی کہ اس گن سے نکلنے والی پوائنٹ تھری ایٹ کیلیبر کی بلٹ نے مقتول کی زندگی کا چراغ گل کردیا تھا لیکن مسئلہ کچھ اور ہے.....!''

میں نے معنی خیز انداز میں بات ادھوری چھوڑی تو اس نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔ ''آپ کا اشارہ کس مسئلے کی جانب ہے وکیل صاحب؟''

''اس کیس کا بنیادی مسئلہ..... پراسیکیوشن اور ڈیفنس کا نظریاتی اختلاف۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''استغاثہ کے مطابق، اس گن سے گولی ملزم کاشف علی نے چلائی تھی مگر میرا دعویٰ ہے کہ میرے مؤکل کا اس گن سے کوئی تعلق ہے اور نہ ہی اس نے مقتول کی کھوپڑی پر فائر کرکے اسے موت کی نیند سلایا ہے۔''

''آپ..... اتنا بڑا دعویٰ کس بنیاد پر کررہے ہیں وکیل صاحب؟'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکتے ہوئے مستفسر ہوا۔

''اس بات کا کوئی ٹھوس ثبوت ہے آپ کے پاس؟''

''ایک جیتا جاگتا، گوشت و پوست کا ثبوت ہے میرے ہاتھ میں.....!'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''جو اس وقت میرے سامنے وٹنس باکس میں کھڑا ہے۔''

''آپ تو سیدھا میری جانب اشارہ کررہے ہیں۔'' وہ بگڑے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''یہ کس قسم کا مذاق ہے؟''

''یہ مذاق نہیں، حقیقت ہے شاہ جی!'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''کرائم سین کی تمام تر کارروائی آپ کے ہاتھوں انجام پائی تھی۔ آپ اس کیس کے تفتیشی افسر ہیں۔ آلۂ قتل بھی آپ ہی کی دریافت ہے۔''

''تو.....؟'' اس نے بپھرے ہوئے لہجے میں میری بات کاٹ دی۔ ''اس سے آپ کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟''

میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے استفسار کیا۔ ''کیا یہ درست ہے کہ واردات کی اطلاع ملتے ہی آپ دو کانسٹیبلو کے ہمراہ جائے وقوعہ پر پہنچے تھے؟''

''جی..... ایسا ہی ہوا تھا۔'' اس نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔

''آپ نے دیکھا مقتول یعقوب مجید اپنی کرسی پر

مردہ حالت میں اس طرح پڑا ہوا تھا کہ اس کے دائیں کان کے اوپر کھوپڑی میں سے خون نکل کر اس کے چہرے کے دائیں حصے اور لباس کے جزوی حصے کو بھگو رہا تھا۔ آپ نے مقتول کو دیکھتے ہی اندازہ لگا لیا کہ وہ اب اس دنیا میں باقی نہیں ہے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا شاہ جی؟''

''نہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''میں نے اپنی رپورٹ میں اس کی تفصیل لکھی ہے..... آپ بالکل بجا فرما رہے ہیں۔''

''آپ کی فراہم کردہ تفصیل میں یہ بھی درج ہے کہ جب آپ نے جائے وقوعہ یعنی مقتول کے کمرے کا جائزہ لیا تو یہ پسٹل آپ کو مقتول کی ٹیبل کے نیچے رکھے ڈسٹ بن کے اندر پڑا ملا تھا..... ہیں نا؟''

''جی ہاں!'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔

''ہم تھوڑی دیر کے لیے آلۂ قتل کے ذکر کو ایک طرف رکھ کر مقتول کی میز پر بات کرلیں؟'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''اگر آپ کی اجازت ہو تو.....؟''

''جی، ضرور۔'' اس نے مختصر جواب پر اکتفا کیا۔

''آپ نے موقع کی رپورٹ تیار کرتے ہوئے مقتول کی میز کا سائز بھی یقیناً نوٹ کیا ہوگا؟'' بات کے اختتام پر میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''جی بالکل!'' اس نے سر کو اثباتی جنبش دی اور بتایا۔ ''اس میز کی لمبائی پانچ فٹ اور چوڑائی تین فٹ تھی۔''

''ٹھیک ہوگیا۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''شاہ جی! کیا وقوعہ کے وقت آپ جائے واردات پر بہ نفس نفیس موجود تھے؟''

''یہ آپ کیا بات کر رہے ہیں؟'' وہ تڑخ کر بولا۔ ''میں جب کرائم سین پر پہنچا تو مقتول یعقوب مجید زندگی کی بازی ہار چکا تھا اور ملزم کا دور دور تک نام و نشان نہیں تھا۔ موقع پر موجود گواہوں کے بیانات سے مجھے پتا چلا کہ ملزم تھوڑی دیر پہلے مقتول کو دس لاکھ روپے دینے آیا تھا۔ اس کے بعد ہی میں نے رمضانی بھائی کے دفتر پر چھاپا مار کر ملزم کو گرفتار کیا تھا۔''

''آپ نے بہت اچھا کیا شاہ جی!'' میں نے ستائشی لہجے میں کہا۔ ''بس اتنا بتا دیں کہ موقع واردات پر آپ نے کل کتنے افراد کے بیانات قلم بند کیے تھے؟''

''تین افراد۔'' اس نے جواب دیا۔ ''منظور حسین، شکیل قریشی اور فرزانہ۔ ان تینوں کے نام استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں شامل ہیں۔''

''استغاثہ کے گواہوں سے بعد میں نمٹیں گے۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''پہلے آلۂ قتل پر ریسرچ مکمل کرلیں۔'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر آئی او کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''شاہ جی! میں تو آپ کو بہت ہوشیار اور سمجھ دار پولیس آفیسر سمجھ رہا تھا لیکن استغاثہ کی رپورٹ میں مجھے ملزم کے فنگر پرنٹس کی رپورٹ کہیں نظر نہیں آئی۔ کیا آپ نے آلۂ قتل پر سے قاتل کی انگلیوں کے نشانات کو اٹھا کر اس کا ملزم کے فنگر پرنٹس سے موازنہ نہیں کیا تھا؟''

''ہم نے آلۂ قتل سے فنگر پرنٹس اٹھانے کی کوشش کی تھی مگر کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔'' اس نے معتدل انداز میں جواب دیا۔ ''پہلے تو میں یہی سمجھا کہ ملزم نے گن کو ڈسٹ بن میں پھینکنے سے پہلے اس پر سے اپنی انگلیوں کے نشانات کو اچھی طرح صاف کر دیا تھا لیکن بعد ازاں مجھے حقیقتِ حال سے آگاہی ہوگئی اور میں مطمئن ہوگیا تھا۔''

''معزز عدالت کے اطمینان کی خاطر وہ ''آگاہی'' کرائے عدالت میں بھی شیئر کر دیں تو آپ کی نوازش ہوگی شاہ جی!'' میں نے منت آمیز لہجے میں کہا۔

''منظور حسین نے ملزم کو مقتول کے کمرے میں داخل ہوتے اور باہر نکلتے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''منظور حسین نے مجھے بتایا کہ ملزم نے آتے اور جاتے وقت اپنے ہاتھوں پر دستانے پہن رکھے تھے جیسا کہ بائیک چلانے والے افراد عموماً پہنتے ہیں لہٰذا یہی بات سمجھ میں آئی کہ ان دستانوں کی وجہ سے گن پر ملزم کی انگلیوں کے نشانات ثبت نہیں ہو سکے تھے۔ یہی سبب ہے کہ آپ کو فنگر پرنٹس کی رپورٹ کہیں نظر نہیں آئی۔''

''بریلینٹ!'' میں نے توصیفی نظر سے انکوائری آفیسر کو دیکھا اور چونکے ہوئے انداز میں استفسار کیا۔ ''بائیک کے تذکرے پر ایک سوال میرے ذہن میں سر اٹھا رہا ہے.....'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

''کیا آپ نے ملزم کی بائیک کو دیکھا ہے؟''

''دو سے تین بار۔'' اس نے جواب دیا۔

''بہت خوب۔'' میں نے تعریفی انداز میں کہا اور سوال کیا۔ ''ملزم کی بائیک کی کنڈیشن کے بارے میں کچھ بتائیں گے۔''

''وہ نہ تو نئی ہے اور نہ ہی پھٹیچر.....'' اس نے بتایا۔ ''آپ اسے ایک یوز ڈ بائیک کہہ سکتے ہیں۔''

میں نے چوبی میز پر سے دوبارہ آلۂ قتل والا سلیوفین بیگ اٹھالیا اور آئی او کی آنکھوں کے سامنے جھلاتے ہوئے خاصے بے مروت لہجے میں استفسار کیا۔

''شاہ جی! کیا آپ کو اس گن کی قیمت کا کچھ اندازہ ہے؟''

''میرے خیال میں یہ آٹھ سے دس ہزار کی ہوگی۔'' اس نے پُرسوچ انداز میں جواب دیا۔

''آپ کا اندازہ درست ہے شاہ جی!'' میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''لگ بھگ اتنی ہی ویلیو ملزم کی بائیک کی بھی ہوگی۔ کیا یہ کچھ عجیب سا نہیں ہے.....؟'' اس کے بعد میں نے ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے استفسار کیا۔

''ملزم نے اپنی بائیک کے برابر مالیت کی ایک گن کو بے پروائی سے نذرِ ڈسٹ بن کردیا اور..... گن بھی وہ جو اسے پھانسی کے پھندے تک لے جاسکتی تھی۔ کیا ملزم اتنا ہی احمق انسان ہے؟''

''یہ تو آپ کو زیادہ معلوم ہونا چاہیے وکیل صاحب!'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''وہ آپ کا مؤکل ہے۔ آپ نے اپنے کسی مجرب عمل سے اسے قابو کر رکھا ہے۔''

''موکلات کو قابو کرنا اور پھر قابو میں کیے رکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے شاہ جی!'' میں نے ذومعنی لہجے میں کہا پھر روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے ان الفاظ میں اپنی جرح ختم کردی۔

''جناب عالی! مجھے آئی او سے اور کچھ نہیں پوچھنا۔''

انکوائری آفیسر پر میری جرح کچھ زیادہ ہی طوالت اختیار کرگئی تھی لیکن میں نے اس دوران میں استغاثہ کا اچھا خاصا پوسٹ مارٹم کرڈالا تھا۔ میری اس کوشش کے نتیجے میں چند ایسے اہم پوائنٹس عدالت کے ریکارڈ پر آگئے تھے جو استغاثہ کی خامیوں بہ الفاظِ دیگر نالائقیوں اور بدنیتی کی جانب واضح اشارہ کرتے تھے۔ یہ ایک اچھا، صحت مند اور مفید آغاز تھا۔

عدالت کا مقررہ وقت ختم ہونے میں چند منٹ باقی تھے لہٰذا استغاثہ کی جانب سے کسی گواہ کو ٹھہرے میں بلانے کے بجائے جج نے ایک ہفتہ بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کردی۔

ہم کورٹ روم سے باہر آئے تو کوریڈور میں میرے ساتھ چلتے ہوئے انور شیرازی نے کہا۔ ''بیگ صاحب! آج کی عدالتی کارروائی تو بھرپور رہی ہے۔ آپ نے استغاثہ کے بخیے ادھیڑ ڈالے ہیں۔''

''شیرازی صاحب!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اس ''بھرپوریت'' کو قائم و دائم رکھنے اور اُدھڑے ہوئے بخیوں کے ''جوں کا توں'' پڑے رہنے کے لیے مجھے آپ کا تعاون درکار ہوگا۔''

''آپ حکم کریں بیگ صاحب۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ''میں ہر قسم کی مدد کے لیے تیار ہوں جناب۔''

''استغاثہ کی جانب سے جن گواہوں کے نام پیش کیے گئے ہیں، ان میں سے ایک دو افراد کے بارے میں مجھے مصدقہ جانکاری چاہیے اور یہ معلومات مجھے آپ فراہم کریں گے۔'' میں نے سپاٹ آواز میں کہا۔ ''باقی سب کو میں خود دیکھ لوں گا۔''

''اگر آپ کے پاس تھوڑا سا وقت ہو تو کینٹین میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔'' اس نے معتدل انداز میں کہا۔ ''میں چائے کی طلب محسوس کررہا ہوں۔''

''یہ تو کھانے کا وقت ہے شیرازی صاحب!'' میں نے کہا۔ ''آپ سٹی کورٹ کی طرف آ ہی گئے ہیں تو یہاں کے مرغ چھولے کھائے بغیر لوٹنا کفرانِ نعمت ہوگا۔''

''اوکے!'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''پہلے لنچ کرتے ہیں۔ اس کے بعد کڑک چائے۔''

ہم باتیں کرتے ہوئے اس علاقے کے ایک معروف اور خوش ذائقہ ریسٹورنٹ میں جا بیٹھے۔ کھانے کے دوران میں، میں نے شیرازی کو اس کیس کے ان کرداروں کے بارے میں بتادیا جن کی جانب سے میرے ذہن میں ایک سنسنی خیز کھٹکا تھا۔ پوری بات سننے کے بعد شیرازی نے کہا۔

''آپ بے فکر ہوجائیں بیگ صاحب! میں اپنے تعلقات اور ذرائع استعمال کرکے ان افراد کی کنڈلیاں نکلواتا ہوں جس سے ان کا ماضی اور حال کھل کر سامنے آجائے گا۔''

''اور اس ماضی اور حال کی روشنی میں ہم بہ آسانی یہ جان لیں گے کہ ان کے مستقبل کے کیا منصوبہ جات ہیں۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''درست فرمایا آپ نے۔'' وہ توانا لہجے میں بولا۔

ہم لنچ کرنے کے ساتھ حالاتِ حاضرہ پر تبادلہ خیال کرنے لگے۔

☆☆☆

گزشتہ پیشی پر ہمارے کیس کو زیادہ وقت نہیں مل سکا تھا اور جتنا بھی وقت ملا تھا، وہ سارے کا سارا میں ہی پی گیا تھا لہٰذا اس پیشی پر عدالتی کارروائی کا آغاز کرتے ہوئے جج نے وکیل استغاثہ کی جانب دیکھتے ہوئے تحکمانہ انداز میں کہا۔

''پراسیکیوشن اپنا گواہ پیش کرے۔''

استغاثہ کی جانب سے منظور حسین سب سے پہلے گواہی دینے کے لیے وٹنس باکس میں آیا۔ منظور حسین کی عمر پینتیس کے اریب قریب تھی۔ وہ مقتول کے آفس میں کام کرتا تھا۔ منظور حسین نے اپنا بیان حلفی ریکارڈ کرادیا تو وکیل استغاثہ اس کے نزدیک پہنچا اور اکیوزڈ باکس کی سمت اشارہ کرکے گواہ سے پوچھا۔

''منظور حسین! کیا تم اس بندے کو جانتے ہو؟''

''جانتا تو نہیں مگر پہچانتا ہوں۔'' وہ نفرت بھرے لہجے میں بولا۔ ''اس نے میرے باس کا خون کیا ہے۔ یہ قاتل ہے۔''

''جس روز یہ واقعہ پیش آیا، کیا تم آفس میں موجود تھے؟''

''جی وکیل صاحب!'' وہ گردن کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔

وکیل استغاثہ نے معتدل انداز میں کہا۔ ''اچھی طرح سوچ کر بتاؤ، اس دن کیا ہوا تھا؟''

''اس روز.....'' وہ پُرخیال انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میں کچن میں باس کے لیے چائے بنا رہا تھا کہ یہ بندہ آفس میں داخل ہوا۔ فرزانہ نے مجھے بتادیا تھا کہ ٹھیک ڈھائی بجے کوئی شخص باس کو دس لاکھ روپے دینے آئے گا۔ اس کا نام کاشف ہے۔ وہ جیسے ہی آکر باس کا پوچھے، میں اسے باس کے کمرے میں پہنچادوں۔'' سانس ہموار کرنے کے لیے وہ تھما پھر اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بتانے لگا۔

''یہ بندہ وقتِ مقررہ یعنی ٹھیک ڈھائی بجے آفس پہنچا تو میں نے اسے باس کے پاس پہنچادیا۔ باس نے مجھ سے کہا کہ دو چائے کمرے میں پہنچادوں۔ چائے بالکل تیار ہی تھی۔ میں نے دو پیالیوں میں چائے بھری اور کمرے میں جاکر ایک پیالی باس کے سامنے اور دوسری پیالی اس بندے کے سامنے میز پر رکھ دی اور باہر نکل آیا۔''

''ایک منٹ۔'' وکیل استغاثہ نے قطع کلامی کرتے ہوئے پوچھا۔ ''تم نے ملزم کی آمد کے کتنی دیر بعد چائے اندر پہنچائی تھی؟''

''فوراً ہی.....!'' وہ جلدی سے بولا۔ ''زیادہ سے زیادہ ایک منٹ کے بعد۔''

''ٹھیک ہے۔'' وکیل استغاثہ نے معتدل انداز میں کہا۔ ''پھر کیا ہوا؟''

''کچن میں چینی تقریباً ختم ہوچکی تھی۔'' وہ سلسلۂ بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''میں چینی لینے کے لیے آفس سے باہر نکل گیا۔ ہماری بلڈنگ کی بغلی گلی میں ایک چھوٹی سی دکان ہے جہاں چینی، پتی، خشک دودھ اور بسکٹ، کیک وغیرہ سب کچھ مل جاتا ہے۔ ہمارے باس چائے زیادہ پیتے ہیں اسی لیے میں ان کی چائے کے لیے چینی لانے دفتر سے باہر چلا گیا تھا۔''

''جب تم چینی لے کر واپس آئے تو کیا ملزم تمہارے باس یعنی مقتول کے کمرے کے اندر موجود تھا یا وہاں سے رخصت ہوچکا تھا؟'' وکیل استغاثہ نے اپنے گواہ سے استفسار کیا۔

''جب میں نے آفس میں قدم رکھا تو یہ بندہ باس کے کمرے سے نکل چکا تھا۔'' گواہ نے جواب دیا۔ ''میں نے اسے ''اللہ حافظ'' بھی کہا مگر اس نے جواب نہیں دیا۔ ان لمحات میں یہ بہت جلدی میں، خاصا گھبرایا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ میں نے اسے ذہن سے جھٹکا اور سیدھا کچن میں چلا گیا۔''

''کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ تم کتنی دیر تک آفس سے باہر رہے تھے؟''

''زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ۔'' اس نے بتایا۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم لگ بھگ دو بج کر پینتیس منٹ پر چینی لینے آفس سے باہر گئے اور کم و بیش دو بج کر پچاس منٹ پر واپس لوٹے تھے؟'' وکیل استغاثہ نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''جی بالکل!'' گواہ نے بڑے اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔'' وکیل استغاثہ نے رسانیت بھرے انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''تم نے ملزم کی آمد اور رخصت کے وقت کوئی خاص بات نوٹ کی تھی؟''

''جی ہاں۔'' منظور حسین نے اثبات میں جواب دیا۔ ''اس بندے نے اپنے ہاتھوں پر دستانے پہن رکھے تھے۔''

''ٹھیک ہوگیا۔'' وکیل استغاثہ نے معتدل انداز میں کہا پھر سوال کیا۔ ''اس کے بعد کیا ہوا تھا؟''

''میں چینی کو برنی میں ڈال کر فارغ ہوا تو سوچا کہ باس کے کمرے سے چائے کے جھوٹے برتن اٹھالاؤں۔'' گواہ نے جواب دیا۔ ''لیکن اس سے پہلے کہ میں باس کے کمرے میں داخل ہوتا، باس کے سالے صاحب وہاں پہنچ گئے.....''

''باس کے سالے صاحب.....؟'' گواہ کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی وکیل استغاثہ نے سوال داغ دیا۔ ''تمہارا مطلب ہے، شکیل قریشی صاحب؟''

گواہ نے اثبات میں جواب دیا۔

وکیل استغاثہ نے گواہ کے چہرے پر نگاہ جما کر استفسار کیا۔ ''شکیل قریشی کتنے بجے آفس پہنچے تھے؟''

''ٹھیک تین بجے۔'' گواہ کے لہجے میں قطعیت پائی جاتی تھی۔

وکیل استغاثہ میری جانب مڑا اور کہا۔ ''یور وٹنس.....!''

اپنی باری پر میں وٹنس باکس میں کھڑے استغاثہ کے گواہ منظور حسین کے قریب چلا گیا پھر بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں جرح کا آغاز کرتے ہوئے گواہ سے استفسار کیا۔

''منظور حسین! پچھلی پیشی پر اس کیس کے تفتیشی افسر اے ایس آئی نواز شاہ نے معزز عدالت کو بتایا تھا کہ وقوعہ کے روز تم نے اپنے باس کی جس ٹیبل پر باس اور ملزم کے لیے چائے سرو کی تھی، اس میز کی لمبائی پانچ فٹ اور چوڑائی تین فٹ ہے۔ میری معلومات کے مطابق تم مقتول کے آفس میں مختلف نوعیت کے کام کرتے ہو جیسا کہ آفس کھولنا اور بند کرنا یعنی صبح سب سے پہلے تم ہی آفس پہنچتے ہو اور شام کو آفس بند کرنا بھی تمہاری ہی ذمے داری ہے۔ علاوہ ازیں آفس کی ڈسٹنگ، کچن میں چائے پانی کا بندوبست، باہر سے لنچ اور دوسری چھوٹی موٹی چیزیں لانا بھی تمہاری ڈیوٹی میں شامل ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ تم اپنے باس یعنی مقتول کے ایک بھروسا مند ملازم تھے تو یہ غلط نہیں ہوگا۔ کیا تم میری باتوں سے اتفاق کرتے ہو؟''

''جی، بالکل!'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بڑے اعتماد سے بولا۔ ''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ باس مجھ پر اندھا اعتبار کرتے تھے۔''

''تجربہ کار اور جہاندیدہ لوگ کہتے ہیں کہ اس دنیا میں ہر شے کی ایک قیمت ہے۔'' میں نے استغاثہ کے گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''انسان کے پاس خریدنے کی طاقت ہونا چاہیے۔ وہ ہر چیز حاصل کرسکتا ہے۔ تم نے اپنے باس کا اعتبار، اعتماد اور بھروسا کتنے میں فروخت کیا تھا؟''

میرے آخری سوالیہ جملے پر وہ اس طرح اچھلا جیسے کسی بچھو نے اسے ڈنک مار دیا ہو۔ ''یہ..... یہ..... آپ.....'' وہ بکھری ہوئی آواز میں مجھ سے مستفسر ہوا۔ ''کیسی..... بات کررہے..... ہیں.....؟''

''آبجیکشن یور آنر!'' وکیل استغاثہ کی احتجاجی آواز کورٹ روم میں گونجی۔ ''ڈیفنس، استغاثہ کے معزز گواہ پر ایمان فروشی کا الزام لگا رہا ہے۔''

''یہ ایمان فروشی ہے نہ ضمیر فروشی اور نہ ہی ہتکِ عزت کا معاملہ جناب عالی!'' میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے اطمینان بھرے انداز میں کہا۔ ''میں نے گواہ سے ایک سیدھا سادہ سوال کیا ہے۔ وہ بڑے تحمل سے ''ہاں یا نہ'' میں اس کا جواب دے سکتا ہے۔ میرے خیال میں اس میں پریشانی والی تو کوئی بات نہیں۔''

''یور آنر! میرے فاضل دوست نے مقتول کے کمرے میں رکھی ہوئی میز کے سائز سے بات شروع کی تھی۔'' وکیل استغاثہ نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ''پھر یہ میز کو بھول کر گواہ کی نیت اور کردار پر حملہ آور ہوئے اور.....!''

''نہ، نہ، نہ.....!'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''میں اس میز کو بھلا کیسے بھول سکتا ہوں۔ ابھی آپ کے سامنے میں مذکورہ میز کے سائز کے علاوہ اس کی ہسٹری اور جیوگرافی پر بھی بات کروں گا لیکن اس سے پہلے مجھے آپ کے گواہ سے ایک دو موٹی موٹی باتیں کرنا ہیں جن میں ایک تو وہی سوال ہے جس پر آپ کا گواہ لقوہ زدہ آواز میں اپنی حیرت آمیز پریشانی کا اظہار کرچکا ہے۔''

''آبجیکشن اوور رولڈ!'' جج کی کراری تحکمانہ آواز سنائی دی۔ ''منظور حسین!'' وہ استغاثہ کے گواہ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''ڈیفنس نے تم سے جو پوچھا ہے، اس کا سیدھا اور کھرا جواب دو۔''

''جج صاحب.....!'' وہ منت ریز لہجے میں بولا۔ ''میں بھلا جھوٹ کیوں بولوں گا۔ میں نے اپنے باس کو کبھی دھوکا نہیں دیا۔ وکیل صاحب خوامخواہ مجھ پر شک کررہے ہیں۔ میں ان کے اعتماد کا خون کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔''

''مسٹر بیگ! آپ کے سوال کا جواب آگیا۔'' جج نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''پلیز! پروسیڈ فردر۔''

''منظور حسین! یہ سن کر اچھا لگا کہ تم اپنے باس کے سچے خیرخواہ اور ایک وفادار ملازم رہے ہو۔'' میں نے گواہ کے چہرے پر نگاہ جما کر کہا۔ ''کیا تم بتاسکتے ہو کہ میں نے آج صبح ناشتے میں کیا کھایا تھا؟''

''میں بھلا یہ کیسے بتاسکتا ہوں وکیل صاحب!'' وہ الجھن زدہ انداز میں بولا۔ ''آپ نے میرے سامنے تو ناشتا نہیں کیا۔''

''تو گویا تم معزز عدالت کے روبرو یہ بتانے کی

کوشش کررہے ہو کہ جس واقعے کو انسان نے اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا ہو اس کے بارے میں وہ حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا؟'' میں نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔

''بالکل..... یہ تو صاف اور کھلی حقیقت ہے۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

''تو.....'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر استفسار کیا۔ ''تھوڑی دیر پہلے یہ حقیقت یکا یک آلودہ اور غیر واضح کیوں ہوگئی تھی؟''

''میں کچھ سمجھا نہیں۔'' گواہ نے بے چارگی سے کہا پھر امداد طلب نظر سے وکیل استغاثہ کو تکنے لگا۔

یہ کیسے ممکن تھا کہ وکیل مخالف اس موقع کو ضائع جانے دیتا۔ منظور حسین کی خاموش فریاد پر وہ جج سے مخاطب ہوتے ہوئے بہ آوازِ بلند بولا۔

''جناب عالی! مجھے سخت اعتراض ہے۔ ڈیفنس، استغاثہ کے گواہ کو اپنی بے سروپا باتوں سے کنفیوز کرنے کی کوشش کررہا ہے۔ انہیں ایسی حرکتوں سے باز رہنے کی تلقین کی جائے۔''

''آبجیکشن سسٹینڈ!'' جج نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا پھر مجھ سے مخاطب ہوکر ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔ ''بیگ صاحب! آپ آسان الفاظ میں اپنے سوال کی وضاحت کردیں تاکہ گواہ کی الجھن دور ہوجائے اور وہ جواب دے سکے۔''

''شیور یور آنر!'' میں نے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے کہا پھر استغاثہ کے گواہ کی جانب مڑ گیا۔

''منظور حسین! اس سیشن کی ابتدا میں تم نے وکیل استغاثہ کے پہلے سوال کا جواب دیتے ہوئے نفرت بھرے انداز میں کہا تھا..... میں ملزم کو جانتا تو نہیں مگر پہچانتا ہوں۔ اس نے میرے باس کا خون کیا ہے..... یہ قاتل ہے۔ تم سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ.....'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔ ''کیا تم نے ملزم کو مقتول پر گولی چلاتے ہوئے دیکھا تھا؟''

''نہیں.....!'' بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

''پھر تم نے اتنے وثوق سے میرے مؤکل کو قاتل کیسے قرار دے دیا؟'' میں نے اس پر چڑھائی کا آغاز کرتے ہوئے پوچھا۔ ''جب کہ تم معزز عدالت کے سامنے اس اصول کی تائید کرچکے ہو کہ جس واقعے کو انسان نے اپنی آنکھوں سے ہوتے نہ دیکھا ہو، اس کے بارے میں اسے کوئی حتمی رائے نہیں دینا چاہیے۔''

''جی، مجھ سے غلطی ہوگئی۔'' وہ فوراً ہی پسپائی اختیار کرتے ہوئے ندامت آمیز انداز میں بولا۔ ''ملزم نے میرے سامنے باس کو شوٹ نہیں کیا تھا۔''

''اپنی غلطی کو تسلیم کرلینا ایک قابلِ ستائش عمل ہے۔'' میں نے گواہ کی طرف دیکھتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ ''مانا کہ تم نے ملزم کو مقتول پر فائر کرتے نہیں دیکھا تھا لیکن گولی چلنے کی آواز تو سنی ہوگی..... ہیں نا؟''

میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے گواہ نے پریشان نظر سے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا۔ وکیل استغاثہ ایک نعرۂ مستانہ کے ساتھ فی الفور اپنے گواہ کی مدد کو لپکا۔

''آئی آبجیکٹ یور آنر! منظور حسین معزز عدالت کے سامنے اس بات کی بڑی بھرپور وضاحت کرچکا ہے کہ وہ ملزم اور مقتول کو چائے سرو کرنے کے بعد دو بج کر پینتیس منٹ پر چینی لانے کے لیے دفتر سے باہر چلا گیا تھا اور اس کی واپسی دو بج کر پچاس منٹ پر ہوئی۔ یہ وہی وقت تھا جب ملزم، مقتول کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد دفتر سے رخصت ہورہا تھا۔ ملزم اتنا حواس باختہ اور جلدی میں تھا کہ اس نے منظور حسین کے ''اللہ حافظ'' کا جواب بھی نہیں دیا تھا۔ یہاں پر اہم پوائنٹ یہ ہے کہ.....'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر انکشاف انگیز لہجے میں سوال کیا۔ وہ براہِ راست مجھ سے مخاطب تھا۔

''میرے ذہین اور قابل دوست! جب مقتول کی موت کے وقت استغاثہ کا گواہ منظور حسین دفتر میں موجود ہی نہیں تھا تو وہ گولی چلنے کی آواز کیسے سن سکتا تھا۔ آپ کا سوال تکنیکی اعتبار سے دو کوڑی کا بھی نہیں ہے۔''

وکیل استغاثہ کا انداز تحقیر آمیز اور عامیانہ تھا۔ قبل اس کے کہ میں بھی جواباً کوئی سخت اور مرچیں لگا دینے والی بات کرتا، جج کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''آبجیکشن سسٹینڈ..... بیگ صاحب! اس سوال سے صرفِ نظر کرتے ہوئے آپ اپنی جرح جاری رکھیں۔''

وکیل استغاثہ نے ایسی نگاہ سے مجھے دیکھا جیسے اپنے ''آبجیکشن'' کی ''پاور'' سے میرے ایک نہایت ہی اہم سوال کو ''کینسل'' کروا کر اس نے کورٹ روم میں کوئی بہت بڑا تیر مار لیا ہو۔ میں نے وکیلِ مخالف کو خوش فہمی میں مبتلا رہنے دیا اور جج کی جانب دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔

''جناب عالی! استغاثہ کے گواہ منظور حسین پر جرح کے ذیل میں اب میرے پاس دو ہی چیزیں باقی بچی ہیں اور یہ دونوں میٹریل تھنگز ہیں یعنی اپنا مادی وجود رکھنے والی اشیا.....

ان میں ایک ہے مقتول کی میز اور دوسری ہے گواہ کی چینی۔ چینی چونکہ سوئٹ ڈشز کا لازمی جزو ہے لہٰذا میں پہلے اسی کی بات کرنا چاہوں گا۔ چوبی میز کی باری بعد میں آئے گی۔''

''پرمیشن گرانٹیڈ!'' جج نے معتدل انداز میں کہا۔

''منظور حسین!'' میں نے اپنا روئے سخن استغاثہ کے گواہ کی طرف موڑتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''تم نے وکیل استغاثہ کی جرح کے جواب میں بتایا تھا کہ تمہارا باس یعنی مقتول بہت زیادہ چائے پینے کا عادی تھا۔ جب تم نے دیکھا کہ کچن میں چینی تقریباً ختم ہو چکی ہے تو تم چینی لانے کے لیے دفتر سے باہر ایک نزدیکی دکان پر چلے گئے تھے تاکہ چینی کی عدم موجودگی کے باعث باس تم پر غصہ نہ ہو۔ تم اپنے باس کی ناراضی سے بہت ڈرتے تھے۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟''

''آپ بالکل درست فرما رہے ہیں وکیل صاحب!'' وہ میرے بچھائے ہوئے جال میں قدم رکھتے ہوئے بولا۔ ''باس میرا بہت خیال رکھتے تھے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ میری کسی غفلت کے باعث انہیں کوئی کوفت ہو۔''

''اسی لیے تم چینی ختم ہونے سے پہلے ہی اپنے صاحب کی چائے کے لیے چینی کا بندوبست کرنے نیچے والی دکان پر گئے تھے۔''

''جی ہاں، یہی حقیقت ہے۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

''منظور حسین! کیا تمہیں ذرا سا بھی احساس ہے کہ تم بری طرح پھنس چکے ہو۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''اگر تم چینی کے بجائے پتی یا دودھ وغیرہ کا بہانہ کرتے تو تمہارا یہ جھوٹ نبھ جاتا لیکن.....!''

''مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی!'' میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی وکیل استغاثہ چلّا اٹھا۔ ''ڈیفنس، استغاثہ کے سیدھے سادے گواہ پر دروغ گوئی کا الزام لگا کر اسے ہراساں کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

''جناب عالی! میں نے اگر استغاثہ کے گواہ کے دروغ گو ہونے کی بات کی ہے تو اسے عدالت میں ثابت بھی کر سکتا ہوں۔'' میں نے دبنگ لہجے میں کہا۔

''آبجیکشن اوور رولڈ.....'' جج نے سپاٹ آواز میں کہا۔ ''مسٹر بیگ! پلیز کنٹینیو اینڈ پروو یور پوائنٹ۔''

''تھینک یو یور آنر!'' میں نے مؤدبانہ انداز میں کہا پھر اپنی فائل میں سے چند پیپرز نکال کر جج کے سامنے رکھنے کے بعد ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔ ''جناب عالی! یہ گلشن اقبال کے ایک معروف ڈاکٹر شوکت علی خان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے نسخہ جات کی کاپیاں ہیں۔ مقتول پچھلے کئی سالوں سے ڈاکٹر شوکت علی کے زیر علاج تھا۔ ان نسخہ جات پر مریض کا نام اور اس کی عمر بھی درج ہے۔ ہر نسخے پر تاریخ کا اندراج بھی نظر آ رہا.....''

''یہ تمام میڈیسنز تو ذیابیطس کے مریضوں کو دی جاتی ہیں۔'' جج کی حیرت بھری سنسنی خیز آواز نے مجھے اپنی بات نامکمل چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ وہ بے یقینی بھرے انداز میں کہہ رہا تھا۔ ''اس میں تو انسولین کا انجکشن بھی لکھا ہوا ہے۔''

''ہیئر از پوائنٹ یور آنر۔'' میں نے اپنی فائلوں پر ہاتھ مارتے ہوئے بہ آوازِ بلند کہا۔ پھر اپنی ادھوری چھوڑی ہوئی بات کو مکمل کرتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔ ''مقتول عرصہ دراز سے ڈایابیٹیز بہ الفاظِ سہل شوگر کے مرض میں مبتلا تھا۔ اگر یہ نسخہ جات میرے دعوے کی تصدیق کے لیے ناکافی محسوس ہو رہے ہوں تو میں عدالت کے حکم پر آئندہ پیشی پر ڈاکٹر شوکت علی خان کو گواہی کے لیے یہاں لا سکتا ہوں۔ ڈاکٹر شوکت علی نے مقتول کو ہر نوعیت کی مٹھاس لینے سے سختی سے منع کر رکھا تھا اور مقتول کا وفادار ملازم اور اس کیس میں استغاثہ کا معزز گواہ منظور حسین مقتول کی چائے کے لیے چینی خریدنے دفتر سے باہر نکل گیا تھا۔'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''جناب عالی! میں نے منظور حسین کی غلط بیانی کو معزز عدالت کے روبرو اجاگر کر دیا ہے۔ وقت آنے پر میں یہ بھی ثابت کر دوں گا کہ مقتول کی موت کے وقت منظور حسین آفس کے اندر ہی موجود تھا لیکن سردست میں..... عدالت کی اجازت سے مقتول کی میز کی کہانی کو ایک منطقی انجام دینے کی خواہش رکھتا ہوں۔''

''پرمیشن گرانٹیڈ!'' جج نے فراخ دلی سے کہا۔ ''پلیز کنٹینیو.....''

''منظور حسین!'' میں نے گواہ کو مخاطب کرتے ہوئے درشت لہجے میں سوال کیا۔ ''تم مقتول کے کمرے کی ڈسٹنگ کرنے کے بعد اس کی میز پر رکھی ہوئی چیزوں کو ایک مخصوص ترتیب سے سیٹ بھی کر دیا کرتے تھے لہٰذا مذکورہ میز کی ساخت اور سائز وغیرہ تمہارے ذہن میں محفوظ ہوگا۔ اس کیس کے تفتیشی افسر نے اس میز کا جو سائز معزز عدالت کے سامنے بیان کیا ہے، کیا تم اس سے اتفاق کرتے ہو؟''

''آپ نے میز کا کیا سائز بتایا تھا؟'' وہ الجھن زدہ لہجے میں مستفسر ہوا۔

میں نے کہا۔ ''میں نے نہیں، انکوائری آفیسر نواز شاہ نے بتایا تھا۔''

''جی جی..... میں انہی کا پوچھ رہا ہوں۔''

''لمبائی پانچ فٹ اور چوڑائی تین فٹ۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا پھر تھوڑے فاصلے پر کھڑے آئی او کی جانب دیکھتے ہوئے تصدیق طلب انداز میں اضافہ کر دیا۔ ''شاہ جی! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟''

آئی او نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

''اب بتاؤ۔'' میں نے وٹنس باکس میں کھڑے استغاثہ کے گواہ کو گھورا۔ ''تم کیا کہتے ہو؟''

''تفتیشی افسر صاحب نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''باس کی میز کا یہی سائز ہے۔''

''جب وقوعہ کے روز تم نے دو پیالی چائے مذکورہ میز پر جا کر رکھی تو تمہارے باس کے سامنے میز کی دوسری جانب ملزم ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ان دونوں کے درمیان تین فٹ چوڑی چوبی میز تھی۔ اگر ہم ان دونوں افراد کی میز سے دوری ایک، ایک فٹ تصور کر لیں تو یہ کہنے میں کوئی عار یا دقت نہیں ہونا چاہیے کہ چائے پینے کے دوران میں ملزم اور مقتول ایک دوسرے سے محض پانچ فٹ کے فاصلے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ تم اس بارے میں کیا کہتے ہو؟''

اس نے چند لمحات سوچنے کے بعد جواب دیا۔

''آپ کا حساب درست ہے وکیل صاحب! میں بھی کئی بار باس کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھا ہوں۔ یہ فاصلہ پانچ، ساڑھے پانچ فٹ سے زیادہ نہیں ہے۔''

''شکریہ منظور حسین!'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''مجھے تم سے اور کچھ نہیں پوچھنا۔''

''جناب عالی! میرے فاضل دوست نے مقتول کی میز کے سائز پر لایعنی بحث کر کے عدالت کا ڈھیر سارا قیمتی وقت برباد کیا ہے۔'' وکیل استغاثہ نے تپتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آخر اس انٹرویو سے کیا حاصل ہوا؟''

جج نے پراسیکیوٹر کے زخموں پر مرہم رکھتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''بیگ صاحب! بال آپ کی کورٹ میں پہنچ گئی ہے۔ بارِ ثبوت آپ کے کندھوں پر آ گیا ہے۔''

''کندھوں پر کیا، سر آنکھوں پر جناب عالی!'' میں نے خم ٹھونک کر چٹانی لہجے میں کہا۔ ''اس لیگل گیم کی بال میری کورٹ میں ہو یا استغاثہ کی ناک کا بال میرے کوٹ کی جیب میں..... میں اس بارِ ثبوت کو معزز عدالت کے سامنے اتار پھینکوں گا لیکن مناسب وقت آنے پر۔ سردست، اپنے فاضل دوست کی تشفی کی خاطر بتاتا چلوں کہ.....'' میں لمحے بھر کے لیے رکا پھر روئے سخن جج کی جانب پھیرتے ہوئے ٹھوس انداز میں کہا۔

''جناب عالی! اب میں جو کچھ کہنے جا رہا ہوں اس کی تصدیق کے لیے آئندہ پیشی پر کسی ایمونیشن ڈیلر یا ویپنز ایکسپرٹ کو عدالت میں بلایا جا سکتا ہے۔'' میں نے طنزیہ اور فاتحانہ انداز میں ایک نظر وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا پھر اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا۔ میرا مخاطب کرسیِ انصاف پر بیٹھا ہوا شخص تھا۔

''یور آنر! پوائنٹ تھری ایٹ کیلیبر کی بلٹ بڑی ظالم اور سفاک ہوتی ہے۔ اگر پانچ چھ فٹ کے فاصلے سے اسے ٹارگٹ پر فائر کیا جائے تو یہ اس ٹارگٹ کا سوا ستیاناس مار ڈالتی ہے جبکہ مقتول کی کھوپڑی کے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اس کی کھوپڑی کا حلیہ بگڑا اور نہ ہی بھیجا کہیں سے برآمد ہو کر منظرِ عام پر آیا بلکہ اعشاریہ تین آٹھ کی گولی چپ چاپ مقتول کی کھوپڑی کے اندر پہنچی اور اس کی زندگی کا چراغ بجھانے کے بعد تھک کر ادھر ہی بیٹھ گئی۔ اس سے ایک بات تو روشن دن کی طرح عیاں ہو گئی کہ.....'' میں نے دانستہ تھوڑا توقف کیا پھر اپنی بات کو ڈرامائی انداز میں مکمل کر دیا۔

''..... کہ مقتول پر گولی چلانے والا شخص اس کے سامنے میز کی دوسری جانب بیٹھا ہوا نہیں تھا بلکہ قاتل نے آٹھ سے دس فٹ کی دوری سے مقتول کو شوٹ کیا تھا یعنی..... ملزم کے رخصت ہونے کے فوراً بعد قاتل مقتول کے کمرے میں داخل ہوا اور اس نے مقتول کے سر کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ ان لمحات میں مقتول اپنی بائیں جانب دیکھ رہا تھا لہٰذا گولی اس کے دائیں کان سے تھوڑا اوپر کھوپڑی کے اندر جا دھسی..... دیٹس آل یور آنر!''

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔ جج نے آئندہ پیشی کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

''دی کورٹ از ایڈ جارنڈ!''

اگلے روز شیرازی مجھ سے ملنے آفس آیا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے مجھے وہ تمام اہم معلومات فراہم کر دیں جو میں نے اسے مہیا کرنے کو کہا تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور پوچھا۔

''تصاویر کا کیا ہوا شیرازی صاحب؟''

''وہ فوٹوز میں کل آپ کو پہنچادوں گا۔'' اس نے بتایا۔ ''اس کے علاوہ میں نے گیلانی صاحب سے بھی ملاقات کرلی ہے۔ آپ نے اس کیس کے حوالے سے جو خفیہ ریسرچ کی ہے، اس کی گیلانی صاحب نے تصدیق کی ہے۔ انہوں نے مجھ سے کہا ہے کہ جب بھی ان کی گواہی کی ضرورت ہو، میں انہیں دو تین دن پہلے بتادوں تاکہ وہ اپنی مصروفیات کو دیکھتے ہوئے ہمارے لیے وقت نکال سکیں۔''

''گیلانی صاحب میرا ایک اہم مہرہ ہیں۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں ان کی درست چال چلنے کے لیے دو تین دن نہیں، ایک ہفتہ پہلے انہیں انفارم کروں گا۔''

''دو روز پہلے جمیلہ بیگم سے بھی میری ملاقات ہوئی تھی۔'' شیرازی نے بتایا۔ ''وہ اپنے بیٹے کے لیے سخت پریشان ہے۔ پوچھ رہی تھی کہ کاشف کب تک بری ہوجائے گا؟''

''ماں کو اللہ نے بڑا عجیب و غریب دل دیا ہے شیرازی صاحب!'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''اگر اولاد ہر لحاظ سے بہ خیر و عافیت ہو تو یہ پھر بھی اس کے لیے بے چین اور مضطرب رہتی ہے۔ جمیلہ بیگم تو ایک ایسے بیٹے کی ماں ہے جو قتل اور غبن نما ڈکیتی کے الزام میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کررہا ہے۔''

''یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں بیگ صاحب!'' شیرازی تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''میں جمیلہ بیگم کی ذہنی اور قلبی کیفیت کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ کی دوبارہ اس سے ملاقات یا بات ہو تو کہہ دیں کہ ہم دوا کررہے ہیں، وہ دعا کرتی رہیں۔ اللہ نے ماں کی دعا اور باپ کی بددعا میں بڑی طاقت رکھی ہے۔ یہ تیر بہ ہدف اثرات کی حامل ہوتی ہیں۔''

''ماں کی دعا اور اس کی حیرت انگیز اثر پذیری کے بارے میں تو میں نے بھی سن رکھا ہے بیگ صاحب!'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''لیکن باپ کی بددعا کا ذکر آج پہلی مرتبہ آپ کی زبان سے سننے کو ملا ہے۔''

''اولاد چاہے کتنی بھی بری کیوں نہ ہو، ماں اس کے لیے کبھی بددعا کر ہی نہیں سکتی۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''یوں سمجھ لیں کہ قدرت نے اس کام کے لیے ماں کو پروگرام ہی نہیں کیا لیکن باپ.....'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک آسودہ سانس خارج کی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن باپ کے اندر یہ سافٹ ویئر موجود ہے۔ وہ اولاد کے ہاتھوں تنگ آکر ان کے لیے بددعا کرسکتا ہے۔ اسی لیے سیانے تنبیہہ کرگئے ہیں کہ باپ سے کبھی بددعا نہیں لینا ورنہ بیڑا غرق ہوجائے گا۔ جس کا باپ اس سے ناراض ہے، اس کا خدا بھی اس سے ناخوش! اب آپ خود اندازہ لگالیں کہ اگر کسی کا خدا اس سے خفا ہوجائے تو وہ شاد و آباد کیسے رہ سکتا ہے؟''

انور شیرازی ایسی نظر سے مجھے تکنے لگا جیسے میں کوئی وکیل نہ ہوں، عالم دین ہوں۔ اس کے اس طرح دیکھنے میں حیرت، استعجاب اور بے یقینی سب کچھ ایک ساتھ پایا جاتا تھا۔

☆☆☆

اس پیشی پر استغاثہ کی جانب سے چار گواہ پیش کیے گئے لیکن میں وقت کا خیال کرتے ہوئے یہاں پر صرف انہی گواہوں کا تذکرہ کروں گا جن کے بیان میں کوئی خاص بات ہوگی۔ یہ بھی بتاتا چلوں کہ اس روز میں نے بھی صفائی کے ایک گواہ کا بندوبست کررکھا تھا۔ جب استغاثہ کی گواہ اور مقتول کی سیکریٹری فرزانہ کا نام پکارا گیا تو میں نے جج سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''جناب عالی! آج کی عدالتی کارروائی کے آغاز پر میں اپنے ایک گواہ کو چند منٹ کے لیے کٹہرے میں بلانا چاہوں گا تاکہ ایک ادھورے کام کی لگے ہاتھوں تکمیل ہوجائے۔''

''وہ گواہ کون ہے اور آپ کس ادھورے کام کی جانب اشارہ کررہے ہیں؟'' جج نے مجھ سے پوچھا۔

''میرے گواہ کا نام ہے رمضانی بھائی..... ہنڈی کا کاروبار کرنے والا وہ شخص جس کے پاس ملزم کام کرتا تھا اور اسی کے آفس سے ملزم کو گرفتار بھی کیا گیا تھا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''رمضانی بھائی سے میں صرف ایک سوال کروں گا اور میرے اس سوال کا جواب استغاثہ کی بدنیتی کو اجاگر کرکے اس کیس کے چالان پر سوالیہ نشان کا ٹھپا لگادے گا۔''

جج نے سوالیہ نظر سے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟''

''مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی!'' وکیل استغاثہ نے چڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ایک تو ڈیفنس نے ابھی تک اپنے گواہوں کی فہرست دائر نہیں کی، اوپر سے اچانک کسی گواہ کو لاکر پیش کردینا وقت کے زیاں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں ڈیفنس کی ایسی حرکتوں سے استغاثہ کے گواہوں

کے بیانات کا یہ سلسلہ بری طرح متاثر ہوگا۔''

''جناب عالی! میں اپنے فاضل دوست کی تشفی اور معزز عدالت کے ریکارڈ کے لیے چند باتوں کی وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔'' میں نے ٹھوس اور پُراعتماد انداز میں کہا۔ ''نمبر ایک..... میں نے اپنے گواہوں کو ابھی تک محض اس لیے صیغۂ راز میں رکھا ہوا ہے کہ ان کے نام منظر عام پر آتے ہی استغاثہ کی صفوں میں ہلچل مچ جائے گی جس سے یعقوب مجید کے قتل میں ملوث شخص چوکنا ہوجائے گا۔ اگر ایسا ہوا تو میری ساری محنت پر پانی پھر جائے گا۔ واضح کردوں کہ میں اپنے مؤکل کو بے گناہ ثابت کرنے کا بندوبست کرچکا ہوں۔ قاتل مجھ سے زیادہ دور نہیں ہے۔ میں بہت جلد اسے بھری عدالت میں بے نقاب کردوں گا۔ نمبر دو..... میں صفائی کے گواہوں کی حیثیت سے صرف تین افراد کو عدالت میں پیش کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں جن میں سے ایک یعنی رمضانی بھائی کا نام میں نے ظاہر کردیا ہے۔ باقی دو گواہ بھی ان شاء اللہ آئندہ کسی پیشی پر حاضرِ عدالت کردوں گا۔ نمبر تین.....'' میں سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر روئے سخن وکیلِ سرکار کی سمت موڑتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔

''میرے فاضل دوست! میں رمضانی بھائی سے صرف ایک ٹیکنیکل سوال کرنا چاہتا ہوں جس میں زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ لگیں گے۔ اگر آپ کو اس قلیل مدت پر بھی کوئی اعتراض ہے تو پہلے آپ اپنا کام نمٹالیں۔ میں آج کے سیشن کے اختتام پر رمضانی بھائی کو وٹنس باکس میں بلالوں گا۔''

وکیل استغاثہ نے حاتم کی گور پر لات رسید کرتے ہوئے معاندانہ فیاضی کا ثبوت فراہم کرنے کی غرض سے برا سا منہ بنا کر کہا۔ ''ٹھیک ہے، آپ اپنے گواہ کو پہلے پیش کرلیں۔''

''میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گا میرے فاضل دوست!'' میں نے طنز میں گندھے ہوئے مصنوعی تشکرانہ لہجے میں کہا۔

رمضانی بھائی کی عمر کا تخمینہ میں نے ساٹھ کے آس پاس لگایا۔ وہ اپنی وضع قطع سے ایک روایتی کاروباری شخص نظر آتا تھا۔ وہ سچ بولنے کا حلف اٹھاچکا تو میں وٹنس باکس کے نزدیک چلا گیا اور نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں تمہیداً کہا۔

''رمضانی بھائی! میں سوال پوچھنے سے پہلے یہ واضح کردوں کہ کمرائے عدالت میں آپ کے ''حوالے'' کے کاروبار سے متعلق جو بھی گفت وشنید ہوگی، اس کی تشہیر کہیں نہیں کی جائے گی لہٰذا اس ذیل میں آپ بالکل مطمئن رہیں۔''

''اگر میرے دل میں کوئی ڈر، خوف اور ذہن میں کسی قسم کا اندیشہ یا خدشہ ہوتا تو میں گواہی دینے کے لیے راضی ہی نہیں ہوتا۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''میرا بزنس دنیا کا ایک ایماندارانہ اور قابلِ بھروسا کاروبار ہے اور پھر سب سے اہم نقطہ یہ ہے کہ اس کیس میں میرا ایک ملازم پھنسا ہوا ہے۔ کاشف علی پچھلے دس سال سے میرے پاس کام کررہا تھا۔ مجھے اور میرے کلائنٹس کو اس سے کبھی کوئی شکایت نہیں رہی۔ ایک بات میں پورے دعوے اور ثبوت کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وقوعہ کے روز کاشف نے مسقط سے آئی ہوئی دس لاکھ روپے کی خطیر رقم یعقوب مجید کے سپرد کردی تھی کیونکہ مسقط والی پارٹی نے فون کرکے میرا شکریہ ادا کیا تھا۔ وہ بندہ میرا پرانا کلائنٹ ہے۔ ہم لوگ شہر کے کاروباری مرکز میں بیٹھے ہیں۔ یہاں پر رقم کی منتقلی کا اچھا خاصا کام ہے۔ پتا نہیں، میں کیا کیا بولتا جارہا ہوں.....'' لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

''وکیل صاحب! آپ نے کیا پوچھنے کے لیے مجھے یہاں بلایا ہے؟''

''رمضانی صاحب! آپ آپوں آپ جو بھی بولتے گئے، اس نے میرا کام آسان کردیا ہے۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا پھر صورتِ حال سے آگاہ کرنے کے بعد میں نے اسے یہ بھی بتادیا کہ ہنڈی کے کاروبار کے بارے میں، میں نے اپنے کن خیالات کا اظہار کیا تھا۔

''آپ نے جو کچھ کہا، وہ کسی حد تک درست ہے۔'' وہ ٹھوس انداز میں بولا۔ ''میں آپ کو بتادوں کہ ہنڈی کا کاروبار بہت ہی سادہ، شفاف اور منظم ہے۔ اس دنیا کے ہر علاقے میں ہمارے ایجنٹس موجود ہیں۔ مثال کے طور پر..... آپ اپنے کسی عزیز یا دوست یا کسی بھی شخص کو ایک مخصوص رقم بھجوانا چاہتے ہیں۔ آپ کا مطلوبہ شخص دنیا کے کسی بھی حصے میں رہتا ہے، ہم وہاں کے اپنے ایجنٹ کو اس کا فون نمبر دے کر کہہ دیں گے کہ اس شخص کو اتنی رقم ادا کردو۔ یعنی ادھر آپ نے رقم ہمارے حوالے کی، ادھر وہی رقم آپ کے بندے تک پہنچ گئی اور مزے کی بات یہ ہے کہ آپ کا بندہ جس کرنسی میں چاہے گا، اسے اسی کرنسی میں ادائیگی کردی جائے گی۔ نہ کسی رسید کا جھنجٹ اور نہ کسی دستخط کا

ٹنٹا..... وکیل صاحب! ہمارا کاروبار صرف زبان اور بھروسے پر چلتا ہے اسی لیے ہم اپنے ورکرز کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کرتے ہیں۔ جس شخص کی نیت میں کھوٹ اور دماغ میں بددیانتی کے جراثیم موجود ہوں، وہ ہمارے سسٹم میں چل نہیں سکتا۔''

''اور ملزم کاشف علی.....'' میں نے ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''پچھلے دس سال سے آپ کے سسٹم میں بہ طریق احسن چل رہا تھا۔'' پھر میں نے وکیل استغاثہ کی جانب مڑ کر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

''مائی ڈیئر کونسلر! یور روٹنس۔''

اس نے بیزاری بھرے لہجے میں کہا۔ ''تھینک یو.....نو کوئسچن۔''

رمضانی بھائی کی گواہی کے بعد استغاثہ کی گواہ اور مقتول کی سیکریٹری فرزانہ وٹنس باکس میں آ کر کھڑی ہوگئی۔ فرزانہ کی عمر تیس سال رہی ہوگی۔ وہ ایک قبول صورت خاتون تھی۔ وہ اپنا بیانِ حلفی ریکارڈ کرا چکی تو وکیل استغاثہ اس کے نزدیک چلا گیا اور اپنی جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

''فرزانہ جی! آپ کو مقتول کے آفس میں کام کرتے کتنا عرصہ ہوا تھا؟''

''ایک سال ہونے والا تھا کہ یہ واقعہ پیش آ گیا۔'' گواہ نے بجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''آپ کی ڈیوٹی ٹائمنگ کیا تھیں؟''

''صبح دس بجے سے شام پانچ بجے تک۔'' فرزانہ نے بتایا۔

''پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق مقتول یعقوب مجید کی موت چوبیس فروری کی سہ پہر دو اور چار بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔'' وکیل استغاثہ نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ دن کا وہ عرصہ ہے جب آپ کو آفس کے اندر موجود ہونا چاہیے تھا لیکن آپ جائے وقوعہ سے غائب تھیں۔ اس کا کوئی خاص سبب؟''

''لگ بھگ دو بجے دوپہر میرے لیے ایک فون آیا تھا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''میں نے وہ کال اٹینڈ کی تو ایک نامانوس مردانہ آواز نے مجھے بتایا کہ میری امی کو ہارٹ اٹیک آیا ہے لہٰذا میں فوراً جناح اسپتال پہنچوں۔ امی کو اسپتال پہنچا دیا گیا ہے۔ میری امی دل کی مریضہ ہیں۔ ان کی صحت کے حوالے سے مجھے ہر وقت دھڑکا ہی لگا رہتا ہے۔ قبل اس کے کہ میں اطلاع دینے والے اس اجنبی سے کوئی سوال کرتی، اس نے فون بند کر دیا تھا۔ میں نے اس نمبر پر کال کی تو پتا چلا کہ وہ جناح اسپتال کے نزدیک واقع ایک پی سی او کا نمبر تھا۔ پی سی او کے مالک نے مجھے بتایا کہ کال کرنے والا کوئی پریشان حال شخص تھا جو فون کرنے کے بعد اسپتال کے گیٹ کی طرف گیا ہے۔ شاید اس کا کوئی رشتے دار اسپتال میں داخل ہے۔'' وہ لمحے بھر کو سانس درست کرنے کے لیے رکی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''میں نے فوراً جا کر سر (مقتول) کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ ہنڈی والے بندے کے بارے میں منظور کو بتا دوں اور میں امی کو دیکھنے جناح اسپتال چلی جاؤں۔ میں نے سر کی ہدایت پر عمل کیا لیکن اسپتال پہنچ کر پتا چلا کہ کسی نے فون کر کے مجھے بے وقوف بنایا تھا۔ میری امی اسپتال میں کہیں بھی نہیں تھیں۔ میں نے اپنے پڑوس میں فون کر کے امی کی خیریت دریافت کی تو معلوم ہوا امی بالکل ٹھیک ہیں۔ میں وہ فون سن کر اس قدر بوکھلا گئی تھی کہ اس وقت یہ خیال ہی نہیں آیا کہ اپنے پڑوس والوں سے اس اطلاع کی تصدیق کروں۔''

''ایسا بھی تو ہوسکتا ہے کہ ملزم نے آپ کو جائے واردات سے ہٹانے کے لیے وہ کال کی ہو؟'' وکیل استغاثہ نے مکاری بھرے انداز میں کہا۔ ''یا اپنے کسی ساتھی سے وہ فون کرایا ہو؟''

''جی..... ایسا ہوسکتا ہے۔'' وہ ملزم کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''یور روٹنس۔'' وکیل استغاثہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

یہ ایک طرح سے اس کی گواہ پر جرح کے ختم ہونے کا اعلان تھا۔ میں نے اپنی باری پر استغاثہ کی گواہ فرزانہ کو اسی مقام پر پکڑا جہاں پبلک پراسیکیوٹر نے اسے چھوڑا تھا۔ میں نے گواہ کو مخاطب کرتے ہوئے پہلا سوال کیا۔

''فرزانہ صاحبہ! کیا آپ ملزم کو ذاتی طور پر جانتی ہیں؟''

اس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''نہیں۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ ملزم آپ کا دوست ہے اور نہ ہی دشمن۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''ایسا ہی ہے نا؟''

''جی بالکل۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

''پھر وہ آپ کو جائے وقوعہ سے ہٹانے کے لیے فیک کال کیوں کرنے لگا؟'' میں نے نسبتاً تیز آواز میں استفسار کیا۔ ''اگر وہ آپ کو اپنے راستے کی رکاوٹ سمجھتا تھا تو اس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ ملزم آپ کو اچھی طرح جانتا تھا جبکہ آپ کے بقول ایسا ہرگز نہیں ہے۔''

''میں نے آپ کے سامنے کوئی غلط بیانی نہیں کی۔'' وہ قدرے برہمی سے بولی۔ ''وکیل صاحب نے اپنے ایک خیال کا اظہار کر کے مجھ سے اس پر رائے مانگی اور میں نے کہہ دیا..... جی، ایسا ہوسکتا ہے۔''

''گویا، یہ آپ کا دعویٰ نہیں ہے؟''

''جی، ظاہر ہے..... میں بھلا ایسا کوئی دعویٰ کیسے کرسکتی ہو؟'' اس نے جواب دیا۔

میں نے مقدمے کی فائل کو بڑی توجہ سے پڑھا تھا خصوصاً موقعِ واردات پر موجود افراد کے بیانات کو۔ انکوائری آفیسر کے مطابق وہ تین افراد تھے۔ نمبر ایک..... منظور حسین، نمبر دو..... فرزانہ اور نمبر تین شکیل قریشی۔ منظور حسین کو میں نے پچھلی ایک پیشی پر کاسٹک سوڈا سے اچھی طرح دھو کر اپنے مؤکل کے حق میں کئی ایک پوائنٹس نکال لیے تھے۔ فرزانہ اس وقت میری جرح کا سامنا کر رہی تھی اور شکیل قریشی کا ابھی نمبر نہیں آیا تھا۔ فرزانہ کے بعد استغاثہ کے صرف دو گواہ بچتے تھے یعنی مقتول کی بیوہ شازیہ قریشی اور مقتول کا سالا شکیل قریشی۔ شازیہ قریشی تو اس کیس کی مدعی اصل تھی اس لیے وہ ہر پیشی پر عدالت میں موجود ہوتی تھی اور شکیل قریشی بھی اکثر و بیشتر اس کے ساتھ ہی نظر آتا تھا۔

میں نے استغاثہ کی گواہ فرزانہ کا جواب سنا اور کٹہرے کے انتہائی قریب جا کر معتدل انداز میں استفسار کیا۔ ''اس واقعے کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ جس نامعلوم شخص نے وقوعہ کے روز فون کر کے آپ کی امی کے ہارٹ اٹیک کی جھوٹی اطلاع دی تھی، اس کا لب و لہجہ تو آپ کو یاد ہوگا؟''

''ہاں..... کچھ کچھ یاد ہے۔'' اس نے پُرسوچ انداز میں جواب دیا۔ ''اگر میں اس آواز کو دوبارہ سنوں تو فوراً پہچان لوں گی۔''

''ویری گڈ!'' میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا پھر اکیوزڈ باکس میں کھڑے اپنے مؤکل کو مخصوص اشارہ کر دیا۔

''فرزانہ! تمہاری امی کو ہارٹ اٹیک آیا ہے اس لیے تم فوراً جناح اسپتال پہنچو۔'' میرا سگنل کیچ کرتے ہی کاشف علی نے فرزانہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری امی کو اسپتال پہنچا دیا گیا ہے۔''

میں نے اپنے مؤکل کو ان لائنز کی خوب پریکٹس کرا رکھی تھی کیونکہ کیس فائل میں لگے ہوئے فرزانہ کے پولیس کو دیے گئے بیان میں اس کا ذکر موجود تھا۔

فرزانہ سمیت عدالت میں موجود ہر شخص ملزم کی اس ''حرکت'' پر چونک کر اسی کو دیکھ رہا تھا۔ وکیل استغاثہ سے برداشت نہ ہوا تو اس نے جھنجلاہٹ بھرے لہجے میں کہا۔

''یہ کیا تماشا ہے.....؟''

''یہ جواب آں تماشا ہے یعنی آپ کے تماشے کا منہ توڑ جواب.....'' میں نے ترکی بہ ترکی کہا پھر وکیل استغاثہ کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے میں نے فرزانہ سے پوچھا۔

''وقوعہ کے روز فون پر آپ کو، آپ کی امی کے ہارٹ اٹیک کے حوالے سے جو اطلاع دی گئی تھی، بہ عین وہی الفاظ ابھی ملزم نے آپ کے سامنے دہرائے ہیں۔ کیا ملزم کی آواز اور لب و لہجہ آپ کی یادداشت میں محفوظ اس اطلاع کنندہ نامعلوم شخص کی آواز اور لب و لہجے سے کسی قسم کی مماثلت رکھتا ہے؟''

''بالکل بھی نہیں۔'' وہ دو ٹوک لہجے میں بولی۔ ''دونوں آوازوں میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔''

''یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ وقوعہ کے روز ملزم نے آواز بدل کر فرزانہ کو اطلاع دی ہو یا کسی اور آدمی سے فون کرایا ہو؟'' وکیل استغاثہ نے ڈھٹائی بھرے انداز میں کہا۔ ''یہ ناممکن تو نہیں ہے۔''

''اس کیس میں استغاثہ کے پلیٹ فارم سے ناممکنات کی ایک روایت سی پڑ گئی ہے۔'' میں نے وکیل مخالف کی طرف دیکھتے ہوئے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''جیسا کہ آئی او صاحب کا ہنڈی کی رسیدیں تیار کر کے وصول کنندہ کے دستخط کے ٹھپے لگانا..... ایک شوگر کے مریض شخص کے ملازم منظور حسین کا اپنے مالک کی چائے میں طبیعت سے خوب چینی گھول کر پلانا.....'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک آسودہ سانس خارج کی پھر وکیل استغاثہ کے کانوں کے کیڑے جھاڑنے کی غرض سے کہا۔

''میرے فاضل دوست! استغاثہ اس خوش فہمی میں نہ رہے کہ ڈیفنس بھی اس کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ایسی حماقتیں کرے گا۔ ڈیفنس تو اس اصول پر کاربند ہے کہ کورٹ روم کے ایرینا میں خود غلطی سے بچتے ہوئے مدمقابل کی غلطی کو پکڑ کر میدان مارنا ہے۔''

وکیل استغاثہ کو کوئی جواب نہ سوجھا تو وہ مجھے ایسی نظر سے گھورنے لگا جیسے اگر اسے موقع مل جائے تو وہ مجھے کچا ہی چبا ڈالے گا۔ میں اسے اسی کی آگ میں جلتا چھوڑ کر گواہ کی جانب متوجہ ہوگیا۔

''فرزانہ جی! میری معلومات کے مطابق آپ کی رہائش صدر کے علاقے میں ہے؟'' میں نے گواہ کے

چہرے پر نگاہ جما کر کہا۔ ''آپ کا نام موقع کے گواہوں میں موجود ہے لیکن آپ تو وقوعہ کے وقت آفس سے نکل کر جناح اسپتال کی طرف روانہ ہوگئی تھیں۔ پھر آپ اسپتال سے گھر چلے جانے کے بجائے واپس آفس کیوں آگئی تھیں؟''

''وہ دراصل بات یہ ہے کہ.....'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''امی کے ہارٹ اٹیک کا سن کر تو میری مت ہی ماری گئی تھی۔ اسی افراتفری اور حواس باختگی میں اپنا پرس میں آفس ہی میں بھول گئی تھی۔ اس روز مجھے امی کے لیے ادویات لے کر جانا تھیں۔ ڈاکٹر کا نسخہ اور پیسے پرس میں رکھے ہوئے تھے۔ اس لیے مجھے واپس آنا پڑا تھا۔''

''میں تو کچھ اور ہی سمجھا تھا۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

وہ پریشان نظر سے مجھے تکتے ہوئے بولی۔ ''کیا؟''

''یہ کہ.....'' میں نے اپنی چھیڑ چھاڑ کو سنجیدگی سے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''آپ قاتل کے ساتھ ملی ہوئی ہیں اسی لیے فون کال کا بہانہ کرکے جائے وقوعہ سے غائب ہوگئیں پھر یہ دیکھنے واپس آگئیں کہ مقتول تسلی بخش انداز میں ٹھکانے لگا یا نہیں۔''

''یہ..... آپ کس قسم کی..... باتیں کر رہے ہیں وکیل صاحب.....!'' وہ سہمی ہوئی نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ ''کچھ تو خدا کا خوف کریں۔''

''کچھ نہیں، میں نے بہت زیادہ اللہ کا خوف کرلیا۔'' میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آپ قاتل ہیں اور نہ ہی کسی قاتل کی ساتھی۔ قاتلوں کے سینے میں ایسا گداز دل نہیں ہوتا جو اپنی ماں کی بیماری کی جھوٹی اطلاع پر بھی تڑپ اٹھے اور اسے اپنی سدھ بدھ کا بھی خیال نہ رہے۔ آئی ایم سوری..... میں آپ سے مذاق کر رہا تھا۔''

''آپ نے تو میری جان ہی نکال دی تھی۔'' وہ عجیب سے لہجے میں شکایت کرتے ہوئے بولی۔ ''بھلا کوئی ایسا مذاق بھی کرتا ہے۔''

''آپ کی جگہ اگر کوئی قاتل کھڑا ہوتا تو اس مذاق پر وہ میری جان نکالنے کے لیے بے چین ہوجاتا۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''مجھے آپ سے اور کچھ نہیں پوچھنا۔ آپ پورے اطمینان کے ساتھ گھر جاسکتی ہیں۔''

استغاثہ کی اگلی گواہ مقتول کی بیوہ شازیہ قریشی تھی۔ شازیہ کی عمر پینتیس سال تھی مگر وہ تیس سے زیادہ کی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ شازیہ کا شمار حسین و جمیل، پرکشش اور طرح دار عورتوں میں ہوتا تھا۔ مقتول اس پر ریجھ گیا تھا اسی لیے ایک سال پہلے اس نے شازیہ سے شادی کرلی تھی۔ میں نے شازیہ کی ذات کے حوالے سے اپنا ہوم ورک اچھے سے مکمل کر رکھا تھا۔

شازیہ کا حلفیہ بیان ریکارڈ ہوچکا تو وکیل استغاثہ جرح کے لیے وٹنس باکس کے نزدیک چلا گیا۔ وہ لگ بھگ آٹھ منٹ تک اپنے گواہ سے ایسے انداز میں سوال و جواب کرتا رہا جیسے گزشتہ رات ہی وہ تازہ تازہ بیوہ ہوئی ہو اور وہ اسے پُرسہ دینے آیا ہو۔

اپنی باری پر جج کی اجازت حاصل کرکے میں استغاثہ کی سب سے اہم گواہ اور مقتول کی بیوہ شازیہ قریشی کے قریب پہنچ گیا۔ میں نے بڑے نپے تلے انداز میں جرح کا آغاز کرتے ہوئے پہلا سوال کیا۔

''شازیہ صاحبہ! آپ چند ماہ پہلے جتنے بڑے صدمے سے گزری ہیں، اس کا مجھے بخوبی احساس ہے اور آپ کے شوہر کے ساتھ پیش آنے والے سانحے کا بے حد افسوس بھی لیکن یہ جرح بھی ضروری ہے۔ اگر آپ تیار ہوں تو میں شروع کروں.....؟''

''جی..... میں ٹھیک ہوں۔'' وہ رسان بھرے لہجے میں بولی۔ ''آپ اپنا کام کریں۔''

''میرا کام ایک ہی مقصد کے گرد محوِ حرکت ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اور وہ مقصد ہے آپ کے شوہر کے قاتل کو سرِعدالت بے نقاب کرنا۔''

اس نے خاصے تیکھے انداز میں مجھ سے پوچھا۔ ''آپ ایسا کر پائیں گے؟''

''آف کورس!'' میں نے پورے یقین سے کہا۔ ''اور یہ تماشا اسی کورٹ روم میں آپ اپنی آنکھوں سے دیکھیں گی۔''

''مجھے تو نہیں لگتا۔'' وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

میں نے پوچھا۔ ''اس کی وجہ؟''

''آپ تو کئی ماہ سے قاتل کو بچانے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔'' اس نے زہر میں بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''چیزیں جیسی نظر آتی ہیں، درحقیقت ویسی ہوتی نہیں شازیہ صاحبہ!'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''جب میں اپنا دعویٰ سچ کر دکھاؤں گا تو آپ کو بھی میری اس فلاسفی پر یقین آجائے گا۔''

''چلیں.....'' وہ بے پروائی سے بولی۔ ''دیکھتے ہیں۔''

شازیہ قریشی کے انداز اور لب و لہجے میں اعتماد پایا

جاتا تھا۔ وہ عام بیوہ عورتوں کی بہ نسبت خاصی سنبھلی ہوئی اور بے فکر نظر آتی تھی۔ اس کی گفتار میں ایک یقین اور چیلنج پایا جاتا تھا اور یہ میرے لیے اچنبھے کی بات ہرگز نہیں تھی۔ میں اس سے کچھ ایسے ہی رویے کی توقع کر رہا تھا۔

''کیا یہ سچ ہے کہ مقتول سے شادی ہونے سے قبل آپ اس کے آفس میں بطور سیکریٹری کام کر رہی تھیں؟'' میں نے اپنی جرح کو پہلے گیئر میں ڈالتے ہوئے استفسار کیا۔ ''آپ نے لگ بھگ چھ ماہ تک اسی پوسٹ پر کام کیا تھا جہاں آپ کی شادی کے بعد فرزانہ کا اپائنٹمنٹ ہوا؟''

''آپ درست فرما رہے ہیں۔'' وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔

''آپ سے شادی، مقتول کی دوسری شادی تھی۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''مقتول کی پہلی بیوی کا نام ہے عاصمہ۔ عاصمہ سے مقتول کی ایک پندرہ سالہ بیٹی نعیمہ بھی ہے۔ نعیمہ اس وقت میٹرک کی اسٹوڈنٹ ہے۔ وہ دونوں ماں بیٹی طارق روڈ کے سینٹرل کمرشل ایریا میں رہتی ہیں۔ مقتول کی ایکس وائف ایک معروف پرائیویٹ اسکول چلاتی ہیں۔''

''وکیل صاحب! آپ نے میرے مرحوم شوہر کے ماضی کے حوالے سے اچھی خاصی ریسرچ کر رکھی ہے۔'' وہ استہزائیہ انداز میں بولی۔ ''کہیں آپ بھری عدالت میں یہ تو ثابت کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے کہ یعقوب کی موت میں عاصمہ کا ہاتھ ہے؟''

میں نے اس کے سوال کا جواب دینا ضروری نہ جانا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ''مقتول سے آپ کی دوسری شادی تھی اور آپ کی.....؟''

''میں سمجھی نہیں.....؟'' وہ حیرت سے پلکیں جھپکاتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا۔ ''مطلب یہ کہ کیا یہ آپ کی پہلی شادی تھی؟''

''آبجیکشن یور آنر!'' وکیل استغاثہ نے بلند آواز میں کہا۔ ''اس وقت عدالت میں یعقوب مرڈر کیس کی سماعت چل رہی ہے اور ڈیفنس غیر ضروری اور غیر متعلق باتوں میں گواہ کو الجھا کر عدالت کا وقت برباد کر رہے ہیں۔''

''بیگ صاحب!'' جج نے مجھ سے استفسار کیا۔ ''کیا گواہ شازیہ قریشی سے پوچھا گیا سوال زیر سماعت کیس سے متعلق ہے؟''

''صد فیصد جناب عالی!'' میں نے چٹانی لہجے میں کہا۔ ''اور اس سوال کی اہمیت دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ نمبر ایک، عدالت کا ریکارڈ اور نمبر دو، پراسیکیوشن کا اطمینان۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو میں اس کی وضاحت کر دیتا ہوں۔''

''آبجیکشن اوور رولڈ!'' جج نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''بیگ صاحب! پلیز کنٹینیو یور ورک۔''

''میرے فاضل دوست کی تسلی کے لیے عرض ہے کہ یعقوب مرڈر کیس میں اس کی بیوہ (شازیہ) کو غیر متعلق کہنا سراسر زیادتی ہوگی اور اس کی مطلقہ (عاصمہ) کے ذکر کو غیر ضروری قرار دینا مجرمانہ غفلت میں شمار ہوگا۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''مقتول اب اس دنیا میں باقی نہیں رہا۔ وہ اپنے پیچھے کروڑوں کا کاروبار اور جائداد چھوڑ کر گیا ہے لہٰذا قانونی بنیادوں پر یہ واضح ہو جانا نہایت ہی اہم ہے کہ مقتول کی موت کے بعد اس کا/ کے بینیفشری کون ہے! ہیں اور یہ گتھی مقتول کی پہلی اور دوسری بیوی کے کرنٹ اسٹیٹس کو ڈسکس کر کے ہی سلجھائی جا سکتی ہے۔ میرے سوال کی سب سے کریٹیکل ریزن یہ ہے کہ.....'' میں سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''استغاثہ کی معزز گواہ اور مقتول کی غیر سوگوار بیوہ کی عمر اس وقت پینتیس سال ہے۔ ایک سال پہلے اس کی شادی مقتول سے ہوئی تھی۔ شازیہ صاحبہ بہت ہی خوبصورت اور دلکش حسن کی مالک ہیں۔ قدرت نے انہیں بڑی فرصت سے بنایا ہے۔ ان جیسی زہرہ جمال خواتین کی شادی پچیس سال کی عمر کے آس پاس ہو جاتی ہے اور.....''

''میری تعریف کرنے کا شکریہ وکیل صاحب!'' میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی گواہ قطع کلامی کرتے ہوئے توانا آواز میں بولی۔ ''ابھی آپ نے عورتوں کی شادی کے بارے میں جو اصول بیان کیا ہے، میں اس کی تائید کرتے ہوئے آپ کو بتاتی چلوں کہ انسان کا نصیب بھی کوئی چیز ہوتی ہے جس سے کوئی لڑ نہیں سکتا۔ جب تک قسمت یاور نہ ہو، انسان کی ساری قابلیت اور حسن و خوبصورتی رکھی رہ جاتی ہے۔ آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے.....'' اس نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر سرسراتی ہوئی آواز میں بولی۔

''یعقوب مجید سے میری پہلی شادی تھی.....!''

''شکریہ میڈم! میں نے نوٹ کر لیا۔'' پھر میں نے وکیل استغاثہ کی جانب دیکھتے ہوئے سلگانے والے انداز میں کہا۔ ''میرے فاضل دوست! آپ بھی نوٹ فرما لیں۔ آئندہ پیشی پر یہ ''نوٹ'' آپ کے بہت کام آئے گا۔''

اس نے میرے اس پیشکش نما مشورے پر دھیان دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ میں نے اپنا دھیان اس کی

گواہ پر لگاتے ہوئے معتدل انداز میں پوچھا۔

''شازیہ صاحبہ! مقتول سے شادی کے بعد آپ اس کے عالیشان بنگلے واقع تھرٹین ڈی، گلشن اقبال میں منتقل ہوگئی تھیں۔ اس سے پہلے آپ کہاں رہتی تھیں؟''

''محمود آباد میں، اپنے بھائی جان کے ساتھ۔'' اس نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہوگیا۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا پھر اچانک سوال کیا۔ ''کیا کبھی آپ ''فردوس گارڈن'' میں بھی رہی ہیں؟''

''جی ہاں!'' بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا پھر اس کے چہرے پر ایسے تاثرات نمودار ہوئے جیسے اس سے کوئی سنگین غلطی سرزد ہوگئی ہو۔ اس نے اضطراری لہجے میں کہا۔ ''کبھی نہیں وکیل صاحب..... یہ فردوس گارڈن کوئی پارک ہے کیا؟''

''فردوس گارڈن ایک اپارٹمنٹس بلڈنگ ہے میڈم!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جو کہ ناظم آباد کے علاقے میں واقع ہے۔''

''میں نے اس بلڈنگ کا نام آج پہلی بار آپ کی زبان سے سنا ہے۔'' وہ اپنے اندرونی اضطراب کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ ''میرا وہاں کبھی جانا نہیں ہوا۔''

''شکریہ شازیہ صاحبہ!'' میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا پھر جج کی طرف دیکھتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔

''جنابِ عالی! مجھے شازیہ قریشی سے فی الحال اور کوئی سوال نہیں کرنا لیکن میری معزز عدالت سے استدعا ہے کہ اگلی پیشی پر شازیہ صاحب کو عدالت میں لازمی حاضر ہونے کی تاکید کی جائے۔ مجھے ان سے مقتول کی ذیابیطس کی بیماری کے حوالے سے چند چونکا دینے والے سوالات کرنا ہیں جو کہ تنگیِ وقت کے باعث ابھی نہیں کیے جاسکتے۔ ویسے بھی شازیہ قریشی استغاثہ کی سب سے اہم گواہ ہیں اور..... اہم چیزوں کی تو کسی بھی وقت ضرورت پیش آسکتی ہے۔ دیٹس آل یور آنر!''

میں نے مقتول کی ذیابیطس کے ذیل میں صریحاً غلط بیانی کی تھی۔ میں شازیہ سے شوگر کے بارے میں نہیں بلکہ سالٹ کے حوالے سے استفسار کرنے کا ارادہ رکھتا تھا اور اگر میں اسے حقیقتِ حالات سے آگاہ کردیتا تو میرا بنا بنایا کھیل بگڑ سکتا تھا جو کہ ظاہر ہے میں نہیں چاہتا تھا۔

''وکیل صاحب!'' جج نے وکیل استغاثہ سے پوچھا۔ ''آپ کے گواہوں کی کیا پوزیشن ہے؟''

''استغاثہ کا بس آخری گواہ باقی ہے۔'' وکیل استغاثہ نے جواب دیا۔ ''مقتول کا سالا شکیل قریشی، جس نے سب سے پہلے مقتول کی لاش کو دیکھا تھا۔''

جج نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یہ عدالت ڈیفنس کی درخواست کو منظور کرتے ہوئے پراسیکیوشن کو اس بات کا پابند کرتی ہے کہ وہ آئندہ پیشی پر مقتول کی بیوہ اور اس کیس کی مدعی اصل کو عدالت میں حاضر کرنے کے ساتھ ہی اپنے آخری گواہ کو بھی نمٹادے تاکہ اس کیس کو نتیجہ خیز بنایا جاسکے۔'' پھر اس نے مجھ سے مخاطب ہوکر پوچھا۔

''بیگ صاحب! آپ اپنے گواہ کب پیش کررہے ہیں؟''

''ان شاء اللہ اگلی پیشی پر۔'' میں نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

جج نے سر کی اثباتی جنبش کے ساتھ عدالت برخاست کرنے کا اعلان کردیا۔ ''دی کورٹ از ایڈجارنڈ!''

آئندہ پیشی دو ہفتے بعد کی تھی۔

☆☆☆

منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں والے کٹہرے میں شازیہ قریشی کا بڑا بھائی شکیل قریشی کھڑا تھا۔ شکیل کی عمر پینتالیس سال تھی۔ وہ متناسب بدن کا مالک ایک دراز قامت شخص تھا۔ اس کے بائیں گال پر آنکھ سے تھوڑا نیچے کٹ کا ایک نشان تھا۔ یہ چوٹ خاصی پرانی دکھائی دیتی تھی۔ اس کی بہن اور مقتول کی بیوہ شازیہ قریشی بھی کمرائے عدالت میں موجود تھی۔

شکیل قریشی نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کرایا تو وکیل استغاثہ وٹنس باکس کے نزدیک چلا گیا۔ اس نے ڈھیلے ڈھالے انداز میں جرح کا آغاز کرتے ہوئے گواہ سے پوچھا۔

''شکیل صاحب! مقتول کی لاش کو سب سے پہلے آپ نے دیکھا تھا۔ معزز عدالت کو بتائیں کہ وقوعہ کے روز مقتول کے آفس میں کیا ہوا تھا؟''

''مجھے اچھی طرح یاد ہے، وہ پچھلے سال فروری کی چوبیس تاریخ کی سہ پہر تھی۔'' وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں ایک ضروری کام سے دُلہا بھائی سے ملنے ان کے آفس گیا تھا۔ بھائی صاحب سے تو ملاقات ہو نہیں سکی، ان کی.....!''

واضح رہے کہ اس کیس کو عدالت میں لگے ہوئے اب کم و بیش ایک سال ہوچکا تھا۔ ان دنوں جنوری کا مہینا

چل رہا تھا۔ گواہ نے بھرائی ہوئی آواز میں اپنی بات ادھوری چھوڑی تو وکیل استغاثہ نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔

''شکیل صاحب! میں آپ کے دکھ کو سمجھ سکتا ہوں مگر آپ کو جس مقصد کے لیے عدالت میں بلایا گیا ہے اس کا حصول بھی ضروری ہے۔ آپ میری بات تو سمجھ رہے ہیں نا؟''

''جی.....!'' وہ نمناک لہجے میں بولا۔ ''آپ کی طرح میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ دُلہا بھائی کے قاتل کو قرار واقعی سزا ملے۔ آپ پوچھیں مجھ سے جو بھی پوچھنا چاہتے ہیں۔ میں آپ کے ہر سوال کا کھرا اور سچا جواب دوں گا۔''

''استغاثہ کو آپ سے ایسے ہی تعاون کی توقع ہے۔'' وکیل استغاثہ نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''عدالت جاننا چاہتی ہے کہ آپ نے جائے واردات پر کیا دیکھا تھا؟''

''جب میں دلہا بھائی کے آفس پہنچا تو ان کی سیکریٹری فرزانہ اپنی سیٹ پر موجود نہیں تھی۔'' وہ معتدل انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میں عموماً فرزانہ سے پوچھ کر ہی دلہا بھائی کے کمرے میں جایا کرتا تھا۔ اس وقت منظور حسین کچن میں کچھ کر رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا، فرزانہ کہاں ہے؟ اس نے مجھے بتایا، فرزانہ کی امی کو ہارٹ اٹیک آیا ہے۔ وہ اپنی امی کو دیکھنے اسپتال گئی ہے۔ میں نے منظور سے دریافت کیا، کیا باس اپنے کمرے میں موجود ہیں؟ میں ان سے ملنے آیا ہوں۔ منظور نے جواب دیا، آپ اندر چلے جائیں۔ باس اس وقت اکیلے ہی بیٹھے ہیں۔'' لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بتانے لگا۔

''میں کمرے میں داخل ہوا تو دلہا بھائی اپنی کرسی میں اس طرح دھنسے بیٹھے تھے کہ ان کے سر سے خون نکل رہا تھا۔ ان کی حالت کو دیکھ کر مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ وہ اس جہان فانی سے کوچ کر گئے تھے۔ میں نے چیخ کر منظور حسین کو آواز دی۔ وہ لپک کر میرے پاس آیا۔ دلہا بھائی کی موت کا منظر دیکھ کر وہ حواس باختہ ہوگیا اور اس نے خوفزدگی کے عالم میں مجھے بتایا کہ چند منٹ پہلے ہنڈی والا باس کو دس لاکھ روپے دینے آیا تھا۔ میں نے دلہا بھائی کی میز کی درازیں وغیرہ چیک کیں تو کہیں پر بھی مجھے دس لاکھ روپے رکھے نظر نہیں آئے۔ یہ اتنی چھوٹی رقم نہیں تھی کہ دلہا بھائی نے ہنڈی والے سے لے کر اپنی کسی جیب میں رکھ لی ہو۔ تاہم میں نے ان کی تمام جیبیں بھی اچھی طرح چیک کیں مگر میری یہ کوشش بھی ناکام رہی۔ اس سچویشن میں یہی بات سمجھ میں آئی کہ وہ ہنڈی والا بندہ ہی دلہا بھائی کو شوٹ کرنے کے بعد دس لاکھ روپے اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ میں نے فون کرکے پولیس کو بلالیا۔ بعد ازاں پولیس نے ملزم کو اس کے ہنڈی والے آفس سے گرفتار کرلیا۔'' پھر وہ جج کی طرف دیکھتے ہوئے جذباتی انداز میں بولا۔

''سر! میری آپ سے دردمندانہ اپیل ہے کہ آپ میرے دلہا بھائی کے قاتل کو پھانسی کی سزا سنادیں۔''

''اچھی طرح سوچ کر بتائیں۔'' وکیل استغاثہ نے گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''وقوعہ کے روز آپ کتنے بجے مقتول کے آفس پہنچے تھے؟''

''دلہا بھائی نے مجھے تین بجے آفس آنے کو کہا تھا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اور میں ٹریفک کی وجہ سے چند منٹ لیٹ ہوگیا تھا۔ میرے خیال میں اس وقت تین بج کر پانچ یا زیادہ سے زیادہ دس منٹ ہوئے ہوں گے۔''

''یور ونس!'' وکیل استغاثہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''شکیل صاحب!'' میں نے استغاثہ کے گواہ پر اپنی جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے اپنے وکیل صاحب کو بتایا ہے کہ وقوعہ کے روز مقتول نے آپ کو تین بجے اپنے آفس بلایا تھا۔ اگر کوئی حرج نہ ہو تو معزز عدالت کو بتائیں، مقتول کے پاس آپ کی آمد کا سبب کیا تھا؟''

''کوئی حرج نہیں ہے وکیل صاحب!'' وہ بے پروائی سے بولا۔ ''دراصل دلہا بھائی اپنے دس لاکھ روپے میرے بزنس میں لگانا چاہتے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ مسقط والی پارٹی چوبیس فروری کی دوپہر ہنڈی سے دس لاکھ روپے بھیجے گی لہٰذا میں تین بجے ان کے دفتر آکر وہ رقم لے جاؤں لیکن جب میں آفس پہنچا تو وہاں بساط ہی الٹ چکی تھی۔''

''یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ بساط الٹانے میں آپ ہی کا ہاتھ ہو؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ تین بجے مقتول سے ملنے اس کے آفس پہنچے، دس لاکھ روپے اس سے لیے اور اس کی کھوپڑی میں گولی اتارنے کے بعد.....''

''آبجیکشن یور آنر!'' وکیل استغاثہ کی احتجاجی آواز کورٹ روم میں گونجی۔ ''میرے فاضل دوست حد سے تجاوز کر رہے ہیں۔ یہ بات اسٹیبلش ہوچکی ہے کہ شکیل صاحب جب آفس پہنچے تو وہاں منظور حسین بھی موجود تھا۔ اسی نے شکیل صاحب کو مقتول کے کمرے میں جانے کے لیے کہا

تھا۔ شکیل صاحب نے جیسے ہی کمرے میں قدم رکھا، انہیں مقتول مردہ حالت میں پڑا ملا تھا۔ اگر شکیل صاحب نے مقتول کو شوٹ کیا تھا تو منظور حسین نے گولی چلنے کی آواز کیوں نہیں سنی؟ آلۂ قتل پر سائیلنسر تو نہیں لگا ہوا تھا۔''

''آبجیکشن سسٹینڈ!'' جج نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا پھر مجھ سے پوچھا۔ ''بیگ صاحب! آپ کچھ کہنا چاہیں گے؟''

''آف کورس یور آنر!'' میں نے پُراعتماد انداز میں کہا۔ ''میرے فاضل دوست جس پوائنٹ کے اسٹیبلش ہونے کی بات کررہے ہیں، اس کے تین کردار ہیں..... منظور حسین، شکیل قریشی اور میرے فاضل اینڈ ہونہار دوست۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ان تینوں کرداروں کا تعلق ''استغاثہ'' سے ہے۔ بہ الفاظِ دیگر یہ تینوں میرے مؤکل کے دشمنوں کی ''تھری مین آرمی'' ہے لیکن.....'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر سلسلۂ دلائل کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''.....لیکن میں نے ان میں سے ایک کردار منظور حسین کی دروغ گوئی کو معزز عدالت کے سامنے آشکار کردیا ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ منظور حسین اور شکیل قریشی اندر سے ملے ہوئے ہوں۔''

''آپ استغاثہ کے معزز گواہوں پر گھناؤنا الزام لگا رہے ہیں۔'' وکیل استغاثہ نے ناپسندیدہ نظر سے مجھے گھورتے ہوئے پوچھا۔ ''اس گری ہوئی حرکت کا کوئی ٹھوس ثبوت ہے آپ کے پاس؟''

''بالکل..... ہے میرے پاس ثبوت۔'' میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا پھر جج کی طرف روئے سخن موڑتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

''جناب عالی! اگر پراسیکیوشن مجھے وٹنس باکس میں کھڑے ہوئے شکیل قریشی پر اپنی جرح مکمل کرنے کا موقع دے تو میں نے ابھی جس امکان کا ذکر کیا ہے، اسے معزز عدالت کے سامنے ثابت بھی کرکے دکھادوں گا۔''

جج نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''مسٹر بیگ! پلیز کنٹینیو۔''

میں استغاثہ کے گواہ کی جانب مڑا اور معتدل انداز میں استفسار کیا۔ ''شکیل صاحب! آپ ایسا کون سا بزنس کرتے ہیں جس میں مقتول اپنے دس لاکھ روپے انویسٹ کرنا چاہتا تھا؟''

''میں رئیل اسٹیٹ کا کام کرتا ہوں جناب!'' اس نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''سرجانی ٹاؤن میں ایک ہاؤسنگ اسکیم اناؤنس ہوئی تھی جس میں خاصے سستے پلاٹ مل رہے تھے۔ میں نے دلہا بھائی سے اس کا ذکر کیا تو وہ مچل گئے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ وہ بھی اس پروجیکٹ میں دس لاکھ روپے لگانا چاہتے ہیں۔''

''آپ کی رہائش کہاں پر ہے؟'' میں نے سوالات کے زاویے میں تبدیلی لاتے ہوئے پوچھا۔

''محمود آباد میں۔'' اس نے ترنت جواب دیا۔

''یہ وہی گھر تو نہیں جہاں سے ایک سال پہلے آپ نے اپنی اکلوتی بہن کو رخصت کیا تھا؟ میں مقتول کی بیوہ شازیہ قریشی کا تذکرہ کررہا ہوں جو اس وقت عدالت کے کمرے میں موجود ہیں۔''

''جی، جی۔ بالکل وہی گھر.....!'' وہ جلدی سے بولا۔

''آپ مذکورہ گھر واقع محمود آباد میں کب سے رہ رہے ہیں؟'' میں نے اپنی جرح میں تیزی لاتے ہوئے گواہ سے استفسار کیا۔

''کم وبیش دس سال سے۔'' اس نے محتاط انداز میں جواب دیا۔

''لیکن میری اطلاعات کے مطابق تو آپ دونوں لگ بھگ ڈیڑھ سال پہلے اس گھر میں آباد ہوئے تھے۔'' میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ''چند روز بعد شازیہ نے مقتول کے آفس میں بطور سیکریٹری ملازمت کرلی تھی اور کوئی چھ ماہ بعد دونوں رشتۂ ازدواج میں بندھ گئے تھے۔''

''شازیہ کی جاب اور شادی کے بارے میں آپ نے ٹھیک کہا ہے۔'' وہ بیزاری سے بولا۔ ''لیکن محمود آباد والے گھر میں ہماری رہائش کے حوالے سے آپ کی معلومات درست نہیں ہیں۔ اگر عدالت ضرورت محسوس کرے گی تو میرے پڑوسی اس امر کی تصدیق کے لیے گواہی دینے یہاں بلائے جاسکتے ہیں۔ وہ آپ کو بتائیں گے کہ ہم کتنے عرصے سے ان کے پڑوس میں رہ رہے ہیں۔''

وہ بڑے اعتماد کے ساتھ مجھے الو بنانے کی کوشش کررہا تھا لیکن میں نے اپنے محسن انور شیرازی کے تعاون سے وہ کڑی دوڑ دھوپ اس لیے نہیں کی تھی کہ استغاثہ کا کوئی گواہ بھری عدالت میں مجھے چونا لگا کر چلتا بنے۔

''اس کی کبھی بھی ضرورت پیش نہیں آئے گی شکیل صاحب کیونکہ میں نے آپ کے ایک پڑوسی کو صفائی کے گواہ کی حیثیت سے آج کی عدالتی کارروائی کے لیے مدعو کررکھا ہے۔ وہ اس وقت کورٹ روم کے باہر میرے بلاوے کا منتظر ہے اور میں آپ کو ''نمٹانے'' کے لیے بے قرار۔''

میں نے لفظ ''نمٹانے'' پر اچھا خاصا دباؤ ڈالا تھا۔ شکیل قریشی کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا تاہم اس نے خود کو مضبوط ظاہر کرتے ہوئے بے پروائی سے کہا۔

''ٹھیک ہے، دیکھ لیتے ہیں۔''

''شکیل صاحب! کیا شازیہ آپ کی سگی بہن ہے؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

وہ اس طرح اچھلا جیسے میں نے بجلی کے ننگے تار کو اس کے ہاتھ سے چھوا دیا ہو لیکن فوراً سے پیشتر اس نے اپنی کیفیت پر قابو پالیا اور خاصے سنبھلے ہوئے مگر برہمی بھرے لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

''آپ کو ہمارے بھائی بہن ہونے پر کوئی اعتراض ہے یا کسی قسم کا کوئی شک ہے؟''

''شک ہے اور نہ ہی اعتراض.....'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''بلکہ میں حیران ہوں..... مجھے یقین ہی نہیں آرہا..... ایسا سوچ کر تو میرا دماغ ہی پھٹنے لگتا ہے کہ..... کہ..... کہ.....!''

''آبجیکشن یور آنر!'' وکیل استغاثہ نے چیخ سے مشابہ آواز میں کہا۔ ''ڈیفنس نے عدالت کا قیمتی وقت برباد کرنے کے لیے نئی طرز کا کوئی ڈراما شروع کردیا ہے۔''

''بیگ صاحب! آسان الفاظ میں وضاحت کریں۔'' جج نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''ایسی کون سی بات ہے جس نے آپ کو ڈسٹرب کر رکھا ہے؟''

''جناب عالی! آپ مجھ سے علم، تجربے اور قانون فہمی کے معاملات میں بہت زیادہ سینئر ہیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں نے تو کہیں پڑھا اور نہ ہی کسی سے سنا کہ پاکستان کے قانون نے سگے بھائی بہنوں کو آپس میں شادی کی اجازت دے دی ہے..... کیا آپ کے علم میں ایسی کوئی خبر ہے؟''

میرے ان الفاظ نے گویا کورٹ روم میں ایک بھونچال ایسی کیفیت پیدا کردی تھی۔ وکیل استغاثہ، انکوائری آفیسر اور جج سمیت ہر شخص الجھن بھری نظر سے مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔ حاضرین عدالت میں چہ میگوئیوں کا سلسلہ چل نکلا تھا اور وہ بھی بہ آواز بلند۔ دیکھتے ہی دیکھتے عدالت کا وہ کمرا مچھلی بازار کا نقشہ پیش کرنے لگا تھا۔

''آرڈر ان مائی کورٹ پلیز.....!'' جج نے چوبی ہتھوڑے کی مخصوص آواز کے ساتھ کہا۔ ''آرڈر..... آرڈر.....!''

یکا یک کورٹ روم میں خاموشی چھا گئی۔ جج نے مجھ سے استفسار کیا۔ ''میرے علم میں تو ایسی قانون سازی نہیں ہے اور ایسا کسی بھی قیمت پر ہو بھی نہیں سکتا کیونکہ یہ ''اسلامی جمہوریہ پاکستان'' ہے۔ یہاں پر اس قسم کے بے ہودہ، مخرب اخلاق اور شرمناک قانون کی کوئی گنجائش نہیں۔''

''یور آنر!'' وکیل استغاثہ نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''آپ ڈیفنس سے یہ تو پوچھیں کہ اس نے ایسی گھٹیا بات کی ہی کیوں؟''

جج نے مجھ سے کہا۔ ''بیگ صاحب! آپ کو اس کی وضاحت کرنا پڑے گی۔''

میں نے ایک پھولا ہوا بھورے رنگ کا لفافہ جج کی میز پر رکھنے کے بعد ٹھوس انداز میں کہا۔ ''جناب عالی! آج سے پانچ سال پہلے شازیہ نے شکیل قریشی کے ساتھ بیاہ رچا کر خود کو شازیہ قریشی بنالیا تھا۔ اس شادی کے بعد یہ دونوں فراڈ میاں بیوی ناظم آباد کے علاقے میں واقع ''فردوس گارڈن'' نامی ایک بلڈنگ میں فلیٹ لے کر کرائے دار کی حیثیت سے رہنے لگے تھے۔ میں نے مقتول کی بیوہ پر جرح کے دوران میں جب اس اپارٹمنٹس بلڈنگ کے بارے میں استفسار کیا تھا تو اس نے کہا تھا، وہ کبھی مذکورہ بلڈنگ میں نہیں گئی بلکہ اس کا کہنا تو یہ تھا کہ اس نے فردوس گارڈن کا نام زندگی میں پہلی بار میری زبان سے سنا ہے۔ یعنی وہ اپارٹمنٹ بلڈنگ جس میں وہ شکیل قریشی کی بیوی کی حیثیت سے لگ بھگ ساڑھے تین سال تک رہائش پذیر رہ چکی تھی۔ مقتول کی بیوہ کی یہ غلط بیانی سنگین جرم کے زمرے میں آتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ شازیہ اور شکیل میں میاں بیوی ہی کا رشتہ ہے۔ باقی سب کچھ ان کے بلڈی بزنس کا تقاضا ہے۔ یہ اسی طرح بھائی بہن بن کر امیر لوگوں کا شکار کرتے ہیں۔ یعقوب مجید ان کا پہلا شکار نہیں تھا۔''

''مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی!'' وکیل استغاثہ کی بپھری ہوئی آواز کمرائے عدالت میں سنائی دی۔ ''میرے فاضل دوست ہوا میں قلعے تعمیر کرنے کے ماہر ہیں۔ یہ کیس اپنے اختتامی مرحلے میں داخل ہوچکا ہے اور موصوف کی نت نئی کہانیاں ہی ختم نہیں ہو رہیں۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔''

''یہی تو ایک کام کی بات ہوئی مائی ڈیئر کونسلر!'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا پھر روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔ ''جناب عالی! اس بھورے لفافے کے اندر شازیہ اور شکیل کے نکاح نامے کی ایک فوٹو کاپی کے علاوہ ان کے چند ویڈنگ فوٹو گرافس بھی ہیں۔ مزید ثبوت کے لیے میں ان کے ایک سابق

پڑوسی عبدالمناف کو صفائی کے گواہ کی حیثیت سے اندر بلانا چاہوں گا۔ عبدالمناف پچھلے پندرہ سال سے ''فردوس گارڈن'' کا رہائشی ہے۔ یہ دونوں نوسرباز میاں بیوی ساڑھے تین سال تک اس کے پڑوسی رہے ہیں۔''

''بیگ صاحب! آپ اپنے گواہ کو بلالیں۔'' یہ کہتے ہوئے جج نے میرا فراہم کردہ وہ بھورا لفافہ کھول لیا۔

ٹھیک دو منٹ میں وٹنس باکس میں میرا گواہ عبدالمناف کھڑا تھا۔ اس دوران میں جج نے شازیہ اور شکیل کے نکاح نامے کی مصدقہ کاپی کے علاوہ ان کی شادی کی وہ تصاویر بھی دیکھ لی تھیں جن میں وہ اسٹیج پر دلہا دلہن کے روپ میں ایک صوفے پر براجمان تھے۔

عبدالمناف کی گواہی نے گویا ان شاطر سازشی میاں بیوی کو سرِعدالت بے نقاب کردیا تھا۔ اس موقع پر میں نے دبنگ انداز میں کہا۔

''جناب عالی! صورتِ حال روزِ روشن کے مانند عیاں ہے۔ معزز عدالت کے سامنے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہوچکا ہے۔ شازیہ قریشی نے شکیل قریشی کی منکوحہ ہوتے ہوئے مقتول سے شادی کرکے سنگین جرم کا ارتکاب کیا تھا اور یہ عورت اس سے پہلے بھی ایسے گھناؤنے کھیل کھیلتی رہی ہے جس میں شکیل قریشی اس کا ساتھی رہا ہے۔ اب کی بار ان لوگوں نے مقتول کے نمک خوار منظور حسین کو بھی خرید کر اپنے ساتھ ملالیا تھا۔ انہیں اپنے منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی جلدی نہیں تھی لیکن مقتول کو کسی طرح ان کے ناپاک عزائم کی بھنک مل گئی۔ ان کی سازباز سے آگاہ ہوتے ہی مقتول نے اپنی وصیت تبدیل کرانے کا فیصلہ کرلیا۔ نئی وصیت کی رو سے مقتول کی موت کے بعد اس کے کاروبار اور جائداد سے شازیہ کو ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں ملنا تھی بلکہ مقتول تو اس بدکردار عورت کو اپنی زندگی سے نکالنے کا حتمی فیصلہ کرچکا تھا۔ مقتول کے وکیل نے ستائیس فروری کو مقتول سے میٹنگ فکس کرلی تھی لیکن بدقسمتی سے مقتول اور اس کے وکیل کے درمیان ہونے والی یہ نہایت ہی اہم ٹیلی فونک گفتگو شازیہ نے چھپ کر سن لی لہٰذا ان کمینے میاں بیوی نے ستائیس فروری سے پہلے ہی مقتول کو لڑھکانے کا فیصلہ کرلیا کیونکہ اگر مقتول اپنی وصیت تبدیل کرانے میں کامیاب ہوجاتا تو شازیہ کے حصے میں کچھ نہ آتا اور مقتول کا سب کچھ اس کی سابق بیوی عاصمہ اور بیٹی نعیمہ کا ہوجاتا۔'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک آسودہ سانس خارج کی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''وصیت میں تبدیلی والے معاملات کے بارے میں مجھے مقتول کے وکیل عارف گیلانی صاحب نے بتایا ہے اور وہی میرے اگلے گواہ بھی ہیں۔ میں معزز عدالت کی اجازت سے ہائی کورٹ کے وکیل جناب عارف گیلانی کو گواہی کے لیے پیش کرنا چاہوں گا۔''

ادھر میری بات ختم ہوئی، ادھر جج کی چونکی ہوئی آواز کورٹ روم میں گونجی۔ ''یہ دونوں..... کہاں چل دیے.....؟''

''قریشی صاحب تو چپ چاپ ہی کھسکنے کے چکر میں دکھائی دیتے ہیں۔'' حاضرین عدالت میں سے ایک خاتون نے بہ آوازِ بلند کہا۔ ''لگتا ہے انہیں ڈیفنس کے دلائل پسند نہیں آئے۔''

''اوہو..... شازیہ قریشی بھی ساتھ ہیں.....'' ایک شخص نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''ایسا محسوس ہوتا ہے یہاں دال نہیں گلی تو کسی اور پارٹی کو بکرا بنانے جارہے ہیں.....''

''کورٹ اسٹاف! روکو انہیں.....!'' جج نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''اگر یہ نکل گئے تو پھر ہاتھ نہیں آئیں گے۔''

ایک مسلح گارڈ نے جج کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اپنی رائفل ان دونوں پر تان لی پھر دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ ''رک جاؤ..... اور ہاتھ اوپر..... اگر کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو ادھر ہی ڈھیر کردوں گا۔''

''وہ..... مجھے ایک ضروری فون کرنے کے لیے..... باہر جانا ہوگا.....'' شکیل قریشی نے بوکھلاہٹ آمیز لہجے میں کہا۔ ''میں پانچ منٹ میں لوٹ آؤں گا.....''

شازیہ لکنت زدہ آواز میں بولی۔ ''اور شکیل کے ساتھ میرا جانا بھی ضروری ہے۔ یہ ایک پرائیویٹ ایشو ہے..... پلیز!''

''تم دونوں نے مقتول یعقوب مجید کا بزنس اور مال و جائداد ہتھیانے کے لیے جو سازباز کی تھی اور اس مقصد کو قبل از وقت حاصل کرنے کی غرض سے ہنگامی بنیادوں پر جس طرح میرے مؤکل کاشف علی کو قربانی کا بکرا بنانے کی کوشش کی تھی، وہ سب عدالت کے سامنے کھل چکا ہے.....'' میں نے ان مکروہ کردار میاں بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے نفرت انگیز لہجے میں کہا۔ ''اب تم لوگ اپنے تمام پرائیویٹ اور گورنمنٹل ایشوز کو اپنی مرضی سے نمٹانے کا اختیار نہیں رکھتے۔ اس کمرے سے تم دونوں پولیس کسٹڈی میں جاؤ گے۔ اس کے بعد براستہ عدالت..... زندگی بھر کے لیے جیل کی سنگلاخ دیواروں کے پیچھے تمہارا دائمی مسکن ہے

اور..... تمہارے ہاتھ اپنے ضمیر کو فروخت کرنے والے منظور حسین کا ٹھکانا بھی ادھر ہی ہے۔'' پھر میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''دیٹس آل یور آنر.....!''

جج نے مسلح گارڈ اور انکوائری آفیسر کی طرف دیکھتے ہوئے انتہائی غصیلے لہجے میں مشترکہ اعلامیہ جاری کردیا۔

''اریسٹ دیم!''

اگلے ہی لمحے شازیہ قریشی اور شکیل قریشی کو گرفتار کرلیا گیا۔ جج نے تفتیشی افسر سے کہا۔ ''مقتول کے نمک حرام ملازم منظور حسین کو بھی ان فراڈ جوڑے کے ساتھ ہی زیر تفتیش رکھ کر اس مقدمے کا نیا چالان جلد از جلد پیش کیا جائے۔ اگلی پیشی تک عدالتی کارروائی کو ملتوی کیا جاتا ہے۔''

اس موقع پر وکیل استغاثہ کی حالت دیکھنے لائق تھی۔ اس کے چہرے پر کچھ اس قسم کے تاثرات تھے جیسے اس کے ہاتھوں کے سارے میاں مٹھو ایک ساتھ پھُر سے اڑ گئے ہوں۔

☆☆☆

کاشف علی کی باعزت بریت کے ایک ہفتے بعد انور شیرازی مجھ سے ملنے آفس آیا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے کہا۔

''تو آپ ایک اور مقدمہ جیت گئے اور وہ بھی عارف گیلانی کی گواہی کے بغیر ہی۔''

''یہ تو ہماری خوش قسمتی اور ان ذلیل میاں بیوی کی بدبختی کہ حقیقتِ حال جج کی سمجھ میں آگئی۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''گیلانی صاحب کی گواہی کی گنجائش ہی نہیں نکلی اور اگر ان کی ضرورت پیش آجاتی تو میں کون سا پیچھے ہٹنے والا تھا۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے، میں نے اس حوالے سے سارا بندوبست کر رکھا تھا۔''

''جی، میں جانتا ہوں۔'' وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''آپ کا انتظام زبردست تھا لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔''

''کون سی بات شیرازی صاحب؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''یہ سوال کئی بار میرے ذہن میں ابھرا ہے۔'' وہ بدستور پُرخیال انداز میں بولتا چلا گیا۔ ''لیکن میں نے سوچا، دورانِ کیس میں آپ کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ جب اس مقدمے کا فیصلہ آجائے گا تو میں آپ کے سامنے یہ سوال ضرور رکھوں گا۔''

''تو پھر ''بسم اللہ'' کریں جناب!'' میں نے کہا۔

''یہ ٹھیک ہے کہ آپ نے جیسا کہا، میں نے آپ کے ساتھ تعاون کیا.....'' وہ میرے چہرے پر نگاہ جما کر مستفسر ہوا۔ ''میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کو شازیہ قریشی پر شک کیوں ہوا تھا؟''

''چند سال پہلے میری رہائش ناظم آباد کے علاقے میں تھی۔'' میں نے ایک آسودہ سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''کئی بار میرا ''فردوس گارڈن'' میں بھی جانا ہوا تھا اور میں نے شازیہ کو ادھر ہی دیکھا تھا۔ وہ ایسے حسنِ بلاخیز کی مالک ہے کہ اس کی دلکش صورت میری یادداشت سے چپک کر رہ گئی۔ شازیہ کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ میں اس کا شکل آشنا ہوں۔'' سانس ہموار کرنے کے لیے میں نے لمحاتی توقف کیا پھر اپنی وضاحت مکمل کرتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔

''پیشیِ اول پر جب شازیہ مجھے مقتول یعقوب مجید کی بیوہ کی حیثیت سے عدالت میں نظر آئی تو میرے ذہن نے چیخ کر کہا۔ ''یہ عورت گڑبڑ ہے۔'' بس پھر میں اس پوائنٹ کو ذہن میں رکھ کر اس کیس کی فائل کا بغور مطالعہ کرتا چلا گیا۔ اس کے بعد کڑی سے کڑی ملتی گئی۔ جب یہ کڑیاں ایک زنجیر کی صورت اختیار کر گئیں تو میں نے آپ کو ان میاں بیوی کی کنڈلی نکالنے کا کام سونپا تھا۔''

''آپ کا مشاہدہ لاجواب ہے بیگ صاحب!'' وہ توصیفی نظر سے مجھے تکتے ہوئے بولا۔ ''آپ نے برسوں پہلے دیکھی ہوئی شازیہ کو یاد رکھا۔''

میں نے معنی خیز انداز میں استفسار کیا۔ ''اور میرے حافظے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟''

''آپ کا مشاہدہ لاجواب، تجربہ باکمال اور حافظہ دھانسو قسم کا ہے بیگ صاحب!'' وہ ستائشی انداز میں بولا۔

''اسی دھانسو حافظے میں ایک یہ بات بھی محفوظ ہے کہ.....'' میں نے ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالتے ہوئے نیم شکایتی لہجے میں کہا۔ ''آپ نے ابھی تک میری رعایتی فیس ادا نہیں کی۔''

اس نے ایک بلند آہنگ قہقہہ لگایا اور نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ سے کوئی نہیں جیت سکتا۔ آپ بھی نا.....!''

میں اس کے تبصرے پر زیرلب مسکرانے لگا۔

(تحریر: حسام بٹ)

کبھی کبھی بے خبری میں انسان ایسا کام کر جاتا ہے جس کے اثرات تمام زندگی کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں... وہ بھی نہیں جانتی تھی کہ اچھی نیت سے کیا جانے والا یہ کام اس کے حق میں کس قدر مہلک ثابت ہوگا مگر ہائے ری لاعلمی... جس نے مرتے دم تک سچ کو اپنی چادر میں چھپائے رکھا۔

ایک معصوم مجرم کے بھیانک قصور کا عبرت ناک انجام

قصوروار

شاہ زین رضوان

1952ء میں لندن اسموگ کی لپیٹ میں تھا لیکن کلائیو ولینڈ کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ اپنی ماں اور بہن ہیزل کے ساتھ اس مہم جوئی پر آمادہ تھا اور یہ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا کہ زرد کہر نے مکانوں، باڑھ اور سڑکوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے کہ ایک قدم کے فاصلے سے بھی کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ان کی ماں نے دونوں بچوں کی ناک پر اسکارف لگا رکھا تھا لیکن کہر اتنی شدید تھی کہ وہ آدھے راستے سے واپس آ گئے۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اسموگ سے بچوں

کے پھیپھڑے متاثر ہوں۔ اسی لیے وہ انہیں اسکول نہیں بھیج رہی تھی اور کلائیو اس پر خوش نہیں تھا۔ ان کا باپ کینیڈا میں تھا اور بچوں کے مزے آئے ہوئے تھے کیونکہ ماں اور نانی نے اسے کھلی چھوٹ دے دی تھی کہ وہ اپنی پسندیدہ کتابیں پڑھے۔ ماڈل ٹرین سیٹ سے کھیلے اور جگ سا پزل میں وقت گزارے۔

اس وقت وہ میز پر بیٹھا اسٹیم انجن کی تصویر بنا رہا تھا۔ دسمبر کی سرد ہوا کو روکنے کے لیے پردے گرے ہوئے تھے اور کمرے میں لیمپ کی زرد روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی بہن آتش دان کے پاس قالین پر بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھی جبکہ ماں اور نانی آرام کرسی پر بیٹھی چائے پینے کے ساتھ باتیں بھی کر رہی تھیں۔ کلائیو اپنی جگہ پر بیٹھا ان کی ہر بات سن رہا تھا۔ ماں مسٹر ایشام کے بارے میں بات کر رہی تھی جو اس کے بہترین دوست جیفرے کا باپ تھا۔ وہ لوگ دس نمبر میں رہتے تھے۔ اس کا باغ بچوں کے کھیلنے کے لیے بہترین تھا۔ کلائیو نے اپنی ماں کی آواز میں کاٹ محسوس کی۔ وہ اسی لہجے میں مسٹر جونز سے بات کرتی تھی جس سے اسے شکایت تھی کہ وہ ہمیشہ کم سامان دیتا ہے۔

''ایسا لگتا ہے کہ حادثے کے بعد ہیرالڈ دن بہ دن مشکل ہوتا جا رہا ہے۔''

اولیو رونالڈ اپنی جگہ سے اٹھی اور سائڈ بورڈ سے ٹی پاٹ اٹھا کر اپنی اور ماں کی پیالیوں میں دوبارہ چائے بھری پھر اس نے ٹی پاٹ واپس اپنی جگہ پر رکھ دیا۔

جین نے اس کی مدد کرنے کی کوشش کی لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اس نے کہا۔ ''وہ اس کے لیے جو کچھ کرتی ہے اس پر بھی اسے غصہ آ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب اس نے باغ کی صفائی کرنے میں اس کی تھوڑی سی مدد کی تو وہ اس پر بھی چلّانے لگا۔'' اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے سرد آہ بھری۔ ''مجھے امید ہے کہ وہ حادثہ اس کے اسٹروک کا سبب نہیں تھا۔''

جیفرے کا باپ اس وقت ہارلینڈ ویلڈ اسٹون اسٹیشن پر موجود تھا جہاں تین ٹرینیں آپس میں ٹکرائی تھیں۔ یہ حادثہ کئی ہفتے قبل رش کے اوقات میں ہوا تھا۔ ایشام اپنے کام پر جا رہا تھا جب لوکل ٹرین اسٹیشن پر کھڑی ہوئی بوگیوں سے ٹکرائی۔ نانی کے کہنے کے مطابق ایشام کی قسمت تھی کہ زندہ بچ گیا کیونکہ اس حادثے میں سو سے زیادہ افراد ہلاک ہوئے تھے اور ہر ایک کا یہی کہنا تھا کہ زمانۂ امن میں اس سے زیادہ بدترین حادثہ نہیں دیکھا۔ کلائیو اور ہیزل بھی اپنی ماں کے ساتھ جائے وقوعہ پر گئے تھے۔ وہ تینوں اسٹیشن پر بوگیوں کا مخروطی مینار دیکھ کر حیران رہ گئے۔

کلائیو کی نانی سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''مانا کہ وہ بہت ہولناک حادثہ تھا لیکن اس کے تو گھر میں مسائل ہیں۔'' وہ اپنے آپ کو جیفرے کی فیملی پر اتھارٹی سمجھتی تھی کیونکہ اس کی مسز کوبرن سے بڑی گہری دوستی تھی۔ وہ بوڑھی عورت ایشام کے مکان سے متصل پورشن میں رہتی تھی اور ملحقہ دیوار ہونے کی وجہ سے اسے ایشام کے گھر میں ہونے والی ہر بات کی خبر رہتی تھی۔

اس نے اپنی چائے ختم کی اور پیالی دوبارہ طشتری میں رکھ دی۔ ''اگر ہیرالڈ یہ روش جاری رکھتا ہے۔'' اس نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''تو وہ جین کو کہیں دور لے جائے۔ جیسا اس نے اپنی پہلی بیوی کے ساتھ کیا تھا۔''

اولیو نے ایک اور سرد آہ بھری۔ ''جب جنگ ختم ہوئی تو ہم سب بہت خوش تھے لیکن اب ہمیں دیکھو۔ ہم سات سال سے یہ عذاب بھگت رہے ہیں۔ اس کے بعد وہ ہولناک حادثہ اور اب یہ خوفناک اسموگ۔ یہ کب ختم ہوگا؟''

کلائیو کو اسموگ کے بارے میں کوئی پریشانی نہیں تھی بلکہ وہ چاہتا تھا کہ یہ مزید ایک ہفتہ جاری رہے تاکہ وہ کرسمس کے موقع پر ہونے والی خاموش تمثیل دیکھنے جا سکیں۔ اس میں اداکار کچھ بولے بغیر اشاروں اور بدن کی بولی سے کردار نگاری کرتے تھے۔ اس کے چچا کوڈک کمپنی میں کام کرتے تھے اور ہر سال اس کے ملازمین اس خاموش تمثیل میں حصہ لیتے تھے۔ اس سال الٰہ دین پر ڈراما ہونا تھا۔ اس میں انکل جم . . . اہم رول پلے کر رہے تھے اور آنٹی پیٹی نے پورے خاندان کے لیے ٹکٹ خرید لیے تھے۔ جیفرے بھی وہ شو دیکھنے جاتا کیونکہ اس کی بڑی بہن سیلی ایشام کوڈک میں کام کرتی تھی اور وہ اس شو میں شہزادی کا رول پلے کر رہی تھی۔

سیلی بہت ہی خوبصورت، سنہری بالوں والی لڑکی تھی۔ دراصل وہ جیفرے کی سوتیلی بہن اور مسٹر ایشام کی پہلی بیوی کے بطن سے تھی اور اپنے دوسرے بہن بھائیوں سے عمر میں کافی بڑی تھی۔ جیفرے کی عمر نو سال تھی جبکہ اس کی دوسری بہن پیرو سات سال کی تھی۔ اس لیے سترہ سالہ سیلی ان کے مقابلے میں بہت بڑی نظر آتی تھی۔ وہ بہت زندہ دل اور پرجوش تھی لیکن اس کے ساتھ نرم دل بھی تھی۔ اس نے کلائیو اور ہیزل کی دیکھ بھال میں مدد کی جب ان کی ماں کو فلو ہو گیا تھا اور جب ایک رات کلائیو نے سوتے میں ڈراؤنا خواب دیکھا تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ تب سیلی نے اسے اوولٹین بنا کر

TAGPK.COM

دیا اور بتایا کہ بچپن میں وہ بھی ڈراؤنا خواب دیکھ کر جاگ جاتی تھی پھر وہ بڑے صبر اور سکون کے ساتھ اس کے پاس بیٹھی رہی جب تک کہ وہ دوبارہ نہ سو گیا۔ کلائیو اسے پسند کرتا تھا اور اس کا خیال تھا کہ سیلی اتنی خوبصورت ہے کہ فلم اسٹار بن سکے۔

کلائیو اور ہیزل کو ایشام کے گھر کھیلنا اچھا لگتا تھا۔ سڑک پر واقع بیشتر مکانات میں صاف ستھرے لان اور پھلوں سبزیوں کے باغات تھے لیکن ایشام کے مکان میں ایسا کوئی باغ نہیں تھا۔ اس کے بجائے وہاں دو بڑے صنوبر کے درخت تھے جن کی شاخیں نیچے کی طرف جھکی ہوئی تھیں جن پر چڑھ کر وہ جھولا جھولتے۔ جب کبھی جین ایشام نے اس جگہ کو صاف کر کے سبزیوں اور پھلوں کا باغ لگانے کی بات کی تو بچے رونا شروع کر دیتے۔ اس طرح یہ چھوٹا سا جنگل اپنی جگہ پر موجود رہا۔

کلائیو کو اس وقت بھی مایوسی ہوئی جب پانچ دن بعد دھند چھٹ گئی اور اس کے اسکول کی چھٹیاں اچانک ختم ہو گئیں۔ بہرحال اس کی وجہ سے خاموش تمثیل جانے کا پروگرام متاثر نہیں ہوا اور وہ لوگ جمعے کی شام آنٹی پیٹی اور ان کی بیٹی سے ملنے کوڈک پہنچ گئے۔ ہیزل کو اپنے نئے کرسمس ڈریس کی وجہ سے الجھن ہو رہی تھی کیونکہ اسے پھولی ہوئی آستینیں پسند تھیں لیکن ماں نے اسے زبردستی یہ لباس پہننے پر مجبور کیا کیونکہ وہ آنٹی پیٹی نے تحفے میں دیا تھا۔ کلائیو کو ڈر تھا کہ کہیں ہیزل کی وجہ سے ان کی شام خراب نہ ہو جائے لیکن جیسے ہی پردہ اٹھا اور ناچنے والی لڑکیاں سلک کے ملبوسات پہنے اسٹیج پر نمودار ہوئیں تو ہیزل کی مسکراہٹ لوٹ آئی۔ وہ سب لوگ سیلی ایشام کی تعریف کر رہے تھے جس نے شہزادی کا رول پلے کیا۔

''اس کی خوبصورت ٹانگوں پر جالی دار پاجامہ بہت اچھا لگ رہا تھا۔'' آنٹی پیٹی نے تبصرہ کیا۔ وہ شو ختم ہونے کے بعد انکل جم کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔

''میں شرطیہ کہتی ہوں کہ انکل ایشام ایسا نہیں سوچ رہے ہوں گے۔'' ان کی بیٹی ایملی نے کہا۔ وہ ایشام فیملی کو اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ تقریباً سیلی کی ہم عمر تھی اور اسی کی کلاس میں پڑھتی تھی۔ ''اگر انکل کا بس چلے تو وہ سیلی کو سر سے پاؤں تک کینوس میں ڈھانپ دیں۔''

''کیا واقعی؟ ایملی! یہ تم کیا فضول باتیں کر رہی ہو۔'' آنٹی پیٹی نے کہا۔

''یہ فضول بات نہیں ہے۔ سیلی نے مجھے خود بتایا ہے۔ اس کے ڈیڈی نے اس پر ہر طرح کی پابندیاں لگا دی ہیں کیونکہ وہ اس کے نئے بوائے فرینڈ کو پسند نہیں کرتے اور اگر وہ بحث کرتی ہے تو اس پر چلانے لگتے ہیں۔ سیلی اتنا تنگ آ چکی ہے کہ وہ گھر سے جانا چاہ رہی ہے۔''

کلائیو، سیلی کے بوائے فرینڈ کو جانتا تھا اور وہ اس سے ایک مرتبہ مل چکا تھا جب وہ اور ہیزل، ایشام کے مکان میں کھیل رہے تھے۔ سیلی ان بچوں کی نگرانی کر رہی تھی کیونکہ مسٹر اور مسز ایشام ایک پارٹی میں گئے ہوئے تھے۔ ان کے جاتے ہی ایڈی وہاں آ گیا۔ اس نے بچوں کو کچھ پیسے دے کر ٹافیاں لینے بھیج دیا تاکہ وہ سیلی کے ساتھ اکیلے میں کچھ وقت گزار سکے اور جب سیلی نے شکایت کی کہ اس کا لاکٹ باغ کے عقبی حصے میں کہیں گر گیا ہے تو جیمز نے بڑی سنگدلی سے اس پر طنز کیا۔ وہ اور کلائیو اندازہ لگا سکتے تھے کہ سیلی اور ایڈی نے ایسی کیا حرکت کی ہوگی کہ لاکٹ ڈھیلا ہو کر گر پڑا۔ کلائیو واقعی ایڈی کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ سیلی کے باپ کے پاس پریشان ہونے کی معقول وجہ ہے۔ آنٹی پیٹی نے بھی مسٹر ایشام کی حمایت کی۔

''سیلی کا باپ دل سے اس کی بہتری چاہتا ہے۔'' انہوں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''ممکن ہے کہ اس کے پاس اس لڑکے کو ناپسند کرنے کی کوئی معقول وجہ ہو۔''

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔'' ایملی نے کہا۔ ''دراصل ایڈی نوٹنگ ہل میں رہتا ہے اور مسٹر ایشام کے خیال میں وہ پسماندہ علاقہ ہے۔''

''ایملی!'' آنٹی پیٹی کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

''میں نے کچھ غلط نہیں کہا۔ سیلی کا باپ تکبر خور ہے اور وہ غریبوں کو حقیر سمجھتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ سیلی کا انجام بھی اس کی ماں جیسا ہوگا۔''

گھر واپس آتے ہوئے کلائیو اسی بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس نے اپنی ماں اور نانی کو مسٹر ایشام کی پہلی بیوی کے بارے میں کئی مرتبہ باتیں کرتے ہوئے سنا تھا۔ اس کا نام مارجوری تھا اور وہ بھی سیلی کی طرح جوان اور زندہ دل سنہری بالوں والی عورت تھی۔ نانی کے کہنے کے مطابق وہ بے چین رہا کرتی تھی جس سے کلائیو نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اس کی دوسرے مردوں سے دوستی تھی جن میں ایک رائل ائرفورس کا خوش وضع پائلٹ بھی تھا۔ وہ اپنی فیملی کو چھوڑ کر اس کے ساتھ چلی گئی، جب سیلی صرف چار برس کی تھی۔ کلائیو سمجھ سکتا تھا کہ مسٹر ایشام کو سیلی کی طرف سے بھی یہی

پریشانی تھی کہ وہ بھی اپنی ماں کی طرح گھر چھوڑ کر چلی جائے گی لیکن اس کا خیال تھا کہ مسٹر ایشام کو ہر وقت سیلی پر ناراض نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اس طرح وہ نہ چاہتے ہوئے بھی جلد ہی گھر چھوڑ کر چلی جائے گی۔

ویک اینڈ پر سیلی اور اس کے باپ کے درمیان جھگڑے نے شدت اختیار کرلی۔ اتوار کے روز نانی آنے والے فٹ بال میچز پر شرطیں لگا رہی تھی۔ یہ ایک طرح کا سٹہ تھا جس میں جیتنے والی ٹیم پر شرط لگائی جاتی تھی جبکہ ماں ریڈ یوسن رہی تھی لہٰذا کلائیو اور ہیزل، ایشام کے گھر کھیلنے چلے گئے لیکن ایک گھنٹے کے اندر ہی ان کی واپسی ہوگئی۔ وہ سیدھے سٹنگ روم میں آئے۔ ان کے چہرے جوش سے تمتما رہے تھے۔

''ہمیں گھر بھیج دیا گیا۔'' کلائیو نے کہا۔ ''مسٹر ایشام واقعی بہت غصے میں ہیں۔''

اولیو نے ریڈیو بند کیا اور بچوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تم نے کیا کیا تھا؟''

ہیزل کافی برہم نظر آرہی تھی۔ ''ہم نے کچھ نہیں کیا۔ وہ سیلی پر ناراض ہو رہے ہیں۔''

کلائیو نے وضاحت کی۔ ''سیلی اپنے دوست ایڈی سے ملنے گئی۔ انہیں ٹیمی شو دیکھنے جانا تھا لیکن اس کے بعد وہ گھر واپس نہیں آئی۔ وہ رات کو ایڈی کے گھر پر رہی اور آج واپس آئی جب ہم وہاں پہنچے۔''

نانی نے اخبار اپنی ران پر رکھا اور بولی۔ ''ظاہر ہے کہ ہیرالڈ کو غصہ آیا ہوگا۔''

''اس میں سیلی کی کوئی غلطی نہیں۔'' کلائیو نے وضاحت کی۔ ''وہ سنیما کے باہر کھڑی ایڈی کا انتظار کر رہی تھی کہ ایک اجنبی شخص نے اس سے باتیں شروع کردیں۔ ایڈی کے آنے پر وہ وہاں سے چلا گیا لیکن سیلی نے اسے دوبارہ دیکھا جب وہ گھر جانے کے لیے بس اسٹاپ پر کھڑی ہوئی تھی۔ وہ اس آدمی کو دیکھ کر خوفزدہ ہوگئی اور ایڈی کے ساتھ اس کے گھر چلی گئی۔ تاہم وہ اپنے باپ کو مطلع نہ کرسکی کیونکہ ایڈی کے گھر میں فون نہیں ہے اور وہ پبلک فون کی تلاش میں دوبارہ گھر سے باہر نہیں جاسکتی تھی۔''

نانی نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''سیلی کو محتاط ہونا چاہیے۔ اسی ہفتے ایک اور عورت بھی لاپتا ہوئی ہے اور میں شرطیہ کہتی ہوں کہ اس کی لاش کسی گڑھے میں پڑی ہوئی ہوگی۔'' اس نے کلائیو کو قہر آلود نظروں سے دیکھا جیسے وہ ذاتی طور پر اس کا ذمے دار ہو۔ ''سنا ہے کہ کوئی دیوانہ عورتوں پر حملے کر رہا ہے اور ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ وہ اجنبی شخص وہی دیوانہ ہوسکتا ہے۔ سیلی کو پولیس میں اس کی رپورٹ کرنی چاہیے۔'' پھر وہ اپنی بیٹی کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ ''ہیرالڈ نے نوٹنگ ہلز کے بارے میں ٹھیک ہی کہا تھا۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں ٹموتھی ایونز نے اپنی بیوی اور بچی کو قتل کیا تھا۔''

کبھی کبھی کلائیو سوچتا کہ نانی اخبار پڑھنے میں اتنا زیادہ وقت نہ لگایا کرے۔ اس کی بیان کردہ خبریں سننے کے بعد آدمی خوفزدہ ہوکر گھر سے باہر نکل جائے۔

دو ہفتے اور گزر گئے۔ کرسمس کی شام اولیو اور اس کی ماں دونوں بچوں کو ریجنٹ اسٹریٹ کی روشنیاں دکھانے کے لیے لندن لے گئیں۔ جب وہ ویلڈ اسٹون اسٹیشن پہنچے تو انہوں نے پلیٹ فارم پر سیلی کو دیکھا۔ وہ ایڈی سے ملنے جارہی تھی۔ اس نے انہیں بتایا کہ اس کا باپ سے ایک اور جھگڑا ہوا ہے کیونکہ اس نے اسے مجبور کیا کہ وہ پولیس اسٹیشن جاکر اس آدمی کے خلاف رپورٹ درج کروائے جس نے سنیما کے باہر اس سے بات کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے ڈیسک سارجنٹ کو واقعے کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ اس کا باپ ہمیشہ اس کے بارے میں غلط سوچتا ہے کیونکہ اس کی ماں کئی برس پہلے گھر چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ اس پر ہیرالڈ ناراض ہوگیا کہ اس نے گھر کی باتیں باہر کیوں بتائیں۔ سیلی نے کہا وہ نہیں چاہتی تھی کہ ایک بے گناہ شخص مشکل میں پڑ جائے لیکن کلائیو سوچنے لگا کہ کیا واقعی کوئی ایسا شخص موجود ہے۔ شاید سیلی نے یہ فرضی کہانی گھڑی ہوتا کہ ایڈی کے گھر رات کو رکنے کا جواز بن سکے۔

اسٹیشن پر بہت رش تھا اور ٹرین فوراً ہی بھر گئی لیکن سیلی کوچ کے عقبی حصے میں اولیو اور ہیزل کے درمیان جگہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ کلائیو اگلی سیٹ پر نانی کے ساتھ بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی وہ پکاڈلی سرکس پہنچ گئے اور بقیہ دوپہر انہوں نے ونڈو شاپنگ کرنے، روشنیاں دیکھنے اور ٹرافیلگر اسکوائر پر موجود گلوکاروں کا گانا سننے میں گزاری۔ وہ چائے پینے کے لیے لائنز کارنر ہاؤس گئے جہاں نانی کو اس کی ایک باتونی دوست مل گئی۔ وہ ''ماؤس ٹریپ'' نامی ڈراما دیکھنے لندن آئی تھی۔

''میں جانتی ہوں کہ یہ ڈراما ابھی شروع ہوا ہے لیکن یہ نہیں معلوم کہ کب تک چلے گا۔'' وہ بن بلائے مہمان کی طرح ان کے پاس بیٹھ گئی اور برطانیہ میں بڑھتے ہوئے جرائم کے بارے میں نان اسٹاپ گفتگو شروع کردی۔

''میری بہن لٹی نے پرسوں اپنی دوست کو فون کیا تو اس کے شوہر نے بتایا کہ وہ گھر چھوڑ کر کہیں اور چلی گئی ہے کیونکہ اسے اپنے علاقے کے لوگوں سے خوف آنے لگا تھا۔ کیا تم نے پہلے کبھی ایسی بات سنی؟''

کلائیو کا دل چاہا کہ یہ خواتین کوئی خوش کرنے والی بات بھی کریں لیکن اس کی یہ خواہش پوری نہ ہوئی اور وہ دونوں مسلسل دل دہلا دینے والی باتیں کرتی رہیں۔ کھانا ختم ہونے پر اس نے سکون کا سانس لیا۔ وہاں سے اٹھنے کے بعد وہ اور ہیزل، نانی کے ساتھ نیوزریل سنیما میں چلے گئے جبکہ ماں آخری لمحات کی شاپنگ کے لیے چلی گئی۔ پوری نیوزریل کے دوران ہیزل بے چین رہی البتہ نئی خوبصورت ملکہ کی تصویریں دیکھ کر اس کی بے چینی کچھ کم ہوگئی لیکن اسے کارٹون پسند آئے جبکہ کلائیو کو پوری نیوزریل ہی اچھی لگی۔ اس میں دم دار ستارے کے مناظر بہت دلچسپ تھے۔ اسی طرح امریکا میں تیار کی گئی ایک نئی کار کی کہانی بھی اسے پسند آئی لیکن جیسے ہی افریقا میں ماؤ ماؤ کی بغاوت کی تصویریں دکھائی گئیں تو نانی انہیں لے کر سنیما سے باہر آ گئی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ہیزل ساری رات ڈراؤنے خواب دیکھتی رہے۔

وہ تھوڑا اور آگے پہنچے جہاں ان کی ملاقات ماں سے ہوئی اور وہ گھر جانے کے لیے ٹرین میں سوار ہو گئے۔ ہیزل کو فوراً ہی نیند آ گئی لیکن کلائیو کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھتا رہا۔ جب ٹرین پیڈنگٹن سے گزری تو اسے سیلی کا خیال آیا اور وہ سوچنے لگا کہ کیا اس بار وہ بہ حفاظت گھر پہنچ گئی ہوگی لیکن گھر پہنچتے ہی دوست کی بہن کا خیال دل سے نکل گیا اور وہ سب بستر پر دراز ہو گئے تاکہ صبح جلد بیدار ہو کر کرسمس کا استقبال کر سکیں۔ کلائیو نے تکیے پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اب اس کے دماغ میں ایک ہی بات تھی کہ کرسمس کی صبح اس کے لیے کیا لے کر آتی ہے۔

صبح کرسمس ٹری کے نیچے وہی تحفے رکھے ہوئے تھے جو دونوں بچے چاہ رہے تھے۔ کلائیو کو ماں نے ''ایگل اینول'' اور نانی نے ''فیمس فائیو'' کا نیا ایڈیشن دیا۔ اس کے علاوہ ڈیڈی نے کینیڈا سے جگ ساپزل بھیجا تھا جس میں شاہی پولیس کے سپاہی گھوڑوں پر سوار تھے جبکہ ہیزل کو ''موفن وی فول'' کی کٹھ پتلی تحفے میں ملی۔ اس نے یہ کھلونا ویلڈ اسٹون کی ایک دکان میں دیکھا تھا اور اسے اسی کی خواہش تھی۔

گیارہ بجے کے قریب جیمز بھی آ گیا۔ ''ڈیڈی بہت غصے میں ہیں۔'' اس نے کہا۔

''اوہ، زبردست!'' اس کی نظر کلائیو کو تحفے میں ملی ہوئی کتابوں پر پڑی۔ اس نے ایک کتاب کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا میں یہ پڑھنے کے لیے لے سکتا ہوں؟''

کلائیو نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''تمہارے ڈیڈی غصے میں کیوں ہیں؟'' اس نے پوچھا۔ ''کیا سیلی گزشتہ رات بھی گھر سے باہر رہی؟''

''نہیں، لیکن وہ بہت دیر سے گھر آئی تھی۔ اس نے خاموشی سے اپنے کمرے میں جانے کی کوشش کی لیکن ڈیڈی اس کا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے سیلی سے کہا کہ پولیس عورتوں کو خبردار کر رہی ہے کہ وہ رات کو تنہا گھر سے نکلنے میں احتیاط کریں اور اگر ایڈی کو واقعی اس کا خیال ہے تو وہ گھر سے باہر اسے بلانے کے بجائے یہیں اس سے مل لیا کرے۔''

جیمز نے کلائیو کا نیا انجن اٹھایا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ''آؤ، تمہارے ٹرین سیٹ کے ساتھ کھیلیں۔ ممی نے میرا سیٹ کہیں چھپا دیا ہے کیونکہ ان کا کہنا ہے کہ اسے دیکھ کر ڈیڈی کا حادثہ یاد آ جاتا ہے۔''

کچن کا دروازہ کھلا اور نانی نے اس میں سے اپنا سر باہر نکالا۔ اس کی نظریں جیمز پر جم گئیں۔ ''تمہارے ڈیڈی نے نوٹنگ ہل کے بارے میں ٹھیک ہی کہا تھا۔'' وہ غرائی۔ ''تم کلائیو سے معلوم کر سکتے ہو کہ ہم نے گزشتہ روز کیا کہانی سنی۔'' اس نے جذباتی انداز میں سر ہلایا اور واپس کچن میں چلی گئی۔

اس کے جاتے ہی جیمز ہال سے نکل کر اوپر جانے لگا۔ کلائیو اس کے پیچھے تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ لائنز کارٹر ہاؤس میں ملنے والی عورت نوٹنگ ہل کے بارے میں بات کر رہی تھی۔ اس نے صرف سڑک کا نام لیا تھا۔ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ وہ کس جگہ کا ذکر کر رہی تھی۔ شاید اس نے ریلنگٹن پیلس کا نام لیا تھا۔ کلائیو کو امید تھی کہ ایڈی اس کے آس پاس کہیں رہتا ہوگا۔

نیا سال شروع ہوا تو زندگی اپنے معمول پر آ گئی اور وہ باقاعدگی سے اسکول جانے لگے البتہ ویک اینڈ پر وہ خوب مزے کرتے۔ کلائیو نے ایک ناکارہ پرام اور پرانے پردوں کے کپڑے سے ایک ٹوائے تھیٹر بنانے میں ہیزل کی مدد کی اور جیمز کے ساتھ مل کر اپنے بیڈروم میں ایک بڑا ٹرین اسٹیشن بنایا۔ سیلی ایشام نے ایڈی سے قطع تعلق کر لیا اور وقتی طور پر یہ معاملہ دب گیا۔

بہرحال بات یہیں ختم نہیں ہوئی۔ مارچ کے آخر میں اسکول سے گھر جاتے ہوئے کلائیو اور ہیزل، مسٹر اسمتھ کے

اسٹور پر رکے تاکہ گول ٹافیاں، کرکرے اور ہفت روزہ ''کامکس'' لے سکیں جو مسٹر اسمتھ ہمیشہ ان کے لیے الگ کر کے رکھتے تھے۔ وہ ایک خوش مزاج انسان تھے اور بچوں سے باتیں کر کے خوش ہوتے۔ انہوں نے بنڈل کھولا اور کاؤنٹر پر کامکس رکھتے ہوئے بولے۔ ''یہ رہے تمہارے رسالے۔''

انہوں نے کلائیو کا اترا ہوا چہرہ دیکھا اور بولے۔ ''تمہیں کیا پریشانی ہے لڑکے؟''

کلائیو نے کونے میں اسٹینڈ پر لٹکے ہوئے اخبار کی سرخی کی طرف اشارہ کیا۔ ''نوٹنگ ہلز مرڈر!''

مسٹر اسمتھ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''یہ ایک دردناک کہانی ہے۔'' انہوں نے اپنی آواز نیچی کی اور رازداری سے بولے۔ ''تم اپنی بہن کو اس ہفتے کے اخبار مت پڑھنے دینا ورنہ اسے ڈراؤنے خواب آئیں گے۔ سنا ہے کہ اس مکان سے مزید لاشیں مل رہی ہیں۔''

جب کلائیو اور ہیزل گھر پہنچے تو کچن کا دروازہ بند تھا لیکن نانی کی تیز اور کرخت آواز ہال میں بھی سنائی دے رہی تھی۔ ''بہتر ہے کہ تم ان بچوں پر نظر رکھو اولیو، اور تم بھی رات میں باہر نہ جاؤ۔ کرسٹی اسی علاقے میں کہیں موجود ہے۔ جب تک وہ پکڑا نہیں جاتا، کوئی بھی محفوظ نہیں ہے۔ ہم سب اپنے بستروں میں ہی مارے جاسکتے ہیں۔''

کلائیو خوش تھا کہ اس کی بہن اپنے کھلونوں سے کھیلنے کے لیے اوپر چلی گئی ہے۔ اگر وہ نانی کی باتیں سن لیتی تو ہر وقت پردوں کے پیچھے، الماری میں اور بستر کے نیچے جھانکتی رہتی لیکن نانی زیادہ دیر تک کرسٹی کا نام لے کر بچوں کو نہ ڈرا سکی۔ صرف ایک ہفتے بعد پولیس نے اسے گرفتار کرلیا۔

''میں گزشتہ روز گروسری سے واپس آتے ہوئے کانسٹیبل وائٹ سے ملی تھی۔'' نانی نے سوئیٹر بنتے ہوئے اولیو سے کہا جو اسٹوو پر شوربا بنا رہی تھی۔ ''اس نے مجھے بتایا کہ کرسٹی چالیس کی دہائی سے عورتوں کو قتل کر رہا تھا۔ ذرا سوچو کہ مقتولین کی تعداد کتنی ہوگی؟''

اولیو نے اپنی آنکھیں گھمائیں۔ اس نے سوچا کہ اس کیس میں اس کی ماں کی دلچسپی غیر ضروری ہے۔ اسے کم از کم بچوں کے سامنے ایسی باتیں نہیں کرنا چاہئیں۔ ہیزل اوپر اپنے کمرے میں کھیل رہی تھی لیکن کلائیو وہیں کچن ٹیبل پر بیٹھا ہوا تھا۔ خوش قسمتی سے وہ کوئی کتاب پڑھ رہا تھا اور لگتا تھا کہ وہ اپنی نانی کی نامناسب گفتگو سے غافل ہے۔

نانی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''مارجوری ایشام بھی 1940ء کے آخر میں لاپتا ہوئی تھی۔''

''مارجوری ائرفورس کے پائلٹ کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔'' اولیو نے آہستہ سے کہا۔

''ہم نے کبھی نہیں سنا کہ انہوں نے شادی کرلی تھی اور ایمی کوبرن کے کہنے کے مطابق وہ شخص ایک کارروائی میں مارا گیا۔ اس کے بعد مارجوری کے ساتھ کیا ہوا؟''

''ہیرالڈ نے اسے طلاق دے دی۔ ان کے درمیان ضرور کوئی رابطہ تھا۔''

''ایمی کو یقین نہیں کہ اس نے کبھی مارجوری کو تلاش کیا ہو اور نہ ہی طلاق دینے کے لیے اس کے پاس گیا ہوتا کہ وہ جین سے شادی کرسکے۔''

اولیو کچھ بے چین نظر آنے لگی۔ اس نے کلائیو کا کندھا تھپتھپایا۔ ''اوپر جا کر اپنی بہن سے کہو کہ وہ ہاتھ دھو کر کھانے کے لیے نیچے آجائے۔''

کلائیو نے بے دلی سے کتاب بند کی اور کمرے سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد اولیو نے ماں سے کہا۔ ''ذرا سوچو کہ تم نے کلائیو کے سامنے کیا کہہ دیا۔''

نانی نے اپنی سلائیاں نیچے کیں۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں ایک چمک تھی۔ ''ہم نہیں جانتے کہ ان کا تعلق جائز تھا۔ ایمی کا کہنا ہے کہ جین نے بڑی آسانی سے مارجوری کی جگہ لے لی۔ اس نے گھر کی مالکن بننے سے پہلے شاید ہی کوئی غلطی کی ہو۔''

''یہ احمقانہ بات ہے۔'' اولیو نے کہا۔ ''ہیرالڈ اسے پہلے سے جانتا تھا کیونکہ وہ کبھی کبھی سیلی کی دیکھ بھال کیا کرتی تھی لیکن وہ مارجوری کے جانے کے بعد ہی قریب آئے۔''

نانی نے دوبارہ بُنائی شروع کردی اور اپنے پرانے خیالات میں کھوگئی۔ ''یہ بات نہیں ہے۔ میں یہ سوچ رہی ہوں کہ ہیرالڈ کی دوسری شادی اور اس پائلٹ کے مارے جانے کے بعد مارجوری کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ وہ ایک من موجی اور غیر متوازن لڑکی تھی۔ تمہیں یاد ہے کہ وہ کیا حرکتیں کرتی تھی۔ ہر وقت نشے میں دھت رہنا اور اسی حالت میں جا کر بستر پر لیٹ جانا اس کا روز کا معمول تھا۔ وہ کسی بھی آوارہ قاتل کے لیے آسان ہدف تھی۔ خاص طور پر 1940ء میں جب جنگ کے دوران فضائی حملے ہو رہے تھے اور بلیک آؤٹ روز کا معمول بن گیا تھا اور متاثرہ عورتوں کی چیخیں بموں کی خوفناک آواز میں دب کر رہ گئی تھیں۔ ایسے میں اگر کسی تاریک رات میں کرسٹی اس پر حملہ کردیتا تو کون اس کی چیخ و پکار کا نوٹس لیتا۔''

اولیو کو جھرجھری آگئی اور وہ پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔

''مجھے امید ہے کہ تم نے ایشام کے سامنے اس خدشے کا اظہار نہیں کیا ہوگا ورنہ اسے شدید صدمہ ہوتا۔''

''نہیں، مجھ میں اتنی عقل ہے لیکن اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مارجوری دوبارہ کبھی نظر نہیں آئی۔ بہرحال پولیس کو اس عورت کا نام معلوم نہیں ہوسکا جس کی لاش کو باغ میں دفنایا گیا تھا۔''

اولیو نے مشکوک انداز میں ماں کی طرف دیکھا۔

''کیا تم یہ تھیوری لوگوں کو بتاتی پھر رہی ہو؟''

نانی نے بُنائی جاری رکھی۔ وہ پُرسکون انداز میں مسکرا رہی تھی۔ ''نہیں، میں نے صرف کانسٹیبل کو اعتماد میں لے کر بتایا تھا۔''

اگلے روز چائے کے بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ کلائیو نے دروازہ کھولا۔ وہاں جیفرے کھڑا ہوا تھا۔ اس کے گال سرخ ہو رہے تھے اور آنکھیں چمک رہی تھیں۔

''میں بڑی مشکل میں ہوں۔'' وہ چلاتے ہوئے بولا۔ ''لہٰذا مما نے مجھ سے کہا کہ میں تمہارے ساتھ کھیلوں جب تک سب لوگ پُرسکون نہ ہو جائیں۔''

''تم نے کیا کر دیا؟''

''پولیس سیلی سے بات کرنے آئی تھی۔ ان کا کہنا ہے کہ سیلی نے جس شخص کو سنیما کے باہر دیکھا تھا، وہ شاید کرسٹی ہو کیونکہ اس کے بتائے ہوئے حلیے کے مطابق اس نے چشمہ لگایا ہوا تھا اور تھوڑا سا گنجا تھا۔''

''میں شرطیہ کہتا ہوں کہ وہ بہت پُرجوش ہوگئی ہوگی۔''

''نہیں۔'' جیفرے نے کہا۔ ''وہ کچھ عرصے سے خاموش ہے اور قتل کے بارے میں سننا پسند نہیں کرتی۔ اس کا کہنا ہے کہ اس کی وجہ سے اسے دوبارہ ڈراؤنے خواب آنے لگے ہیں اور اگر کوئی اس بارے میں بات کرے تو وہ اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیتی ہے اور جب پولیس والے نے اس کی ماں کے بارے میں پوچھنا شروع کیا تو اس کا چہرہ سفید ہوگیا اور وہ کانپنے لگی اور انہیں پوچھ گچھ روکنی پڑی کیونکہ اسے دیکھ کر یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی طبیعت بگڑ رہی ہے لہٰذا مما اسے اندر لے گئیں اور ڈیڈی پولیس والے سے باتیں کرنے لگے لیکن جب ہم باہر آئے تو میں نے سیلی کو پیرو سے کہتے ہوئے سنا کہ پولیس کا خیال ہے کہ اس کی ماں کی لاش بھی باغ میں دفن ہے۔ یہ کہہ کر اس نے رونا شروع کر دیا۔''

''بے وقوف لڑکی۔'' کلائیو نے کہا۔ ''شاید اسی لیے تمہاری ماں نے وہاں سے جانے کے لیے کہا ہو۔ بے چاری سیلی!''

''بے چارے تو ہم ہیں کہ اسے برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔ مجھے اس وقت خوشی ہوگی جب وہ نارمل زندگی کی طرف لوٹ آئے گی اور ہم اس کے بارے میں فکر کرنا چھوڑ دیں گے۔''

خوش قسمتی سے جلد ہی ریلنگٹن پیلس سے ملنے والی لاشوں کی شناخت ہوگئی۔ ان میں مارجوری ایشام کی لاش نہیں تھی بہرحال نانی کا کہنا تھا کہ ایسی شہادت ملی ہے کہ کرسٹی نے اپنے گھر میں جو لاشیں چھپائی تھیں، ان کے علاوہ بھی دوسری عورتوں کو قتل کیا۔ اولیو کو اپنی ماں کا جنون انتہائی پریشان کن لگا۔ خصوصاً جب کرسٹی کا مقدمہ شروع ہوا۔ نانی نے ٹموتھی ایونز کی پرزور مذمت کی تھی جب اسے 1950ء میں اپنی بیوی اور بیٹی کو قتل کرنے کے الزام میں سزا سنائی گئی۔ اب وہ اسی طرح بھرپور طریقے سے پولیس کی نااہلی کی مذمت کر رہی تھی۔ اس کے خیال میں کرسٹی ایک بدترین ولن تھا۔ اس نے جیوری کے فیصلے پر اطمینان کا اظہار کیا جب کرسٹی کی اپیل مسترد ہوگئی اور اسے بیوی کے قتل کے الزام

افکار پریشاں

☆ سب کچھ قابلِ مرمت ہے سوائے اعتبار کے۔

☆ یقین اور تڑپ ہو تو اللہ کو سات آسمانوں کے پار ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ وہ تو شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔

☆ سجدہ بھی اسی وقت قبول ہوتا ہے جب سر کے ساتھ دل بھی جھکے۔

☆ ہم سب مرجائیں گے۔ اس حقیقت کو جاننے کے باوجود بھی ہم ایک دوسرے کا دل دکھاتے ہیں۔

☆ اللہ کو ہر اس لمحے کی خبر ہے جب تم بے بس ہو کر خاموش ہو جاتے ہو۔

☆ ہم بہرے ہی تو ہیں۔ جس نے کان دیے اس کی بھی نہیں سنتے۔

☆ خاموشی بہت کچھ کہتی ہے۔ کان لگا کر نہیں، دل لگا کر سنیں۔

☆ جب انسان خواہش نہیں کرتا تو ضرورتیں خود بخود پوری ہو جاتی ہیں۔

☆ اچھا وقت اس کا ہوتا ہے جو کسی کا برا نہیں سوچتا۔

(مرسلہ: وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ)

TAGPK.COM

میں سزا سنادی گئی۔

اس وقت کلائیو اور ہیزل اپنی ماں کے ساتھ ساحل سمندر پر تھے جب کرسٹی کو سزا سنائی گئی لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ اخبارات نے اس مقدمے کی پوری تفصیل شائع کی تھی اور کلائیو کو امید تھی کہ ان خبروں کی اشاعت سے سیلی پریشان نہیں ہوگی۔

اگلے روز وہ چھٹیوں سے واپس آئے تو وہ اور ہیزل، جیمرے اور پیرو کے ساتھ کھیلنے ان کے گھر چلے گئے۔ ان کی تفریح کے لیے ان کے دوستوں نے ایک سفید رنگ کا چھوٹا کتا منگوایا تھا جس کا نام روپرٹ رکھا گیا کیونکہ پیرو کا کہنا تھا کہ وہ دیکھنے میں ریچھ جیسا لگتا ہے۔ سرد موسم ہونے کے باوجود آسمان بالکل صاف تھا اور بچوں نے وہ پورا دن باغ میں گزارا۔ جیمرے کو اس کی سالگرہ پر ایک اسپیس گن تحفے میں ملی تھی چنانچہ وہ اور کلائیو اس سے کھیلنے لگے لیکن ہیزل اور پیرو اس چھوٹے کتے سے دل بہلانے لگیں جسے ان کی پھینکی ہوئی گیند کا پیچھا کرنے کے بجائے اپنے پنجوں سے زمین کھودنے میں دلچسپی تھی۔ جب اس نے عقبی باڑ کے ساتھ ایک گہرا سوراخ بنایا تو پیرو بے اختیار چلّائی اور جھک کر مٹی میں سے کوئی چیز اٹھانے لگی۔ لڑکوں نے بھی اپنا گیم روک دیا اور یہ دیکھنے کے لیے آئے کہ اسے کیا ملا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی چیز تھی جو گندگی میں لتھڑی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ ہی ایک ٹوٹی ہوئی چین مٹی میں دبی ہوئی تھی۔ اس کی حالت کے باوجود وہ دل کی شکل کی کوئی چیز تھی۔

''یہ سیلی کا لاکٹ ہے۔'' پیرو خوش ہوتے ہوئے بولی۔ ''یاد ہے کہ یہ گزشتہ موسم گرما میں کھو گیا تھا۔ جب میں یہ اسے دوں گی تو وہ بہت خوش ہوگی۔'' یہ کہہ کر وہ گھر کی طرف دوڑی۔ ہیزل بھی اس کے پیچھے تھی۔

سیلی کچن میں جین کی مدد کر رہی تھی۔ پیرو دوڑتی ہوئی کچن میں آئی اور اسے لاکٹ دکھایا لیکن اس کا سارا جوش رخصت ہوگیا جب اس نے اپنی بہن کا چہرہ دیکھا۔ سیلی مڑی اور اس نے اپنی بہن کے ہاتھ سے لاکٹ لے لیا پھر دوڑتی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔

جین ایشام کو غصہ آگیا۔ ''اس لڑکی کو کیا ہوا؟'' اس نے کہا۔ ''ویسے بھی یہ اس کا لاکٹ نہیں تھا اور کافی خراب ہوگیا تھا۔ یقیناً یہ وہاں کافی عرصے سے پڑا ہوگا۔''

''کیا تمہیں یقین ہے؟'' پیرو نے کہا۔

''ہاں، سیلی کا لاکٹ باغ میں نہیں گرا تھا۔ اس نے اپنے باپ کو یہی بتایا۔''

''پھر اس کا لاکٹ کہاں گیا؟''

جین نے سرد آہ بھری۔ ''ایڈی کو پیسوں کی ضرورت تھی۔ سیلی نے اپنا لاکٹ اسے دیا کہ وہ جیولری شاپ پر گروی رکھ دے۔ اس شرط پر کہ وہ اسے بعد میں چھڑا کر سیلی کو واپس کردے گا۔ بہرحال وہ اسے واپس نہیں ملا۔ ہیرالڈ نے اس لڑکے کے بارے میں ٹھیک ہی کہا تھا۔ مجھے شک ہے کہ تمہیں جو لاکٹ ملا ہے وہ مارجوری کا ہے۔'' اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''سیلی کے پاس اس کی ماں کے لاکٹ کی نقل تھی۔ مجھے یاد نہیں کہ مارجوری نے کبھی اپنا لاکٹ گم ہونے کی شکایت کی ہو۔ مجھے تمہارے باپ سے پوچھنا ہوگا۔''

کمرے میں روشنی کم ہوگئی تھی۔ جین نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس نے اٹھ کر لائٹ جلائی۔ ''تم دونوں لڑکیاں میری مدد کرنے کے لیے یہاں کیوں نہیں رک جاتیں۔ بارش ہونے والی ہے اور وہ لڑکے کسی وقت بھی اندر آسکتے ہیں۔''

لیکن کلائیو اور جیمرے کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ ابھی تک کھیلنے میں مصروف تھے۔ دروازہ زور سے بند ہونے کی آواز پر انہوں نے پلٹ کر دیکھا۔ ان کا خیال تھا کہ لڑکیاں واپس آرہی ہیں لیکن انہیں ہیزل اور پیرو کے بجائے وہاں سیلی نظر آئی جو دروازے سے باہر آرہی تھی۔

اس کی چال کچھ عجیب لگ رہی تھی جیسے سوتے میں چل رہی ہو۔ وہ باغ میں آئی اور سیدھی اس جگہ گئی جہاں درختوں کے درمیان تھوڑی سی جگہ کھدی ہوئی تھی۔ ''کیا وہ لاکٹ اس جگہ سے ملا تھا؟'' اس نے پوچھا۔

دونوں لڑکوں نے خاموشی سے سر ہلا دیا۔ ''پھر وہ ڈراؤنا خواب نہیں تھا۔'' اس نے سرگوشی کی۔ ''وہ واقعی اسی جگہ دفن ہے۔''

چھ ہفتے بعد پولیس نے ہیرالڈ ایشام کو اپنی پہلی بیوی کو قتل کرنے کے الزام میں گرفتار کرلیا۔

''مجھے بالکل حیرت نہیں ہوئی کہ وہ بے چاری لڑکی ڈراؤنے خواب دیکھتی تھی۔'' نانی نے کہا۔ ''اس نے باپ کو اپنی ماں کی لاش باغ میں دفن کرتے دیکھا۔'' نانی نے چائے کا گھونٹ لیا اور اپنے ہونٹوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ ''میری دوست ایمی کو بالکل حیرت نہیں ہوئی جب پولیس ہیرالڈ کو گرفتار کرنے آئی کیونکہ جس رات مارجوری لاپتا ہوئی تو ان کے بیچ زبردست جھگڑا ہوا تھا اور اسے دیوار کے پار سے آوازیں سنائی دے رہی تھیں گو کہ ان کے

درمیان کوئی کشمکش نہیں ہوئی۔ اس نے سیڑھیوں پر ان کے قدموں کی آواز سنی۔ وہ اوپر جا رہے تھے پھر مارجوری کی آواز آئی۔ وہ ہیرالڈ سے کہہ رہی تھی کہ اسے چھوڑ کر جا رہی ہے اور یہ کہ وہ نیچے جا کر کاؤچ پر سو جائے پھر دروازہ زور سے بند ہوا اور خاموشی چھا گئی تو ایمی یہی سمجھی کہ جھگڑا ختم ہو گیا ہے لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ یقیناً اوپر گیا ہوگا اور اس نے مارجوری کو گلا گھونٹ کر مار دیا۔''

کلائیو اپنا پزل مکمل کرنے میں مصروف تھا لہٰذا وہ کچھ نہیں بولا لیکن وہ یہ جانتا تھا کہ نانی غلط کہہ رہی ہے۔ مارجوری کا گلا نہیں گھونٹا گیا بلکہ اس نے بڑی مقدار میں سکون بخش گولیاں لے لی تھیں۔ کلائیو یہ ساری کہانی جیمز سے سن چکا تھا جس نے اس کے علاوہ کسی اور کو یہ بات نہیں بتائی کیونکہ اس کی ماں اور بہنیں ہر وقت روتی رہتی تھیں۔ ایشام کی گرفتاری نے انہیں پریشان کر دیا تھا اور وہ اس صورت حال سے گھبرا کر اپنے دوست سے ملنے چلا آیا تھا۔

یہ سب اس وجہ سے ہوا کہ سیلی کی ماں انہیں چھوڑ کر جا رہی تھی۔ جس رات اس کی موت ہوئی، وہ اپنے پائلٹ دوست کے ساتھ ڈرنک کرنے باہر گئی ہوئی تھی۔ جب وہ گھر آئی تو ایشام بیٹی کو سلا رہا تھا۔ سیلی کی ماں نے اپنے لیے ایک جام بنایا اور اسے شب بخیر کہنے اوپر آئی لیکن ایشام اسے کھینچتا ہوا دوبارہ نیچے لے گیا۔ وہاں ان دونوں میں زبردست جھگڑا ہوا۔ اس کے بعد وہ تیزی سے اوپر آئی اور سیلی کو اندر کھینچ لیا پھر وہ لینڈنگ پر گئی، میز پر سے اپنا گلاس اٹھایا۔ ایشام اس کے پیچھے آیا تو اس نے کہا کہ وہ نیچے جا کر کاؤچ پر سو جائے۔ اپنا ڈرنک پیا اور بیڈ روم میں جا کر دروازہ زور سے بند کر لیا۔

کلائیو نے فرض کر لیا کہ اسے بہت جلدی نیند آ گئی ہوگی کیونکہ اس نے سکون بخش گولیاں لے لی تھیں تاکہ وہ پرسکون ہو کر سو جائے۔ جیمز نے کہا کہ شراب میں ملانے کے بعد وہ گولیاں اور زیادہ پاور فل ہو جاتی ہیں اور نہ جانے گھر آنے سے پہلے اس نے کتنی شراب پی ہوگی۔ جب وہ سیلی کے کمرے میں گئی تھی تو مسٹر ایشام نے ضرور اس کے گلاس میں مزید گولیاں ڈال دی ہوں گی اور یہ زیادہ مقدار اس کی موت کی وجہ بن گئی۔ اس کے مرنے کے بعد ایشام نے لاش کو کمبل میں لپیٹا اور باغ میں لے جا کر دفن کر دیا۔ یہ جانتے ہوئے کہ صبح ہونے تک کھدی ہوئی جگہ ہوا چلنے سے برابر ہو جائے گی۔ رات کی تاریکی میں اسے دیکھنے والا کوئی نہیں تھا کیونکہ بلیک آؤٹ کی وجہ سے پڑوس کی تمام کھڑکیوں پر پردے پڑے ہوئے تھے۔

اسے یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ سیلی عقبی دروازہ کھلنے کی آواز سن کر جاگ گئی تھی اور اس نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر دیکھ لیا تھا کہ اس کا باپ ٹارچ کی روشنی میں کھدائی کر رہا ہے۔ وہ دیکھ سکتی تھی کہ اس کے باپ نے ایک بڑا بنڈل اٹھا کر گڑھے میں ڈالا اور اسے مٹی سے بھر دیا۔ وہ دوبارہ سونے کے لیے چلی گئی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس نے جو کچھ دیکھا، اس کی کیا اہمیت ہے۔ دوسرے روز صبح ایشام نے اسے بتایا کہ اس کی ماں اپنے پائلٹ دوست کے ساتھ چلی گئی ہے اور کبھی واپس نہیں آئے گی۔

کلائیو نے سیلی کے لیے ہمدردی محسوس کی۔ جب ایشام کی گرفتاری سے اس بیوی کی بدنامی ہو رہی تھی اور وہ اپنا مکان بیچ کر بچوں کے ساتھ کہیں اور چلی گئی۔ کلائیو کو اپنے دوست کے جانے کا افسوس تھا۔ اب وہ اس کے ساتھ ان کے خوبصورت باغ میں نہیں کھیل سکتا تھا۔

سیلی اپنے باپ کی گرفتاری پر مغموم اور صدمے میں تھی۔ اس نے ایک عرصے تک اس رات کی یاد کو دبائے رکھا لیکن اب اسے سب یاد آ گیا تھا اور وہ ہر بار یہ سوچ کر کانپ جاتی کہ اس کی پیاری ماں منوں مٹی کے نیچے دفن ہے۔ البتہ کچھ باتیں اسے یاد نہیں تھیں۔ صرف ہیرالڈ ہی پورا سچ جانتا تھا کہ چار سالہ سیلی نے یہ سوچا سکون بخش گولیاں ہی اس کی ماں کو آرام پہنچا سکتی ہیں اور وہ اپنی فیملی کو چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گی چنانچہ جب اس کے والدین میں جھگڑا ہو رہا تھا تو اس نے اپنی ماں کے سرہانے رکھی ہوئی شیشی میں سے کچھ گولیاں نکال کر اس کے گلاس میں ڈال دیں۔ اسے یہ بھی یاد نہیں تھا کہ جب اس کا باپ اسے دیکھنے آیا تو اس نے غنودگی کے عالم میں اسے بتایا کہ اس نے ماں کو گھر پر روکنے کے لیے کیا حرکت کی ہے۔ وہ فوراً مارجوری کے کمرے میں گیا لیکن اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔

صرف ہیرالڈ کو ہی یہ بات یاد تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ پولیس کبھی اس کے بیان پر یقین نہیں کرے گی۔ انہوں نے اس وقت بھی اس پر یقین نہیں کیا اور نہ ہی وہ اب کریں گے۔ اس کے علاوہ وہ دل سے سیلی کا بھلا چاہتا تھا پھر وہ اسے کیسے بتاتا کہ وہ اپنی ماں کی موت کی ذمے دار ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ سیلی زندگی بھر اپنے آپ کو قصوروار سمجھے۔ کچھ باتوں کا نہ بتانا ہی بہتر ہے۔

⌘⌘⌘

محفلِ شعر و سخن

❁ ریاض بٹ.....حسن ابدال

میں نے کبھی یہ ضد تو نہیں کی پر آج شب
اے دوست نہ جا کہ طبیعت اداس ہے

❁ حاجی محمد زاہد اقبال زرگر.....نئی منڈی سکھیکی

مجھے یقین ہے وہ بھی تڑپ رہا ہوگا
جسے یہ ضد تھی کہ ہر حال میں جدا ہوگا
ملیں گے ہم مگر اس دم سلگتی آنکھوں میں
نہ جانے کتنی صدیوں کا رت جگا ہوگا

❁ ناہید یوسف.....اسلام آباد

سرخرو ہر قدم پر اس کو رکھنے کی چاہ میں
جان بوجھ کر ہر بازی میں اس سے ہارتا رہا

❁ انعم کمال.....حیدرآباد

محرومیاں، ناکامیاں، اداسیاں سمیٹ کر
جب کچھ نہ بن سکا تو میرا دل بنا دیا

❁ محمد راحیل.....پاکپتن شریف

کہتے نہیں زباں سے، دل بے قرار ہے
نظریں بتا رہی ہیں انہیں مجھ سے پیار ہے

❁ محمد عتیق.....پنڈ دادن خان

یہ خدا یہ تو عنایت ہے خدا کی ورنہ
تم سا محبوب زمانے میں کہاں ملتا ہے

❁ واجد علی.....نواب شاہ

اس خوف سے وہ ساتھ نبھانے کے حق میں ہے
کھو کر مجھے یہ لڑکی کہیں دکھ سے مر نہ جائے

❁ نجمہ مسعود.....فیصل آباد

غلام بھاگتے پھرتے ہیں مشعلیں لے کر
محل پہ ٹوٹنے والا آسماں ہو جیسے

❁ عزیز احمد.....لاہور

ہوگئی عمر بہاروں کے تصور میں تمام
سیر کرتے رہے نادیدہ گلستانوں کی

❁ ثوبیہ علی.....کراچی

کس قدر قحطِ وفا ہے میری دنیا میں ندیم
جو ذرا ہنس کے ملے اس کو مسیحا سمجھوں

❁ فیاض خان.....اوکاڑہ

یہ کون لوگ اندھیروں کی بات کرتے ہیں
کہ تیری یادوں کے چراغ ابھی بجھے تو نہیں

❁ عبدالجبار رومی انصاری.....قصور

یاد رکھو تو عشق کی حقیقت اور ہے
ہر کوئی نہ پاسکے یہ فضیلت اور ہے
معراجِ عشق نہ پائی تو ڈوب جاؤ گے
اس عشق کی تو رومی طریقت اور ہے

❁ انیس شیخ.....گوجرانوالہ

لٹ گئی محفل بجھ گئے ہیں چراغ
اب کیا ڈھونڈنے آئے ہو یہاں

❁ محمد شہباز اکرم نوئی.....پاکپتن شریف

تم نہیں جانتے یکطرفہ محبت کا مزہ
یہ وہ محنت ہے جو بیکار کیا کرتے ہیں

TAGHK.COM

❁ سلطان احمد قائم خانی.....ٹنڈو جان محمد

گو ذرا سی بات پر برسوں کے یارانے گئے
لیکن اتنا تو ہوا کچھ لوگ پہچانے گئے
میں اسے شہرت کہوں یا اپنی رسوائی کہوں
مجھ سے پہلے اس گلی میں میرے افسانے گئے

❁ بلال آرائیں.....حیدرآباد

تم کہکشاں سے اپنی آواز دو نہ مجھ کو
یہ دھوپ کا نگر ہے کیا ساتھ تم چلو گے
ساون کی ہیں پھواریں، جیون پہ اب تمہارے
پیاسا مرا شجر ہے، کیا ساتھ تم چلو گے

❁ خالد نعیم.....خان پور

کبھی تو لوٹ آئے گا جو دور سمندر پار گیا
ہر روز اک نئے جذبے سے ہم خود کو سنوارا کرتے ہیں

❁ اعجاز اعوان.....ایبٹ آباد

کہتے ہیں آنسوؤں سے بجھائیں گے ہم تجھے
یہ دل لگی بھی کرتے ہیں دل کی لگی سے ہم

❁ رانا رفاقت.....میرپور

ذرا کر زور سینے پر کہ تیر پُرستم نکلے
جو یہ نکلے تو دل نکلے جو دل نکلے تو دم نکلے

❁ مریم انصاری.....کراچی

کچھ دیر مجھے بھی مہکاؤ اور دل کا اجالا بن جاؤ
ان مست پون کے جھونکوں سے پھولوں کی مالا بن جاؤ
ہے اپنے حسن پہ ناز اگر تو روپ نگر میں بس جاؤ
یہ چاند پرستی چھوڑ کے تم خود چاند کا ہالا بن جاؤ

❁ شاہدہ سومرو.....کھپر

جو تمہاری طرح تم سے کوئی جھوٹے وعدے کرتا
تمہی منصفی سے کہہ دو، تمہیں اعتبار ہوتا

❁ حرا اطہر.....کراچی

نہ تھا وہ بے وفا پھر بھی رہا آغوشِ دشمن میں
ہماری بدگمانی نے اسے برسوں وہیں رکھا

❁ محمد اکرام.....کراچی

جلی ہیں دھوپ میں شکلیں جو ماہتاب کی تھیں
کھنچی ہیں کانٹوں پہ جو پتیاں گلاب کی تھیں

❁ امتیاز احمد.....پھالیہ

ساتھ شوخی کے کچھ حجاب بھی ہے
اس ادا کا کہیں جواب بھی ہے

❁ امجد حسین.....تلہ گنگ

دل لے کے اس کی بزم میں جایا نہ جائے گا
یہ مدعی بغل میں چھپایا نہ جائے گا

❁ ایس فیاض انجم.....ڈیرہ اسماعیل خان

اندازِ بیاں کچھ ایسا تھا ہر دل پہ اثر ہوجاتا تھا
اب چپ کا گہرا ساگر ہوں، وہ شعلہ بیانی بھول گئی
اک بکھرے خواب کی صورت ہے وہ دور سنہرے بچپن کا
اب یاد ہیں قصے بھوتوں کے، پریوں کی کہانی بھول گئی

❁ شاہینہ مہتاب.....چنیوٹ

جن کو اپنی خبر نہیں اب تک
وہ میرے دل کا راز کیا جانیں

❁ فرحت نسیم.....سانگلہ ہل

میں ہر طرح سے موردِ الزام ہوگیا
تقصیر کی کسی نے، میرا نام ہوگیا

❁ رانا اشرف.....لاڑکانہ

دیکھیں تو کیسے فتنے ہیں نیچی نگاہ میں
آئینہ رکھ دے کاش کوئی ان کی راہ میں

❁ محمد نعیم اصغر.....گجرات

ہزار بار جو مانگا کرو تو کیا حاصل
دعا وہی ہے جو دل سے کبھی نکلتی ہے

❁ منیر شگفتہ.....وہاڑی

آنکھوں میں طوفان چھپے ہیں، ساون میں کیا رکھا ہے
دل میں غم کے داغ لگے ہیں، دامن میں کیا رکھا ہے
کاجل آنکھ کا پھیلا کیوں ہے آنچل سر سے کیوں ڈھلکا
کیوں بیری پر پتھر آئے، آنگن میں کیا رکھا ہے

❁ محمد اسلم بلوچ.....ٹنڈو جام

تسلی بھی دیے جاتے ہو دل بھی توڑے جاتے ہو
مسیحا ہو کے بیماروں کو کس پر چھوڑے جاتے ہو

❁ عبدالجبار نیازی.....منڈی بہاءالدین

کعبہ کی ہوس ہے کبھی کوئے بتاں کی ہے
مجھ کو خبر نہیں مری مٹی کہاں کی ہے

❁ عمران قریشی.....ٹنڈو الہیار

اٹھتے ہیں جو عالم میں وہ مٹ جاتے ہیں فتنے
کافر تری آنکھوں کی شرارت نہیں جاتی

❁ شاہد حسن.....مظفرگڑھ

جی چاہتا ہے چھیڑ کے ہوں اس سے ہمکلام
کچھ تو لگے گی دیر سوال و جواب میں

❁ منصور علی.....آزاد کشمیر

اکثر ساون رت میں بادل گھر گھر کر تو آئے بہت
لیکن بوند نہ برسا پائے مستی میں اترائے بہت
کیسے من کی بات کہوں میں کیسے اس کو سمجھاؤں
میرے جذبوں کو نہ سمجھے مجھ کو ہی سمجھائے بہت

TAGPK.COM

❁ محمد پرویز.....ملتان

ادائے مطلبِ دل ہم سے سیکھ جائے کوئی
انہیں سنا ہی دیا حال داستاں کی طرح

❁ محمود خان.....کراچی

گھبرا کے اگر موت بھی مانگوں تو کہیں وہ
جاگیر نہیں ہے عدم آباد کسی کی

❁ شاہد جیلانی.....بہاولنگر

غیروں سے التفات پہ ٹوکا تو یوں کہا
دنیا میں بات بھی نہ کریں کیا کسی سے ہم

❁ وقاص شیخ.....پشاور

اے کاش ہم اب ٹھوکریں کھا کر ہی سنبھلتے
سر ملتے ہیں اس کوچے میں پتھر نہیں ملتا

❁ طارق رشید.....ٹوبہ ٹیک سنگھ

پھر کبھی چھپتی ہے جب ظاہر محبت ہوچکی
ہم بھی رسوا ہوچکے ان کی بھی شہرت ہوچکی

❁ اصغر حیات.....میانوالی

دل میں سما گئی ہیں قیامت کی شوخیاں
دو چار دن رہا تھا کسی کی نگاہ میں

❁ فرحان لیاقت.....پنڈی

یہ گستاخی یہ چھیڑ اچھی نہیں ہے اے دلِ نادان
ابھی پھر روٹھ جائیں گے ابھی تو من کے بیٹھے ہیں

❁ کاشف حسین.....قصور

کیا کیا فریب دل کو دیے اضطراب میں
ان کی طرف سے آپ لکھے خط جواب میں

❁ ایس حیدر.....ساہیوال

ملے وہ آج مدت میں بہت روئے بہت تڑپے
وہ دردِ عشق سن سن کر، ہم اپنا درد کہہ کہہ کر

❁ محمد زبیر.....ہزارہ

تم خواب میں بھی آئے تو منہ کو چھپا لیا
دیکھو جہاں میں پردہ نشیں اور بھی تو ہیں

❁ عمیر عاصم.....حیدرآباد

ساز یہ کینہ ساز کیا جانیں
ناز والے نیاز کیا جانیں

❁ راجہ عباس.....کھاریاں

تخت و تاج کی دنیا میں بس چہرے بدلے جاتے ہیں
کب حالات بدلتے دیکھے پل پل کے بدلاؤ میں

❁ امجد علی.....پنڈی بھٹیاں

نازاں ہے کس عیاری پر او جابر انسان
پورب پچھم فتح کیے نہ فتح کیے اذہان

❁ فوزیہ چودھری.....تحصیل عارف والہ

کیسے گوارا کرلوں میں ان پل دو پل کے سہاروں کو
آنچل میں کیوں باندھ کے رکھوں پت جھڑ جیسی بہاروں کو
وہ سمجھے ہم کچے رنگ میں گم ہوکر من ہاریں گے
ہم ایسے نادان نہیں جو دل دے دیں بنجاروں کو

❁ شفیق الرحمان.....ٹنڈو آدم

یہ میری عقل کا دھوکا ہے یا اس کی ہے یہ دانائی
میں بیٹھ گئی اک منزل پر، وہ منزل منزل ہرجائی
اس رنگ و بو کی دنیا میں ہر سمت نظارے بکھرے ہیں
اک پھول ہی پہ موقوف نہیں گلشن میں بہت ہے زیبائی

❁ آمنہ بٹ.....منگلا ڈیم

بارود برستا ہو جہاں روز زمیں پر
اس دیس میں پھولوں کے زمانے نہیں آتے
جس دھرتی پہ لاشوں ہی کی ہر فصل اُگی ہو
اس دھرتی کے پیڑوں پہ شگوفے نہیں آتے

❁ رضوانہ عدیل.....راولپنڈی

پھول گگن اور تارے مٹی سب کا وہ دھن وان
شکر کرے ہے ذرہ ذرہ نا شکرا انسان

❁ نقیب احمد جان.....سوات

جیت سکے نہ دل کی دنیا عیاری، مکاری سے
نام ہوتے ہیں جن کے روشن دنیا کی تسخیروں میں
سسی، پنوں، لیلیٰ، مجنوں جیتے جاگتے قصے ہیں
مہر و وفا کے رنگ بھرے ہیں ان زندہ تصویروں میں

❁ مہتاب احمد.....حیدرآباد

کوئی نہ اپنا ساتھی ہو تو سنگت کس سے ہم جوڑیں
چاروں سمت ہو ویرانی تو راہ کو اپنی کیا موڑیں

محفلِ شعر و سخن

کوپن برائے شمارہ مارچ 2022

نام : _____

پتا : _____

TAGPK.COM

اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور وہ اپنے پرس میں موجود چیزوں کو تیزی سے باہر نکال کر پھینک رہی تھی اور جونہی اس کا موبائل فون اس کے ہاتھ لگا، اس نے پرس ایک طرف پھینکا اور موبائل فون کی اسکرین روشن کرنے کے بعد اس کے ہاتھ کی انگلیاں رک گئیں..... اس کا دماغ جیسے کچھ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکا تھا۔ اس کے ہونٹ تھرتھرا رہے تھے اور آنکھوں میں نمی اتری ہوئی تھی..... گھبراہٹ اور خوف چہرے سے مترشح تھا۔

خدا کی قدرت ہو یا انسان کی فطرت... کسی کے لیے بھی اسے سمجھنا آسان نہیں ہوتا... وہ جو بظاہر ہمدردوں کے روپ میں سایا بن کر چل رہے تھے... کیا خبر تھی موت کی دستک اپنی آہٹوں میں چھپائے ساتھ نبھانے کا محض ڈراما کر رہے تھے اور جب خبر ہوئی تو کسی کی ہنستی بستی زندگی موت کی آغوش میں جا چکی تھی کیونکہ... خدا کی قدرت ہو یا انسان کی فطرت... اسے سمجھنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔

انجام سے بے خبر بے سمت مسافروں کے سفر کی دلخراش روداد

پردہ

محمد فاروق انجم

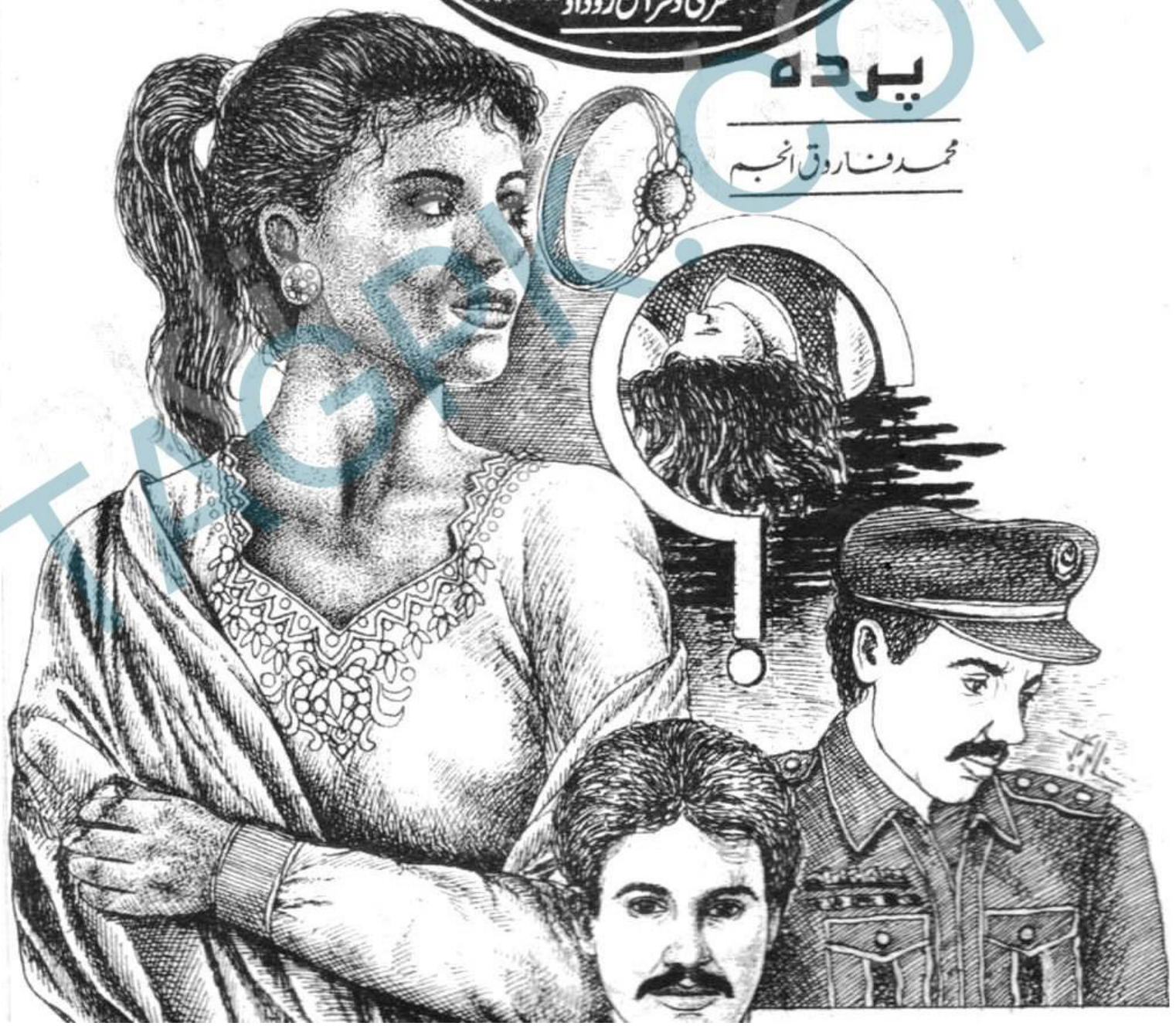

اس نے ایک نمبر نکالا اور کال کرنے کے بعد انتظار کرنے لگی کہ دوسری طرف سے آواز اس کی سماعت میں پڑے..... لیکن فون اٹینڈ نہیں ہوا۔ اس نے پھر کوشش کی لیکن دوسری طرف سے کال کاٹ دی گئی۔ وہ سوچنے لگی کہ اب وہ کیا کرے؟

جب اس کی سمجھ میں کوئی بات نہ آئی تو اس نے کال کرنے کا ارادہ بدل دیا اور کمرے سے نکل کر ٹی وی لاؤنج سے ہوکر دروازے کی طرف دوڑی تو وہاں فرش پر پڑی لاش پر اس کا پیر پڑنے ہی والا تھا کہ اس نے سرعت سے اپنا رخ بدلا اور دروازے کے پاس چلی گئی۔

اس نے مضطربانہ انداز میں دائیں بائیں دیکھا۔ کشادہ گلی میں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ ہر گھر کا دروازہ بند تھا۔ وہ واپس پلٹنے ہی والی تھی کہ اسے گلی میں کوئی داخل ہوتا دکھائی دیا۔ اس نے رک کر اس کی طرف غور سے دیکھا اور کوئی اجنبی دیکھ کر وہ اندر چلی گئی اور ایک بار پھر اپنا موبائل فون نکال کر اس کی اسکرین روشن کی اور عجلت میں اس کی انگلیاں اسکرین پر رقص کرنے لگیں۔ پھر اس نے ایک نمبر پش کیا اور موبائل فون اپنے کان سے لگا کر بے چینی سے اپنے جسم کو دائیں بائیں حرکت دینے لگی۔ جونہی اس کا رابطہ ہوا تو وہ جلدی سے بولی۔

''پولیس اسٹیشن..... میرے گھر ایک قتل ہوگیا ہے.....''

☆☆☆

اس کا نام نگہت تھا۔ اس کی عمر تیس، بتیس سال تھی۔ اس کے شوہر کا نام الیاس تھا جو ایک کمپنی میں شعبۂ مارکیٹنگ..... سے وابستہ تھا اور اسے روز اپنے کام کے سلسلے میں شہر سے باہر جانا پڑتا تھا۔ اس کا ایک بیٹا تھا جس کی عمر چھ سال تھی اور وہ قریب ہی ایک پرائیویٹ اسکول میں پڑھتا تھا۔

نگہت گھبرائی، ڈری اور سہمی ہوئی ایک طرف بیٹھی تھی۔ وہ بار بار اپنے دونوں ہاتھوں کو مل رہی تھی اور کبھی کبھار سر اٹھا کر بھی دیکھ لیتی تھی۔

اس وقت اس کے گھر میں پولیس موجود تھی۔ فرش پر اسی کی عمر کی ایک خوبصورت لڑکی کی لاش پڑی تھی جس کے گلے پر تیز دھار چھری چلائی گئی تھی۔ لاش کے اردگرد خون پھیلا ہوا تھا۔ پولیس لاش کا جائزہ لینے کے علاوہ اردگرد سے کسی ثبوت کی تلاش میں بھی تھی۔ پولیس اہلکار کے ساتھ انسپکٹر زیرک بھی موجود تھا جو وجیہہ اور ذہین نوجوان تھا۔

اپنی کارروائی کرنے کے بعد انسپکٹر زیرک نے لاش اٹھانے کا اشارہ کیا اور خود نگہت کی طرف بڑھا۔ اس وقت نگہت کے پاس ایک عورت اور پچاس سال کی عمر کا شخص بھی موجود تھا جن کے چہروں پر خوف تھا۔ وہ شخص، نگہت کا بڑا بھائی اور عورت اس کی بیوی تھی۔ دونوں اسی علاقے میں کچھ فاصلے پر رہائش پذیر تھے جو اس خبر کو سننے کے بعد فوراً اس کے گھر پہنچ گئے تھے۔

''آپ کا نام کیا ہے؟'' انسپکٹر زیرک نے نگہت سے پوچھا۔

''اس کا نام نگہت ہے اور یہ میری چھوٹی بہن ہے۔'' نگہت کے بولنے سے قبل اس شخص نے جواب دیا تو انسپکٹر زیرک کی نگاہ اس شخص کے چہرے پر رک گئی۔

''آپ اپنا اور اپنی بیوی کا نام بھی بتا دیں۔''

''میرا نام شمس اور میری بیوی کا نام عذرا ہے۔'' اس نے جلدی سے بتایا۔

''اب آپ چپ رہیں گے۔'' انسپکٹر زیرک نے کہہ کر نگہت کی طرف دیکھا۔ ''مجھے آپ تفصیل بتائیں گی.....''

نگہت کا جسم خوف سے کانپ رہا تھا اور وہ اپنے ہاتھ غیر معمولی انداز میں ایک دوسرے کے ساتھ مسلسل مل رہی تھی۔ اس نے انسپکٹر زیرک کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے پر خوف اور بھی عیاں ہوگیا۔

''آپ بالکل نہ گھبرائیں، مجھے بتائیں کیا ہوا تھا..... یہ قتل کیسے ہوا؟ کون آیا تھا.....؟'' انسپکٹر زیرک کے لہجے میں نرمی تھی اور وہ اس کے چہرے کے تاثرات نوٹ کر رہا تھا۔

نگہت بولی۔ ''میں گھر آئی تو..... ثروت کو کسی نے قتل کر دیا تھا اور اس کی لاش پڑی تھی.....''

''اس کا نام ثروت تھا؟'' انسپکٹر زیرک نے پوچھا۔

''جی ہاں، یہ ثروت ہے اور نگہت اور یہ ایک زمانے میں ایک ساتھ کالج میں پڑھتی تھیں اور جب ثروت کے والد کا تبادلہ اس شہر سے ہوا تو ثروت اپنے گھر والوں کے ساتھ یہ شہر چھوڑ کر چلی گئی تھی.....'' نگہت کے بولنے سے پہلے ایک بار پھر شمس بول پڑا۔ جونہی انسپکٹر زیرک نے شمس کی طرف دیکھا اس کی بولتی بند ہوگئی اور وہ ایسے چپ ہوگیا جیسے اسے سانپ سونگھ گیا ہو۔

''مجھے ان سے بات کرنے دیں.....'' انسپکٹر زیرک نے نرمی سے سمجھایا تو شمس نے سہم کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ انسپکٹر زیرک نے نگہت کی طرف دیکھتے ہوئے کوئی سوال کرنے کے بجائے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔

نگہت بولی۔ ''ثروت کچھ دنوں سے میرے پاس آئی

ہوئی تھی۔ آج مجھے دس، سوا دس بجے اپنے بیٹے کے اسکول سے فون کال آئی کہ میرا بیٹا سیڑھیوں سے گر کر زخمی ہوگیا ہے۔ میں نے ثروت کو بتایا اور تیزی سے اسکول کی طرف بھاگی۔ جب میں وہاں پہنچی تو مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ میرا بیٹا بالکل ٹھیک تھا اور وہ کال مجھے اسکول کی طرف سے نہیں آئی تھی..... میں پریشان ہوگئی کہ میرے ساتھ ایسا مذاق کس نے کیا ہے۔ میں اسکول کی پرنسپل سے مل کر واپس گھر آئی تو گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں اندر آئی تو یہ دیکھ کر میری چیخ نکل گئی کہ..... ثروت کی خون آلود لاش فرش پر پڑی تھی.....''

نگہت بتانے کے بعد خوف سے کانپنے لگی۔ انسپکٹر زیرک نے پوچھا۔ ''مجھے اپنا موبائل فون دیں گی آپ؟''

نگہت نے دوسری طرف دیکھا تو بیڈ کی تپائی پر موبائل فون پڑا تھا۔ شمس نے وہ فون اٹھا کر انسپکٹر زیرک کے حوالے کردیا۔ انسپکٹر زیرک نے کہا۔ ''مجھے بتائیں وہ کال کس نمبر سے آئی تھی.....؟''

نگہت نے موبائل سے وہ نمبر نکال کر ایک بار پھر موبائل فون انسپکٹر زیرک کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے نمبر کو غور سے دیکھا۔ کال آنے کا وقت دس بج کر چوبیس منٹ تھا۔ انسپکٹر زیرک نے اپنے اہلکار کو بلا کر وہ نمبر نوٹ کرایا اور اسے ہدایت دینے کے بعد نگہت کی طرف متوجہ ہوا۔

''اس گھر میں اور کون کون رہتا ہے؟''

''میں، میرا شوہر اور ہمارا بیٹا۔''

''آپ کا شوہر کہاں ہے؟''

''وہ شہر سے باہر ہیں۔ ایک کمپنی میں مارکیٹنگ منیجر ہیں۔ تقریباً وہ روز ہی شہر سے باہر جاتے ہیں اور شام تک ان کی واپسی ہوجاتی ہے۔'' شمس شاید زیادہ دیر چپ نہیں رہ سکتا تھا اس بار بھی اس نے ہی جواب دیا۔

''آج وہ کتنے بجے گئے تھے؟'' انسپکٹر زیرک نے پوچھا۔

''وہ نو بجے گھر سے نکل گئے تھے۔''

''آپ نے ان کو اطلاع دی.....؟''

''پولیس کو فون کرنے سے پہلے میں نے ان کو ہی کال کی تھی لیکن وہ شاید مصروف تھے اس لیے میری ان سے بات نہیں ہوئی۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا اس لیے میں نے فوراً پولیس کو کال کردی.....'' نگہت نے بتایا۔

''میں نے الیاس کو اطلاع کردی ہے۔ میرا اس سے رابطہ ہوا تھا۔ وہ کام چھوڑ کر واپس آرہا ہے۔'' شمس نے بتایا۔

''ثروت یہاں کیوں آئی تھی، آپ نے اس کے گھر والوں کو بتایا ہے؟'' انسپکٹر زیرک کی نگاہیں نگہت پر مرکوز تھیں۔

''ثروت کے والدین فوت ہوچکے ہیں۔ اس کے دونوں بڑے بھائی ملک سے باہر ہوتے ہیں اور ثروت اکیلی اس شہر میں اپنے گھر میں رہتی تھی اور اس کے آنے کی وجہ اس کے شوہر کی موت کی وہ خبر تھی جو اسے دو ماہ بعد اچانک ملی تھی۔'' نگہت نے بتایا تو انسپکٹر زیرک نے اس کی طرف بغور دیکھا۔

''اس کے شوہر کی موت کی خبر.....؟ دو ماہ بعد اسے ملی.....آپ مجھے تفصیل سے بتائیں۔''

''ثروت ماں باپ کے انتقال کے بعد اکیلی ہی اپنے شہر میں رہتی تھی۔ اس کے دونوں بھائی روزگار کے سلسلے میں ملک سے باہر تھے۔ ثروت کی ملاقات ظفر احمد سے ہوئی تو دونوں نے شادی کرلی۔ ظفر احمد نے بتایا تھا کہ وہ اسی شہر کا رہائشی ہے اور اس کا بزنس ہمارے شہر میں ہے اس لیے اسے بزنس کے لیے پندرہ دن یہاں رہنا ہوتا تھا اور وہ پندرہ دن ثروت کے پاس ہوتا تھا کیونکہ اس کا کاروبار اس شہر میں بھی تھا۔ پھر جب ظفر احمد اس شہر میں آیا تو وہ پندرہ دن بعد واپس نہیں گیا اور جو نمبر ثروت کے پاس تھا، وہ مسلسل بند جارہا تھا۔'' نگہت کچھ دیر رکنے کے بعد پھر بولی۔ ''ثروت کو پریشانی ہوئی تو وہ اسے تلاش کرنے لگی۔ ثروت نے کبھی یہ معلوم ہی نہیں کیا تھا کہ ظفر کا کاروبار اس کے شہر میں کس جگہ پر ہے۔ وہ کچھ نہیں جانتی تھی اور نہ اس نے جاننا چاہا تھا۔ جب اس کا شوہر اچانک غائب ہوا تو اس نے اسے تلاش کرنے کی کوشش کی..... اس نے مجھ سے بھی رابطہ کیا۔ الیاس نے بھی ظفر کا پتا لگانے کی کوشش کی لیکن بغیر معلومات کے وہ کیسے ملتا.....''

نگہت چپ ہوئی تو انسپکٹر زیرک نے پوچھا۔ ''پھر کیا ہوا.....؟''

''پھر اچانک ثروت کو اپنے شہر میں ناصر ملا جو ان کی شادی میں گواہ کے طور پر شامل ہوا تھا۔ اس نے ظفر احمد کا پتا دیا اور وہ میرے شہر آگئی۔ ہم دونوں اس پتے پر جب پہنچے تو ثروت پر پہلی بار یہ انکشاف ہوا کہ ظفر احمد پہلے سے شادی شدہ اور جوان بچوں کا باپ تھا اور اس کی پہلی بیوی اور بچوں پر بھی یہ خبر حیرت بن کے ٹوٹی کہ اس شخص نے خفیہ دوسری شادی بھی کی ہوئی تھی۔''

''اوہ.....'' انسپکٹر زیرک نے اپنے ہونٹوں کو سیٹی بجانے کی شکل دیتے ہوئے سر ہلایا۔

''ظفر احمد کی دوسری بیوی کو دیکھ کر اس کی پہلی بیوی

اور بچوں نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ وہاں پر اچھی خاصی تلخ کلامی ہوگئی اور ظفر احمد کے بڑے بیٹے نے غصے سے شیشے کا جگ ثروت کو دے مارا..... وہ عین وقت پر نیچے جھک گئی ورنہ اس کا سر پھٹ جاتا۔ اس پر ہی نہیں اس لڑکے نے پھر حملہ کرنے کی کوشش کی اور میں زبردستی ثروت کو کھینچتی ہوئی وہاں سے واپس لے آئی۔''

''اس کے بعد کیا ہوا.....؟''

''دو دن سے ثروت سوچ رہی تھی کہ وہ کیا کرے۔ اس نے قانونی چارہ جوئی کے لیے وکیل صاحب سے بھی مشورہ کیا تھا۔ الیاس ہی ثروت کو اپنے ساتھ وکیل کے پاس لے کر گئے تھے تاکہ اس کی چھوڑی ہوئی جائداد میں سے اس کو بھی حصہ ملے.....''

''وکیل نے کوئی کارروائی کی تھی؟''

''ابھی مشورہ ہو رہا تھا۔ جانے ان تک کیسے یہ بات پہنچ گئی اور ظفر احمد کے اسی بیٹے کا فون ثروت کو آیا۔ اس نے غلیظ زبان استعمال کرتے ہوئے اسے جان سے مار دینے کی دھمکی دی تھی۔'' نگہت بولی۔

''ظفر احمد کے اس بیٹے کا کیا نام ہے؟''

''اس کا نام عامر ہے۔ وہ اس کا بڑا بیٹا ہے اور بہت بدتمیز ہے۔ شاید دولت نے اسے ایسا بنا دیا ہے۔'' نگہت نے کہا۔

''مجھے ظفر احمد کی پہلی بیوی کے گھر کا پتا بتا دیں۔'' انسپکٹر زیرک نے کہا تو نگہت نے اسے پتا سمجھا دیا۔ پتا نوٹ کرنے کے بعد انسپکٹر زیرک نے دائیں بائیں کا جائزہ لیا۔ پولیس ثروت کی لاش کو اٹھا کر لے گئی تھی۔ اس نے نگہت سے کہا۔ ''جب آپ کے شوہر آجائیں تو انہیں پولیس اسٹیشن بھیج دیجیے گا، ان سے بھی بات کرنی ہے۔''

''آپ ان سے کیا بات کریں گے؟'' شمس نے جلدی سے پوچھا۔

انسپکٹر زیرک نے اسے گھور کر دیکھا اور پھر دھیمے لہجے میں کہا۔ ''ان سے بات کرنی ہے کہ آج کل ٹریولنگ اخراجات کتنے آجاتے ہیں۔'' انسپکٹر زیرک نے کہا۔ شمس اس بات میں الجھ گیا کہ انسپکٹر زیرک اس سے اخراجات کے بارے میں کیوں پوچھنا چاہتا ہے؟

انسپکٹر زیرک نے نگہت کی طرف گھوم کر کہا۔ ''مجھے اس جگہ کا پتا چاہیے جہاں آپ کے شوہر کام کرتے ہیں..... اس شہر میں ان کا آفس ہوگا یقیناً.....''

اس سے قبل کہ نگہت کچھ کہتی، شمس نے اپنی جیب سے اپنا پھولا ہوا بٹوا نکال لیا۔ ''بالکل..... ان کا آفس اس شہر میں ہے۔ دو، چار مرتبہ میں بھی وہاں جا چکا ہوں اور ان کا کارڈ بھی میرے پاس ہے۔'' اپنے پھولے ہوئے بٹوے سے ایک کارڈ تلاش کر کے اس نے انسپکٹر زیرک کی طرف بڑھا دیا اور وہ یہ بالکل بھی نہیں دیکھ سکا کہ جب وہ ایسا کر رہا تھا تو نگہت اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

انسپکٹر زیرک نے کارڈ لے کر پڑھا اور بولا۔ ''شکریہ.....''

''جی شکریہ کی کوئی بات نہیں ہے، میرے پاس اور لوگوں کے بھی وزیٹنگ کارڈز ہیں، آپ کو ضرورت ہے تو میں وہ بھی دے سکتا ہوں.....'' یہ بات کہتے ہوئے جونہی شمس نے انسپکٹر زیرک کی طرف دیکھا تو اس کی گھورتی آنکھوں کی تاب نہ لاتے ہوئے اس نے بٹوا اپنی جیب میں ٹھونس لیا۔ جبکہ نگہت کی نگاہیں شمس پر مرکوز تھیں۔

☆☆☆

پوش علاقے میں وہ ایک بڑا اور عالیشان گھر تھا۔ انسپکٹر زیرک ایک عام گاڑی میں بغیر وردی کے اپنے ساتھی حسن کے ساتھ پہنچا تھا۔ بیل دینے کے بعد تھوڑی دیر انتظار کیا تو اندر سے ایک عورت کی آواز آئی۔ ''کون.....؟''

''مجھے مسز ظفر احمد سے ملنا ہے اور میں انسپکٹر زیرک ہوں۔'' انسپکٹر زیرک نے کہتے ہوئے اپنا تعارف کرایا تو اندر سے کسی کے تیزی سے واپس جانے کی آواز آئی اور کچھ ہی دیر گزری تھی کہ کسی کے گیٹ کے پاس آنے کی آواز سنائی دی اور اس نے بغیر گیٹ کھولے پوچھا۔

''وہ عدت میں ہیں اور مل نہیں سکتیں۔ وہ یہ بھی پوچھ رہی تھیں کہ آپ ان سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟''

''میں ان کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ میں یہ بھی جاننا چاہوں گا کہ آپ کون ہیں۔''

''میں ان کی کام والی ہوں۔'' اس نے بتایا۔

''ان سے جا کر کہو کہ مجھے ان سے ضروری بات کرنی ہے۔ بات پردے میں بھی ہو سکتی ہے۔'' انسپکٹر زیرک نے کہا۔ اس کے جانے کی پھر آواز آئی۔ کچھ انتظار کے بعد جب گیٹ کھلا تو وہ انیس سال کی عمر کا ایک نوجوان تھا۔ جس نے متحیر انداز میں دائیں بائیں اور پھر اپنے سامنے کھڑے اس شخص کی طرف مشکوک نظروں سے دیکھا۔ باہر کوئی پولیس والا دکھائی نہ دینے پر وہ سوچ رہا تھا کہ اس شخص نے اس کی نوکرانی سے جھوٹ بولا ہے۔

''مجھے انسپکٹر زیرک کہتے ہیں۔ کیا آپ ظفر احمد کے

صاحبزادے ہیں؟'' انسپکٹر زیرک نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

''جی.....'' اس نے متانت سے اثبات میں سر ہلایا۔

''آپ کا نام؟'' انسپکٹر زیرک نے سوال کیا۔

''آپ کیوں آئے ہیں..... آپ کو اس عورت نے بھیجا ہے؟'' نوجوان نے جواب دینے کے بجائے سوال کردیا۔

''آپ کس عورت کی بات کررہے ہیں؟'' انسپکٹر زیرک کی نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

وہ نوجوان ہچکچایا۔ ''وہ عورت..... جو کہتی ہے کہ وہ پاپا کی دوسری بیوی تھی۔''

''مجھے اس نے نہیں بھیجا..... بہتر ہے ہم اندر بیٹھ کر بات کریں۔'' انسپکٹر زیرک نے کہا۔

''آپ اندر نہیں جاسکتے اور نہ ہی میری مما آپ سے مل سکتی ہیں۔'' نوجوان نے کوشش کی کہ اس کا لہجہ پُراعتماد رہے۔

''میں زیادہ وقت ضائع کرنے کا عادی نہیں ہوں اور نہ ہی روایتی انداز کا پولیس والا ہوں۔ مجھے اندر جانے کی اجازت دو ورنہ میں خود بھی اندر جاسکتا ہوں کیونکہ وہ عورت جو آپ کے والد کی دوسری بیوی تھیں، اس کا قتل ہوگیا ہے۔'' انسپکٹر زیرک نے متانت سے کہا تو جیسے نوجوان ایک دم ڈر گیا۔ اس نے متوحش نظروں سے انسپکٹر زیرک کی طرف دیکھا اور گیٹ بند کرکے اندر جانا چاہتا تھا کہ انسپکٹر زیرک نے آگے پیر رکھ دیا اور گیٹ لاک نہیں ہوا۔ وہ نوجوان تیزی سے اندر چلا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد ملازمہ ایک کمرے میں لے گئی جس کی کھڑکی دوسرے کمرے میں بھی کھلتی تھی۔ اس کھڑکی کے پاس ایک کرسی تھی۔ ملازمہ نے انسپکٹر زیرک کو اس کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولی۔ ''بی بی صاحبہ دوسرے کمرے میں کھڑکی کے ساتھ بیٹھی ہیں۔ آپ بات کرسکتے ہیں۔''

انسپکٹر زیرک نے اپنا گلا صاف کرنے کے بعد کہا۔ ''میرا نام انسپکٹر زیرک ہے اور آج ظفر احمد کی دوسری بیوی کا قتل ہوگیا ہے.....''

''مجھے ابھی ملازمہ نے بتایا ہے۔'' کھڑکی کی دوسری طرف سے مسز ظفر کی آواز آئی۔

''ظفر احمد نے ان کے ساتھ دوسری شادی کی تھی اور آپ سب کو لاعلم رکھا تھا۔'' انسپکٹر زیرک نے کہا۔

''جی ایسا ہی تھا۔''

''جب اس بات کا علم آپ سب کو ہوا تو آپ کے بیٹے عامر نے ہنگامہ کردیا تھا اور ثروت کو جگ بھی مار دیا تھا۔''

''عامر کے اس غصے کی وجہ ثروت کا رویہ تھا۔ وہ بہت تیز طرار تھی۔ اس نے غصے میں کچھ ایسی باتیں بولی تھیں کہ عامر کی برداشت سے باہر ہوگیا اور اس نے غصے سے قریب پڑا پانی کا جگ اس کی طرف پھینکا تھا..... مارا نہیں تھا۔'' مسز ظفر کی آواز آئی۔

''عامر نے اسے قتل کی دھمکیاں بھی دی تھیں۔''

''ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ عامر نے کوئی قتل کی دھمکی نہیں دی تھی، وہ پڑھنے لکھنے والا لڑکا ہے۔''

''میں عامر سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''وہ گھر میں نہیں ہے۔''

''میں انتظار کرلیتا ہوں، آپ اسے بلالیں۔''

''وہ شہر سے باہر گیا ہوا ہے۔'' مسز ظفر کی آواز میں اعتماد کی کمی تھی جسے انسپکٹر زیرک نے نوٹ کیا تھا۔

''کس شہر میں گیا ہے؟''

''وہ اسلام آباد گیا ہے۔ کاروباری معاملہ ہے۔ سارا کاروبار وہی دیکھتا ہے۔'' مسز ظفر نے بتایا۔

''ابھی آپ نے کہا تھا کہ وہ پڑھنے لکھنے والا لڑکا ہے..... آپ کی اس بات کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ کالج، یا یونیورسٹی میں پڑھتا ہے؟'' انسپکٹر زیرک نے جلدی سے سوال کیا۔

مسز ظفر تذبذب میں مبتلا ہوگئی۔ ''میرا مطلب ہے کہ اس نے ابھی پڑھائی چھوڑی ہے اور کاروبار کو سنبھال لیا ہے۔''

''جب آپ کو پتا چلا کہ آپ کے شوہر نے دوسری شادی کی ہے تو آپ کو یقیناً دھچکا لگا ہوگا کیونکہ انہوں نے وہ شادی خفیہ رکھی تھی۔''

''ایسا ہونا فطری بات تھی۔''

''ظفر مرحوم کی دوسری بیوی اچانک اس وقت قتل ہوجاتی ہے جب وہ آپ کے سامنے آتی ہے۔ ان کی دوسری بیوی ثروت کا اس شہر میں کوئی ایسا جاننے والا بھی نہیں تھا جس کے ساتھ اس کا کوئی معاملہ ہو۔ اس کے قتل کے بعد آپ کا بیٹا بھی شہر میں نہیں ہے.....''

''میں نے بتایا نا کہ میرا بیٹا اپنے کاروبار کے سلسلے میں شہر سے باہر ہے۔'' مسز ظفر نے جلدی سے کہا۔

''مجھے ان کا موبائل نمبر دے دیں۔''

''وہ موبائل فون ساتھ لے کر نہیں گیا.....'' مسز ظفر کہتی ہوئی ایک دم چپ ہوگئی۔ انسپکٹر زیرک اس کے بولنے کا منتظر تھا۔ اس نے بات گھمائی۔ ''میرا مطلب ہے کہ اس کا

موبائل فون بند جا رہا ہے۔ شاید وہ بہت بزی ہے۔''

''ایک کاروباری آدمی کا موبائل فون بند ہونا ایسے ہی ہے جیسے وہ خود اپنا نقصان کر رہا ہو۔ اسی ذریعے سے تو وہ لاکھوں کا لین دین کرتا ہے۔ بہرحال آپ مجھے اس کا نمبر دے دیں۔'' انسپکٹر زیرک نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا تو اس نے جلدی سے اپنی نوٹ بک سیدھی کر لی۔

کھڑکی کی دوسری طرف سے بالکل خاموشی تھی۔ پھر آواز آئی۔ ''ثروت کے قتل کے ساتھ ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کا قتل جہاں ہوا ہے وہاں پوچھ گچھ کریں.....''

''بہتر یہ ہے کہ آپ مجھے مشورہ نہ دیں بلکہ عامر کا موبائل فون نمبر دے دیں۔'' انسپکٹر زیرک نے نرم لہجے میں کہا تو کچھ توقف کے بعد اس نے عامر کا موبائل نمبر لکھوایا اور ساتھ ہی یہ کہہ دیا۔ ''میں عدت میں ہوں اور زیادہ بات نہیں کر سکتی..... مہربانی ہوگی آئندہ آپ اس معاملے سے ہمیں دور رکھیں۔''

''میری کوشش ہوگی کہ آپ اس معاملے سے دور رہیں لیکن اگر یہ معاملہ مجھے کھینچ کر اس دروازے تک لے آیا تو میں مجبور ہوں گا۔'' انسپکٹر زیرک کہہ کر کھڑا ہو گیا اور حسن کے ساتھ باہر جانے لگا تو وہ رک گیا۔ انسپکٹر زیرک نے ایک طرف دیکھا اور باہر چلا گیا۔

☆☆☆

پولیس اسٹیشن میں ایک نوجوان بینچ پر بیٹھا تھا۔ اس نے جینز کے ساتھ شرٹ اور اوپر کوٹ پہنا ہوا تھا۔ اس نے اچھی طرح سے شیو بنائی ہوئی تھی۔ بوٹ بھی چمک رہے تھے۔ وہ پندرہ منٹ سے اس بینچ پر براجمان تھا۔ اس کے چہرے پر اعتماد اور اطمینان عیاں تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد اسے کمرے میں بلا لیا گیا۔ سامنے انسپکٹر زیرک اور اس کے برابر والی کرسی پر حسن بیٹھا تھا۔ انسپکٹر زیرک نے نوجوان کو اپنے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ جونہی وہ کرسی پر بیٹھا انسپکٹر زیرک نے پہلا سوال کیا۔

''آپ کا نام الیاس ہے؟''

''جی میرا نام الیاس ہے۔'' اس کی آواز میں بھی اعتماد تھا۔

''آپ مارکیٹنگ کے شعبے میں ہیں؟''

''میں کمپنی میں زونل سیلز منیجر ہوں۔'' اس نے فوری اپنا مکمل عہدہ بتایا۔

''آپ کے گھر میں قتل کی واردات ہوئی ہے اور آپ شہر سے باہر تھے۔'' انسپکٹر زیرک نے اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''مجھے بہت دکھ اور افسوس کے ساتھ خوف بھی ہے۔''

''خوف بھی ہے؟'' انسپکٹر زیرک نے فوری سوال کیا۔

''جس کے گھر میں قتل ہو جائے وہ خوفزدہ نہیں ہوگا؟''

''ہاں..... بالکل ہوگا۔''

''مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ میرے گھر میں ثروت کا قتل ہو گیا ہے۔'' اس نے پہلو بدلا۔

''آپ کو کسی پر کوئی شک ہے؟ آپ نے کچھ محسوس کیا ہو، کچھ ایسا دیکھا ہو جو غیر معمولی ہو؟''

''اسے اس کے پہلے شوہر کے بیٹے اور بیوی کی طرف سے مسلسل دھمکیاں مل رہی تھیں۔ وہ بہت پریشان تھی اور ڈری ہوئی بھی تھی۔'' اس نے بتایا۔

''اپنے خوف اور ڈر کا اظہار اس نے آپ سے کیا تھا؟''

''بالکل کیا تھا..... میں ہی تو اسے وکیل کے پاس لے کر گیا تھا۔ اس سلسلے میں ہم قانونی چارہ جوئی کرنا چاہتے تھے۔''

''آپ کی ''ہم'' سے کیا مراد ہے؟'' انسپکٹر زیرک نے اس کے جواب سے سوال اچک لیا۔

اس نے ایک لمحہ چونک کر انسپکٹر زیرک کی طرف دیکھا اور جواب دیا۔ ''میں، میری بیوی اور ثروت.....''

''آپ دونوں میاں بیوی اس کی مدد کر رہے تھے؟''

''جی بالکل ایسا ہی تھا۔''

''آج آپ شہر سے باہر تھے؟''

''یہ میرا معمول ہے۔ میں مارکیٹنگ کے لیے روز شہر سے باہر ہوتا ہوں۔ مجھے ڈسٹری بیوٹر سے ملنا ہوتا ہے اور وہاں کی سیل کا معاملہ دیکھنا ہوتا ہے۔'' اس نے کہتے ہوئے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور جونہی اسے احساس ہوا کہ وہ اس وقت پولیس اسٹیشن میں بیٹھا ہے تو اس نے 'سوری' کہہ کر پیکٹ اپنی جیب میں رکھ لیا۔

''آج آپ کتنے بجے شہر سے باہر گئے تھے؟''

''یہی کوئی نو بجے میں شہر سے باہر چلا گیا تھا۔''

''آپ کو قتل کی اطلاع کس نے دی؟''

''میرے عزیز ہیں شمس صاحب، انہوں نے مجھے کال کی تھی۔''

''پھر آپ فوری واپس آ گئے؟'' انسپکٹر زیرک کی نگاہیں بدستور اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

''یہ خبر سن کر میرے ہاتھ پیر پھول گئے تھے اور میں

اپنا کام چھوڑ کر فوری واپس بھاگا۔'' وہ بولا۔

انسپکٹر زیرک اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کے عقب میں کھڑا ہو کر نیچے جھکا اور اپنا منہ اس کے کان کے قریب لا کر بولا۔ ''آج آپ اس شہر سے باہر گئے ہی نہیں تھے۔''

اس بات نے جیسے الیاس کے جسم میں بے چینی بھر دی۔ اس نے تیزی سے اپنی گردن گھما کر انسپکٹر زیرک کی طرف دیکھا۔ انسپکٹر زیرک نے پہلی بار الیاس کے چہرے پر خوف دیکھا۔

''میں شہر سے باہر تھا..... یہ کس نے کہہ دیا ہے کہ میں شہر سے باہر نہیں گیا تھا؟'' اس نے اپنے خوف کو معدوم کر کے پھر اسی لہجے میں کہا۔

''آج آپ ساڑھے نو بجے اپنے آفس میں پہنچے اور اپنے سنیئر کو کال کی کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے آج میں لوکل ورکنگ کروں گا۔ گیارہ بجے آپ اپنے آفس سے باہر نکلے اور کہیں چلے گئے تھے.....'' انسپکٹر زیرک اپنی بات مکمل کرتا ہوا اپنی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔

جیسے جیسے الیاس وہ بات سن رہا تھا، اس کے چہرے پر حیرت اور پریشانی کے تاثرات آ رہے تھے۔ اپنی بات مکمل کرنے اور کرسی پر اطمینان سے بیٹھنے کے بعد انسپکٹر زیرک نے الیاس کے چہرے پر اپنی نگاہیں منجمد کر دیں۔

''جس نے بھی آپ کو یہ سب بتایا ہے، جھوٹ ہے۔ جب سے میں اس عہدے پر آیا ہوں میرے ہی کولیگ میرے مخالف بن گئے ہیں۔'' اس نے کہا۔

''مسٹر الیاس! میں وقت ضائع کرنے کا عادی نہیں ہوں اور اپنا کوئی بھی کیس روایتی انداز میں حل کرنے کے بجائے تفتیش سے مکمل کرتا ہوں۔ اس لیے بہتر ہے کہ آپ مجھے یہ بتا دیں کہ گیارہ بجے آفس سے نکل کر آپ کہاں گئے تھے۔'' انسپکٹر زیرک نے اطمینان سے کہا۔

''میں آفس میں ہی تھا۔''

انسپکٹر زیرک کے چہرے پر گہری متانت آ گئی اور اس نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''اگر میں نے بتا دیا تو پھر آپ کو صفائی کا موقع نہیں ملے گا۔ میں ابھی آپ کہہ کر مخاطب کر رہا ہوں اور ایک دم آپ سے بات تم تک جا پہنچے گی.....''

انسپکٹر زیرک کے کہنے کا انداز ایسا تھا کہ وہ تذبذب میں مبتلا ہو گیا اور بولا۔ ''میں واقعی آج شہر سے باہر نہیں گیا تھا۔''

''اب آگے سب کچھ بتا دیں۔'' انسپکٹر زیرک نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی۔

الیاس کچھ دیر بات کرنے سے قبل جھجکا اور آخر وہ بولا۔ ''دراصل آج میری ڈیٹ تھی.....''

''ڈیٹ.....؟'' انسپکٹر زیرک نے وضاحت چاہی۔

''کچھ ہفتوں پہلے میری فیس بک پر نادیہ نام کی لڑکی کے ساتھ دوستی ہوئی تھی اور ہم کبھی کبھار گھوم بھی لیتے تھے۔ اس دن بھی ہم نے باہر پروگرام بنایا تھا اور ہمارا کچھ شاپنگ کا ارادہ بھی تھا۔ میں اس کے ساتھ تھا اور اس دوران مجھے کال آئی کہ ثروت کا قتل ہو گیا ہے..... میں نادیہ کے ساتھ تھا اور یہی حقیقت ہے۔''

''شادی شدہ ہو کر آپ اب بھی عشق لڑا رہے ہیں۔ بیوی سے خوش نہیں ہیں کیا؟''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے، بس وہ ایسے ہی دوستی ہوئی اور بات کچھ آگے بڑھ گئی۔''

''میں نادیہ کی آئی ڈی دیکھنا چاہتا ہوں۔'' انسپکٹر زیرک کے کہنے پر اس نے جھجکتے ہوئے اپنے موبائل فون سے اس کی آئی ڈی دکھائی اور انسپکٹر زیرک نے اس کا موبائل فون پکڑ کر ایک نظر حسن کو بھی دکھا دی۔

''ٹھیک ہے، اب آپ جائیں۔'' انسپکٹر زیرک نے کہا۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ ''ایک گزارش کرنی تھی آپ سے۔''

''ہاں بولیں۔''

''اس بات کا ذکر میری بیوی سے نہ کیجیے گا۔''

''ابھی تفتیش جاری ہے۔ آگے کیا حالات ہوتے ہیں کچھ کہہ نہیں سکتا کہ کیا راز رہے گا اور کیا چیز سامنے آ جائے گی۔'' انسپکٹر زیرک نے کہا تو الیاس منہ لٹکا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد انسپکٹر زیرک نے حسن کی طرف دیکھا۔ ''حسن! عشق تو تم نے بھی کیا تھا۔''

''سر جی..... اب اس کا کیا ذکر؟'' حسن شرماتے ہوئے مسکرایا۔

''یہ بات سچ ہے کہ عشق میں بندہ کچھ بھی کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ محبوبہ کی ہر خواہش پوری کرنے کے لیے وہ کوئی بھی قدم اٹھا لیتا ہے۔ جب تمہاری محبوبہ نے ایک خواہش کی تھی تو تم نے اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے اپنے ابا کی قیمتی بھینس کا سودا کر دیا تھا.....''

حسن ہنسا۔ ''بھینس کا بیعانہ لیا تھا۔ ابا کو پتا چلا تو انہوں نے وہ چھتر مارے کہ میں محبوبہ کو بھول گیا۔'' اس کی بات سن کر انسپکٹر زیرک بھی ہنسا۔ اس نے مزید کہا۔ ''یہ سچ ہے کہ محبوبہ کی ایک ادا کسی کو قتل بھی کروا سکتی ہے۔''

TAGHK.COM

''ہوں.....'' انسپکٹر زیرک نے سوچتے ہوئے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔

☆☆☆

انسپکٹر زیرک نے اپنی تفتیش میں جس کو شامل کرنا تھا اور جس سے ملاقات کرنی تھی، وہ اس نے کی تھی لیکن عامر سے نہ تو موبائل فون پر رابطہ ہو رہا تھا اور وہ گھر میں بھی نہیں مل رہا تھا۔ تین دن کے بعد جب حسن دوبارہ عامر کے گھر اس کا پتا کرنے گیا تو گھر والوں نے بتایا کہ وہ نہیں ہے اور اسی شام کو عامر کا ایک رشتے دار معراج پولیس اسٹیشن انسپکٹر زیرک کے پاس پہنچ گیا اور پریشانی کے عالم میں بولا۔

''آپ نے عامر کو گرفتار کیا ہے تو کیوں؟ اس کا قصور کیا ہے؟''

انسپکٹر زیرک نے پہلے تو اس کا جائزہ لیا اور اس کے بعد دھیمے لہجے میں بتایا۔ ''ابھی تک ہمیں عامر ملا ہی نہیں ہے اور گرفتار کیسے کر لیا اسے؟''

''وہ اپنے کاروبار کے سلسلے میں شہر سے باہر گیا تھا اور اب نہ تو ہمارا اس سے رابطہ ہو رہا ہے اور نہ ہی وہ واپس آیا ہے۔ آپ لوگوں نے عامر کو ناجائز اور بغیر کسی وجہ کے گرفتار کیا ہوا ہے جس کی ہمیں اطلاع نہیں دی جا رہی ہے۔'' معراج کا لہجہ تیز ہو گیا تھا۔

''اگر عامر لاپتا ہے تو اس کی رپورٹ درج کرا دیں۔ پولیس نے اسے گرفتار نہیں کیا ہے۔''

''آپ غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں۔ ہمارے بچے کو آپ نے کہیں بند کیا ہوا ہے۔''

انسپکٹر زیرک نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''شکر کریں آپ کا سامنا کسی روایتی پولیس والے سے نہیں ہے ورنہ اس وقت یہاں کا سین کچھ اور ہی ہوتا۔ ہم پر الزام لگانے سے بہتر ہے کہ... اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرا دیں اور اس کی ایک تصویر بھی تھانے میں جمع کرا دیں۔''

''میرا وکیل آپ سے بات کرے گا۔''

''یہ بات زیادہ بہتر ہے۔'' انسپکٹر زیرک نے اطمینان سے کہا تو معراج اس کی طرف ایسے دیکھنے لگا جیسے وہ کوئی اور امید لے کر اس کے پاس آیا تھا۔ انسپکٹر زیرک نے اتنا کہہ کر فائل کھول لی تھی اور اپنے اسسٹنٹ حسن کے ساتھ کوئی بات کرنے لگا تھا۔ جب معراج نے دیکھا کہ اس کی طرف کوئی توجہ نہیں ہے تو وہ بولا۔

''میرا وکیل ابھی آئے گا۔''

''جب بھی آپ کا وکیل آئے منشی سے مل لے۔'' انسپکٹر زیرک کہہ کر حسن کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گیا۔ معراج کچھ دیر ان کو گھورنے کے بعد جونہی کمرے سے باہر نکلا انسپکٹر زیرک نے فائل بند کی اور بولا۔

''اس کا پیچھا کرو۔''

حسن نے اپنا موبائل فون اٹھا کر ایک کال کی اور موبائل فون کو کان سے لگا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

معراج نے باہر نکل کر اپنی بائیک نکالی اور ایک طرف چلا گیا۔ وہ یہ بات نہیں جانتا تھا کہ اس کے تعاقب میں ایک بغیر وردی والا شخص موٹر سائیکل پر براجمان تھا۔

معراج ایک محلے میں چلا گیا تھا۔ اس نے بائیک ایک مکان کے سامنے کھڑی کی اور بیل دینے کے بعد دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد جونہی دروازہ کھلا، وہ اندر چلا گیا۔ پیچھے آنے والا پولیس والا کسی کو کال کرنے لگا۔ ابھی وہ کال کرنے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ اسی مکان کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور معراج نے سر نکال کر پولیس والے کی طرف دیکھا اور فوری دروازہ بند کر کے اندر بھاگا اور ایک کمرے کا دروازہ کھولا تو سامنے پلنگ پر عامر بیٹھا موبائل فون پر لگا ہوا تھا۔

''یہاں سے بھاگو..... پولیس میرا پیچھا کرتی ہوئی یہاں تک پہنچ گئی ہے۔''

عامر جلدی سے اٹھا اور اپنے جوگرز پہن کر کمرے سے باہر نکلا۔ معراج اسے سیڑھیوں کی طرف لے گیا۔ وہ دونوں چھت پر چلے گئے۔

''چھتوں سے ہوتے ہوئے یہاں سے چوتھے مکان کی چھت پر چلے جانا۔ وہ مکان میرے دوست کا ہے۔ میں اسے کال کر دیتا ہوں۔ وہ تمہیں نیچے سے نکال دے گا۔ اب تم یہاں کہیں مت رکنا اور بھاگ جانا.....''

عامر دیوار پر چڑھا اور دوسری طرف کود گیا۔ اسی دوران اس کے دروازے پر تیز بیل ہوئی اور وہ چھت کا دروازہ لاک کر کے نیچے چلا گیا۔ نیچے جا کر اس نے دروازہ کھولا تو اسی پولیس والے کے ساتھ جو اس کا پیچھا کر کے یہاں تک آیا تھا، ایک اور آدمی بھی تھا۔ دروازہ کھلتے ہی دونوں تیزی سے اندر چلے گئے۔

''کیا بات ہے، کون ہو تم؟'' معراج نے رعب دار انداز میں پوچھا۔

''چپ چاپ کھڑے رہو۔ گھر میں کون کون ہے؟'' ایک نے درشت لہجے میں کہا۔

''میں اکیلا ہی ہوں۔''

جو آدمی اس کا تعاقب کر کے یہاں تک پہنچا تھا، اس نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا تو اس نے معراج کو پکڑ کر ایک طرف بٹھا دیا اور وہ آدمی ایک ایک کمرے کی تلاشی لینے لگا۔ ہر کمرا خالی تھا۔ اس نے اوپر کی چھت تک دیکھ لی لیکن اسے کوئی نہیں ملا۔ وہ واپس ان کے پاس آ گیا۔

''کچھ ملا.....؟'' معراج نے تمسخرانہ لہجے میں پوچھا اور پھر ایک طنزیہ مسکراہٹ اپنے چہرے پر عیاں کی۔

وہ دونوں اہلکار سوچ رہے تھے کہ وہ اس کے طنز کا کیا جواب دیں۔ جب معراج نے عامر کو چھت سے کودنے کے لیے کہا تھا، اسے کال کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا اور وہ تیزی سے نیچے آ گیا تھا۔

جب عامر چھت پھلانگتا ہوا اس مکان کی چھت پر پہنچا تو وہ تیزی سے سیڑھیاں اتر کر نیچے چلا گیا۔ معراج کا دوست اس وقت کچن میں چائے بنا رہا تھا۔ اسے کوئی تیزی سے سیڑھیاں اترتا ہوا سنائی دیا۔ وہ اپنا کام چھوڑ کر غور سے سننے لگا اور پھر اپنا وہم سمجھ کر چائے بنانے میں مشغول ہو گیا۔

عامر نے باہر کا دروازہ کھولا اور تیزی سے گھر سے باہر نکل کر ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ ایک اہلکار باہر موجود تھا۔ جب اس نے ایک نوجوان کو گھر سے باہر نکل کر ایک طرف تیزی سے بھاگتے ہوئے دیکھا تو اس نے اپنی بائیک اس کے پیچھے لگا دی۔

تھوڑا آگے جا کر ہی عامر کو احساس ہو گیا تھا کہ اس کے پیچھے کوئی ہے۔ اس نے گردن گھما کر دیکھا اور بھاگنے کی رفتار اور بھی تیز کر لی۔ اس کے تعاقب میں آنے والے نے بھی اپنی بائیک اس کے پیچھے ہی رکھی تھی۔

عامر نے بھاگتے بھاگتے کوڑے کا ڈرم گرا دیا۔ وہ گھومتا ہوا سڑک کے درمیان میں آ گیا اور تیز رفتار بائیک اس کے ساتھ ٹکرا گئی۔ وہ اہلکار اپنی بائیک سمیت نیچے گر گیا۔

وہ اہلکار تیزی سے اٹھا اور عامر کے پیچھے بھاگنے لگا۔ عامر نے کوشش کی کہ وہ اس سے بھی تیز بھاگے..... لیکن ایسا ممکن نہ ہو سکا اور اس اہلکار نے اسے دبوچ ہی لیا۔

☆☆☆

عامر پولیس اسٹیشن میں سہما اور گھبرایا ہوا بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے انسپکٹر زیرک اور حسن کھڑے اس کی... طرف ایسے دیکھ رہے تھے جیسے عامر ان کے سامنے کوئی بہت بڑا انکشاف کرنے والا ہو۔

اس صورتِ حال سے قبل جب عامر کو پولیس اسٹیشن میں لایا گیا تو وہ کسی معصوم بچے کی طرح ڈرا ہوا تھا اور ساتھ چلا بھی رہا تھا۔

''میں بے قصور ہوں..... میں نے کچھ نہیں کیا..... مجھے چھوڑ دو..... مجھے جانے دو..... خدا کی قسم میں نے کچھ نہیں کیا ہے.....''

اسے بہ مشکل چپ کرایا گیا۔ اس کے بعد انسپکٹر زیرک نے کہا کہ وہ سب کچھ بتائے کہ وہ چھپا کیوں تھا اور پھر فرار ہونے کی کوشش کیوں کی تھی؟

عامر کسی ننھے بچے کی طرح روتے ہوئے بتانے لگا کہ جب اسے اور اس کی فیملی کو یہ پتا چلا کہ ثروت کا قتل ہو گیا ہے تو وہ سب بری طرح سے ڈر گئے تھے۔ جب ثروت ان کے گھر آئی تھی تو اس نے اس پر حملہ بھی کیا تھا اور اسے جان سے مارنے کی دھمکی بھی دی تھی۔ قتل کے بعد وہ سب اتنے خوفزدہ ہو گئے تھے کہ کہیں ثروت کی دوست اور اس کا شوہر ان پر قتل کا الزام نہ لگا دیں اور پولیس گرفتار کر کے اسے جیل میں نہ ڈال دے۔

ایسا سوچنے کے بعد وہ اپنے انکل معراج کے پاس جا کر چھپ گیا تھا تاکہ وہ حالات کا جائزہ لے سکیں اور اس کے بعد وہ سامنے آ جائے گا۔

سب کچھ بتانے کے بعد وہ پھر رونے لگا اور بار بار اپنی سچائی بیان کرنے لگا۔ جیسا وہ بگڑا ہوا نوجوان لگتا تھا اندر سے اس سے کہیں زیادہ ڈرپوک تھا۔

اس کی ساری باتیں سننے کے بعد انسپکٹر زیرک نے حسن کی طرف دیکھا اور اس کے قریب جا کر دھیرے سے بولا۔ ''یہ تو بالکل ہی موم ہے۔''

''مجھے تو اس کی بات کا یقین ہے۔''

''اتنا بھی یقین نہ کرو۔''

''کیا مطلب ہے سر؟'' حسن نے اس کی طرف دیکھا۔

''کچھ لوگ بہت بڑے اداکار ہوتے ہیں اور ایسے اداکاروں کو کھلا چھوڑ دینا چاہیے۔''

''آپ کا مطلب ہے اس پر ابھی شک کا پہرا رہنے دیں؟'' حسن نے پوچھا۔

''اسے تسلی دو اور یہاں سے رخصت کر دو۔ آگے کیا کرنا ہے میں بعد میں بتاؤں گا۔'' انسپکٹر زیرک نے کہا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

حسن نے ایک طرف سر جھکائے عامر کی طرف دیکھا اور اس کے قریب جا کر بولا۔ ''سر کو تمہاری بات پر یقین ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ تم جاؤ اور اب تمہیں کہیں چھپ کر بیٹھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

''واقعی.....؟'' عامر نے ایک دم سر اٹھا کر حسن کی طرف دیکھا۔

''ہاں.....'' وہ بولا۔

''تو میں جاؤں؟'' عامر مسکراتے ہوئے کھڑا ہوگیا۔ جس خوف اور ڈر میں وہ مبتلا تھا وہ اب معدوم ہو چکا تھا۔ حسن نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے جانے کی اجازت دے دی۔ عامر تیزی سے باہر چلا گیا۔ حسن کچھ دیر تک بند دروازے کو دیکھتا رہا۔

☆☆☆

الیاس بہت پریشان تھا۔ اسے ایک پریشانی تو یہ تھی کہ جس عشق کو اس نے خفیہ رکھا تھا، وہ انسپکٹر زیرک کی نظر میں آگیا تھا اور اگر تفتیش مزید آگے بڑھتی تو کہیں نادیہ کا راز اس کی بیوی نگہت تک نہ پہنچ جائے۔ اسے دوسری پریشانی یہ تھی کہ وہ چند روز سے نادیہ کو نظر انداز کر رہا تھا۔ اس کے دن میں چار، پانچ فون اور کئی میسجز آتے تھے اور وہ اس سے رابطہ نہیں کر رہا تھا۔

نادیہ کی طرف سے آنے والے ایک میسج نے الیاس کو مضطرب کر دیا تھا۔ اس نے لکھا تھا۔ ''میں ایک گھنٹے میں تمہارے گھر پہنچ رہی ہوں۔''

اس میسج نے جیسے الیاس کے پیروں تلے سے زمین کھینچ لی تھی۔ وہ اس وقت اپنے آفس میں بیٹھا تھا اور جس کام میں وہ مصروف تھا وہ کام کرنا اس کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔

وہ سوچنے لگا کہ وہ کیا کرے۔ آخر اس نے نادیہ کو کال کی تو اس کی دوسری بیل پر ہی آواز آئی۔

''اب کیا ہوا؟ اتنی جلدی کال کر دی اور میں جو کئی روز سے کالیں کر رہی ہوں اور میسج بھیج رہی ہوں ان کا کیا تھا.....؟ اب گھر آنے کی بات کی ہے تو کال کر دی ہے۔''

''تم غلط سمجھ رہی ہو۔ ہیڈ آفس سے لوگ آئے ہوئے ہیں۔ ان کے ساتھ مصروف ہوں۔''

''میں کچھ نہیں جانتی۔ تم آدھے گھنٹے میں اسی ریسٹورنٹ میں پہنچو جہاں ہم اکثر ملتے تھے۔ آدھے گھنٹے کا مطلب آدھا گھنٹا ہی ہے.....'' نادیہ نے جلدی سے کہہ کر کال منقطع کر دی تو الیاس مزید بے تاب ہوگیا۔

الیاس کی حالت خراب تھی اور وہ دس منٹ میں دو گلاس پانی کے پی چکا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ نادیہ سے ملنے نہیں جائے گا۔ وہ خود ہی فون اور میسج کر کے چپ ہو کر بیٹھ جائے گی۔ اس نے کبھی اسے اپنے گھر کا پتا نہیں بتایا تھا اور نہ ہی اس نے کبھی اس سے یہ تذکرہ کیا تھا کہ وہ کس علاقے میں رہتا ہے۔ جب وہ اسے مسلسل نظر انداز کرے گا تو وہ اس کا پیچھا چھوڑ دے گی۔

الیاس بظاہر اپنے کام میں مصروف ہوگیا تھا لیکن اس کا دھیان اپنے موبائل فون کی طرف ہی رہا۔ آفس ٹائم ختم ہوا تو اس نے بیگ اپنے کندھے سے لٹکایا اور گھر کی طرف چلا گیا۔ اسے اطمینان تھا کہ اس نے نادیہ کی بات نہیں مانی تھی اور نادیہ نے اسے دوبارہ کال نہیں کی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ سمجھ گئی تھی کہ الیاس اس سے تعلق قائم کرنا نہیں چاہتا ہے۔

الیاس گھر پہنچا اور ابھی اس نے کپڑے بھی تبدیل نہیں کیے تھے کہ اس کی بیوی نگہت کمرے میں داخل ہوتے ہی بولی۔

''تم سے ایک بات کرنی تھی۔''

الیاس اس کی طرف متوجہ ہوا۔ ''ہاں بولو۔''

''جب ثروت ہمارے گھر میں تھی اور ایک صبح جب وہ منہ ہاتھ دھو کر باتھ روم سے باہر نکلی تو تھوڑی دیر کے بعد ہی وہ باتھ روم کی طرف بھاگی تھی۔ اس کی پریشانی دیکھ کر میں نے پوچھا تھا کیا ہوا تو اس نے بتایا تھا کہ منہ ہاتھ دھونے سے پہلے اس نے اپنی انگلی سے سونے کی انگوٹھی نکال کر بیسن پر رکھی اور اسے اٹھانا یاد نہیں رہی تھی۔ پانچ منٹ کے بعد جب اسے یاد آیا تو وہ باتھ روم میں گئی مگر انگوٹھی نہیں ملی۔'' نگہت اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''ہاں مجھے یاد ہے۔'' الیاس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے الماری کی طرف رخ کر لیا۔

''الماری سے کپڑے بعد میں نکال لینا پہلے میری بات سنو۔'' نگہت اس کی طرف بڑھی تو الیاس نے پھر اس کی طرف رخ کر لیا۔ وہ بولی۔ ''ثروت اپنی انگوٹھی کے کھو جانے پر بہت پریشان تھی۔ اس سے زیادہ پریشانی مجھے تھی کہ اس کی انگوٹھی میرے گھر میں گم ہوئی تھی لیکن اس نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی تھی کہ شاید اس سے انگوٹھی نالی میں گر گئی ہے..... اور وہ چپ ہوگئی تھی لیکن میں جانتی ہوں کہ اسے اپنی انگوٹھی کے کھو جانے کا افسوس اور دکھ تھا۔''

''تم اب مجھ سے یہ بات کیوں کر رہی ہو؟ کیا تمہیں وہ انگوٹھی باتھ روم یا کہیں اور سے مل گئی ہے؟'' الیاس کے لہجے میں اکتاہٹ تھی۔

''وہ انگوٹھی مجھے آج مل گئی ہے۔'' نگہت کے اس انکشاف پر الیاس ایک دم سے چونکا اور اس نے متحیر نظروں سے نگہت کی طرف دیکھا۔ اسی وقت نگہت نے اپنا موبائل

فون روشن کیا اور انگوٹھی کی تصویر اسے دکھائی۔ الیاس ششدر نظروں سے انگوٹھی کی تصویر دیکھنے لگا۔

''یہ تو اس کی تصویر ہے، تم نے اس وقت بنائی تھی؟''

''یہ تصویر مجھے کسی نامعلوم نمبر سے آئی ہے۔ اس نے ساتھ لکھا ہے کہ یہ انگوٹھی آپ کے شوہر الیاس صاحب نے خود اپنے ہاتھوں سے میری انگلی میں ڈالی تھی۔'' نگہت کی اس بات نے جیسے الیاس کی سانس کھینچ لی اور وہ کچھ دیر بعد بولا۔

''یہ کیسا مذاق ہے؟''

''میں اسے مذاق نہیں سمجھ رہی ہوں۔ مجھے بتاؤ نادیہ کون ہے اور تم نے ثروت کی انگوٹھی اٹھا کر اسے کیوں دی؟''

''کون نادیہ..... اور میں کسی کو انگوٹھی کیوں دوں گا۔'' الیاس تذبذب میں مبتلا ہو گیا تھا۔ بظاہر تو وہ پُراعتماد کھڑا تھا لیکن اندر سے وہ ڈر گیا تھا اور سوچ رہا تھا کہ نادیہ کے پاس نگہت کا نمبر کہاں سے آیا.....؟

نگہت اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ ''اس نے لکھا ہے کہ ہم دونوں دوست ہیں اور ایک تصویر بھی بھیجی ہے.....'' یہ کہتے ہی نگہت نے نادیہ کی طرف سے بھیجی ہوئی وہ تصویر بھی دکھائی جب وہ نادیہ کے ساتھ ریسٹورنٹ میں موجود تھا اور وہ تصویر نادیہ نے بنائی تھی۔ دونوں مسکرا رہے تھے۔

الیاس کے پاس اب بات کو گھمانے اور جھوٹ در جھوٹ بولنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ اس نے سوچا نگہت پر حقیقت منکشف کر دینا ہی بہتر ہے۔ اس نے نگہت کو ایک طرف بٹھایا اور اس کے سامنے بیٹھ کر اپنی اور نادیہ کی دوستی کے بارے میں سب کچھ بتا دیا اور یہ حقیقت بھی کھول دی کہ ثروت نے انگوٹھی اپنے بستر کے سرہانے پر رکھی تھی اور وہ ایک کام سے جب کمرے میں گیا تھا تو اس کی نظر پڑ گئی تھی اور اس نے وہ انگوٹھی اٹھا لی تھی اور نادیہ کو متاثر کرنے کے لیے انگوٹھی اسے تحفے میں دے دی تھی۔

نگہت اس کی بات سن رہی تھی اور اسے شدید صدمہ پہنچ رہا تھا۔ الیاس نے سب کچھ بتانے کے بعد ندامت آمیز لہجے میں کہا۔ ''نگہت! مجھے معاف کر دو۔ میں بس اس کی باتوں میں آ گیا تھا.....''

نگہت نے اس کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''تم ایک بات اور بھی جانتے تھے۔''

''کون سی بات؟'' الیاس نے اس کی طرف دیکھا۔

''جب وہ یہاں آئی تھی تو اس نے میرے ساتھ اکیلے میں کچھ باتیں کی تھیں۔ میری اچانک نظر پڑی تو تم دروازے کے پاس کھڑے سن رہے تھے اور مجھے دیکھتے ہی چلے گئے تھے لیکن جو اس نے کہا تھا، وہ تم نے سب سن لیا تھا.....'' نگہت کی نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں اور وہ اسے مشکوک نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''ہاں، میں نے وہ سب سن لیا تھا۔'' الیاس نے اپنی نگاہیں جھکا لیں۔

''اگر تم انگوٹھی چرا سکتے ہو تو تم.....'' نگہت کہتے ہوئے رک گئی اور اس نے متوحش انداز میں کہا۔ ''کہیں تم نے تو.....''

''کک..... کیا سوچ رہی ہو تم میرے بارے میں.....'' الیاس ایک دم بھڑک کر کھڑا ہو گیا۔

''تم اس دن شہر سے باہر بھی نہیں گئے تھے۔'' نگہت تیزی سے اس کے سامنے چلی گئی اور اس بات نے الیاس کو مزید چونکا دیا۔

''یہ بات تمہیں کس نے بتائی ہے؟''

''آج انسپکٹر زیرک آئے تھے۔ جس کمرے میں ثروت ٹھہری تھی، قتل کے بعد اس کمرے کو انہوں نے سیل کر دیا تھا۔ آج انہوں نے اس کمرے کی سیل کو کھولا اور اندر کا اچھی طرح سے جائزہ لیتے رہے اور جاتے ہوئے

دوپٹا

ہمارے ہمسائیوں کا دوپٹا ہوا کی وجہ سے ہمارے گھر آ گرا۔ میں نے اٹھایا تو خستہ حالت میں تھا۔ میں بازار گیا، رنگ کروایا، پیکو کروایا اور سوچا شام کو جاؤں گا اور ہمسایوں کی لڑکی کو دے آؤں گا۔ شام کو دوپٹا شاپر میں ڈالا اور گھر کی بیل بجائی۔ سامنے خوبرو لڑکی کھڑی تھی۔

میں نے کہا۔ ''یہ آپ کا دوپٹا ہے۔ ہوا کی وجہ سے ہمارے گھر گرا تھا، لے لیں۔''

وہ مجھے دیکھ کر پہلے تو مسکرائی پھر بولی۔ ''یہ دوپٹا نہیں، ابا کی دھوتی ہے۔''

بکھرے موتی

☆ نہ ہونے کا احساس سب کو ہے لیکن موجودگی کی قدر کسی کو نہیں۔

☆ جن کے دل میں مکافاتِ عمل کا خوف ہو، وہ لوگ برا کرنے سے پہلے کئی بار سوچتے ہیں۔

☆ تاعمر بس ایک ہی سبق یاد رکھیے۔ تعلق اور عبادت میں نیت صاف رکھیے۔

(مرسلہ: وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ)

TAGPK.COM

انہوں نے کہا کہ اپنے شوہر پر نظر رکھا کریں..... وہ شہر سے باہر جانے کا کہہ کر اسی شہر میں ہوتے ہیں.....''

الیاس کے منہ سے انسپکٹر زیرک کے لیے کچھ ایسے الفاظ نکلے جو وہ اپنی بیوی کے سامنے بول نہیں سکتا تھا۔

''اس دن مجھے کام پڑ گیا تھا اور میں باہر نہیں گیا تھا۔''

''تم نے مجھے بتایا تھا کہ تم شہر سے باہر ہو۔ جب شمس بھائی نے کال کی تو بھی تم نے کہا کہ تم شہر سے باہر ہو۔ جب تم لیٹ گھر پہنچے تو تم نے مجھے کہا تھا کہ تم سیدھے یہاں آرہے ہو اور تم نے یہ بھی کہا تھا کہ تمہارے لیے وہ سفر بہت طویل ہوگیا تھا..... تم نے سارے جھوٹ میرے آگے کس اعتماد سے بولے تھے؟'' نگہت بول رہی تھی اور الیاس اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''وہ سب باتیں میں نے اس لیے کہی تھیں تاکہ تم شک نہ کرو۔'' الیاس سے ڈھنگ کا بہانہ بھی نہ بن سکا۔

''مجھے تم سے ڈر لگنے لگا ہے۔ مجھے بتاؤ تم نے کیا منصوبہ بندی کی تھی؟'' نگہت اس سے دو قدم پیچھے ہٹ گئی تھی۔

''تم غلط سمجھ رہی ہو۔''

''اتنا کچھ سامنے آنے کے بعد بھی میں غلط سمجھ رہی ہوں؟ ثروت کا وہ سامان بھی غائب ہے جس کے بارے میں تم اور میں ہی جانتے تھے۔'' نگہت بولی۔ اس کی مشکوک نگاہیں ابھی تک الیاس کے مضطرب چہرے پر مرکوز تھیں۔

الیاس کچھ کہنا چاہتا تھا اور ابھی اس نے منہ کھولا ہی تھا کہ الیاس کے موبائل فون پر بیل ہونے لگی۔ اس نے چونک کر دیکھا تو انسپکٹر زیرک کی کال تھی۔ اس نے گھبرائے اور ڈرے ہوئے انداز میں موبائل فون کان سے لگا لیا۔ نگہت کی ساکت آنکھیں الیاس کے چہرے اور کان اس کی کانپتی آواز پر جمے ہوئے تھے۔

☆☆☆

انسپکٹر زیرک کے کمرے میں اس وقت نگہت، الیاس اور عامر کے علاوہ حسن موجود تھا۔

الیاس کی گھبرائی ہوئی صورت کو اس کی بیوی نگہت بار بار دیکھ رہی تھی اور اس کا دل ڈوب رہا تھا۔

انسپکٹر زیرک نے تینوں کی طرف باری باری دیکھا اور انکشاف کیا۔ ''میں نے ثروت کے قاتل کو گرفتار کرلیا ہے.....''

اس کی بات سنتے ہی تینوں نے چونک کر انسپکٹر زیرک کی طرف دیکھا اور نگہت نے بے چینی سے پوچھا۔

''کک..... کون ہے وہ؟''

''یہیں ہے..... اسی پولیس اسٹیشن میں۔'' انسپکٹر زیرک نے جواب دیتے ہوئے اپنے کمرے میں نظر دوڑائی۔ ''قاتل کے بارے میں بتانے سے قبل میں کچھ باتیں واضح کرنا چاہتا ہوں۔ سب سے پہلی بات یہ کہ جب قتل ہوا اور میں نے تفتیش شروع کی تو میں نے سارے معاملات کو دیکھا، ہر چیز کو نوٹ کیا لیکن مجھ سے ایک چیز نظر انداز ہوگئی۔ میں دوسرے کاموں میں تو لگ گیا لیکن اس بات کی طرف توجہ ہی نہیں دی اور جب اچانک دماغ میں وہ بات آئی تو میں قاتل تک پہنچ گیا.....''

''وہ کونسی بات تھی؟'' اس بار بھی نگہت نے ہی سوال کیا اور اپنی مضطرب نگاہیں انسپکٹر زیرک کے چہرے پر جما دیں۔

''وہ بھی بتاتا ہوں۔'' انسپکٹر زیرک نے اطمینان سے کہا۔ ''میں پہلے کچھ دوسری باتیں واضح کردوں۔ جب ثروت بی بی کی شادی ظفر احمد سے ہوئی تھی تو انہوں نے حق مہر میں اپنی دوسری بیوی کو پچاس تولے سونا لکھ کر دیا تھا جو کہ انہوں نے ادا بھی کر دیا تھا۔''

اس انکشاف نے عامر کی آنکھیں حیرت سے کھول دی تھیں۔ اسے پہلی بار اس بات کا علم ہو رہا تھا کہ اس کے باپ نے اپنی دوسری جوان بیوی کو حق مہر میں پچاس تولے سونا دیا تھا۔

انسپکٹر زیرک نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''ثروت اپنے گھر میں ایک پرانی ملازمہ کے ساتھ اکیلی رہتی تھی۔ جب اسے معلوم ہوا کہ اس کا شوہر وفات پا گیا ہے تو اس نے اس شہر میں آنے سے پہلے یہ سوچا کہ وہ پچاس تولے سونا کہاں رکھے۔ اس کی ایک رشتے دار ایماندار اور بہت پرہیزگار نیک خاتون تھی۔ ثروت اس کے پاس گئی اور اس نے پچاس تولے سونا اپنے پاس امانت کے طور پر رکھنے سے معذرت کرلی اور ثروت کے پاس اب یہی چارہ تھا کہ وہ سونا اپنے ساتھ یہاں لے آئے اور وہ سونے کو اپنے بیگ میں رکھ کر لے آئی۔'' انسپکٹر زیرک عین الیاس کے سامنے کھڑا ہوگیا تھا اور الیاس کی اٹھی ہوئی نگاہیں ایک دم جھک گئی تھیں اور پھر وہ دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ کمرے کا اکلوتا دروازہ بند تھا۔

نگہت کن انکھیوں سے الیاس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ایک دم انسپکٹر زیرک کا رخ عامر کی طرف چلا گیا۔ ''تم بہت ڈرپوک اور بزدل نکلے۔ قتل کا سنا اور چھپ گئے۔ تمہاری وہ تمام بڑکیں جھاگ کی طرح بیٹھ گئیں جو تم نے ثروت کے سامنے لگائی تھیں..... میں نے ٹھیک کہا نا؟''

''جی بالکل ٹھیک کہا۔'' عامر نے بغیر نظریں ملائے

اٹکتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

''ثروت نے الیاس کے گھر میں آتے ہی سب سے پہلے اپنے بیگ سے سونا نکال کر نگہت صاحبہ کو دیتے ہوئے کہا کہ یہ پچاس تولے سونا ہے اور اسے اپنے پاس کسی جگہ محفوظ جگہ پر رکھ لو اور کسی کو مت بتانا۔ نگہت صاحبہ نے وہ سونا ایک محفوظ جگہ پر رکھ دیا۔ ایسا ہی ہوا تھا نا نگہت صاحبہ؟'' انسپکٹر زیرک نے آخری جملہ نگہت کی طرف منہ پھیر کر کہا۔

''جی بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔'' نگہت نے اقرار کیا۔

''اس کے بعد قاتل دو دن تک اس تاک میں رہا کہ وہ ثروت سے پچاس تولے سونا کیسے لے۔ وہ منصوبہ بندی کرتا رہا اور سب کچھ نوٹ بھی کرتا رہا۔ اس کی نظریں نگہت صاحبہ کے گھر کے معمولات پر تھیں پھر قاتل نے اس سونے کو حاصل کرنے کے لیے وقت ضائع کیے بغیر کارروائی کی.....'' انسپکٹر زیرک کہتے ہوئے رک گیا اور اس نے الیاس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''اس سے پہلے میں ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔ جس عورت کے ساتھ آپ عشق فرما رہے تھے اس دن میں نے اس کی آئی ڈی دیکھی اور اسے خاموشی سے تلاش کیا۔ لڑکوں کے ساتھ دوستی کرنا اور تحفے لینا اس کا کام تھا۔ میرے ایک میسج پر وہ مجھ سے ملنے کو تیار ہوگئی۔ جب ملی تو ہم اسے یہاں لے آئے.....''

انسپکٹر زیرک کے کہتے ہی الیاس اور نگہت نے بیک وقت اس کی طرف دیکھا۔ الیاس کے چہرے پر پریشانی عیاں تھی۔ انسپکٹر زیرک بولا۔ ''اس کے موبائل فون سے ہم نے ہی آپ کی دی ہوئی انگوٹھی کی تصویر واٹس ایپ کی تھی اور جو میسج لکھا تھا وہ بھی میں نے ہی لکھا تھا تاکہ آپ کے گھر سے دھواں اٹھے اور کوئی بات سامنے آئے..... اس دوران ہم قاتل تک بھی پہنچ گئے تھے.....''

''قاتل کون ہے؟'' نگہت نے جلدی سے سوال کیا۔ الیاس کے ساتھ ساتھ عامر بھی انسپکٹر زیرک کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ عامر اور الیاس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

کچھ توقف کے بعد انسپکٹر زیرک نے کہا۔ ''میں نے شروع میں ایک بات کی تھی کہ ہم سے ایک بات نظر انداز ہوگئی تھی۔ جو مجھے بعد میں یاد آئی اور اس ایک سرے کو لے کر ہم قاتل تک جا پہنچے۔''

''کیا بات تھی..... کیا سرا تھا..... جلدی سے بتائیں۔'' نگہت زیادہ مضطرب تھی۔

''آپ کے موبائل فون سے ہم نے اس دن کی تمام کالز نوٹ کی تھیں۔ جس نمبر سے آپ کو اسکول کی طرف سے کال آئی تھی وہ ہم سے نظر انداز ہوگیا تھا۔ جونہی میرا دھیان اس طرف گیا ہم نے فوراً اس نمبر کو ٹریس کیا۔ وہ اس اسکول کے کسی فرد کا نمبر نہیں تھا۔ وہ نمبر بند تھا۔ ہم نے تحقیق کی اور ہم اس نمبر کے مالک تک پہنچ ہی گئے۔ جس نمبر سے وہ کال ہوئی تھی، اس نمبر کا مالک پچاس تولے سونا اڑانے کے چکر میں تھا۔ اس نے نگہت صاحبہ کو کال کی اور وہ اسکول چلی گئیں۔ ان کے جاتے ہی وہ گھر میں داخل ہوا اور ثروت کو باندھ کر گھر کی تلاشی لینا چاہتا تھا۔ اس نے ثروت کو باندھ بھی دیا اور گھر کی تلاشی لی اور پچاس تولے سونا ڈھونڈ لیا۔ اس دوران ثروت نے اپنے ہاتھ کھول لیے اور دونوں میں مزاحمت ہوئی اور ثروت نے اس کا چہرہ دیکھ لیا۔ اس کے بعد ثروت کو جان سے مارنا اس کے لیے ضروری ہوگیا تھا۔ اس نے ثروت کو قتل کیا اور گھر سے باہر نکل گیا۔ یہ سب ہمیں قاتل نے خود بتایا ہے.....'' انسپکٹر زیرک نے اپنی نگاہیں الیاس پر مرکوز کرتے ہوئے اس کا جھکا ہوا چہرہ اوپر کیا تو اس کے چہرے پر پسینا صاف دکھائی دے رہا تھا۔ نگہت اور عامر کی نظریں بھی ان پر مرکوز تھیں۔

ایک دم انسپکٹر زیرک نے کہا۔ ''حسن.....''

''یس سر.....'' حسن مستعد ہوا اور اشارہ پاتے ہی باہر چلا گیا۔ تینوں کے دل زور زور سے دھڑک رہے تھے۔ نگہت بدستور الیاس کی طرف دیکھ رہی تھی اور الیاس ساکت تھا۔

اچانک دروازہ کھلا اور حسن ایک آدمی کو اندر لے آیا۔ اس کا چہرہ کپڑے سے ڈھانپا ہوا تھا۔ سبھی اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اسے قریب لایا گیا اور جونہی اس کے چہرے سے کپڑا ہٹایا گیا تو نگہت ایک دم چونکی۔

''یہ تو ثروت کا کزن ہے۔''

''اسی کی ایماندار، پرہیزگار اور نیک بیوی کے پاس ثروت زیور امانت کے طور پر رکھوانے گئی تھی اور اس بے ایمان نے دونوں کی باتیں سن لی تھیں اور یہ اس کے پیچھے اس شہر تک آ گیا تھا۔ راستے میں اس کو موقع نہیں ملا ورنہ یہ بیگ لے کر بھاگ جاتا اور اس زیور نے اسے قاتل بنا دیا۔ یہ تھا قتل پر پڑا ہوا پردہ اور وجہ.....''

انسپکٹر زیرک کہنے کے بعد اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اور اطمینان سے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی۔

⌘⌘⌘

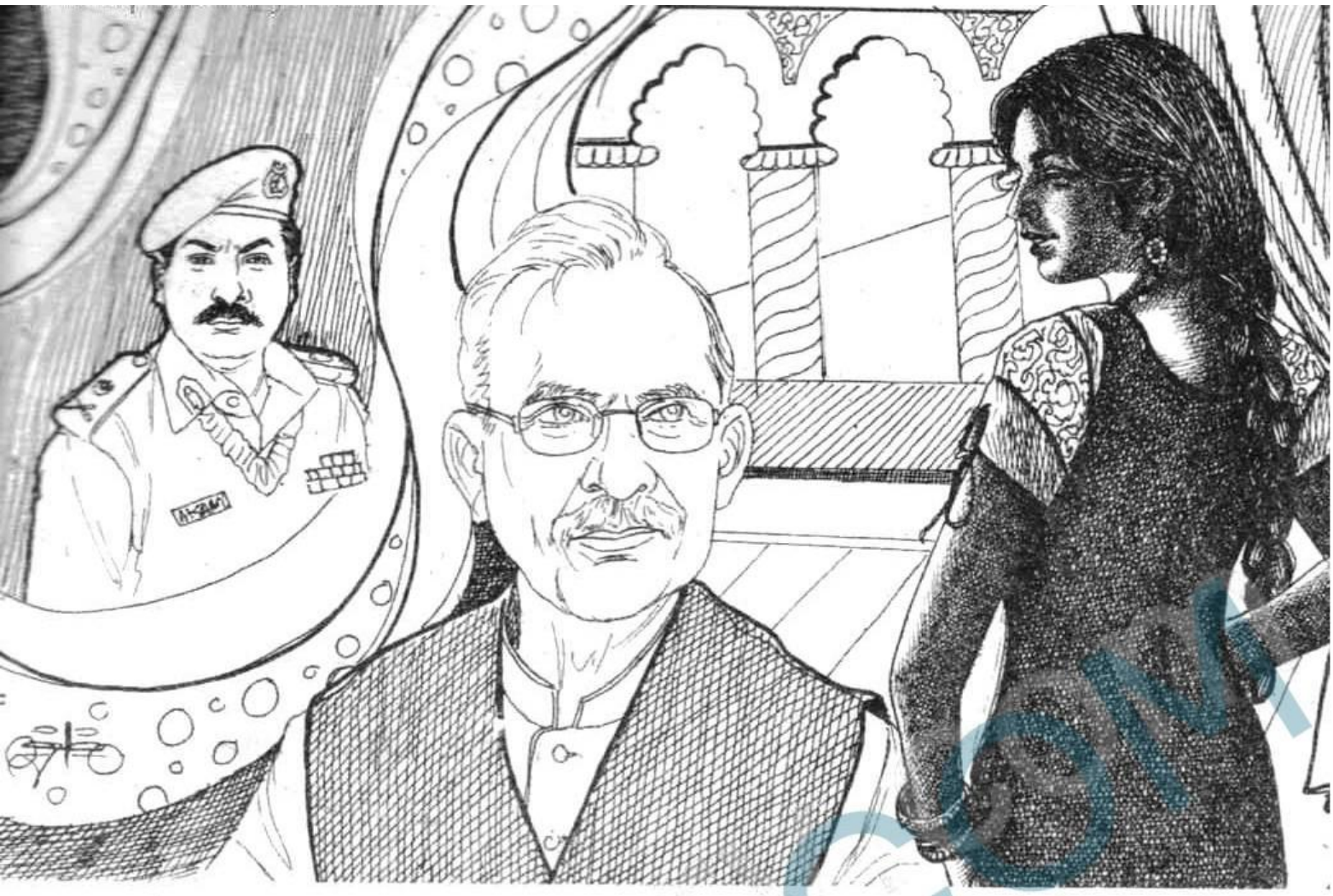

کانچ محل

طاہر جاوید مغل

آٹھواں حصہ

محبت میں لمحہ کوئی بھی ہو لوٹ کر نہیں آتا... اور جب چاہنے والا بھی بنا کسی خطا کے اور بغیر کچھ بتائے زندگی سے چلا جائے تو ایک لامتناہی انتظار آنکھوں میں ایسی اذیت ثبت کر دیتا ہے کہ دیکھنے والی ہر آنکھ ان آنکھوں میں چھپے درد کی کسک محسوس کیے بنا نہیں رہ پاتی۔ اسی کوچۂ قاتل میں کہ... جہاں قدم قدم پر موت کے سائے لرزاں تھے اور جہاں مان، وعدے... اور ارمان نیلام ہوتے تھے... جہاں رحم کی کوئی جگہ تھی نہ عدل کا کوئی رستہ، جس کی ہر سوچ کو گھمنڈ اور احساسِ برتری کی زنجیروں نے قید کیا ہوا تھا... یہ عشق کی جادوگری ہی تو تھی کہ پھر بھی اس قاتل جاں کی ہر ادا لاجواب اور ہر نقش بے مثال تھا... جانے کس امید پر وہ تیرگی میں بھی سحر کے آثار کا متلاشی بنا خاردار رستوں پر چل نکلا تھا... ایک کانچ کی گڑیا کے لیے اس نے خوابوں کا کانچ محل آنکھوں میں سجالیا تھا۔

ٹوٹے خوابوں کی کرچیوں پر محوِ سفر..... ایک بے باک مگر گھائل

عشق اور حُسن کی فتنہ سامانیوں کی طویل داستان

وہ جیسے بہ زبان خاموشی کہہ رہی تھی..... یہ بغاوت نہیں ہے لیکن اگر کچھ لوگ اسے سمجھتے ہیں تو سمجھتے رہیں۔

ایک کونے میں مرشد کا کردار ادا کرنے والا سینئر اداکار اپنے مکالمے دہرا رہا تھا..... وہ ہزار ہا شکلوں میں ہمارے اردگرد موجود ہے۔ اس کی ساری صفات موقع محل کے مطابق ہمارے ارادوں میں حلول کرتی ہیں۔ وہ ہم بن جاتا ہے اور ہم وہ بن جاتے ہیں.....

☆☆☆

..... راز کی ریکارڈنگ شروع ہوگئی۔ اگلے دن ہی میڈیا پر یہ خبر عام ہوگئی کہ اس سیریل میں سجاد ساہی صاحب کی دختر حاشہ سجاد مرکزی کردار ادا کررہی ہے۔ یہ خبر ردِعمل کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی اور اسی ردِعمل کا خیال حاشہ کو ڈرا رہا تھا۔ اگر تیمور اس کے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑا نہ ہوتا تو شاید وہ ایسی جسارت کر ہی نہ سکتی۔ بہرحال، اب تو جو ہونا تھا، وہ ہوگیا تھا..... وہ پیچھے نہیں ہٹ سکتی تھی۔ اب اسے اس ردِعمل کو فیس کرنا تھا۔ اب یہ ڈوآر ڈائے تھا۔

یہ ردِعمل دوسرے ہی دن سامنے آگیا۔ حویلی میں ریکارڈنگ جاری تھی۔ حاشہ کے دو خاموش سین تھے۔ تیسرے سین میں اسے دو تین فقرے بولنا تھے۔ تیمور نے حویلی کی حفاظت کا مکمل انتظام کر رکھا تھا۔ ڈرامے میں حاشہ کی شرکت کے بعد ان انتظامات کو مزید سخت کردیا گیا تھا۔ اے آئی جی عطا صاحب بھی صورتِ حال کی طرف سے باخبر تھے۔ تیمور سیٹ پر ہی موجود تھا۔ ایک بندہ گھبرایا ہوا اندر داخل ہوا اور تیمور کے کان میں کچھ کہا۔ تیمور کا رنگ بدلا اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''حاشہ پلیز! آپ اندر جائیں۔'' اس نے کہا اور اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر باہر نکل گیا۔

تیمور باہر آیا..... وہ بہ مشکل پانچ چھ قدم چل کر حویلی کی ڈیوڑھی میں ہی پہنچا تھا کہ سجاد ساہی کسی تند بگولے کی طرح اندر آتا دکھائی دیا۔ اس نے گارڈز کو دھکے دیے اور چنگھاڑتا ہوا تیمور کے سامنے آکھڑا ہوا۔ ''کہاں ہے حاشہ؟'' وہ گرجا۔ فرطِ غضب کے سبب اس کی کلف لگی سیاہ مونچھیں بے ساختہ پھڑکتی چلی جارہی تھیں۔

''وہ یہاں نہیں ہے۔'' تیمور نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔

''میں آگ لگادوں گا ایک ایک کو..... چھلنی کردوں گا۔'' اس نے پستول نکال لیا۔

''میں نے کہا ہے، وہ یہاں نہیں ہے۔''

''حرامزادے، کمینے، بدنسلے۔'' سجاد ساہی کا بھرپور تھپڑ تیمور کے رخسار پر پڑا اور اس کی پی کیپ اچھل کر دور جا گری۔

یہ منظر دیکھ کر تیمور کا وفادار اسسٹنٹ شوکت رائے اپنے جذبات پر کنٹرول نہ رکھ سکا۔ وہ تڑپ کر سجاد کے سامنے آگیا..... اور اسے گریبان سے پکڑ کر دھکیلتا ہوا کئی قدم پیچھے لے گیا۔ ''خبردار!'' اس نے سجاد ساہی کے چہرے کی طرف انگلی اٹھائی۔ ''اس سے آگے نہ بڑھنا۔ یہیں ماردوں گا یا مرجاؤں گا۔''

سجاد ساہی نے اسے بھی تھپڑ مارنا چاہا مگر اس نے کلائی پکڑ کر مروڑ دی۔ تیمور جلدی سے آگے بڑھا۔ ''پیچھے ہٹو شوکت!'' وہ گرجا اور الٹے ہاتھ کا زوردار طمانچہ شوکت کے منہ پر مارا۔ ''یہ میری اور ان کی لڑائی ہے۔ تم کون ہوتے ہو بیچ میں آنے والے۔''

کئی افراد درمیان میں پڑ گئے اور غضب ناک سجاد ساہی کو دھکیل کر چند قدم پیچھے لے گئے۔ اس دوران میں سجاد ساہی نے ایک ہوائی فائر بھی کیا۔ سجاد ساہی فرطِ طیش میں اکیلا ہی یہاں چلا آیا تھا لیکن اب وہ فون پر پیٹرولنگ پولیس کو بلا رہا تھا۔ اس کی گالیوں کی آواز فلک شگاف تھی۔ وہ تیمور اور ساتھیوں کو ہی نہیں، خود کو بھی ننگی گالیاں دے رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں پولیس بھی پہنچ گئی۔ مقامی ایس پی ہمراہ تھا لیکن وہ سب جانتے تھے کہ ان کا سامنا بیرسٹر تیمور سے ہے۔ بغیر سرچ وارنٹ کے وہ اس حویلی میں داخل نہیں ہو سکتے اور وہ ہو بھی جاتے تو حاشہ کو یہاں نہیں ڈھونڈ سکتے تھے۔ حاشہ کے لیے حویلی کے اندر ہی ایک محفوظ ٹھکانے کا انتظام تیمور نے پہلے ہی کردیا تھا۔

بہرطور سجاد ساہی، اسسٹنٹ شوکت رائے کو کسی صورت بخشنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کی چربی دار گردن پر کچھ خراشیں آگئی تھیں اور گریبان پھٹ گیا تھا۔ وہ اسے خود پر تشدد کا نام دے رہا تھا۔ پولیس پارٹی ہر صورت شوکت کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتی تھی۔ تیمور نے محسوس کیا کہ اس موقع پر اگر اس نے زیادہ مزاحمت کی تو معاملہ بگڑ جائے گا۔ اس نے شوکت کو بھیج دیا مگر ساتھ ہی اے آئی جی عطا صاحب کو بھی باخبر کردیا۔ اس کے علاوہ بار کے نائب صدر کو اطلاع دے دی۔ ظاہر ہے کہ اس سنگین واقعے کے بعد شوٹنگ کا ''پیک اپ'' ہی ہونا تھا۔

..... تیمور کا اسسٹنٹ شوکت رائے تو رات گیارہ بجے تک واپس آگیا مگر اس واقعے سے جو سراسیمگی پھیلی تھی، اس کے سبب اگلے تین چار روز تک پلے کی ریکارڈنگ رکی

رہی۔

☆☆☆

دشمنی کی آگ بڑی تیزی سے بھڑکتی چلی جارہی تھی اور اس آگ کو سب سے زیادہ ایندھن ریٹائرڈ ایس ایس پی سجاد ساہی ہی فراہم کررہا تھا۔ وہ جیسے اپنے ہوش وحواس ہی کھو بیٹھا تھا۔ دوسرے نمبر پر اس کا بیٹا، حاضر سروس عدیل عالم تھا۔ ان کی جلتی پر تیل ڈالنے میں ایک اور واقعے نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس واقعے کا علم تیمور کو دو روز بعد اس وقت ہوا جب سخت حفاظتی انتظامات کے ساتھ پلے کی ریکارڈنگ پھر شروع ہوئی۔ (فی الحال ریکارڈنگ میں حاشہ کے مناظر نہیں رکھے گئے تھے۔ وہ فیروز ہاؤس میں ہی تھی)۔ دوپہر کو اسسٹنٹ شوکت نے اسے بتایا۔ ''تیمور صاحب! ایک نئی خبر چل رہی ہے گاؤں کے حوالے سے۔''

''گاؤں کے حوالے سے؟''

''ہاں جی، سجاد ساہی کا گاؤں۔ وہاں ساہی فیملی کے تین چار گھرانے ہیں اور آپ کو پتا ہی ہوگا کہ ساتھ والے گاؤں میں سرداروں کے ساتھ ساہی فیملی کی پرانی رنجش ہے۔''

''ہاں، تو کیا ہوا؟''

''وہی جو آہستہ آہستہ ہونے لگتا ہے..... اور جو ہونا بھی چاہیے جناب! قدرت کا قانون اسی کو تو کہتے ہیں۔ اس ساہی فیملی نے دوسروں کی بہو بیٹیوں پر ہمیشہ بری نظر رکھی ہے لیکن ان کی اپنی عورتوں کی طرف کوئی غلطی سے بھی آنکھ اٹھا کر دیکھ لے تو یہ قیامت برپا کردیتے ہیں، خون بہانے کو تیار ہوجاتے ہیں۔ یہ گندے اصول اور دُہرے معیار بالآخر تو رنگ دکھاتے ہیں نا۔ آپ ہی تو کہا کرتے ہیں، شدید گھٹن بغاوت کو جنم دیتی ہے۔ ایسی ہی ایک بغاوت چار پانچ روز پہلے ساہی فیملی میں ہوئی ہے۔ سجاد ساہی کی ایک بھتیجی نے سردار برادری کے ایک نائب تحصیل دار لڑکے سے کورٹ میرج کرلی ہے۔''

تیمور طویل سانس لے کر رہ گیا۔ اس نے تفصیلات پوچھیں پھر ایک جگہ فون بھی کیا۔ شوکت رائے کی اطلاع کی تصدیق ہوئی۔ اس واقعے کی ٹائمنگ بھی معنی خیز تھی۔ جس دن اخباروں میں یہ اطلاعات آئی تھیں کہ حاشہ ساہی ڈراما سیریل ''راز'' میں اداکاری کررہی ہے، اس سے تیسرے روز ہی یہ کورٹ میرج والا واقعہ ہوا تھا۔ ساہی فیملی کے غرور وتکبر کے قلعے میں ایک اور دراڑ پیدا ہوئی تھی۔ ظلم اور جبر کے ضابطے ایسے ہی کمزور ہوتے ہیں اور آہستہ آہستہ ٹوٹنا شروع ہوتے ہیں۔

تیمور فی الحال حاشہ کو اس خبر سے آگاہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ یقیناً اس نے مزید پریشان ہونا تھا مگر ظاہر ہے کہ یہ اطلاع اس کے لیے زیادہ دیر چھپی بھی نہیں رہ سکتی تھی۔ ایک حوالے سے تیمور کو تسلی تھی۔ وہ حاشہ کے ارادے کی پختگی کو بہ خوبی جان چکا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس سیریل کے حوالے سے جو قدم اس نے اٹھالیا ہے، وہ اس سے پیچھے نہیں ہٹے گی۔

..... حالات کا پہیا حرکت کررہا تھا۔ تیمور کو علم نہیں تھا کہ ایک اور ایسا واقعہ ہونے والا ہے جو اس کہانی کے رخ کو بالکل بدل دے گا۔ ایک اور کردار تھا جو اس زہر آلود منظر نامے میں قدم رکھنے والا تھا۔

☆☆☆

حویلی میں سیریل کی ریکارڈنگ حفاظتی انتظامات کے ساتھ جاری تھی۔ اپنا کردار ادا کرتے ہوئے حاشہ کو شروع میں تو مشکل پیش آئی مگر اس نے بہت جلد خود کو سنبھال لیا تھا۔ ڈائریکٹر احمد نقوی کی صلاحیت اور ذہانت کھل کر سامنے آرہی تھی۔ وہ اس بات کو بڑی اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ حاشہ پہلی بار اس طرح کیمرے کا سامنا کررہی ہے۔ وہ اس کے لیے ایکٹنگ میں بے شمار آسانیاں پیدا کررہا تھا۔ کسی وقت تو حاشہ کو محسوس ہوتا تھا کہ وہ صرف احمد کے ایکسپریشنز کو کاپی کررہی ہے۔ اسے پہلی مرتبہ احساس ہورہا تھا کہ اچھا ڈائریکٹر ایک اداکار کے اندر سے کس طرح صلاحیتوں کو ابھارتا ہے۔

حاشہ کے نقوش کی دلکشی میں کوئی کلام نہیں تھا..... جب وہ کیریکٹر کی ڈیمانڈ کے مطابق میک اپ اور ڈریسنگ کے ساتھ سیٹ پر آتی تو دیکھنے والے مبہوت ہوجاتے تھے۔ حاشہ کی جھجک کو محسوس کرتے ہوئے تیمور نے حکم دے رکھا تھا کہ حاشہ کے شاٹس کے وقت سیٹ پر صرف دو چار ضروری افراد ہی موجود ہوں۔

ایک روز شاٹس کے درمیانی وقفے میں تیمور اور حاشہ حویلی کی چھت پر بڑے سائز کی ایک رنگین چھتری کے نیچے بیٹھے تھے۔ شام کا وقت تھا، دھوپ کی تمازت نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ سورج کا سرخ گولا دھیرے دھیرے سبز لہلہاتے کھیتوں کے اوپر سے گزر کر مغربی افق کی طرف جھک رہا تھا۔ ہوا حاشہ کے ریشمی بالوں سے اٹکھیلیاں کررہی تھی۔ تیمور سیریل کی دوسری قسط کے ایک سین پر حاشہ سے گفتگو کررہا تھا۔ ایک چھوٹی سی الجھن سامنے آرہی تھی۔

حاشہ نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ''کتنا اچھا ہوتا وسیم بھائی اس وقت ہمارے ساتھ ہوتے۔ چٹکی بجاتے یہ مسئلہ حل کردیتے۔''

تیمور نے کہا۔ ''کرشمے اور معجزے بھی تو اسی دنیا میں ہوتے ہیں۔ کیا پتا کسی دن وہ آہی جائے۔ ہم ریکارڈنگ کررہے ہوں۔ عثمان اس کی وہیل چیئر دھکیلتا اندر داخل ہو۔ وہ کہے..... رک جائیں، رک جائیں۔ یہ آپ کیا کررہے ہیں؟ یہ منظر میں نے اس طرح نہیں لکھا تھا..... یہ تو اس طرح ہوگا۔''

حاشہ کے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ کھیل گئی۔ ''کھلی آنکھوں سے خواب دیکھنا انسان کی مجبوریوں میں سے ایک مجبوری ہے۔''

''کہہ تو آپ ٹھیک رہی ہیں۔'' تیمور نے اس کی طرف دیکھ کر معنی خیز لہجے میں کہا پھر جلدی سے موضوع بدل کر بولا۔ ''ویسے میں نے نسیمہ شاہ کو بلایا ہے، بس آتی ہی ہوگی۔ میرا خیال ہے وہ سین کو اچھے طریقے سے تبدیل کرلے گی۔''

ابھی یہ باتیں ہورہی تھیں کہ نسیمہ شاہ زینے چڑھ کر اوپر آتی دکھائی دی۔ وہ ذرا فربہ بدن کی پینتیس چھتیس سالہ خاتون تھی۔ بال ترشے ہوئے تھے۔ ''لو، وہ آہی گئی۔'' تیمور نے کہا۔

وہ قریب آئی تو اسے دیکھ کر تیمور اور حاشہ دونوں چونکے۔ عینک کے پیچھے اس کی آنکھیں رونے سے سرخ نظر آرہی تھیں۔

''مم..... مجھے آپ کے ساتھ کام کرنے کا خمیازہ بھگتنا پڑرہا ہے تیمور صاحب! اے کے بیدل صاحب نے میرے لیے دو ڈراما سیریلز کی آفرز ختم کرادی ہیں بلکہ ایک سیریل پر تو میں کچھ کام بھی کرچکی تھی۔ اس کے علاوہ آپ کو پتا ہی ہے، میری چھوٹی بہن شازیہ کو بڑی مشکل سے ایک سوپ میں اچھا رول ملا تھا۔ بڑی خوش تھی بے چاری۔ اسے بھی کٹ کردیا ہے بیدل صاحب نے۔ وہ نہ صرف کٹ ہوئی ہے بلکہ آج دوپہر شازیہ اور اس کا منگیتر دو گھنٹے حوالات میں بھی رہے ہیں۔ میں آپ کو بہت کال کرتی رہی مگر آپ کا فون نہیں مل سکا۔''

''کیا ہوا تھا؟''

''انہیں ایک ریسٹورنٹ سے پکڑ کر لے گئے پولیس والے۔ نازیبا حرکات اور شیشہ پینے کا جھوٹا الزام لگایا اور یہ سب کچھ حاشہ صاحبہ کے پاپا سجاد ساہی صاحب کی ایما پر ہوا ہے۔ میں شازیہ کے پیچھے پولیس اسٹیشن گئی تو سجاد صاحب مجھے پولیس اسٹیشن سے باہر ہی اپنی کار میں بیٹھے مل گئے۔ انہوں نے مجھے گالیاں دیں اور صاف کہا کہ یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ میں ''راز'' کا اسکرپٹ لکھنے سے باز نہیں آئی۔''

''اب کہاں ہے تمہاری بہن؟'' تیمور بھڑک کر بولا۔

''میری منت سماجت پر چھوڑ دیا گیا ہے دونوں کو مگر سجاد صاحب نے کھلی دھمکی دی ہے کہ اگر میں آپ لوگوں کے ساتھ جڑی رہی تو اس کا برا انجام ہوگا۔ انہوں نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ میں ڈھونڈتی پھروں گی اپنی بہن کو۔ بہت..... گندی..... دھمکیاں دے رہے تھے۔ اس کے علاوہ..... آپ کے لیے بھی..... میرا مطلب ہے آپ کے لیے بھی کچھ اچھا نہیں بول رہے۔ میں پیٹھ پیچھے کچھ کہنا نہیں چاہتی..... مگر آئی ایم سوری تیمور صاحب! آپ اور حاشہ جی کے بارے میں بھی ان کے ارادے کچھ اچھے نہیں ہیں۔ وہ کچھ بھی کرسکتے ہیں۔'' اس نے ''کچھ بھی'' پر زور دیا اور اشکبار ہوگئی۔

تیمور نے اسی وقت فون اٹھا کر اے آئی جی عطا صاحب کو کال کی اور بات کرتا ہوا چھت کے دوسرے حصے کی طرف چلا گیا۔ حاشہ، نسیمہ شاہ سے باتیں کرتی رہی۔

کچھ دیر بعد واپس آکر تیمور نے بڑے پراعتماد لہجے میں کہا۔ ''نسیمہ! تم بے فکر ہوکر کام جاری رکھو۔ تمہاری حفاظت ہماری ذمے داری ہے۔ ان شاء اللہ تمہارا یا تمہاری سسٹر کا بال بھی بیکا نہیں ہونے دیں گے۔ تم دونوں بہنیں اپنا فلیٹ چھوڑ دو۔ فی الحال میں تم دونوں کے قیام کا انتظام ایک اور جگہ کررہا ہوں۔ میں دیکھتا ہوں یہ لوگ کیسے آنکھ اٹھاتے ہیں تمہاری طرف۔'' تیمور کا چہرہ انگارہ ہورہا تھا۔

نسیمہ شاہ نروس بریک ڈاؤن کا شکار لگ رہی تھی۔ پیشانی پر بار بار پسینا آتا تھا۔ تیمور نے اسے میڈم مہناز کی اسسٹنٹ کے حوالے کیا اور اسے کہا۔ ''انہیں نیچے لے جاؤ۔ یہ ایک دو گھنٹے آرام کرلیں۔ اس کے بعد یہ میرے ساتھ ہی لاہور واپس جائیں گی۔''

نسیمہ شاہ کے نیچے جانے کے بعد حاشہ نے اپنی آنکھوں کے بھیگے کنارے پونچھے۔ وہ بالکل مختلف موڈ میں آگئی تھی۔ دور مشرقی افق سے پوری رات کا چاند درختوں کے عقب سے جھلک دکھانے لگا تھا۔ چھت کی دودھیا لائٹس میں حاشہ سوچ میں ڈوبی نظر آتی تھی، بولی۔ ''تیمور! کسی وقت مجھے لگتا ہے کہ میں شاید زیادہ دیر جی نہ پاؤں.....

آپ مجھ سے ایک وعدہ کریں، پلیز میری بات رد نہ کیجیے گا۔''

تیمور خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

''بالفرض مجھے کچھ ہوجاتا ہے..... اور میرے گھر والوں کی طرف سے ہوتا ہے تو آپ اسے صرف اور صرف میرا اور ان کا معاملہ رہنے دیں گے۔ آپ سمجھیں کہ میں اپنا خون انہیں معاف کرچکی ہوں۔''

''یہ کیسی باتیں کررہی ہیں آپ؟''

''بس ہم فرض کررہے ہیں۔ اللہ کرے یہ سب کچھ نہ ہو اور دعا بھی کرتی ہوں کہ یہ سب کچھ نہ ہو اور خود سے زیادہ دعا میں آپ کے لیے کرتی ہوں اور پتا نہیں کیوں میرے دل کی گواہی ہے کہ آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔''

''اور میرے دل کی گواہی ہے کہ آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔''

''اللہ کرے یہ وقت دعاؤں کی قبولیت کا ہو۔'' حاشہ نے کہا پھر عجیب التجا بھری نگاہوں سے تیمور کو دیکھا۔ ''ایک وعدہ اور تیمور..... جس طرح آج تک آپ نے میری بات کا مان رکھا ہے اور عدیل کی سب زیادتیوں کے باوجود اس کے خلاف کبھی ایگریشن نہیں دکھائی حالانکہ ایسا کرنا آپ کے بس میں تھا۔ آپ کا یہی سلوک میں اپنے والد کے سلسلے میں بھی چاہتی ہوں۔ پلیز تیمور..... پلیز، میں جانتی ہوں کہ وہ اپنے نہایت بُرے رویّے کے سبب آپ کے غصے کی زد میں آسکتے ہیں لیکن میں چاہتی ہوں کہ آپ انہیں اپنے اس ردعمل..... بلکہ کہنا چاہیے، جائز ردعمل سے دور رکھیں۔''

تیمور چند لمحے تک کھوئی کھوئی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ ان لمحوں میں اسے حاشہ کے اندر وہی لوک داستان والی صاحباں نظر آئی جو سب ظلم سہنے کے باوجود اپنے باپ اور بھائیوں کے لیے نرم گوشہ رکھتی تھی۔

''..... کچھ اور حاشہ؟'' تیمور نے بھی کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

''بہت کچھ کہنا چاہتی ہوں لیکن آپ مانیں گے نہیں۔ ان میں سے ایک بات ہی مان لیں تو میں اپنی آخری سانس تک آپ کی احسان مند رہوں گی۔''

''چلیں، وہ بھی کہہ دیں۔''

''یہ ڈراما سیریل ختم ہوتے ہی آپ اپنی والدہ کو لے کر پاکستان سے چلے جائیں۔ میں آپ کو سلامت دیکھنا چاہتی ہوں۔'' وہ آنسو پونچھتی ہوئی اٹھی اور تیزی سے سیڑھیاں اتر کر نیچے چلی گئی۔

تیمور اپنی جگہ بیٹھا اسے دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆

نئے گھر میں آنے کے بعد سے تیمور کی والدہ سخت ڈپریشن کا شکار تھیں۔ انہیں ہر وقت اپنے اکلوتے بیٹے کی طرف سے دھڑکا لگا رہتا تھا۔ برسوں پہلے اپنے جیٹھ کے ہاتھوں شوہر کے قتل کے بعد سے تیمور ہی تو ان کا سب کچھ تھا۔ رات کو حویلی میں ریکارڈنگ کے بعد جب تیمور دس بجے کے لگ بھگ گھر پہنچا تو انہوں نے ابھی تک اس کے انتظار میں کھانا نہیں کھایا تھا۔ اس کے آنے کے بعد بھی انہوں نے نہیں کھایا۔ وہ ناراض تو تھیں ہی، بہت پژمردہ بھی لگ رہی تھیں۔ رات گیارہ بجے کے لگ بھگ انہیں انجائنا کا شدید درد ہوا۔

..... اگلے تین روز انہیں اسپتال میں گزارنا پڑے۔ تیمور ان کی دیکھ بھال میں مصروف رہا۔ اس کا عدالتی کام تو رکا رہا اور ریکارڈنگ بھی قریباً رکی ہی رہی۔ والدہ گھر آئیں تو معمولات پھر شروع ہوئے۔ پانچ روز کے وقفے سے تیمور شیخوپورہ کی اس حویلی میں بھی پہنچا جہاں سیریل کی ریکارڈنگ جاری تھی۔ دیگر کاسٹ کے علاوہ حاشہ بھی موجود تھی۔

وہ کافی غمزدہ نظر آرہی تھی۔ ایک سین ریکارڈ کرانے کے بعد وہ تیمور کے ساتھ ایک گوشے میں آبیٹھی۔ ''والدہ اب کیسی ہیں؟'' اس نے آزردہ لہجے میں پوچھا۔

''پہلے سے بہتر ہیں۔ آج کھانا وغیرہ بھی کھایا ہے۔ تھوڑی چہل قدمی کی ہے۔''

''تیمور!'' حاشہ نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''پتا نہیں کیوں کسی وقت مجھے لگتا ہے کہ ان کی پریشانیوں کی بڑی وجہ میں ہی ہوں۔ میں خود پر بہت بوجھ محسوس کرتی ہوں۔ میں نے آپ کے پاس بس ان کی تصویر ہی دیکھی ہے۔ کبھی ان سے ملی نہیں، ان سے بات نہیں کی لیکن ان کا چہرہ اکثر میری نگاہوں کے سامنے رہتا ہے۔'' اس نے تھوڑا توقف کیا پھر عجیب جذباتی لہجے میں بولی۔ ''..... تیمور! میرا دل چاہتا ہے..... کسی روز سارا دن ان کے ساتھ گزاروں، ان کی مزاج پرسی کروں، ان کی خدمت کروں، ان سے باتیں کروں لیکن.....'' وہ کہتے کہتے خاموش ہوگئی۔

''لیکن کیا.....؟'' تیمور نے پوچھا۔

''جب انہیں پتا چلے گا کہ میں کون ہوں تو شاید وہ مجھے کھڑے کھڑے ہی باہر نکال دیں۔''

''نہیں..... اب ایسا بھی نہیں ہے۔'' تیمور نے کہا۔

TAGPK.COM

اچانک جیسے حاشہ کے ذہن میں نیا خیال آیا۔ ''لیکن تیمور! ضروری تو نہیں کہ انہیں بتایا بھی جائے۔ میرا مطلب ہے کہ انہوں نے کون سا مجھے دیکھا ہوا ہے۔ میں کسی اور حیثیت سے انہیں مل سکتی ہوں..... ہاں، یہ ٹھیک رہے گا تیمور!'' اس کے چہرے پر چمک سی نمودار ہوگئی۔

تیمور کو حاشہ کا اس طرح سوچنا اچھا لگ رہا تھا۔ یہ اس کے اندر کی اچھائی اور ہمدردی کا غماز تھا مگر عملی طور پر یہ کچھ مشکل نظر آرہا تھا۔

تاہم اگلے آدھ گھنٹے میں ان دونوں کے درمیان جو گفتگو ہوئی، اس میں حاشہ کی خواہش کے مطابق ایک چھوٹا سا پلان بن گیا۔

اگلے دو روز میں چونکہ حاشہ کی کوئی ریکارڈنگ نہیں تھی لہٰذا وہ صبح سویرے تیمور کے ساتھ فیروز ہاؤس سے نکلی اور تیمور کے گھر پہنچ گئی۔ اس نے خود کو ایک طویل چادر میں ڈھانپا ہوا تھا۔ چہرے پر چادر ہی کا نقاب تھا۔ رنگین کھڑکیوں والی گاڑی کے عقب میں حسب معمول گارڈز والی گاڑی بھی تھی۔ تیمور کی اس نئی رہائش گاہ پر بھی سیکیورٹی کا مکمل انتظام تھا۔ حاشہ دھڑکتے دل کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔ تیمور نے والدہ کو کل ہی بتادیا تھا کہ اس کی لاء فرم میں بطور اکاؤنٹنٹ کام کرنے والی ایک لڑکی ان سے ملنے کی خواہش مند ہے۔

ارشاد بیگم بستر پر نیم دراز تھیں۔ ''سلام آنٹی جان!'' حاشہ نے تپاک سے کہا۔

ارشاد بیگم نے لیٹے لیٹے حاشہ کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ وہ ان کے قریب ہی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ''آنٹی جان! تیمور کی زبانی آپ کا اتنا ذکر سنا اور اتنی بار سنا کہ آپ کو دیکھنے اور آپ سے ملنے کی خواہش پیدا ہوگئی۔ اب آپ کی تکلیف کے بارے میں پتا چلا تو آپ سے ملنے کو بے چین ہوگئی۔''

''تیری مہربانی ہے دھی رانی ورنہ آج کل کے کڑیاں منڈے کہاں بڈھے بڈھیوں کا خیال کرتے ہیں۔ کیا نام بتایا تھا تو نے؟''

''مونا شکیل، جی..... جیسا آپ کے بارے میں سوچا تھا، ویسا ہی پایا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جلد از جلد صحت دے اور آپ پہلے کی طرح ہنستی مسکراتی نظر آئیں۔''

ارشاد بیگم نے ایک نگاہ غلط انداز تیمور پر ڈالی اور بولیں۔ ''ہنسنا مسکرانا تو پہلے بھی نہیں تھا اب تو جیسے تیسے حیاتی کے دن پورے کررہی ہوں۔''

تیمور نے بھانپ لیا تھا کہ اب لمبے چوڑے شکوے شروع ہونے والے ہیں۔ اس نے جلدی سے رسٹ واچ دیکھی اور اجازت لیتا ہوا واپس چلا گیا۔

حاشہ، ارشاد بیگم کے بیڈ کے ساتھ بیٹھی اپنایت بھرے لہجے میں ان سے باتیں کرتی رہی۔ جو بات دل سے نکلتی ہے وہ اثر بھی کرتی ہے۔ ارشاد بیگم کم آمیز ہونے کے باوجود بہت جلد حاشہ سے گھل مل گئیں۔ ان کے اندر جیسے ایک خلا سا تھا، کسی ایسے فرد کے لیے جو تسلی سے ان کے پاس بیٹھے اور پوری توجہ سے ان کی باتیں سنے۔ حاشہ کو بڑے بوڑھوں کے پاس بیٹھنا اور ان کی باتیں سننا ہمیشہ سے اچھا لگتا تھا۔ یہ عادت شاید اسے اپنی ماما سے پڑی تھی۔ وہ گھنٹوں ان کے گھٹنے کے ساتھ لگی ان کی گفتگو سے لطف اندوز ہوا کرتی تھی۔ پتا نہیں کیوں ارشاد بیگم کو دیکھ کر اسے یوں لگا جیسے ان میں کہیں نہ کہیں ان کی ماما کی جھلک موجود ہے۔ شاید یہ جھلک ان کی آواز میں تھی یا پھر ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ میں یا پھر ان کی مجموعی شخصیت میں۔ تاہم یہ بھی کہا جاسکتا تھا کہ تمام عمر رسیدہ لوگ ایک خاص اسٹیج پر پہنچ کر ایک دوسرے سے مشابہ لگنے لگتے ہیں۔ ارشاد بیگم سے مل کر حاشہ کے دل و دماغ میں اپنی ماما کی وہ ساری یادیں تازہ ہوگئیں جو ہمہ وقت اس کے سینے میں کچوکے لگاتی رہتی تھیں (خاص طور سے اپنی لاچار ماما کا آخری دن..... وہ پہر جو انہوں نے ایک جانکاہ خوف کے نرغے میں گزارے تھے..... اور آخر اسی خوف کے نیچے دب کر ان کا دم گھٹ گیا تھا۔ الم کی اس شام کو ایک عرصہ گزر چکا تھا..... مگر اس کے بعد آج تک حاشہ نے چاول نہیں کھائے تھے یا کھا ہی نہیں سکی تھی۔ اسے اس آخری دن کے وہ دو تین لقمے یاد آجاتے تھے جو سہ پہر کے وقت حاشہ نے زبردستی ماما کو کھلائے تھے۔ ان کا ''وہ لقمے کھانے کا انداز'' ہمیشہ کے لیے ایک جاں گسل درد بن کر حاشہ کے دل میں ٹھہر گیا تھا)۔

حاشہ نے تیمور کی والدہ کے ساتھ ایک نہایت بھرپور دن گزارا۔ وہ ان سے باتیں کرتی رہی، انہیں چہل قدمی میں مدد دی۔ ان کے منع کرنے کے باوجود ان کے سر میں زیتون کا تیل لگایا۔ ملازمہ نیلوفر کے ساتھ مل کر انہیں نہانے میں مدد دی۔ ان کے لیے اپنے ہاتھ سے دیسی طرز کی یخنی بنائی..... اور سلاد تیار کی۔ شام ہوتے ہوتے ارشاد بیگم، حاشہ سے یوں باتیں کررہی تھیں جیسے برسوں سے اسے جانتی ہوں۔ کہنے لگیں۔ ''مونا! تم دفتر میں ہر وقت اس کے ساتھ رہتی ہوگی، لگتا ہے کہ وہ تمہاری بات دھیان سے سنتا بھی ہے۔ کیا تم اسے سمجھا نہیں سکتی ہو اس لڑکی کے بارے

میں..... بلکہ لڑکی بھی کیا اب تو وہ عورت لگتی ہوگی۔''

حاشہ نے ارشاد بیگم کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ''کیا وہ بہت زیادہ چاہتے ہیں اسے؟''

''تم چاہنے کی گل کر رہی ہو۔ وہ اس کے عشق میں پڑا ہوا ہے۔ وہاں انگلینڈ میں اتنی اتنی سوہنی کڑیاں تھیں، پاکستانی، ہندوستانی، انگریز، ہر طرح کی۔ امیر سے امیر کڑی کے ساتھ اس کا ویاہ ہوجانا تھا..... اور تو اور وہ گورا صاحب اسے اپنی دھی دینے کے لیے تیار ہوگئے تھے۔ چنگی بھلی منگنی بھی ہوگئی تھی۔ مجھے تو لگتا ہے کہ تھوڑا بہت پسند بھی کرنے لگا تھا اسے..... لیکن پھر سب کچھ ''چوڑ'' کر دیا۔''

''..... یہ گورا صاحب کون تھے؟''

ارشاد بیگم نے ایک گہری سانس لی۔ ''تمہیں بتایا ہے نا کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے بعد تیمور نے پاکستان میں بڑے ہاتھ پاؤں چلائے تھے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے لیے، پر کچھ نہ بنا پھر وہ کسی لانچ شانچ پر بیٹھ کر اٹلی چلا گیا اور وہاں سے انگریزوں کے ملک انگلینڈ۔ وہاں پر اللہ تعالیٰ نے اس کی مدد کی اور ان گورے صاحب نے اس یتیم کا ہتھ پکڑ لیا۔ وہ ایک بڑے وکیل ہیں۔ ان ہی کی مہربانیوں سے تیمور نے اپنی پڑھائی پوری کی اور پھر روزگار پر بھی لگا۔ ان ہی کی وجہ سے میں بھی تیمور کے پاس انگلینڈ پہنچی۔ گورا صاحب کی مہربانیاں گنوائی نہیں جاسکتیں مگر یہ ایسا بے وقوف نکلا کہ ان کی ایک چھوٹی سے چھوٹی مہربانی کا بھار بھی نہ اتار سکا۔ ان کی دھی کے ساتھ اپنا رشتہ نہ بنا سکا اور مجھے پکی طرح پتا ہے اس کی ساری بے وقوفیوں کی طرح اس بے وقوفی میں بھی کچھ نہ کچھ ہاتھ اس مرن جوگی کا ہے جو اس کے گوڈے..... گٹوں میں بیٹھ گئی ہے..... مجھے..... نفرت ہوگئی ہے اس کے نام سے۔ اللہ کرے کسی کی آئی، اسے آجائے۔'' وہ بڑبڑانے لگیں۔ حاشہ نگاہیں جھکا کر سنتی رہی۔

پھر گفتگو کا رخ حاشہ کی طرف مڑ گیا۔ ارشاد بیگم نے کہا۔ ''میں نے ایک بات تو اب تک تجھ سے پوچھی ہی نہیں۔ تیری شادی تو نہیں ہوئی، پر کیا منگنی شنگنی بھی نہیں ہوئی؟''

وہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ ''ہاں آنٹی جان! منگنی تو ہوگئی ہے۔ کزن ہے میرا۔''

وہ چپ سی ہو کر اسے دیکھنے لگیں جیسے یہ اطلاع انہیں کچھ زیادہ اچھی نہ لگی ہو پھر وہ منگنی اور منگنی کے بعد کے حالات کے بارے میں حاشہ سے سوال جواب کرنے لگیں۔ حاشہ اس ''فیک'' موضوع سے پیچھا چھڑانا چاہتی تھی۔ ملازمہ نیلوفر کی آمد سود مند ثابت ہوئی۔ وہ چائے کے برتن میز پر رکھتے ہوئے بولی۔ ''مالکن! ٹی وی پر بہت پرانی فلم لگی ہوئی ہے۔ آپ کے دور کی..... پکے والی۔''

حاشہ بولی۔ ''آنٹی جان! پرانی فلمیں دیکھتی ہیں؟''

''ہاں جی، پنجابی ہونی چاہیے اور صبیحہ خانم یا مسرت نذیر وغیرہ کی۔'' نیلوفر بولی۔

''میری ماما کو بھی ایسی ہی پرانی پاکستانی فلمیں اچھی لگتی تھیں۔ کہتی تھیں آج کل تو فلمیں نہیں ''شور شرابا'' بنتا ہے۔''

کچھ ہی دیر بعد حاشہ نے ارشاد بیگم کی پسند کے مطابق یوٹیوب پر ایک پرانی فلم ڈھونڈی اور ایل ای ڈی پر لگا دی۔ وہ شام بڑی اچھی گزری۔

رات آٹھ بجے کے قریب تیمور، حاشہ کو واپس لے جانے کے لیے آگیا لیکن تب تک ارشاد بیگم ایک عجیب سی کیفیت سے دوچار ہوچکی تھیں۔ حاشہ کے ساتھ ایک دن کی رفاقت نے ان پر گہرا اثر چھوڑا تھا۔ انہوں نے تیمور سے بات کی اور اپنی بات پر اڑ گئیں۔ ان کا مطالبہ تھا کہ جب تک وہ صحت یاب نہیں ہوجاتیں، تیمور، مونا (حاشہ) کو روزانہ یہاں لے آیا کرے اور وہ شام تک یہیں ان کے پاس رہا کرے۔

ظاہر ہے کہ یہ عملی صورت میں کسی طور ممکن نہیں تھا۔ حاشہ کی یہاں تیمور کے گھر میں موجودگی بہت سے مسائل پیدا کرسکتی تھی۔ بدخواہ تو پہلے ہی موقع تلاش کر رہے تھے۔ دوسرے سیریل کی ریکارڈنگ ہو رہی تھی۔ شیڈول بے حد ٹائٹ تھا۔ ارشاد بیگم کی بزرگانہ ضد نے زور پکڑا تو حاشہ کو مداخلت کرنا پڑی۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں تیمور کو باہر جانے کا اشارہ کیا پھر ارشاد بیگم کا ہاتھ تھام کر بولی۔ ''آنٹی جان! تیمور صاحب تو شاید اجازت دینے پر تیار ہوجائیں۔ ظاہر ہے کہ وہ آپ کی بات ٹال نہیں سکتے لیکن میری اپنی ایک مجبوری ہے۔ اپنے ایک ذاتی کام کے لیے مجھے کم از کم تین چار ہفتوں کے لیے کوئٹہ جانا ہے۔ میری پرسوں کی فلائٹ ہے..... ویسے میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ ویڈیو کال کے ذریعے آپ سے بات کرتی رہوں گی۔''

ارشاد بیگم کے دماغ میں جو بات آگئی تھی، بس آگئی تھی۔ وہ اصرار کرتی رہیں۔ بڑی مشکل سے انہیں سمجھایا بجھایا گیا مگر انہوں نے شرط رکھی کہ وہ کم از کم کل شام تک

یہیں ان کے ساتھ رہے گی۔

بہ امرِ مجبوری حاشہ کو یہ شرط ماننا پڑی۔ ویسے بھی کل ریکارڈنگ نہیں تھی۔ اس نے فیروز حسن صاحب کو کال کر کے انہیں ساری صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔

..... وہ گرما کی ایک نسبتاً خوشگوار رات تھی۔ کیاریوں میں اور گل دانوں میں موتیے اور سوسن کے پھول مہکے ہوئے تھے۔ حاشہ نے کچن میں جا کر ارشاد بیگم کے لیے خود کھانا بنایا پھر وہ سب باہر گراسی لان میں کرسیوں پر آ بیٹھے۔ تیمور کو یہ سب کچھ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اپنے گھر میں چلتی پھرتی حاشہ کو دیکھ کر اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے سینے میں دبی ہوئی کوئی ہزاروں سال پرانی ''خوش رنگ آرزو'' پوری ہو رہی ہے۔ اس کا دل چاہا کہ یہ وقت اسی جگہ ٹھہر جائے۔ وہ کل کبھی نہ آئے جب حاشہ کو یہاں سے جانا ہو..... پتا نہیں کیوں ایک بار پھر تیمور کو وہ دن یاد آ گئے جب وہ بارہ تیرہ سال کا، تیل سے چپڑے بالوں والا شیر وتھا اور سفید ستونوں والے گیٹ کے ساتھ لگ کر ایسے ہی ایک سبزہ زار میں حاشہ کو خوش رنگ لباس میں حرکت کرتے دیکھا کرتا تھا۔ اس وقت وہ بڑی حسرت کے ساتھ سوچا کرتا تھا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ یہ گڑیا سی دلکش لڑکی اس کے اپنے گھر میں ہو اور اسی طرح وہاں چلتی پھرتی نظر آئے۔ عجیب سی احمقانہ خواہشیں اس کے دل میں جاگا کرتی تھیں..... جیسے ایک یہ خواہش تھی کہ اس کے گھر میں جہاں جہاں اس دلکش گڑیا کے قدم پڑیں گے، وہ اس جگہ کی مٹی کو اٹھا کر اپنی نیکر کی جیبوں میں بھر لے گا اور پھر اسے چوما کرے گا۔

آج مدتوں بعد اس کی کم از کم یہ خواہش تو پوری ہوئی تھی کہ وہ خوش رنگ لباس والی حاشہ اس کے گھر میں چلتی پھرتی نظر آ رہی تھی۔ اس کا رنگین آنچل یہاں وہاں لہرا رہا تھا۔ کتنی عجیب بات تھی، آج وہ شیر و نہیں تھا، ایک نامی گرامی وکیل اور ٹی وی اسٹار تھا مگر اس کے اندر دبی ہوئی دیوانی آرزو ویسی ہی تھی۔ وہ آج بھی اپنی نگاہوں کو اس کی قدم بوسی سے باز نہیں رکھ پا رہا تھا۔ بے شک ایسا سوچتے ہوئے وہ خود کو احمق بھی محسوس کر رہا تھا لیکن اس حماقت پر اسے کوئی ندامت نہیں تھی۔ پتا نہیں کیوں تھا ایسا؟ شاید یہ اسی عشق کی کرشمہ کاریاں تھیں جس کا دانش اور ہوش و خرد سے کوئی ''ناتا'' نہیں ہوتا۔

وہ ملازمہ نیلوفر کو کچھ ہدایات دے کر لان میں تیمور اور اس کی والدہ کے پاس ہی آ بیٹھی۔ گارڈن لائٹ میں اس کا چہرہ شیشے کی طرح چمک رہا تھا۔ کرسیوں کے نیچے چکراتی ہوئی پالتو للی ایک بار پھر جست کر کے حاشہ کی گود میں آ بیٹھی۔ اس نے تیسری چوتھی مرتبہ ایسا کیا تھا۔ حاشہ نے اس کی گردن سہلائی اور اپنے ساتھ لگا لیا۔ ''بھئی تم تو بڑی فرینک ہو گئی ہو۔''

تیمور مسکرایا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ اس کی دو وجوہات ہیں۔ ایک تو آپ کی اپنی شخصیت، دوسرے شاید روشو کی خوشبو۔''

''کیا مطلب؟''

وہ ہولے سے بولا۔ ''روشو بھی تو آپ کی گود میں چڑھتا ہے نا۔ اس کو یہاں روشو کی خوشبو آتی ہو گی۔ آپ کو تو پتا ہی ہے دونوں دیوانے ہیں ایک دوسرے کے۔''

نیلوفر قہوہ لے کر آ گئی تھی۔ ارشاد بیگم اس کی طرف متوجہ تھیں لہٰذا انہوں نے تیمور اور حاشہ کا مکالمہ نہیں سنا۔ حاشہ نے بھی قہوے کی بھاپ اڑاتی پیالیوں کی طرف متوجہ ہونا بہتر سمجھا..... تیز ہوا چلنا شروع ہو گئی۔ حاشہ کے ریشمی بال اس کے چہرے پر اٹکھیلیاں کرنے لگے۔

رات کو موسم ابر آلود ہو گیا تھا پھر بارش بھی شروع ہو گئی۔ تیمور کے لیے یہ خیال بے حد راحت آفریں تھا کہ آج حاشہ اسی چھت کے تلے اس کے ساتھ موجود ہے۔ وہ والدہ والے کمرے میں ہی سو رہی تھی۔ تیمور گھر کے فرنٹ پورشن میں اپنے کمرے کے اندر تھا۔ یہاں سے اسے گھر کا گیٹ اور وہاں موجود سیکیورٹی گارڈ بھی نظر آتے رہتے تھے۔ آج چونکہ بارش تھی اس لیے گارڈز گیٹ کے قریب لکڑی کے چھوٹے سے کیبن میں تھے۔ کم از کم ایک گارڈ گھر کے باہر بھی متحرک رہتا تھا۔ رات کے تیسرے پہر تک تیمور جاگتا رہا پھر اس پر غنودگی طاری ہوئی اور وہ سو گیا۔ وہ جانتا نہیں تھا کہ آج ایک اور کردار اس کہانی میں داخل ہونے والا ہے۔

تیمور زبردست شور کی وجہ سے جاگا تھا۔ یہ شیشہ ٹوٹنے کا زوردار چھناکا تھا۔ اس کے ساتھ ہی کوئی وحشیانہ انداز میں دہاڑا۔ تیمور اٹھا، لائٹ آن کی اور سلیپنگ گاؤن کی ڈوری باندھتا ہوا اس حصے کی طرف گیا جہاں والدہ اور حاشہ سو رہی تھیں۔ اس نے دراز میں سے اپنا پستول بھی نکال لیا تھا۔ وہ والدہ کے بیڈ روم کے قریب پہنچا تو دو سیکیورٹی گارڈز اور ملازم نورا کسی شخص سے لپٹے ہوئے نظر آئے۔ وہ کوئی نوجوان تھا۔ ان کے ہاتھوں سے نکل نکل جا رہا تھا پھر ایک اور گارڈ بھی آ گیا۔ نوجوان اوندھے منہ شیشے کی ایک تپائی سے ٹکرا کر قالین پر گرا۔ اسے چاروں طرف سے دبوچ

لیا گیا۔ تب تیمور نے دیکھا کہ نوجوان کے ہاتھ میں کوئی تیز دھار آلہ بھی ہے۔ تیمور آگے بڑھا اور آلے والی کلائی پر اپنا پاؤں رکھ دیا۔ ایک گارڈ نے تیز دھار آلہ اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ یہ ایک خنجر نما خم دار چاقو تھا۔ تب تیمور نے دیکھا کہ ایک سیکیورٹی گارڈ کا بازو کندھے کے قریب سے لہولہان نظر آرہا تھا۔

نوجوان کی عمر چوبیس پچیس سال تھی۔ رنگ گندمی اور بال لمبے تھے۔ وہ چھریرے اور مضبوط جسم کا تھا۔ اس نے براؤن رنگ کی شلوار کے اوپر کافی لمبی قمیص پہن رکھی تھی جو اب کئی جگہ سے پھٹ چکی تھی۔ وہ مچل رہا تھا اور چلّا رہا تھا۔

''نہیں چھوڑوں گا۔ ایک ایک کو ماردوں گا۔ پورا خاندان ختم کردوں گا۔''

سیکیورٹی گارڈز اسے رائفلوں کے کندوں سے پیٹنے لگے۔ ''رک جاؤ۔ بات کرنے دو اس سے۔'' تیمور نے کہا۔

وہ پھر چنگھاڑنے لگا۔ ''مجھے پتا ہے تم یہاں پر ہو۔ میری بات کان کھول کر سن لو..... میں نے نہیں چھوڑنا تجھے اور نہ تیرے باپ اور بھائی کو۔ ایک ایک کی آنتیں (انتڑیاں) نکال دوں گا.....''

یکا یک تیمور کو محسوس ہوا کہ یہ بپھرا ہوا شخص کسی اور کو نہیں، حاشہ کو دھمکیاں دے رہا ہے۔ پھر اچانک جیسے بجلی سی چمک گئی۔ اس کی پھرتی حیران کن تھی۔ اس نے تڑپ کر پینترا بدلا اور اپنے دونوں ہاتھ ایک گارڈ کی رائفل پر ڈال دیے۔ قریب تھا کہ وہ آٹو میٹک رائفل چھین لیتا، تیمور نے اس کی کلائی پر زوردار ٹھوکر رسید کی۔ انچارج گارڈ نے اس کے لمبے بال مٹھی میں جکڑے اور اس کا سر ایک ستون سے ٹکرا دیا۔ اسے ایک بار پھر قالین پر پوری طرح چھاپ لیا گیا۔

زخمی گارڈ کے بازو پر چاقو کا وار ہی لگا تھا۔ اسے ٹانکوں وغیرہ کی ضرورت تھی۔ تیمور نے اسے ملازم نورے کے ساتھ فوراً قریبی کلینک کی طرف روانہ کردیا۔ نوجوان کے ہاتھ نائیلون کی رسی کے ساتھ اس کی پشت پر باندھ دیے گئے اور ٹانگیں بھی جکڑ دی گئیں۔ وہ پہلے تو گالی گلوچ کرتا رہا پھر ایک گارڈ کے تھپڑ کھا کر ایک دم چپ ہوگیا۔ آنکھیں بند کرلیں اور لمبے سانس لینے لگا۔ اس کی ایک باچھ سے مسلسل خون رس رہا تھا۔

تیمور کی والدہ اور حاشہ ڈری سہمی ایک کھڑکی میں سے جھانک رہی تھیں۔ تیمور نے انہیں جا کر تسلی دی۔ والدہ نے حملہ آور کی دھاڑیں وغیرہ نہیں سنی تھیں۔ وہ یہی سمجھ رہی تھیں کہ کوئی چور ڈاکو گھس آیا ہے۔ تاہم حاشہ کے چہرے کا رنگ بدلا ہوا تھا۔

تیمور کے حکم پر اس کے گارڈز بندھے ہوئے نوجوان کو گھسیٹتے ہوئے ڈرائنگ روم کے ساتھ والے کمرے میں لے گئے۔ بارش ابھی تک جاری تھی۔ ایک گارڈ نے بتایا کہ بارش کی وجہ سے وہ لوگ اپنے کیبن میں تھے۔ یہ لڑکا پہلے ساتھ والی کوٹھی میں داخل ہوا پھر وہاں سے درمیانی دیوار پھاند کر صحن میں کودا۔

گارڈ نے کہا۔ ''ہم نے اسے دیکھا اور اس کے پیچھے لپکے۔ یہ سائڈ کے کمرے والا شیشہ توڑ کر اندر گھس گیا۔ اسے پکڑا گیا تو اس نے اندھا دھند چاقو گھمایا اور اسلحہ چھیننے کی کوشش بھی کی۔''

تیمور نے کہا۔ ''کہیں ایسا تو نہیں کہ اس کا کوئی ساتھی بھی ہو جو اندر گھسنے کے بعد کہیں چھپا ہوا ہو یا باہر چکرا رہا ہو؟''

سینئر گارڈ نے پورے یقین سے کہا۔ ''نہیں سر! اندر تو یہ اکیلا ہی گھسا تھا پھر بھی ہم باہر اچھی طرح دیکھ لیتے ہیں.....''

شکر کا مقام تھا کہ اس سارے ہنگامے میں کوئی فائر وغیرہ نہیں ہوا تھا ورنہ اب تک اڑوس پڑوس والے جمع ہوچکے ہوتے۔

حملہ کرنے والے نوجوان کو گارڈز کی نگرانی میں چھوڑ کر تیمور ایک بار پھر حاشہ کے پاس پہنچا۔ اسے علیحدہ کمرے میں لے جا کر اس سے پوچھا۔ ''آپ جانتی ہیں اس بندے کو؟''

حاشہ کے چہرے پر الجھن کی پرچھائیاں تھیں، بولی۔ ''مجھے لگتا ہے کہ میں نے اسے دیکھا ہوا ہے۔ شک پڑتا ہے کہ یہ ہماری پرانی ملازمہ شگفتہ کا کوئی رشتے دار یا کزن وغیرہ تھا۔''

''یہ بڑی پریشانی والی بات ہے حاشہ! لگتا ہے کہ یہ آپ کو نقصان پہنچانا چاہ رہا تھا۔ آپ کے پاپا کا نام بھی لے رہا تھا۔ کہیں کوئی پرانی رنجش وغیرہ؟''

حاشہ نے سر نفی میں ہلا کر لاعلمی کا اظہار کیا مگر تیمور نے محسوس کیا کہ حاشہ کے چہرے پر ایک سایہ سا بھی لہرایا ہے۔

تیمور، حاشہ اور والدہ کو تسلی وغیرہ دینے کے بعد پھر اس کمرے میں آگیا جہاں جنونی حملہ آور کو پکڑ کر رکھا گیا تھا۔ وہ نائیلون کی رسی میں جکڑا ننگے فرش پر پڑا تھا۔ اس کا

تعلق جنوبی پنجاب سے لگتا تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی تھیں اور ان میں طیش کے سرخ ڈورے سے تیرتے تھے۔ ایک کان میں چاندی کی چھوٹی سی بالی بھی نظر آتی تھی۔ وہ ناک پھلا کر لمبی لمبی سانس لے رہا تھا اور لگتا تھا کہ کسی بھی وقت پھر غصے سے پھٹ پڑے گا۔

تیمور نے گارڈ کو حکم دیا کہ اسے اٹھا کر کرسی پر بٹھایا جائے پھر وہ خود بھی صوفے پر بیٹھ گیا اور گارڈز کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ پتا نہیں کیوں نوجوان کی آنکھوں میں سرخ ڈورے دیکھ کر تیمور کو عجیب سی سنسنی کا احساس ہو رہا تھا۔

اس نے آنکھیں بند کیں اور ایک بار پھر زہریلی سرگوشیاں کرنے لگا۔ ''نہیں چھوڑوں گا۔ ان میں سے کسی کو نہیں چھوڑوں گا اور اس دغاباز کو بھی نہیں چھوڑوں گا۔''

پتا نہیں کہ وہ کس دغاباز کا ذکر کر رہا تھا۔

''کیوں گھسے ہو تم یہاں؟'' تیمور نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''میری تم سے کوئی دشمنی نہیں باؤ صیب! میری دشمنی اس بدبخت سے ہے اور اس کی اولاد سے ہے۔ میں نے ان میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑنا.....''

اس کے لہجے نے تیمور کے جسم میں ایک سرد لہر دوڑا دی۔ وہ اس کا چہرہ اور اس کی آنکھیں دیکھتا چلا گیا۔ ان آنکھوں میں کچھ سرخ ڈورے تھے۔ ایک عمودی رخ پر، دو تین افقی رخ پر۔ بیرسٹری کے دوران میں اور بیرسٹری کے بعد تیمور نے قریباً آٹھ سال انگلینڈ میں گزارے تھے۔ تیمور کو اس اعلیٰ مقام تک پہنچانے میں اس کے مہربان مسٹر جیمز جانسن کا بہت رول تھا۔ وہی گورا صاحب، جس نے تیمور کی زندگی کے نہایت مشکل دور میں اس کا ہاتھ تھاما تھا اور اسے اپنی راہنمائی سے انگلینڈ کا ایک جانا پہچانا ''لائر'' بنا دیا تھا۔ مسٹر جانسن زیادہ تر قتل کے کیسز میں بطور وکیل صفائی پیش ہوتے تھے۔ ان کی زیر نگرانی تیمور نے بھی سیکڑوں ہی مرڈر کیس ڈیل کیے تھے۔ ان گنت قاتلوں کو دیکھنے اور ان سے ملنے کا اسے اتفاق ہوا تھا۔ کئی بار تو وہ اپنے کسی مؤکل کا چہرہ دیکھ کر بھی اندازہ لگا لیا کرتا تھا کہ اس نے قتل کیا ہوگا یا نہیں۔ خاص طور سے اسے بھی مسٹر جانسن کی طرح قاتلوں کی آنکھوں کی پہچان ہو گئی تھی۔

.....آج اپنے گھر میں گھسنے والے اس ''ینگ اینگری مین'' کو دیکھ کر تیمور کو یہی لگا تھا کہ اس کے چہرے پر ایک قاتل کی آنکھیں ہیں۔ وہ قتل کر چکا ہے یا عنقریب کرنے والا ہے۔ اس کی وحشت، اس کا جنون، اس کی جسمانی طاقت سب اسی امر کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ تیمور کا دل گواہی دینے لگا کہ آج حاشہ ایک بڑے سانحے سے بچی ہے۔

تیمور بات کرنے کا فن جانتا تھا اور اپنے مخاطب کو اپنے ڈھب پر لانے کا ہنر بھی اسے حاصل تھا۔ شاید یہی ہنر تھا جس نے اسے ایک کامیاب وکیل کے ساتھ ساتھ ایک ہر دلعزیز ٹی وی ہوسٹ بھی بنایا تھا۔ بہت جلد نہ صرف حملہ آور کی وحشت کم ہو گئی بلکہ وہ نہایت جذباتی انداز میں تیمور کے کچھ سوالوں کے جواب بھی دینے لگا۔

اس نے اپنا نام مراد بتایا۔ اس نے بلا جھجک اعلان کیا کہ وہ سابق ایس ایس پی سجاد ساہی کی بیٹی کو مارنے کے لیے اس گھر میں گھسا تھا۔ اس کا اصل نشانہ تو سجاد ساہی ہے مگر اس کے ہوتے سوتوں میں سے بھی جو اس کے ہتھے چڑھے گا، وہ اس کا خون پی جائے گا۔

وہ ایسی کسی جنونی کیفیت میں تھا کہ اپنے ارادوں کو چھپانا بھی ضروری نہیں سمجھ رہا تھا۔ یہ کسی مجرم کی وہ اسٹیج ہوتی ہے جب گرفتاری، پولیس مقابلے یا پھانسی وغیرہ کا خوف اس کے ذہن سے نکل جاتا ہے۔

وہ دھیرے دھیرے تیمور پر کھلتا جا رہا تھا۔ تیمور نے کہا۔ ''پہلے تم یہ بتاؤ کہ تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ سجاد ساہی صاحب کی بیٹی اس گھر میں ہے؟''

''مجھے پتا ہے وہ کمینی اس گھر میں ہے۔'' وہ آنکھوں سے شعلے چھوڑتے ہوئے بولا۔ ''جب وہ فیروز ہاؤس سے یہاں آنے کے لیے نکلی، مجھے اسی وقت پتا چل گیا تھا۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ تم فیروز ہاؤس کے آس پاس گھوم رہے تھے؟''

وہ پھنکارا۔ ''میں ہر اس جگہ کے آس پاس گھوم رہا ہوں جہاں اس بدمعاش خاندان کا کوئی کمینہ بھی مجھے مل سکے۔'' وہ سینہ تان کر اور گلے کی رگیں پھلا کر بولا۔

تیمور نے اس سلسلے میں اس سے دو تین سوال مزید کیے اور اسے اندازہ ہوا کہ وہ اتنا بھی سادہ نہیں جتنا نظر آ رہا ہے۔ کم از کم اس حوالے سے تو وہ غلط بیانی ہی کر رہا تھا کہ اس نے حاشہ کو فیروز ہاؤس سے ٹریس کیا تھا۔

تیمور نے کہا۔ ''سجاد ساہی سے کیا دشمنی ہے تمہاری؟''

اس سوال پر وہ ایک بار پھر جوش میں آ گیا۔ ''تم بتاؤ باؤ صیب! تمہاری کیا دوستی ہے سجاد کی دھی سے؟ سنا ہے کہ تمہارا تو وہ بہت وڈا دشمن ہے۔ تمہارے پر کیس کیے ہوئے

ہیں اس نے اور اس کے پتر نے۔ تمہیں قتل کرنے کو پھر رہے ہیں وہ لوگ اور تم نے اس کی دھی سے معاملہ بنایا ہوا ہے۔ ہر ایک کو پتا ہے اس کا۔''

وہ حاشہ کے لیے بُرے الفاظ استعمال کر رہا تھا۔ ایک بار تو تیمور کا جی چاہا کہ ایک دو کرارے تھپڑ اسے رسید کرے مگر یہ مناسب نہیں تھا۔ وہ چاہ رہا تھا کہ مراد نامی اس بندے کے ساتھ اس کا ذہنی فاصلہ کم ہوتا کہ وہ اس کے سامنے کچھ اگل سکے۔

تیمور نے اپنا سوال ذرا مختلف اینگل سے دہرایا تو وہ ایک دم پھٹ پڑا۔ سجاد ساہی کی شان میں ''قصیدے'' پڑھنے کے بعد بولا۔ ''وہ ظالم ہے۔ اس نے اپنی طاقت اور دولت کے زور پر مجھ سے زندہ رہنے کا حق چھین لیا ہے۔ وہ میرا سب کچھ تھی۔ میں اس کے بغیر جینے کا سوچ بھی نہ سکتا تھا پر وہ میری نہ رہی۔ وہ اس عیاش کی گود میں جا بیٹھی۔ اب کون ہے میرا آگے پیچھے جس کے لیے زندہ رہوں گا۔ ماردوں گا۔ اس ساہی نام کے کمینے کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

تیمور سمجھ گیا کہ وہ اپنی کسی محبوبہ کا ذکر کر رہا ہے جو سجاد ساہی کی ہوس کی بھینٹ چڑھی ہے۔ ایسی نہ جانے اور کتنی سیاہیاں سجاد ساہی کے اعمال نامے میں تھیں۔

تیمور کو یاد آیا کہ وہ ابھی کچھ دیر پہلے کسی کے دغا دینے کا ذکر بھی کر رہا تھا۔ تیمور نے پوچھا۔ ''اور وہ دغاباز کون ہے جس کی تم ابھی بات کر رہے تھے؟''

وہ پھنکارا۔ ''وہی ہے جس نے میری غربت پر تھوکا اور دولت کی پجارن بن کر اس کے بستر پر چلی گئی۔ نہیں چھوڑوں گا اس بے وفا کو بھی۔ ٹوٹے کروں گا اس کے..... میں اس کو اپنا بنانے کے لیے پردیس میں اپنی ہڈیاں رولتا رہا، رات دن اپنا خون پسینا ایک کرتا رہا اور وہ یہاں اس سرمایہ دار کے سامنے اپنا سب کچھ ہار گئی۔''

تیمور کو اب کچھ کچھ اس کہانی کی سمجھ آ رہی تھی۔ اس نے اس شعلہ فشاں نوجوان سے گفتگو جاری رکھی۔ وہ سراپا آتش تھا اور یہ آتش کسی بھی طرح اپنے اہداف کو جلا کر راکھ کرنا چاہتی تھی۔ اس کی گفتگو سے پتا چلا کہ اس کی محبوبہ کا نام شگفتہ تھا اور وہ سابق ایس ایس پی سجاد ساہی کے گھر ملازم تھی۔

تیمور کے ذہن میں کھد بد ہوئی۔ اسے یاد آیا کہ کچھ عرصہ پہلے حاشہ نے اپنی دیرینہ ملازمہ شگفتہ کی موت کا مختصر سا ذکر کیا تھا اور اب وہ یہ بھی کہہ رہی تھی کہ یہ لڑکا شاید اس کا کزن ہے۔

کمرے کے بند دروازے پر دستک ہوئی۔ تیمور کا ملازم خاص نورا کھڑا تھا۔ ''صاحب جی! میڈم حاشہ آپ کو بلا رہی ہیں۔'' موجودہ صورتِ حال میں نورا بھی سخت کشیدہ نظر آتا تھا۔

زخمی مراد کو اس کے حال پر چھوڑ کر تیمور نے کمرا لاک کیا اور حاشہ کے پاس پہنچا۔ وہ زرد اور نڈھال نظر آ رہی تھی۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ یہ سب کیا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ وہ جلد از جلد فیروز ہاؤس واپس بھی جانا چاہتی تھی مگر ظاہر ہے کہ اس کی واپسی والا کام صبح سے پہلے نہیں ہو سکتا تھا۔

رات کا باقی حصہ اہلِ خانہ نے جاگتے ہوئے ہی گزارا۔ صرف والدہ کو تیمور نے سکون بخش دوا کھلا دی تھی اور وہ سو گئی تھیں۔ زخمی گارڈ مرہم پٹی کے بعد واپس آ چکا تھا۔ تیمور نے ابھی تک فیروز حسن صاحب کے سوا اس واقعے کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا اور نہ پولیس میں اطلاع دی تھی۔

اب رات کے چار بجے کا عمل تھا۔ بارش بوندا باندی میں تبدیل ہو چکی تھی۔ تیمور، حاشہ کے ساتھ بالائی منزل کے ایک کمرے میں بیٹھا تھا۔ اس نے وہ ساری گفتگو حاشہ کے گوش گزار کر دی تھی جو مراد نامی اس نوجوان کے ساتھ ہوئی تھی۔ حاشہ کا رنگ مزید زرد نظر آنے لگا تھا اور آنکھوں میں تشویش کے سائے گہرے ہو گئے تھے۔

تیمور نے حاشہ کے چہرے پر نگاہیں جمائے ہوئے کہا۔ ''حاشہ! اگر آپ بتانا نہ چاہیں تو میں ہرگز آپ پر زور نہیں دوں گا..... مگر ذہن میں تجسس پیدا ہو رہا ہے۔ کیا یہ وہی شگفتہ ہے جو چند ماہ پہلے ڈیلیوری کے دوران میں مری ہے؟''

حاشہ کے چہرے پر کرب کے آثار تھے جیسے ایک بڑی آزمائش سے گزر رہی ہو۔ آخر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ دو موٹے آنسو اس کے زردی مائل رخساروں پر رینگ گئے۔

''ہاں تیمور.....! یہ بندہ جس شگفتہ سے بدلہ لینے کی باتیں کر رہا ہے، وہ تو پہلے ہی اپنی نادانی پر پچھتانے اور رونے پیٹنے کے بعد جان ہار چکی ہے۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے، یہ لڑکا شگفتہ کا کوئی کزن تھا۔ اس کا آگے پیچھے کوئی نہیں تھا..... دونوں چاہتے تھے ایک دوسرے کو پھر شاید یہ مزدوری وغیرہ کرنے کے لیے مسقط چلا گیا تھا۔''

''بعد میں وہ آپ کے پاپا کی باتوں میں آ گئی.....'' تیمور نے کہا۔ ''اور سب گنوا بیٹھی۔''

حاشہ نے دکھی انداز میں سر جھکا لیا۔

''آپ کے پاپا اور بھائی کی بھڑکائی ہوئی آگ اب آپ تک بھی پہنچ رہی ہے۔ سچ ہی کہتے ہیں کہ کہانیاں اچھی ہوں یا بُری، اپنے کرداروں سے رشتہ نہیں توڑتیں..... جب بھی موقع ملے، وہ ان کی طرف پلٹتی ہیں۔''

وہ کھوئی ہوئی آواز میں بولی۔ ''پتا نہیں تیمور! کیوں اب تو یہی دل چاہتا ہے کہ کوئی کہانی میری طرف پلٹ آئے۔ میری جان لے لے۔ کچھ تو کفارہ ادا ہو ساہی نیملی کے گناہوں کا۔''

''پلیز حاشہ!'' تیمور نے سخت لہجے میں اسے چپ کرا دیا۔

حاشہ نے جیسے چونک کر پوچھا۔ ''اس لڑکے کو پتا ہے کہ شگفتہ..... میرا مطلب ہے کہ شگفتہ اس دنیا میں نہیں رہی؟''

''اسے نہیں پتا حاشہ! وہ اسے بھی ڈھونڈ رہا ہے۔ اسے بے وفا گردان رہا ہے اور اس کی بھی جان لینا چاہتا ہے۔''

''تیمور..... پلیز! آپ نے شگفتہ کی موت کا ذکر اس سے نہیں کرنا اور ہو سکے تو اس جنونی کو اپنے ارادوں سے باز رکھنے کی کوشش کریں۔ بہتر تو یہی ہے کہ اسے پولیس کے حوالے کیا جائے.....''

تیمور کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں نمایاں ہو گئیں۔

..... کچھ ہی دیر بعد وہ پھر اس مراد نامی نوجوان کے پاس بیٹھا تھا۔ تیمور کی ہدایت پر نورے نے اس کے پاؤں کھول دیے تھے مگر ہاتھ ابھی تک پشت پر بندھے تھے۔ وہ آڑا ترچھا صوفے پر پڑا تھا اور سخت مضطرب نظر آتا تھا۔ تیمور نے اس سے کہا۔ ''غصہ عقل کو کھا جاتا ہے۔ تم بھی حماقت کے دریا میں بہہ رہے ہو۔ تمہیں پتا نہیں کہ سجاد ساہی کی جس بیٹی کی جان لینا چاہتے ہو، وہ تو خود اپنے باپ اور بھائی کے ظلم کا شکار ہے۔ ان کے دیے ہوئے دکھ جھیل رہی ہے۔''

..... تیمور نے اسے وہ سب کچھ بتایا جو بتانا ضروری سمجھا۔ وہ کبھی بے یقینی اور کبھی تھوڑے یقین کے ساتھ سنتا رہا۔ تب تیمور نے اس سے شگفتہ کے بارے میں پوچھا۔ ''تم کہتے ہو کہ وہ لالچ میں آ کر سجاد ساہی کے ساتھ رنگ رلیاں منانے لگی۔ اس کا کیا ثبوت ہے تمہارے پاس؟''

''بہت سے ثبوت ہیں اور سب سے بڑا ثبوت میرے دل کی گواہی ہے۔'' اس نے آخری چار پانچ الفاظ طیش کے عالم میں اتنی بلند آواز سے کہے کہ کمرا گونج اٹھا۔

''تمہیں کچھ پتا نہیں مراد ے! تمہیں تو شاید یہ بھی پتا نہیں کہ وہ شگفتہ ہے کہاں؟''

''وہ جہاں بھی ہے، بچ نہیں پائے گی۔ ماردوں گا اس کو بھی۔'' اس کے لہجے میں دیوانگی آمیز عزم تھا..... اور آنکھوں میں وہی سرخ ڈورے نظر آ رہے تھے جنہیں تیمور ''مرڈرنگ لائنز'' کہا کرتا تھا۔

تیمور کے سامنے میز پر وہ اشیا پڑی تھیں جو مراد کی تلاشی کے بعد اس کے لباس سے ملی تھیں۔ ایک دیہاتی طرز کا چھوٹا رومال تھا جس پر پھول بنے ہوئے تھے، ڈھائی تین سو کی نقدی تھی، ایک لائٹر اور سگریٹ کا پیکٹ تھا۔ سگریٹ کے اس پھٹے ہوئے خالی پیکٹ پر ایک جگہ پنسل سے شکستہ لکھائی میں لکھا تھا۔ 25 تاریخ بروز ہفتہ گجرات سے آگے شاپور گاؤں۔ میلے میں ضرور ہوگا۔

میلے میں ضرور ہوگا..... اس کا کیا مطلب تھا؟ گجرات اور شاپور کے الفاظ بھی تیمور کے ذہن میں کھٹک رہے تھے پھر اسے یاد آیا یہی تو حاشہ اور اس کی نیملی کا آبائی گاؤں تھا۔ وہاں حاشہ کے دادا کی حویلی تھی۔ یہ لوگ اکثر وہاں جاتے تھے۔ خاص طور سے میلے میں۔ تیمور نے سامنے دیوار پر آویزاں کیلنڈر کو دیکھا۔ دو روز بعد 25 تاریخ تھی اور ہفتہ تھا۔ تو کیا شاپور گاؤں میں میلا بھی تھا؟ اگر میلا تھا تو وہاں ساہی فیملی کے لوگوں نے ضرور جانا تھا۔ بہت سی کڑیاں آپس میں ملنے لگیں۔ مطلب یہ کہ سجاد ساہی کا اس میلے میں ہونا بھی عین ممکن تھا۔ (تیمور کی معلومات کے مطابق حاشہ کا بھائی عدیل عالم اپنی نو بیاہتا بیوی کے ساتھ دو ہفتے کے تفریحی ٹور پر گلگت گیا ہوا تھا)۔

تیمور نے ایک بار پھر اس ٹوٹی پھوٹی تحریر کو پڑھا۔ تاریخ کے نیچے لکھا ہوا تھا..... میلے میں ضرور ہوگا..... یہ کس کے ہونے کی بات تھی؟

تیمور نے مراد سے پوچھا تو وہ صاف مکر گیا کہ اس نے کچھ لکھا ہے..... تب ایک بار پھر اسے جوش آنا شروع ہو گیا۔ وہ سجاد ساہی اور اس کی نیملی کو صلواتیں سنانے لگا۔ تیمور کے پکارنے پر نورا ایک تنومند گارڈ کے ساتھ اندر آیا۔ انہوں نے مراد کو صوفے سے قالین پر گرا دیا اور اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اوپر سے بھی ایک کپڑا باندھ دیا تاکہ اس کی گالیاں اس کے اندر ہی گونجتی رہیں۔

تیمور باہر نکل آیا اور دروازہ لاک کروا دیا۔

☆☆☆

اگلے روز صبح سویرے ہی حاشہ فیروز ہاؤس واپس چلی گئی تھی۔ ابھی تک یہ واضح نہیں ہوسکا تھا کہ مراد کو اس بات کا پتا کیسے چلا کہ حاشہ فیروز ہاؤس سے تیمور کے گھر آئی ہے۔ اگر واقعی اسے فیروز ہاؤس سے یہ سراغ ملا تھا تو پھر فیروز ہاؤس میں حاشہ اور فیروز حسن صاحب کو مزید احتیاط کی ضرورت تھی۔

مراد عرف مراد ابھی تک تیمور کی تحویل میں تھا۔ اسے گھر کے عقبی کمرے میں مقفل رکھا گیا تھا۔ اس کے ہاتھ وغیرہ کھول دیے گئے تھے مگر کھانا کھڑکی کی آہنی گرل کے اندر سے ہی پہنچایا جارہا تھا۔ تیمور ابھی تک فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ اسے پولیس کے حوالے کیا جائے..... یا پھر اس سے کسی اور طرح نمٹا جائے۔ تیمور کا وہ دن ویسے بھی عدالتی کاموں اور ریکارڈنگ کے سلسلے میں بہت مصروف گزرا تھا۔ رات دس بجے کے قریب وہ تھکا ماندہ واپس آیا اور والدہ سے ملنے کے بعد فوراً لیٹ گیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ صبح مرادے سے بات کرے گا۔

رات بارہ بجے کے لگ بھگ وہ جاگا تو سرہانے رکھا موبائل وائبریٹ کررہا تھا۔ نامعلوم نمبر تھا۔ اس نے کال ریسیو کی۔ بھرائی آواز میں بولا۔ ''ہیلو کون؟''

دوسری طرف جیسے بم پھٹ گیا۔ سجاد ساہی کی دہاڑتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''میں انگاروں پر لوٹ رہا ہوں حرامزادے..... تُو کیسے آرام سے رہ سکتا ہے؟ تُو نے کھلی جنگ کی ہے میرے ساتھ۔ اب جو جو کچھ ہوگا، تیری وجہ سے ہوگا..... تیری وجہ سے ہوگا۔''

تیمور نے ایک توقف کے بعد ہموار لہجے میں کہا۔ ''میری وجہ سے کچھ نہیں ہوگا۔ یہ تم لوگوں کے کالے کرتوت ہیں جو سامنے آرہے ہیں اور میں لعنت بھیجتا ہوں تمہاری اس گندی زبان پر۔'' اس کے ساتھ ہی تیمور نے فون بند کردیا۔

کچھ دیر بعد کال کے سگنل پھر آنے لگے۔ وہی نمبر تھا۔ تیمور نے فون صوفے پر پھینکا اور آنکھیں بند کرکے لیٹ گیا۔ بیل ہوتی چلی جارہی تھی۔ آخر ٹیکسٹ میسج آیا۔ یہ سجاد کی طرف سے ہی تھا۔ گالیوں سے شروع ہوکر گالیوں پر ختم ہوا تھا۔ درمیان میں اس نے لکھا تھا۔ ''.....تم نے میری بیٹی کو اسکرین پر تماشا بنایا ہے۔ وہ جو سات پردوں میں رہتی تھی اب..... ہزاروں لاکھوں لوگوں کے سامنے ڈرامے کرے گی۔ تیری اس ''دلیری'' کے لیے تجھے مار دینا معمولی سزا ہے تیمورے! مزہ تو تب ہے کہ تو موت کی بھیک مانگے۔''

اس میسج میں ایک نیلی آگ تھی جو سجاد ساہی نے لفظوں کے ذریعے تیمور تک پہنچائی تھی۔ ساہی جیسے خطرناک شخص کی دھمکی کسی بھی شخص کا پتا پانی کرسکتی تھی مگر وہ تیمور تھا۔ اس کا باپ محمد علی کہا کرتا تھا..... میرے شیر و کے سینے میں شیر کا دل دھڑکتا ہے.....

تیمور نے اطمینان سے اپنے بالوں بھرے سینے پر انگلیاں چلائیں اور زیرلب مسکرا کر فون پھر صوفے پر پھینک دیا۔

وہ دوبارہ سونے کی تیاری میں تھا جب اچانک اس کی نگاہ بالائی منزل کی اس کھڑکی سے گزر کر گراؤنڈ فلور کے عقبی پورشن کی طرف چلی گئی۔ اسے ایک ہیولا سا نظر آیا۔ اس نے آنکھیں سکوڑ کر دیکھا۔ یہ اس کا پرانا ملازم نورا تھا۔ نورے کا نظر آنا عجیب بات نہیں تھی، عجیب اس کا انداز تھا۔ وہ جیسے بڑی رازداری کے ساتھ دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا اس کمرے کی طرف جارہا تھا جہاں مراد بند تھا۔

تیمور کھڑکی کے شیشے سے آنکھیں لگا کر بغور دیکھنے لگا۔ نورا اب اس گرل دار کھڑکی کے سامنے تھا جہاں سے مراد کو کھانا پہنچایا جارہا تھا۔ دائیں بائیں بڑی احتیاط سے دیکھنے کے بعد نورا کھڑکی پر جھک گیا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ اندر موجود مرادے سے کچھ بات کررہا ہے۔

یہ سب کیا ہورہا ہے؟ تیمور نے بڑی حیرانی سے سوچا..... یکایک اس کے دماغ میں پھلجڑی سی چھوٹ گئی۔ کہیں..... کہیں یہ سب کیا دھرا نورے کا ہی تو نہیں تھا؟ کہیں نورے نے ہی تو مرادے کو حاشہ کے یہاں آنے کی اطلاع نہیں دی تھی؟ نورا بھی مرادے کی طرح جنوبی پنجاب کا تھا اور اسی ایریا میں رہتا تھا جہاں مراد رہتا تھا..... یہ عین ممکن تھا کہ یہاں لاہور میں ان دونوں کا آپس میں کوئی رابطہ ہو۔ تب تیمور مزید ٹھٹک گیا۔ اس نے دیکھا کہ نورے نے اپنی قمیص کی بغلی جیب سے کچھ نکالا ہے۔ ایک بار پھر احتیاط سے اردگرد دیکھنے کے بعد وہ کمرے کے دروازے پر جھک گیا۔ غالباً وہ چابی سے دروازہ کھولنے کی کوشش کررہا تھا..... اور تیمور نے اسے اس کام سے سختی سے منع کیا تھا۔

تیمور کھڑکی کھول کر پکارا۔ ''نورے..... نورے!''

نورا بری طرح ٹھٹکا اور ایک دم چوکور ستون کی آڑ میں ہوگیا۔ تیمور سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے پہنچا۔ اس نے دیکھا کہ نورا ڈرے ہوئے انداز میں گیلری کی سیڑھیوں کی طرف جارہا ہے۔ وہ جیسے چھپنے یا بھاگنے کی فکر میں تھا۔ تیمور

اس کے پیچھے لپکا اور گیلری میں اسے دبوچ لیا۔ اس وقت بالکل یہی لگ رہا تھا کہ نورا گیلری کی کھڑکی میں سے کود کر بھاگ جانا چاہتا ہے۔

تیمور کو یقین ہی نہیں ہو پا رہا تھا کہ اس کا وفادار نورا یہ سب کچھ کر رہا ہے۔ اس نے بدحواس نورے کو کھڑکی سے دور کرنے کے لیے زور سے کھینچا۔ نورا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور گیلری کی سیڑھیوں پر لڑھک گیا۔ اس کا لمبا تڑنگا جسم سر کے بل فرش سے ٹکرایا..... اور وہ بے حرکت ہو گیا۔ خانساماں دوڑتا ہوا آیا۔

''اسے دیکھو۔'' تیمور نے خانساماں سے کہا اور خود اس کمرے کی طرف دوڑا جہاں مراد ابند تھا۔ حیرانی کی بات یہ تھی کہ اتنی دھما چوکڑی مچنے کے باوجود تیمور کا کوئی گارڈ موقع پر نہیں پہنچا تھا۔ ابھی تیمور، مراد والے کمرے سے دس پندرہ قدم دور ہی تھا کہ کمرے کا دروازہ دھماکے سے کھلا اور مراد اندر سے نکل کر لان کی طرف بھاگا (جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، نورے نے کمرے کا تالا تو کھول دیا تھا مگر باہر سے چٹخنی بھی لگی ہوئی تھی جو بعد ازاں مراد نے اپنے کندھے کی ٹکر سے توڑی تھی)۔

''رک جا مراد ے۔'' تیمور چلایا۔ ''گولی مار دوں گا تجھے۔''

مراد ے کے جسم میں جیسے بجلیاں بھری ہوئی تھیں۔ وہ سنی ان سنی کرتا ہوا پورچ میں پہنچ گیا۔

تیمور نے صرف دھمکی دی تھی۔ پستول فی الحال اس کے پاس تھا ہی نہیں۔ مراد اکسی تیندوے کی طرح جھپٹتا ہوا گیٹ پر پہنچ گیا۔ کوئی گارڈ سامنے نہیں آیا۔ گیٹ بھی کھلا تھا۔ مراد اگیٹ سے گزرا اور بھاگتا چلا گیا۔ تیمور کی چھوٹی گاڑی پاس ہی کھڑی تھی۔ اس کا رخ بھی گیٹ کی طرف ہی تھا۔ اس کی چابی تیمور کے گاؤن میں موجود تھی۔ وہ جھپٹ کر گاڑی میں بیٹھا اور اسے اسٹارٹ کر کے مفرور مراد ے کے پیچھے جانا چاہا۔ مراد اسیدھی سڑک پر بھاگتا ہوا صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اسٹریٹ لائٹس میں اس کے لمبے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اس کی رفتار بہت تیز تھی مگر کچھ بھی تھا، تیمور گاڑی میں تھا۔ وہ اسے پکڑ سکتا تھا۔ گاڑی کے ڈیش بورڈ میں تیمور کا لائسنس یافتہ پستول بھی موجود تھا۔

مگر پتا نہیں اچانک تیمور کو کیا ہوا۔ گیٹ سے گزرنے کے ساتھ ہی اس نے ایک دم بریک لگائے اور گاڑی روک دی..... وہ عجیب لمحے تھے۔ ان لمحوں میں تیمور کو لگا جیسے مقتول غیاث کا بوڑھا باپ اس کی گاڑی کے سامنے کھڑا ہے۔ اس نے سفید کپڑے پہن رکھے تھے اور اس کے بوڑھے سینے میں ایک زنگ آلود سریا دھنسا ہوا تھا۔ اس کی قمیص لہولہان تھی۔ وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بڑے کرب سے تیمور کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا تھا..... ''اسے جانے دو تیمور..... اسے مت روکو..... ہم کچھ نہ کر سکے لیکن یہ کر لے گا..... یہ قدرت کی لاٹھی ہے..... یہ اوپر والے کا انصاف ہے..... اس انصاف کو رستہ دو تیمور! اسے جانے دو۔''

تیمور نے ہاتھ بڑی مضبوطی سے اسٹیئرنگ پر جمائے رکھے۔ وہ ایکسلریٹر تو دباتا رہا..... مگر..... اس سے کلچ نہیں چھوڑا گیا۔ اس کی نگاہیں دور سیدھی سڑک پر جمی ہوئی تھیں جہاں مراد ے کا ہیولا دور ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اس نے اسے مزید دور ہونے دیا اور وہ..... آنکھوں میں سرخ ڈورے رکھنے والا..... سینے میں ایک آگ کی پرورش کرنے والا، 24 تاریخ کی سیاہی سے 25 تاریخ کے اجالے کی طرف سفر کر گیا۔

25 تاریخ کا دن ابھی طلوع نہیں ہوا تھا۔ وہ اوجھل تھا..... اور اس کے بطن میں چھپے ہوئے سارے اچھے برے واقعات بھی اوجھل تھے۔ ساری خوشیاں، سارے دکھ..... ہر طرح کا انوکھا پن..... اور ہر طرح کی حیرت۔

تیمور گاڑی کو ریورس کر کے واپس گھر کے لان میں لے آیا۔ یہاں کم از کم چار سیکیورٹی گارڈز تھے اور ان میں سے کوئی بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ تیمور لکڑی کے اس چھوٹے کیبن کی طرف گیا جو گیٹ کے پاس تھا۔ اس نے دیکھا انچارج گارڈ اور اس کا ساتھی وہاں کرسیوں پر ہی سوئے پڑے تھے۔ ان کے قریب ہی چائے کی پیالیاں بھی موجود تھیں.....

چند ہی لمحے میں تیمور کو اندازہ ہو گیا کہ انہیں چائے یا قہوے میں کچھ ملا کر پلایا گیا ہے۔ تیمور نے دائیں بائیں دیکھا تو ایک گارڈ برآمدے کے فرش پر نظر آیا۔ وہ ایک ستون کے ساتھ ٹیک لگا کر نیم دراز تھا۔ سویا ہوا تھا یا پھر شاید نیم بے ہوش تھا۔ اس کی رائفل بھی فرش پر لڑھکی ہوئی تھی۔

تیمور کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ کیا دھرا بھی اس کے ''وفادار'' نورے کا ہے۔ پتا نہیں کہ یہ سب کیوں کیا تھا اس نے؟ کیا وہ کسی کا آلۂ کار بنا تھا؟

تیمور لپکتا ہوا اندر پہنچا۔ خانساماں نے نیم بے ہوش نورے کو گھسیٹ کر کمرے کے وسط میں کر دیا تھا اور اس کے

چہرے پر پانی کے چھینٹے دے کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ نورے کے سر سے خون بہہ رہا تھا جسے خانساماں نے ایک کپڑے کی مدد سے روکنے کی کوشش کی تھی۔

''صاحب جی! وہ لڑکا پکڑا گیا؟'' خانساماں نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

''نہیں...... بھاگ گیا۔'' تیمور نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

تیمور کی نگاہیں نورے کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ گہرے سانس لے رہا تھا۔ نورے پر دھوکے بازی کا شبہ کرنا تیمور کو بہت مشکل محسوس ہو رہا تھا...... یہ نورا ہی تھا جس نے کچھ عرصہ قبل بابے رشید کو دیسی پستول فراہم کیا تھا تاکہ وہ سجاد ساہی سے اپنے بیٹے غیاث کے قتل کا بدلہ چکا سکے۔ سجاد ساہی کے سارے کرتوت نورے کے علم میں بھی تھے۔ عین ممکن تھا کہ سجاد اور اس کے بیٹے کے لیے جو عناد اور غصہ نورا اپنے اندر رکھتا تھا، وہی اس کارروائی کا سبب بنا ہو۔ اپنے گرائیں مرادے سے اس کی ملاقات ہوئی ہو اور اس نے مرادے کی مدد کی ہو۔ جوں جوں تیمور سوچتا گیا، اس کے خیال کو تقویت ملتی گئی۔

☆☆☆

منظر شاہ پور گاؤں کا تھا۔ یہ ہفتے کا روز تھا۔ سالانہ میلا آج جوبن پر تھا۔ صبح دس بجے کے لگ بھگ سجاد ساہی اپنے لاؤلشکر کے ساتھ اپنے پرکھوں کی حویلی سے نکلا۔ اس موقع پر عموماً عدیل عالم بھی اس کے ساتھ ہوتا تھا مگر آج کل وہ اپنی نوبیاہتا بیوی کے ساتھ تفریحی دورے پر تھا...... ہاں سجاد کا بھائی، اس کے دو تین بیٹے اور سابقہ داماد صائم وغیرہ اس کے ساتھ تھے۔ عجیب بات تھی، بے شک صائم اور حاشہ میں طلاق ہو چکی تھی مگر صائم ابھی تک سجاد ساہی کا چہیتا تھا۔ اس کی ایک وجہ سجاد ساہی کا کاروباری مفاد بھی تھا۔ صائم خود تو کسی لائق نہیں تھا۔ اس کی ساری عیاشی اور سارے مزے سجاد ساہی کے ''دستِ شفقت'' کے مرہونِ منت تھے اور یہ دستِ شفقت مفت میں نہیں تھا۔ سجاد ساہی، صائم کو وراثت میں ملنے والے کاروبار سے پورا پورا حصہ وصول کر رہا تھا...... بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ کاروبار کو پورا پورا نچوڑ رہا تھا۔

اب بھی صائم کسی خوشامدی چمچے کی طرح سجاد ساہی کے پیچھے پیچھے تھا۔ سیکیورٹی کے انتظامات معمول سے زیادہ تھے اور اس کی وجہ سردار برادری کے ساتھ ساہی فیملی کا نیا

خُدارا ۔۔۔ خُدارا

شوگر کے مریض

مایوس نہ ہوں۔ کیونکہ مایوسی تو گناہ ہے۔ ہم نے طویل ریسرچ کے بعد دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک خاص قسم کا ہربل۔ شوگر نجات کورس۔ تیار کیا ہے۔ جس سے انشاء اللہ آپ کو شوگر سے مستقل نجات مل سکتی ہے۔ شفا من جانب اللہ پر ایمان رکھیں۔ شوگر انسانی جسم کے اعصاب کو دیمک کی طرح اندر ہی اندر کھوکھلا۔ کمزور۔ بے جان بنا کر اعصابی کمزوری۔ جوڑوں کی درد اور ہر وقت کی تھکاوٹ سے بے بس۔ لاچار اور ناکارہ بنا دیتی ہے۔ آج ہی فون پر اپنی شوگر کی تمام علامات سے آگاہ کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP شوگر نجات کورس منگوالیں۔ خدا کیلئے آپ ایک دفعہ ہمارا شوگر نجات کورس آزما کر تو دیکھ لیں۔ آج ہی فون کریں۔

المسلم دار الحکمت (رجسٹرڈ)

ضلع حافظ آباد پاکستان

فون صبح 10 بجے تا رات 9 بجے تک

0300-6526061

0301-6690383

TAGPK.COM

تنازعہ بھی تھا۔ ساہی فیملی کی ایک لڑکی نے زمانوں کی گھٹن کا پردہ چاک کر کے بغاوت کا علم بلند کیا تھا..... اور سردار برادری کے ایک پڑھے لکھے نوجوان سے کورٹ میرج کر لی تھی۔

سجاد ساہی کارندوں کے جھرمٹ میں میلے کے وسطی حصے میں پہنچا۔ ساہی فیملی کی خواتین بھی پیچھے پیچھے آ رہی تھیں لہٰذا میلے کی رنگا رنگ فضا پر سنجیدگی کا عنصر غالب ہو گیا تھا۔ علاقے کے لڑکے بالے میلے کی حدود سے باہر کر دیے گئے تھے۔ دکاندار بھی نگاہیں جھکائے بیٹھے تھے اور باادب باملاحظہ کی تصویر نظر آتے تھے۔ سجاد ساہی کے مسلح کارندے ٹھیلے والوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر سجاد ساہی کے لیے راستہ صاف کروا رہے تھے۔ اچانک ایک شامیانے کی اوٹ سے قدرے لمبے بالوں والا ایک نوجوان برآمد ہوا۔ اس نے اپنے گرد لپٹی ہوئی چادر اتار پھینکی اور سجاد ساہی کی طرف لپکا۔ اس کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا پستول نظر آ رہا تھا۔ اس نے اپنا بازو سیدھا کیا اور ایک چنگھاڑ کے ساتھ سجاد ساہی پر دو فائر کیے۔ پہلا فائر سجاد ساہی کے دائیں کندھے پر اور دوسرا اس کے عقب میں کھڑے دبلے پتلے صائم کے سر میں لگا۔ صائم کٹے ہوئے شہتیر کی طرح ایک پھل فروش کی ریڑھی پر گرا۔ سجاد کا تنومند بھائی نوجوان کو دبوچنے کے لیے جھپٹا مگر یہ اس کی زندگی کی آخری غلطی تھی۔ نوجوان کا تیسرا فائر عین اس کے سینے پر دل کے مقام پر لگا اور وہ اپنی توند کے بل اوندھے منہ گر گیا۔

ایک تہلکہ سا مچ گیا تھا۔ کسی نے نوجوان کے پستول والے ہاتھ پر زور سے لاٹھی ماری۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ ایک گارڈ نے نوجوان کو عقب سے بازوؤں میں جکڑا لیکن نوجوان حملہ آور کے جسم میں جیسے بجلیاں لپک رہی تھیں۔ اس نے تڑپ کر اپنے سامنے ہاتھ چلایا اور پگڑی والے ایک کارندے کی کمر سے لگی ہوئی چھوٹے دستے کی کلہاڑی کھینچ لی..... اس کے عام سے جسم میں بلا کی طاقت عود کر آئی تھی..... اس کی آنکھوں میں سرخ ڈورے تیر رہے تھے اور اس کا چہرہ انگارہ تھا۔ اس نے ایک نعرہ لگایا اور اپنے عقب سے چمٹے ہوئے گارڈ سمیت سابق ایس ایس پی سجاد ساہی پر جا گرا۔ ''حرامزادے! تو نے برباد کر دیا مجھے۔'' وہ چنگھاڑا۔

کلہاڑی کا ایک طوفانی وار سجاد ساہی کی کھوپڑی میں لگا۔ کلہاڑی کے دوسرے وار نے نہ صرف ایک گارڈ کی انگلیاں کاٹ ڈالیں بلکہ سجاد ساہی کی کنپٹی بھی توڑ دی۔ وہ ذبح ہونے والے جانور کی طرح چلایا۔ دو تین محافظ اسے بچانے کے لیے اس کے اوپر گر پڑے۔ کچھ نے نوجوان حملہ آور کو دبوچ لیا اور نہایت بیدردی سے مارنے لگے۔ چند سیکنڈ میں وہ لہولہان ہو گیا۔ ایک مشتعل گارڈ نے اس کے سر پر رائفل کا بیرل رکھ کر گولی چلانا چاہی مگر ایک چودھری نما شخص نے روک دیا۔ وہ چلا کر بولا۔ ''نہیں..... جان سے نہیں مارنا۔''

اردگرد کہرام سا مچا ہوا تھا۔ سجاد کا بھائی اور سابقہ داماد صائم تو شاید وہیں دم توڑ گئے تھے مگر شدید زخمی سجاد ساہی کا جسم ابھی حرکت کر رہا تھا۔ کچھ لوگ اسے اٹھا کر ایک جیپ کی طرف لپکے۔ یقیناً وہ اسے اسپتال پہنچانا چاہتے تھے..... مگر ''اسپتال'' لہولہان سجاد ساہی سے بہت دور نظر آتا تھا..... دل گواہی دے رہے تھے کہ وہ نہیں پہنچ پائے گا۔

حملہ آور کو رائفل کے کندوں اور لاٹھیوں سے بے دریغ پیٹا جا رہا تھا۔ اس کے کپڑے پھٹ گئے تھے، وہ لہولہان تھا..... غالباً اس کی دو چار ہڈیاں بھی ٹوٹ چکی تھیں مگر اس کا چہرہ چٹان کی طرح سخت تھا۔ یہ چہرہ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا تھا..... میں باغی کی ادا ہوں، میں مزاحمت کا نشان ہوں، میں ازل سے ہوں اور ابد تک رہوں گا۔ جہاں ظلم ہوگا، جہاں مزاحمت کے راستے مسدود کر دیے جائیں گے، جہاں سجاد جیسے لوگ ''انصاف'' کو قتل کریں گے، وہاں میں کسی نہ کسی صورت میں، کسی نہ کسی نام سے آموجود ہوں گا..... مجھے بھیجنے والا، مجھے وہاں بھیج دے گا۔

میلے میں ہر طرف بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔

☆☆☆

سجاد ساہی کو ایک تیز رفتار جیپ کے ذریعے اسپتال کی طرف لے جایا گیا تھا مگر یہ جیپ لوئر راوی روڈ پر ایک بڑے ٹریفک جام میں پھنس گئی۔ سجاد ساہی کے پاس وقت زیادہ نہیں تھا۔ نہایت حسرت ناک انداز میں اسی ٹریفک جام کے اندر اس کی سانس اکھڑ گئی۔ کلہاڑی کے طوفانی وار سے اس کے سر اور کنپٹی کی ہڈیاں ٹوٹ چکی تھیں۔ ساری جیپ میں اس کا خون پھیلا ہوا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ آخری ہچکی لے کر جہان فانی سے کوچ کر گیا۔

سجاد ساہی، اس کے بھائی اور سابقہ داماد کے تہرے قتل کی خبر نے شہر میں تہلکہ مچا دیا۔ حملہ آور پولیس کی کسٹڈی میں تھا اور اسے کسی نامعلوم مقام پر منتقل کر دیا گیا تھا۔ تیمور نے یہ ساری نیوز ٹی وی پر ہی سنیں۔ وہ کتنی ہی دیر ساکت و

جامد بیٹھا ساہی کے انجام پر غور کرتا رہا۔ تیمور کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ مراد نامی جنونی لڑکا اتنا کاری وار کرے گا۔ اس نے پستول آج ہی کہیں سے حاصل کیا تھا یا چھینا تھا اور اس پستول نے صرف سجاد ساہی کو ہی نشانہ نہیں بنایا تھا، اس کا عزیز بھائی اور سابقہ داماد بھی وہیں موقع پر دم توڑ گئے تھے۔ نہ جانے کیوں ایک بار پھر مراد کی آنکھوں کے سرخ ڈورے تیمور کی نگاہوں میں گھوم گئے۔

.....تیمور کو حاشہ کی فکر تھی۔ قاتل مراد پولیس کی تحویل میں تھا۔ یقیناً اس پر بہت تشدد ہونا تھا۔ اگر وہ اگل دیتا کہ اس نے سجاد سے پہلے اس کی بیٹی کو مارنے کی کوشش کی تھی اور اس مقصد سے وہ کسی کے گھر میں گھسا تھا اور وہاں کیا کچھ ہوا تھا..... تو ایک اور طرح کا طوفان کھڑا ہو جاتا۔ یہ ثابت ہو جاتا کہ سجاد ساہی کی بیٹی حاشہ اس وقت فیروز ہاؤس میں نہیں تھی بلکہ تیمور کے گھر میں تھی۔

یہی اندیشہ دل میں لیے ہوئے تیمور ایک بار پھر گھر کی زیریں منزل کے اس کمرے میں پہنچا جہاں اس کا قدیمی، وفادار ملازم نورا صاحب فراش تھا۔ مراد کے فرار کے وقت جو دھینگا مشتی ہوئی تھی، اس میں نورا گیلری کی سیڑھیوں سے گر کر سخت زخمی ہوا تھا۔ تیمور نے گھر میں ہی اس کا علاج کروایا تھا اور اب واقعے کے قریباً 30 گھنٹے بعد وہ بیان دینے کے قابل تھا۔

تیمور کو دیکھ کر اس نے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی مگر تیمور نے اسے روک دیا۔ نورے کی سرمہ لگی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔

''یہ سب کیا ہوا ہے نورے؟ کیوں کیا تم نے؟'' تیمور نے گمبھیر آواز میں پوچھا۔

جواب میں اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔ یہ اس کا اعتراف بھی تھا اور معافی کی درخواست بھی۔ ''صاحب جی..... بس میری عقل ماری گئی تھی۔''

''تمہاری عقل نہیں ماری گئی تھی۔ تم نے جان بوجھ کر عقل کو ایک طرف کر دیا تھا اور اندھے جوش کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ تم نے اپنے ''ہم وطن'' مرادے کی مدد کی..... اور تمہیں پتا چل ہی گیا ہوگا کہ اس مدد کا نتیجہ کیا نکلا؟ سجاد ساہی اپنے دو ساتھیوں سمیت مارا گیا ہے..... اس لڑکے نے یہاں سے نکل کر اسے مار دیا ہے۔''

نورا عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''معاف کر دیں صاحب جی! سجاد ساہی کو اس لڑکے نے نہیں مارا..... اس کے اپنے اعمال نے مارا ہے۔ ان بے گناہوں کی آہیں اسے لگی ہیں جنہیں وہ جھوٹے پولیس مقابلے میں مرواتا رہا ہے اور ان عورتوں کی بددعائیں اسے لے ڈوبی ہیں جو اس کے ہاتھوں خراب ہوتی رہی ہیں۔ مرادے کی منگیتر کوئی پہلی لڑکی تو نہیں تھی اور نہ آخری تھی۔ سجاد ساہی کے ڈیرے کی کہانیاں کس کو معلوم نہیں ہیں۔''

تیمور نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مرادے کو میلے والی اطلاع تم نے ہی پہنچائی تھی نا؟ اور یہ خبر بھی اسے تم نے ہی دی تھی کہ ساہی صاحب کی بیٹی یہاں ہمارے گھر میں ہے؟''

اس نے ایک بار پھر ہاتھ جوڑ کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

درحقیقت نورا ہر وقت تیمور کے ساتھ رہتا تھا۔ اسے پتا تھا کہ تیمور کی اور سابق ایس ایس پی سجاد کی دشمنی کس اسٹیج پر پہنچی ہوئی ہے۔ ایک طرح سے وہ بھی درپردہ سجاد ساہی کا جانی دشمن بنا ہوا تھا۔ اس سے پہلے بابے رشید کو بھی اس نے تیمور کی اجازت کے بغیر ہی پستول مہیا کیا تھا تاکہ وہ سجاد کی جان لے سکے (یہ کوشش ناکام رہی تھی)۔ تیمور اور حاشہ کے تعلق کے بارے میں نورے کو کچھ علم نہیں تھا۔

☆☆☆

رات تک یہ خبر میڈیا پر پورے زور و شور سے چل رہی تھی کہ سجاد ساہی کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا ہے۔ مزید کہا گیا تھا کہ اس سنگین واردات میں کسی شگفتہ نامی لڑکی کا نام بھی لیا جا رہا ہے جو عرصے سے لاپتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ لڑکی حملہ آور کی کزن اور منگیتر تھی۔

صرف حاشہ جانتی تھی یا تیمور جانتا تھا کہ وہ لڑکی بھی جان کی بازی ہار چکی ہے۔ ساہی اور اس کے ساتھیوں کے بستر کی زینت بننے کے بعد اور حاملہ ہونے کے بعد وہ بیمار ہوئی اور جانبر نہ ہو سکی اور ایک بات اور تھی اور وہ بات صرف اور صرف تیمور جانتا تھا، حاشہ بھی نہیں جانتی تھی..... اور وہ یہ کہ سجاد ساہی کو جہنم واصل کرنے میں تیمور بھی شریک ہے۔ یہ تیمور ہی تھا جس نے بھاگتے ہوئے مرادے کا پیچھا کرنا چاہا تھا لیکن پھر اس کی نگاہوں کے سامنے لہولہان بابا رشید آن کھڑا ہوا تھا..... اور تیمور نے خود کو وہیں روک لیا تھا۔

تیمور جلد از جلد حاشہ سے رابطہ کرنا چاہتا تھا مگر ناکامی ہو رہی تھی۔ اس کا فون مسلسل بند تھا۔ فیروز حسن صاحب سے پتا چلا کہ وہ سب اندیشے بالائے طاق رکھ کر اپنے والد کا آخری دیدار کرنے ان کے گھر چلی گئی ہے۔ یہ تشویشناک تھا۔ باپ نہیں رہا تھا تو کیا ہوا، اس کا جانی دشمن بھائی تو

موجود تھا۔

تیمور نے دو تین گھنٹے سخت تشویش میں گزارے۔ یہاں تک کہ اسے فیروز حسن صاحب کے ذریعے ہی یہ خبر ملی کہ حاشہ فیروز ہاؤس واپس آگئی ہے۔ اس کی حالت اچھی نہیں تھی۔ بی پی بہت لو ہو چکا تھا۔ فیروز حسن نے بتایا کہ وہ دوبار بے ہوش بھی ہوئی ہے۔

تیمور تڑپ اٹھا۔ وہ اسی وقت فیروز ہاؤس پہنچا۔ یہ رات کا تیسرا پہر تھا۔ آنسوؤں سے تر چہرے کے ساتھ حاشہ بستر پر سیدھی لیٹی تھی۔ فیروز حسن نے اسے کوئی سکون آور دوا دی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ تیمور نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر اسے ہولے سے پکارا۔ اس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ بس سرسوں کے پھول جیسے رخساروں پر تازہ آنسو لڑھک گئے۔

تیمور اس سے تسلی کی باتیں کرنے لگا۔ وہ سسکتی رہی پھر وہ کراہی۔ ''مجھے تو ان لوگوں نے پاپا کا چہرہ بھی نہیں دیکھنے دیا۔ دھکے مار کر نکال دیا ہے۔''

تیمور کو پہلے ہی اندیشہ تھا کہ حاشہ کے ساتھ اسی طرح کا سلوک ہوگا۔ وہ دھیمی آواز میں بند آنکھوں کے ساتھ بولتی رہی اور اپنے صدمے کا اظہار تیمور سے کرتی رہی۔ پھر اس نے اپنی تر بتر آنکھیں کھولیں اور قدرے شکوہ کناں لہجے میں بولی۔ ''تیمور! میں نے آپ سے کہا بھی تھا کہ اس خبیث کو پولیس کے حوالے کردیں۔ اس میں دیر نہ کریں..... لیکن.....'' وہ کراہ کر چپ ہوگئی۔

''حاشہ! میں دیر کرنا نہیں چاہتا تھا مگر مجھے آپ کی طرف سے ڈر تھا۔ وہ پولیس کے حوالے ہونے کے بعد بہت کچھ بک دیتا۔ یہ بات سامنے آجاتی کہ وہ آپ پر حملہ کرنے کے لیے میرے گھر میں گھسا تھا اور آپ اس رات میرے ہی گھر میں تھیں۔''

تیمور کی دلیل میں وزن تھا۔ وہ جیسے آہ بھر کر چپ ہوگئی۔ تیمور نے کہا۔ ''میرے ملازم نورے نے دھوکا دیا۔ وہ اسی کے علاقے کا رہنے والا تھا۔ نورے کی وجہ سے وہ دروازہ توڑ کر بھاگنے میں کامیاب ہوا۔ اگر وہ.....''

''مجھے یہ ساری بات فیروز انکل نے بتائی ہے۔'' حاشہ نے دکھ کے عالم میں تیمور کی بات کاٹی اور آنکھیں ایک بار پھر بند کرلیں۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ یہ وقت اکیلے میں گزارنا چاہتی ہے۔

تیمور اس کے پاس سے اٹھ کر فیروز حسن کے پاس کامن روم میں جا بیٹھا۔ فیروز حسن نے دروازہ بند کیا اور ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''تیمور! بڑا ہونے کے ناتے میں تمہیں آج ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں۔''

''جی فرمائیں۔''

''ڈراما سیریل کی کتنی قسطیں ریکارڈ ہوئی ہیں؟''

''تقریباً دس ہوگئی ہیں۔''

''یعنی سات آٹھ اور ہوں گی..... یہ کتنے عرصے میں مکمل ہوجائیں گی؟''

''اس کا انحصار اب حاشہ کے سنبھلنے پر ہے۔ حاشہ کام شروع کردے گی تو آٹھ دس ہفتے میں کام مکمل ہوسکتا ہے۔''

فیروز حسن نے اپنے آدھے سفید، آدھے کالے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔ ''تیمور! تم کو اندازہ ہو ہی چکا ہوگا کہ یہ ساہی فیملی کس قدر کینہ پرور اور منتقم المزاج ہے۔ یہ لوگ ہر طرح کا ظلم تو ڈھاتے ہیں لیکن انصاف کو راستہ نہیں دیتے۔ دشمنی کی یہ آگ بہت بھڑک چکی ہے۔ سجاد کی موت اسے ٹھنڈا کرنے کے بجائے مزید بھڑکائے گی اور اگر کسی طرح یہ راز کھل گیا کہ قاتل تمہارے گھر سے فرار ہوکر جائے قتل پر پہنچا تو سوچو کیا طوفان آئے گا..... دیکھو تیمور! تم نے اپنی ہمت، طاقت کے مطابق وہ سب کچھ کیا جو کرسکتے تھے۔ اب تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ خود کو مزید خطروں میں نہ ڈالو.....''

تیمور نے فیروز حسن کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ چاہتے ہیں کہ میں واپس انگلینڈ چلا جاؤں؟''

انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''وہاں تم یہاں سے کہیں بہتر زندگی گزار سکتے ہو۔ بطور قانون دان وہاں تمہارا نام یہاں سے بھی زیادہ ہے۔ وہاں بھلا کس چیز کی کمی ہوگی تمہیں؟''

تیمور نے جواب نہیں دیا مگر دل ہی دل میں کہا۔ ''انکل فیروز! آپ کیا جانو، وہاں مجھے کس چیز کی کمی ہوگی..... اور وہ کمی ایسی ہے جو میری پوری زندگی پر حاوی ہوجائے گی۔ میں زندہ رہ کر بھی زندہ نہیں رہوں گا۔ جب جینے کا جواز ہی ختم ہوجائے گا، جب وہ آس ہی باقی نہیں رہے گی جو زمانوں سے میرے خون میں گردش کرتی رہی ہے۔ جب ان حسین لب و رخسار کو چھونے کی آرزو ہی خاک میں مل جائے گی تو پھر میں بھی خاک میں مل جاؤں گا۔''

''کس سوچ میں کھو گئے ہو؟'' فیروز حسن نے کہا۔

''کچھ نہیں انکل! سوچ رہا ہوں، کیا جواب دوں۔'' انہوں نے جچے لہجے میں کہا۔ ''میں تمہیں بتاتا ہوں تم کیا سوچ رہے ہو..... تم..... حاشہ کے بارے میں سوچ

رہے ہو اور مجھے پتا ہے تمہارے انگلینڈ سے یہاں آنے کی وجہ بھی حاشہ ہی ہے..... لیکن تیمور..... میری اگلی بات تمہیں دل پر پتھر رکھ کر سننا پڑے گی..... سن لو گے نا؟''

تیمور نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تیمور! اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ حاشہ تم سے محبت کرتی ہے تو ایسا نہیں ہے۔ تم اس کے لیے ایک بہت اچھے، مہربان دوست تو ہو لیکن اس کے سوا اور کچھ نہیں۔'' تیمور بالکل ساکت بیٹھا فیروز حسن کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ گمبھیر لہجے میں بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔ ''تیمور! تم ایک پریکٹیکل آدمی ہو۔ تمہیں حقیقت کو سمجھ لینا چاہیے۔ تم کسی کے دل میں زبردستی اپنی محبت پیدا نہیں کر سکتے۔''

تیمور نے ایک لمبے توقف کے بعد کہا۔ ''انکل! آپ سے یہ بات حاشہ نے کہی ہے؟''

انہوں نے جواب نہیں دیا مگر انہوں نے جس انداز سے سر جھکایا اس نے تیمور کو سمجھا دیا کہ اس موضوع پر حاشہ سے ان کی بات ہوئی ہے۔

وہ بے پروائی سے مسکرایا۔ انکل فیروز کو سلام کر کے اٹھ کھڑا ہوا اور واپس چلا گیا۔

☆☆☆

حاشہ کے والد سجاد ساہی اور چچا مختار کی تدفین کو دو روز گزر چکے تھے۔ رو دھو کر حاشہ کو اب کچھ سکون آ گیا تھا۔ اس کے باپ کو ملازمہ شگفتہ کے چاہنے والے نے قتل کیا تھا مگر وہ جانتی تھی دراصل اس کے والد کے اپنے اعمال نے ہی ان کی جان لی تھی۔ چچا مختار کی موت کے حوالے سے بھی اس کے خیالات کچھ ایسے ہی تھے۔ شاہ پور کے اس تہرے قتل میں جو تیسرا فرد مارا گیا، وہ صائم تھا۔ صائم اس کا شوہر رہا تھا مگر نہ جانے کیوں حاشہ نے اس کی موت کی خبر ایسے ہی سنی تھی جیسے کسی اجنبی کی موت کی خبر ہو۔ ازدواجی زندگی کے آخری دنوں میں سجاد کے بل بوتے پر صائم نے جس طرح حاشہ کا اخلاقی اور جسمانی استحصال کیا تھا، وہ حاشہ کو بھولا نہیں تھا۔ وہ اسے اپنے جسم پر ایک طفیلی کیڑے کی طرح محسوس کیا کرتی تھی۔ آج وہ کیڑا اپنی غلاظت سمیت مسلا گیا تھا۔ پیوندِ خاک ہو گیا تھا۔

اب حاشہ کو ایک اور طرح کا خوف دامن گیر تھا۔ وہ نوجوان مراد اب پولیس کی تحویل میں تھا۔ اگر وہ پولیس کے سامنے یہ حقیقت بیان کر دیتا کہ قتل سے ایک رات پہلے وہ تیمور کے گھر میں گھسا تھا، وہاں وہ حاشہ کو مارنا چاہتا تھا اور حاشہ وہیں موجود تھی..... تو پھر ایک اور طرح کا طوفان کھڑا ہو جانا تھا۔ بے شمار سوال پوچھے جاتے اور سب سے اہم سوال یہی ہوتا کہ حاشہ اس رات تیمور کے گھر میں کیوں تھی؟

یہی وجہ تھی کہ جب اس روز سہ پہر کے وقت اسے بساط کا فون آیا تو اس کی باتیں سن کر وہ بری طرح چونکی بھی اور اسے ایک طرح کا اطمینان بھی محسوس ہوا۔ بساط نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ ''حاشی! کچھ پتا چلا کہ انکل پر حملہ کرنے والے کے ساتھ کیا ہوا؟''

''کیا ہوا؟''

''وہ نہیں رہا..... مارا گیا ہے۔ ابھی ٹی وی پر خبر آ رہی تھی۔ اسے کورٹ لے جایا جا رہا تھا۔ راستے میں اس نے بھاگنے کی کوشش کی۔ ایک سب انسپکٹر کا پستول نکال لیا۔ اس نے ایک فائر بھی کیا مگر پھر مارا گیا۔''

''اوہ گاڈ!'' حاشہ نے ایک طویل سانس لی۔

بساط بولی۔ ''اب پتا نہیں واقعی یہ سب کچھ ہوا ہے..... یا پھر وہی فرضی ''ان کاؤنٹر'' والا معاملہ ہے۔ بہرحال اس کا قصہ تمام ہو گیا ہے۔''

ایک لمحے کے لیے حاشہ کو محسوس ہوا جیسے اسے موت کی اس اطلاع پر ہلکا سا قلق ہوا ہے لیکن پھر اس قلق پر اطمینان کی کیفیت غالب آ گئی۔ راز افشانی کا جو ایک خدشہ سا مسلسل اس کے ذہن میں تھا، معدوم ہو گیا..... شگفتہ کی صورت اس کی نگاہوں میں گھومنے لگی۔ آج مرنے والا مراد اس سے پیار کرتا تھا۔ شگفتہ کی ذرا سی لغزش نے اسے خوار کیا اور کہیں کا نہیں پہنچا دیا..... اور آج اسے چاہنے والا بھی اپنے بدلے کی آگ ٹھنڈی کر کے منوں مٹی کے نیچے چلا گیا۔

اس رات حاشہ دیر تک جاگتی رہی۔ جان لیوا سوچیں ذہن کو اپنے نکیلے پنجوں سے کھرچتی رہیں۔ رین بو مچھلی شیشے کے کیس میں تڑپتی رہی۔ اس کے خاندان والوں نے اسے اپنے مرحوم والد کا چہرہ بھی دیکھنے نہیں دیا۔ اس کے بھائی نے اس سے کلام تک نہیں کیا۔ آگے نہ جانے کیا کیا ہونا تھا۔ وہ جانتی تھی سب سے زیادہ خطرہ تیمور کے لیے ہے۔ بے شک وہ کٹھن حالات کا مقابلہ کرنا بڑی اچھی طرح جانتا تھا..... مگر مقابلہ تو وہاں ہوتا ہے جہاں کوئی سامنے ہو۔ اندھیرے میں سے چھوٹا ہوا تیر کسی کی بھی جان لے سکتا ہے اور اسے اپنی فیملی کے بغض و عناد کا بہت اچھی طرح علم تھا۔ خصوصاً جب سے خاندان کی ایک اور لڑکی نے حاشہ ہی کی طرح مجبور ہو کر مزاحمت اور بغاوت کا راستہ اپنایا تھا۔ حاشہ کچھ لوگوں کے لیے اور بھی ناقابلِ برداشت ہو گئی تھی۔

ان لوگوں کے لیے حاشہ ناقابلِ برداشت تھی تو تیمور تو

کہیں زیادہ قابل گردن زنی تھا۔ حاشہ کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ تیمور کی بوڑھی والدہ کا چہرہ اس کی نگاہوں میں آیا۔ تصور ہی تصور میں اس نے انہیں کسی کی لاش پر بین کرتے اور سینہ کوٹتے دیکھا۔ یہ..... تیمور کے سوا کس کی لاش ہوسکتی تھی؟ وہ سرتاپا لرز گئی۔ اسے پوٹھوہاری غیاث کی موت یاد آگئی..... اس کی والدہ کی موت یاد آگئی اور کومے کی حالت میں مرنے والے ذیشان کی موت یاد آگئی..... اس کا ماضی ایسے ہی دردناک واقعات سے بھرا ہوا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ خود کو ایک خوشنما زہریلی جھاڑی کی طرح سمجھنے لگتی تھی۔ جو کوئی بھی اس کے قریب سے گزرتا تھا یا اس کے سائے میں بیٹھنے کا خیال دل میں لاتا تھا، اذیت، ذلت، یہاں تک کہ موت کا شکار ہوا تھا۔ وہ تیمور کے ساتھ ایسا نہیں ہونے دے گی۔ وہ کیوں اس کے لیے اپنی جان خطرے میں ڈالے..... جبکہ..... وہ اس سے محبت بھی نہیں کرتی..... وہ اس کے لیے ایک نہایت مہربان دوست کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے..... کچھ بھی نہیں ہے..... اور اس نے دل کڑا کر کے یہی بات چند دن پہلے انکل فیروز سے بھی کہہ دی تھی اور اسے امید تھی کہ انکل کے ذریعے یہ بات تیمور تک بھی پہنچ چکی ہوگی۔

رات بھیگ رہی تھی۔ پالتو روشو اس کے پاؤں میں بیٹھا تھا۔ گاہے بہ گاہے سوالیہ نظروں سے حاشہ کی طرف دیکھتا تھا۔ جیسے وہ بھی اپنی مالکن کی پریشانیوں کو سمجھتا ہو۔ واپسی کے بعد حاشہ نے روشو کا خوب خیال رکھا تھا۔ اس کے زخم مکمل طور پر بھر گئے تھے۔ پہلے سے توانا اور سڈول ہوگیا تھا۔ یہ صحت مندی کی نشانی ہی تھی کہ اس کے بال بہت ہموار ہوگئے تھے اور اس کے جسم سے ایک خاص قسم کی بھینی بھینی خوشبو اٹھنے لگی تھی.....

فیروز ہاؤس کی کھڑکیوں سے باہر پوپلر اور سرو کے بلند قامت درختوں اور پھول دار کیاریوں پر مدھم چاندنی بکھری ہوئی تھی۔ اوس کی نمی نے شیشوں پر نقرئی لکیریں سی بکھیر دی تھیں۔ وہ بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہوگئی۔ سلیپنگ گاؤن میں اس کی صراحی دار گردن دور تک نظر آتی تھی۔ سیاہ بال شفاف رخساروں پر یوں بکھرے ہوئے تھے جیسے چاندنی شب میں ٹیولیپ کے زرد پھولوں پر کسی گھنے پیڑ کا سایہ ہو۔ وہ سوگوار سی کیفیت میں تھی مگر کیفیت کوئی بھی ہوتی تھی، اس کی خداداد دلکشی میں کسی نہ کسی زاویے سے اضافہ ہی کرتی تھی۔

غنودگی سے اس کی پلکیں بوجھل ہونے لگیں۔ کافی دنوں بعد اس نے ایک بار پھر اپنے پردۂ تصور پر وہی برسوں پرانا منظر چلتے دیکھا۔ وہی گونجتی اور پھیلتی ہوئی جاں سوز صدا..... وادیاں میرا دامن، راستے میری باہیں، جاؤ میرے سوا تم کہاں جاؤ گے.....

وہی غیر متزلزل یقین..... وہی بیکراں اعتماد..... وہ مشکی گھوڑے پر سوار اس کے پیچھے لپکا آرہا تھا۔ وہ اس کے ہاتھ نہیں آنا چاہتی تھی..... ہرگز نہیں آنا چاہتی تھی۔ آج وہ زیادہ تیزی سے بھاگ رہی تھی..... وہ اس سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ بھاگ سکتی تھی مگر کیوں نہیں بھاگ رہی تھی؟ شاید اس لیے کہ اس کے ننگے پاؤں میں کنکر چبھ رہے تھے مگر یہ چبھن تو اسے کبھی تکلیف نہیں دیتی تھی۔ شاید اچھی لگتی تھی۔ آج بھی اچھی ہی لگ رہی تھی۔ پھر وہ تیز کیوں نہیں بھاگ رہی تھی؟ شاید وہی ڈر کہ کہیں وہ سچ مچ ہی اس کی نظروں سے اوجھل نہ ہوجائے۔ یہ کیسا گورکھ دھندا تھا۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ وہ قریب آتا جارہا تھا پھر اس نے بھاگتے گھوڑے پر سے جھک کر اسے اٹھانا چاہا..... اس کے جسم سے روشو کی سی مہک آرہی تھی یا شاید یہ صرف اس کا وہم تھا۔ وہ اسے دبوچنے کے قریب تھا..... مگر اس مرتبہ وہ اس کے ہاتھ نہیں آئی۔ اس نے تڑپ کر خود کو چھڑا لیا..... اور اس کے ساتھ ہی وہ اپنے ہوش وحواس میں واپس آگئی۔ سینہ دھونکنی کی طرح پھول پچک رہا تھا۔ گردن کی صراحی پر پسینے کی بوندیں تھیں۔

اس نے اٹھ کر فریج سے پانی پیا۔ کچھ دیر بے چینی سے ٹہلتی رہی پھر ایک سکون آور گولی کھائی اور لیٹ گئی۔

دوبارہ اس کی آنکھ کھلی تو سورج کافی اوپر آچکا تھا۔

وہ منہ ہاتھ دھو کر اور لباس بدل کر ڈائننگ روم میں آگئی۔ ملازمہ نے بتایا کہ فیروز حسن ناشتے پر اس کا انتظار کرنے کے بعد جاچکے ہیں۔ آنٹی سے اس کا سامنا ویسے ہی کم ہوتا تھا۔ وہ کسی اور ذہن کی تھیں۔ جب سے فیروز ہاؤس پر حملہ ہوا تھا اور گارڈ کی جان گئی تھی، وہ اس سے کچھ کھنچی کھنچی سی رہتی تھیں۔ اب انہیں یہ بات بھی اچھی نہیں لگتی تھی کہ حاشہ ٹی وی پلے کی ریکارڈنگ میں حصہ لے رہی ہے۔

حاشہ ٹیبل پر بیٹھ تو گئی مگر کچھ بھی لینے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اس نے صرف ایک بریڈ پیس اور دودھ کے بغیر چائے منگوائی۔ اخبار اٹھایا تو پہلے ہی صفحے پر اس کی نظر مراد والی خبر پر پڑی۔ اس کے سر اور سینے پر تین گولیاں لگی تھیں اور وہ موقع پر ہی ہلاک ہوگیا تھا۔ حاشہ نے اخبار ایک

طرف پھینک دیا۔

روشو ٹیبل کے نیچے اس کے پاؤں میں لوٹ رہا تھا۔ حاشہ اس کی منشا سمجھ رہی تھی۔ اس نے ملازمہ کو ہدایت کی کہ وہ روشو کو فیڈ کرائے۔ وہ اس کی گود میں چڑھ آنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے اس نے اپنے جسم کو تولا۔ ''نو روشو!'' حاشہ نے تنبیہی انداز میں انگلی اٹھائی۔ اس نے فرمانبرداری دکھاتے ہوئے ارادہ بدل دیا۔

ڈائننگ روم کی ایک دیوار پر سی ٹی وی کا مانیٹر لگا ہوا تھا۔ چھ کیمرے فیروز ہاؤس کے چھ مختلف حصوں کے مناظر دکھا رہے تھے۔ دو مناظر گیٹ کے آگے سڑک کے تھے۔ وہ بے خیالی میں اسکرین پر نگاہ جمائے چائے کے سپ لے رہی تھی جب اچانک ایک منظر نے اسے بری طرح چونکا دیا۔ وہ سکتہ زدہ سی رہ گئی۔ اس نے درمیانی عمر کے ایک شخص کو دیکھا۔ وہ کوئی چوکیدار یا مالی وغیرہ لگتا تھا۔ وہ ایک پرانی سی موٹر بائیک پر جا رہا تھا۔ موٹر بائیک کے پیچھے ایک کیرج سی بنی ہوئی تھی جو سامان وغیرہ ڈھونے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ اس کیرج میں سامان کے بجائے ایک مفلوک الحال شخص بیٹھا تھا۔ اس نے شاید کسی چیز سے ٹیک بھی لگا رکھی تھی..... وہ کوئی اور نہیں، وسیم تھا۔ حاشہ کی نگاہ دھوکا نہیں کھا رہی تھی..... ہرگز نہیں کھا رہی تھی۔ شبہے کا امکان پانچ دس فیصد سے زیادہ نہیں تھا۔

وہ اسپرنگ کی طرح اچھل کر کھڑی ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی وہ اضطراری حالت میں پکاری۔ ''وسیم..... وسیم بھائی!''

پھر وہ ایک کرسی سے ٹکراتی ہوئی باہر کو دوڑی۔ ملازمہ بھی حیرانی کے عالم میں اس کے پیچھے لپکی۔ ''بی بی جی کیا ہوا؟ بی بی جی کون ہے؟''

حاشہ کو جیسے کچھ سنائی اور دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ لان میں پہنچی اور پھر گیٹ کی طرف لپکتی چلی گئی۔ گیٹ بند تھا۔ فیروز ہاؤس کی سخت سیکیورٹی کے سبب گیٹ کا چھوٹا دروازہ بھی ہر وقت لاک رکھا جاتا تھا۔ باہر مسلح گارڈ موجود تھے۔ حاشہ نے دروازہ پیٹ ڈالا۔ ''گارڈ! دروازہ کھولو۔ اوپن داڈور۔''

دروازہ کھلنے میں آٹھ دس سیکنڈ مزید لگ گئے۔ اس دوران میں حاشہ گارڈز سے مخاطب ہو کر پکاری۔ ''ابھی ایک موٹر بائیک لوڈر یہاں سے گزری ہے۔ اس میں ایک بندہ بیٹھا ہے۔ اس کو دیکھو..... اس کا پیچھا کرو۔''

گارڈز کو ان ہیجانی کلمات کی فوراً سمجھ نہیں آئی۔

قارئینِ پاکیزہ کے لیے بڑی خوشخبری

مایہ ناز مصنفہ اور پاکیزہ کی دیرینہ ساتھی

ناہید سلطانہ اختر کے مشتاق قلم کا ایک اور شاہکار ناول

کے صفحات کی زینت بننے جا رہا ہے

معاشرتی مسائل کو ماہرانہ انداز اور جداگانہ طرزِ تحریر سے اجاگر کرتی مصنفہ کی یہ نئی کاوش بھی مداحین کو پسند آئے گی۔ ان شاء اللہ

ایک نہایت دل نشیں، دل گداز، پُرلطف و متاثر کُن تحریر جلد ہی

آپ جیسے باذوق قارئین ماہنامہ پاکیزہ میں پڑھ سکیں گے

بہرحال انہوں نے چھوٹا دروازہ کھول دیا۔ حاشہ اضطرابی عالم میں دوڑ کر سڑک پر پہنچ گئی۔ سڑک کافی فاصلے تک خالی نظر آرہی تھی۔ دائیں بائیں تین چار ذیلی سڑکیں تھیں۔

حاشہ نے سیکیورٹی گارڈز کو لوڈر اور اس کی ساخت کے بارے میں بتایا۔ ایک موٹر بائیک اور ایک مہران گاڑی فوراً حاشہ کی بتائی ہوئی سمت میں روانہ ہوگئیں۔

حاشہ کے دل و دماغ میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ جس وسیم کو وہ سب کئی ماہ سے دیوانہ وار تلاش کررہے تھے، وہ آج بالکل غیر متوقع طور پر اسے نظر آیا تھا۔ یہ کوئی واہمہ نہیں تھا، بصری دھوکا نہیں تھا۔ وہ وسیم تھا..... اسی اثنا میں فیروز حسن کا ڈرائیور بھی ہنڈا سوک لے کر سڑک پر آگیا۔ حاشہ جلدی سے پچھلا دروازہ کھول کر گاڑی میں بیٹھی اور اس تلاش میں شامل ہوگئی۔

..... یہ سب کچھ بے سود رہا۔ لوڈر کا سراغ نہیں ملا۔ دراصل حاشہ کے گیٹ تک پہنچنے میں..... اور گیٹ کے اُن لاک ہونے میں جو وقت ضائع ہوا اس نے رکشا نما لوڈر کو اوجھل کردیا۔

فیروز ہاؤس واپس پہنچ کر حاشہ نے فوراً تیمور کو فون کیا اور اسے صورتِ حال بتائی۔ تیمور کے لیے بھی یہ سنسنی خیز خبر تھی۔ جن لوگوں کے پیارے کھو جاتے ہیں بعض اوقات انہیں راہ چلتے لوگوں پر گمشدہ پیاروں کا دھوکا ہوتا ہے مگر حاشہ جس یقین کے ساتھ بات کررہی تھی، اس میں دھوکے کا امکان کم ہی نظر آتا تھا۔

تیمور نے کہا۔ ''میں انکل فیروز کو فون کرتا ہوں۔ ہم سی سی ٹی وی کیمروں کے ذریعے لوڈر کا رخ دیکھتے ہیں۔''

حاشہ بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگی۔ وسیم جو ایک راز بن کر نگاہوں سے اوجھل ہوچکا تھا..... اپنی ایک جھلک دکھا کر پھر اوجھل ہوگیا تھا۔ جیسے یہ بتا کر گیا ہو کہ میری طرف سے مکمل مایوس نہ ہونا۔ میں زندہ ہوں..... اور ابھی اسی شہر کے گلی کوچوں میں ہوں۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اس منظر کو ذہن میں تازہ کرنے لگی۔ پھر اس نے سی سی ٹی وی کی ریکارڈنگ نکلوائی۔ تصویر بہت واضح تو نہیں تھی مگر حاشہ کو پچانوے فیصد یقین تھا کہ چیتھڑوں میں ملبوس جو ہڈیوں کا ڈھانچا سا اس لوڈر رکشا میں موجود ہے، وہ وسیم ہے..... وسیم ساحلی..... جس کی لکھی ہوئی کہانی کو بڑے زور و شور کے ساتھ ڈراما ٹائز کیا جارہا ہے۔

حاشہ نے بساط کو کال کرنے کے لیے فون اٹھایا لیکن پھر رکھ دیا۔ وہ پہلے ہی جدائی کے شدید کرب سے گزر رہی تھی۔ وہ اسے مزید جذباتی تلاطم کا شکار کرنا نہیں چاہتی تھی۔ پہلے لوڈر کی تلاش کسی نتیجے پر پہنچ جاتی پھر اسے بتانے کے بارے میں سوچا جاسکتا تھا۔

☆☆☆

ساہی فیملی میں شدید ترین بے چینی پائی جاتی تھی۔ اس بے چینی کی ایک وجہ تو یقیناً وہ تہرا قتل تھا جس میں سجاد ساہی اپنے بھائی اور سابقہ داماد سمیت ہلاک ہوگیا تھا۔ دوسری بڑی وجہ بیرسٹر تیمور چودھری اور حاشہ والا معاملہ تھا۔ تیمور نے جو کام کیا تھا وہ کچھ عرصہ پہلے تک کوئی کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ بیاہتا حاشہ کو بیلف کے ذریعے اپنے ساتھ لے گیا تھا اور بات یہیں تک نہیں رہی تھی۔ اس نے ڈنکے کی چوٹ پر اسے عدالت سے خلع دلوایا تھا..... اور فیروز ہاؤس میں پناہ دلوائی تھی..... تب اس کی ''دیدہ دلیریاں'' اس سے بھی آگے بڑھی تھیں۔ وہ ساہی خاندان کی بیٹی کو شوبز میں لے آیا تھا اور کچھ لوگ تو یہاں تک کہتے تھے کہ وہ اس کے ساتھ رہ رہا ہے۔ اس کے ساتھ خفیہ نکاح کرچکا ہے۔

یہ سب کچھ ساہی فیملی کی برداشت سے باہر تھا۔ برادری میں ایک طوفان سا بپا تھا اور یہی وجہ تھی کہ آج سجاد ساہی کا بڑا بھائی ارباب ساہی جو اب ایک طرح سے خاندان کا سربراہ تھا، ایک نہایت اہم میٹنگ میں شریک تھا۔ یہ میٹنگ بڑی رازداری کے ساتھ ساہی فیملی کے ایک مضافاتی فارم ہاؤس میں ہورہی تھی..... اپنی فیملی کی نمائندگی کرنے کے لیے ارباب ساہی اور عدیل عالم موجود تھے۔ پولیس کی نمائندگی یوں تو عدیل سے بھی ہورہی تھی تاہم سجاد ساہی کا دستِ راست اور ''ان کاؤنٹر ماہر'' شاہد خاں بھی اس سنگین میٹنگ میں موجود تھا۔ ارباب ساہی، منسٹر کے سامنے وہ سارا رونا رو چکا تھا جس میں اس کی برادری کے اندر پائے جانے والی شدید تکلیف اور تشویش کا ذکر تھا۔ دوسری طرف منسٹر راؤ بھی بتا چکا تھا کہ تیمور چودھری ڈراما انڈسٹری میں ایک پڑھے لکھے غنڈے کے طور پر سامنے آیا ہے اور اس نے فاران پروڈکشن اور اے کے بیدل جیسے مہان لکھاریوں کے خلاف باقاعدہ ایک محاذ قائم کررکھا ہے۔

ایس پی شاہد خاں نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''جناب! میری ناچیز رائے تو وہی ہے جو میں پہلے عرض کرچکا ہوں۔ اس سانپ کو پٹاری میں بند کرنا بڑا مشکل ہے۔ اس کا سر ہی کچلنا پڑے گا۔''

منسٹر راؤ تذبذب میں نظر آرہا تھا۔ وہ سفاری سوٹ میں تھا۔ اس کی کنپٹیاں سفید تھیں اور عینک کے پیچھے اس کی آنکھوں میں رعب اور تشویش ایک ساتھ دکھائی دیتے تھے۔ اس سے پہلے کہ منسٹر راؤ کوئی مخالفانہ بات کہتا، ارباب ساہی نے ایس پی شاہد خاں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے ذہن میں کیا طریقہ ہے کہ تمہارا یہ پولیس مقابلہ واقعی پولیس مقابلہ لگے گا؟''

''لگے گا جناب! کیوں نہیں لگے گا۔ وفادار لڑکے ہیں اپنے پاس۔ بس تھوڑا سا خرچہ کرنا پڑے گا۔ ایک ہیڈ کانسٹیبل ہے، ایک اے ایس آئی۔''

''یعنی دونوں ٹانگ پر گولیاں کھائیں گے؟''

''ایک ٹانگ پر کھالے گا، ایک بازو یا کندھے پر۔''

''خرچہ کتنا ہو جائے گا؟''

''میرا خیال ہے آٹھ آٹھ لاکھ میں مان جائیں گے۔ علاج معالجہ تو ظاہر ہے اس کے علاوہ ہوگا۔''

''پرموشن وغیرہ کا بھی تو کہیں گے۔'' منسٹر راؤ نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

''ہیڈ کانسٹیبل تو ڈیمانڈ نہیں کرے گا۔ اے ایس آئی کچھ کہے تو دیکھ لیں گے۔''

منسٹر راؤ، عدیل عالم اور ارباب ساہی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ شاہد خاں کی بات واضح تھی۔ تیمور کے ان کاؤنٹر کی بات ہو رہی تھی۔ اس ان کاؤنٹر کو شک و شبہے سے بالا رکھنے کے لیے اپنے ہی دو اہلکاروں کو زخمی کرنے کی تجویز تھی۔

منسٹر راؤ اور عدیل کو سوچ میں دیکھ کر شاہد خاں نے جلدی سے کہا۔ ''اس بدمعاش بیرسٹر صاحب نے پولیس مقابلے کا ماحول تو پہلے ہی تیار کرلیا ہے۔ یہ ہمارا اے ایس پی عدیل ہمارے سامنے بیٹھا ہے۔ آپ سب جانتے ہیں چند ہفتے پہلے اس نے کس طرح عدیل کے آگے گاڑی بھگائی اور پھر اسے گہرے جوہڑ میں گرایا۔ اقدام قتل کا مقدمہ اس پر درج ہے۔''

ایس پی شاہد خاں کی باتوں میں وزن تھا مگر شاہ زین راؤ ابھی تک تذبذب میں تھا۔ اس کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ وہ اس حد تک جانا نہیں چاہتا..... اور اگر جانا ہی پڑے تو وہ ہاتھ پاؤں بالکل بچا کر کام کرنا چاہتا ہے۔ اسے اندیشہ تھا کہ اگر تیمور جیسے نامی گرامی بیرسٹر کا اس طرح قتل ہوا تو کسی نہ کسی طور دھیان ان لوگوں کی طرف ہی جائے گا جن کے ساتھ تیمور کی مخاصمت چل رہی ہے۔

منسٹر شاہ زین راؤ نے بارعب انداز اور گمبھیر آواز میں اپنے خیالات کا اظہار اہل نشست پر کیا تو سب کے چہرے بجھے نظر آنے لگے۔ کچھ دیر تک فارم ہاؤس کی اس نشست گاہ میں بوجھل خاموشی طاری رہی پھر ایکا ایکی ارباب ساہی کے چہرے پر نئی چمک ابھری۔ اس نے اپنے بھاری تن و توش کے ساتھ کرسی پر پہلو بدلا اور اپنے کلف لگے بالوں پر ہاتھ پھیر کر دبے دبے جوش سے بولا۔ ''جناب! ایک اور تجویز میرے ذہن میں آرہی ہے..... اور..... مجھے لگتا ہے کہ آپ بھی اسے پسند کریں گے.....''

شرکاء سوالیہ نظروں سے ارباب ساہی کے بہت بڑے چہرے کی طرف دیکھنے لگے جس پر عیاری موسلا دھار بارش کی طرح تھی۔ وہ منسٹر راؤ سے مخاطب ہو کر مؤدب لہجے میں بولا۔ ''محترم! تیمور وکیل ہے اور کافی ڈھاڈا وکیل ہے۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ ایسے وکیلوں کے کچھ اصیل قسم کے دشمن بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں ایک ایسے بندے کو جانتا ہوں جس کا سگا بھائی اسی تیمور کی وجہ سے پھانسی کے تختے پر پہنچا ہوا ہے۔ یہ بندہ اس کے خون کا پیاسا ہے۔ اگر اسے موقع ملے تو وہ اس کی جان لے لے گا۔''

''تو اب تک اس نے جان کیوں نہیں لی؟'' شاہ زین راؤ نے پوچھا۔

''وہ یہاں ہے ہی نہیں۔ پولیس سے بھاگا ہوا ہے۔ آج کل ''کچے'' کے آس پاس کے علاقے میں چھپا ہوا ہے۔'' ساہی نے چند لمحے توقف کیا پھر بولا۔ ''جناب! مجھے لگتا ہے کہ اگر اسے یہاں آنے اور واپس جانے کے لیے محفوظ راستہ دے دیا جائے تو وہ اس تیمور کے کام تمام کر ڈالے گا۔''

منسٹر راؤ سمیت سب کے چہروں پر سوچ کی پرچھائیاں نمودار ہوگئیں۔ عدیل عالم نے پوچھا۔ ''جرم کیا ہے اس کا؟''

''جرم تو ایک سے زیادہ ہی ہوں گے..... مگر جو بات کرنے والی ہے وہ یہ ہے کہ یہ بندہ بیرسٹر صاحب کو پار کردے گا اور یہ ایک ایسا قتل ہوگا جس کا کوئی اشارہ ہماری طرف نہیں آئے گا۔ خود کو مزید محفوظ کرنے کے لیے ہم اس بندے کو بعد میں بیرونِ ملک بھی بھجوا سکتے ہیں۔''

''..... یا پھر..... اس کو بھی..... پار کر دیا جائے۔'' ایس پی شاہد خاں نے خطرناک دھیمے لہجے میں کہا۔

گفتگو میں ایک بار پھر ہم آہنگی پیدا ہونے لگی۔ بہرحال منسٹر راؤ نے یہ بات بالکل واضح طور پر ارباب ساہی اور شاہد خاں کے گوش گزار کردی کہ اگر وہ اس طرح کی کوئی کارروائی کرنا چاہتے ہیں تو وہ انہیں صرف اپنے بل بوتے پر کرنا ہوگی..... وہ اور اس کا بیٹا اس سارے معاملے سے یکسر الگ رہیں گے۔

''مگر کچھ نہ کچھ سہولت تو جناب کی طرف سے فراہم ہوگی نا؟'' شاہد خاں نے بتیسی نکالتے ہوئے کہا۔ اس کا چہرہ خونی جانور کا سا چہرہ تھا اور جب وہ مسکراتا تھا تو ایسے ہی لگتا تھا جیسے کوئی درندہ دانت نکوس رہا ہو۔

''تم کہنا چاہتے ہو کہ وہ پنجاب میں داخل ہو تو اسے گرفتار نہ کیا جائے؟''

ایس پی شاہد خاں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''ٹھیک ہے۔ اس بارے میں دیکھتے ہیں۔'' شاہ زین راؤ نے ہامی بھری تو شاہد خاں، عدیل اور ارباب ساہی کے چہرے کھل اٹھے۔

ارباب ساہی نے دبے دبے جوش اور سرخ چہرے کے ساتھ کہا۔ ''آپ کی اجازت ہو تو میں ابھی لاڑے منٹھل سے بات کرتا ہوں..... لاڑا اسی کا نام ہے۔'' ارباب ساہی نے اپنا قیمتی سیل فون اٹھالیا۔

شاہ زین راؤ جیسے بدک کر بولا۔ ''نہیں، ٹھہرو ابھی۔ ذرا اور سوچ لو اور اگر فون کرنا ہی ہوا تو میرے جانے کے بعد کرنا۔'' اس کے ساتھ ہی وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ لوگ اسے رخصت کرنے کے لیے فارم ہاؤس کے احاطے تک آئے۔ راؤ نے ایک بار پھر انہیں ہاتھ پاؤں بچا کر کام کرنے کی ہدایت کی۔

شاہ زین راؤ کے جاتے ہی وہ تینوں دوبارہ نشست گاہ میں آن بیٹھے۔ اس مرتبہ شراب کی بوتل بھی میز پر آگئی اور سگریٹ بھی سلگا لیے گئے۔ ارباب ساہی نے اپنے سیل فون کے ذریعے ایک نمبر ملایا۔ دو تین کوششیں رائگاں گئیں مگر پھر رابطہ ہوگیا۔ یہ واٹس ایپ کال تھی۔ دوسری طرف سے ایک نہایت کرخت اور بھاری آواز سنائی دی۔ ''ہیلو۔''

''ہیلو..... میں ارباب بول رہا ہوں، لاہور سے۔''

''اوہو..... مائی باپ ارباب ساہی صاحب! کہاں یاد کرلیا، کیسے یاد کرلیا؟ مجھے تو اپنے کمینے دماغ پر یقین نہیں ہو رہا کہ حضور والا کی آواز سن رہا ہوں۔''

ساہی نے جوش سے کہا۔ ''اوئے اپنا کیمرا تو آن کر..... تیرا تھوبڑا شریف دیکھ لوں۔''

''کوئی ڈر خطرے کی بات تو نہیں؟'' لاڑے نے تسلی چاہی۔

''اوئے نئیں۔ ستے خیراں ہیں۔''

کیمرا آن ہوگیا۔ کافی بڑے چہرے اور عقابی آنکھوں والے ایک خوفناک شخص کی شکل نظر آئی۔ اس کا رنگ سانولا تھا۔ پیشانی اور رخساروں پر کئی پرانے زخموں کے نشان تھے۔ ارباب ساہی نے موبائل کیمرے کا رخ ایسا رکھا تھا کہ اے ایس پی عدیل اور ایس پی شاہد خاں نظر نہ آئیں پھر وہ لاڑے سے بات کرتا کرتا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

ساہی کی واپسی قریباً دس منٹ بعد ہوئی۔ اس کا چہرہ اندرونی خوشی سے تمتما رہا تھا۔ ایس پی شاہد خاں سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''لاڑے کی اپنی ایک پہچان ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ پورے ملک میں چوٹی کے جو چار پانچ کرائے کے قاتل ہیں، ان میں سے ایک وہ ہے۔''

شاہد خاں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اب کچھ یاد آیا۔ نام تو سنا ہوا ہے میں نے بھی۔''

ارباب ساہی نے پورے یقین سے کہا۔ ''لاڑا جس بندے کو مارنے کی ہامی بھرتا ہے وہ سمجھو..... نوّے فیصد تو ہامی کے وقت ہی مرجاتا ہے.....''

''اور لاڑے نے ہامی بھرلی ہے؟'' عدیل نے پوچھا۔

ارباب ساہی نے اثبات میں سر ہلایا پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''بس تھوڑی سی دیر ضرور ہوجائے گی۔ کمینے کی پنڈلی میں کوئی گولی شولی لگی تھی۔ زخم تو ٹھیک ہوگیا ہے مگر بھاگ دوڑ میں تھوڑی سی مشکل ہو رہی ہے۔ کہتا ہے کہ دو تین ہفتے میں سولہ آنے فٹ ہوجائے گا۔''

''مار لے گا اسے؟'' عدیل عالم نے دانت پیستے ہوئے پوچھا۔

''سمجھو مار دیا ہے پتر جی!'' ارباب ساہی نے کرسی کے ہتھے پر زور سے ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''آج سے اس کا دانہ پانی گنا گیا ہے۔''

تینوں نے اپنے اپنے گلاس ٹکرائے اور ایک ایک تلخ گھونٹ اپنے معدے میں اتارا۔

☆☆☆

حاشہ بے حد ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی۔ اس کے باوجود اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ڈرامے کی ریکارڈنگ کرانے میں

زیادہ تاخیر نہیں کرے گی۔ جب کبھی بھی اس نے اس ''راز'' نامی کہانی کے بارے میں سوچا تھا، اس کے اندر آپوں آپ ایک عجیب سی توانائی پیدا ہوئی تھی۔ وہ اس کہانی کے لیے کچھ کر گزرنے کے لیے مچلنے لگی تھی جیسے کوئی غیبی طاقت ہو جو اسے مہمیز کر رہی ہو اور اب تو کچھ کرنے کی ضرورت اور بھی زیادہ محسوس ہونے لگی تھی۔ سی سی ٹی وی پر اس نے اتفاقاً وسیم کو دیکھا تھا۔ وہ زندہ تھا اور اسی شہر میں کہیں تھا۔ اس کی کہانی پر ڈراما بن جاتا، مقبول ہو جاتا تو عین ممکن تھا کہ وہ بھی اپنی روپوشی کو چھوڑ کر سامنے آجاتا، مایوسیوں کی دلدل سے نکل آتا۔

حاشہ اور تیمور کے درمیان ہر طرح کا رابطہ تقریباً منقطع تھا مگر ڈرامے کی تکمیل کے لیے تو ان کا ملنا بہر حال ضروری تھا۔ چند روز بعد انکل فیروز کو درمیان میں لا کر حاشہ نے تیمور کو آگاہ کیا کہ وہ ریکارڈنگ میں حصہ لینے کے لیے تیار ہے۔

..... کڑے پہرے میں ایک بار پھر شیخوپورہ کی اس وسیع حویلی میں عکس بندی شروع ہوگئی۔ تیمور نے عدالتی مصروفیات کو کچھ روز کے لیے ملتوی کر دیا تھا اور ہمہ وقت ڈرامے کی تکمیل میں لگا ہوا تھا۔ یوں تو حاشہ اور تیمور ایک دوسرے سے بات کرتے تھے مگر ایک کھنچاؤ اور فاصلہ سا دونوں جانب موجود تھا۔

ریکارڈنگ میں وقفہ تھا۔ دونوں حویلی کے سبزہ زار میں ایک بڑی چھتری کے نیچے بیٹھے تھے۔ تیمور ہاف سلیو شرٹ اور دھوپ کے چشمے میں کافی ہینڈسم نظر آرہا تھا۔ اس کے فون کی بیل ہوئی۔ ''ہیلو، تیمور چودھری اسپیکنگ۔''

دوسری طرف اس کا اسسٹنٹ ایڈووکیٹ شوکت رائے تھا۔

''نہیں شوکت۔'' تیمور نے کہا۔ ''ابھی تو دو ہفتے تک بالکل فرصت نہیں ہے۔ انہیں ٹال دو.....''

دوسری طرف سے شوکت نے کہا۔ ''لیکن وہ بہت اصرار کر رہے ہیں۔ بہتر ہے کہ آپ خود ان سے بات کرلیں۔''

فوراً ہی پھر کال آگئی۔ اس مرتبہ یہ اوورسیز کال تھی۔ غالباً انگلینڈ سے آئی تھی۔ تیمور انگلش میں بات کرنے لگا۔ حاشہ خاموشی سے سنتی رہی۔ کوئی پرانی پارٹی تھی جو بے حد اصرار کر رہی تھی کہ وہ انگلینڈ آئے اور ان کا کیس ہینڈل کرے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ منہ مانگی فیس بھی آفر کر رہے ہیں۔ بہر طور تیمور نے انکار کر دیا۔

کال ختم ہوئی تو حاشہ نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ''..... تیمور! آپ انگلینڈ چلے کیوں نہیں جاتے؟ وہاں بہترین مواقع ہیں آپ کے لیے اور پھر یہاں جو خطرات پیدا ہو چکے ہیں، وہ کم ہونے والے نہیں۔''

تیمور نے کہا۔ ''اگر یہی بات میں آپ سے کہوں، یہ خطرات کم ہونے والے نہیں، آپ کہیں باہر شفٹ کیوں نہیں ہو جاتیں؟''

وہ جز بز ہوگئی۔ موضوع بدل کر بولی۔ ''آپ کے خیال میں ریکارڈنگ کتنے دن میں مکمل ہو جائے گی؟''

''کم از کم تین ہفتے تو لگ ہی جائیں گے۔''

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں گھر بیٹھے حاصل کریں

جاسوسی، ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ

پاکستان کے کسی بھی شہر یا کاؤں کے لیے 1800 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 20,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 19,000 روپے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں

رابطہ

مرزا ثمر عباس: 0301-2454188

سرکولیشن مینیجر سید منیر حسین: 0333-3285269

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی

مین کورنگی روڈ۔ کراچی

''تیمور! پلیز اس کو جلد از جلد ختم کریں۔''

''میں آپ کی اس بات سے اختلاف کروں گا اور میرا خیال ہے کہ آپ غور کریں تو آپ بھی اختلاف کریں گی۔ یہ آخری اقساط ہیں۔ ہمیں جلد بازی نہیں کرنی چاہیے۔ اس مرحلے میں اس کام کو پورا ٹائم ملنا چاہیے تب ہی بہتری کی امید ہوسکتی ہے۔''

حاشہ نے ہوا میں اڑتی اپنی لٹوں کو سنبھالا۔ ''کل ڈائریکٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ دسویں اور چودھویں قسط کے درمیان کہانی کچھ ''ڈریگ'' ہوگئی ہے۔ کیا آپ کو بھی ایسا لگتا ہے؟''

''ابھی اس بارے میں ہم یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اصل پتا تو آن ائر ہونے کے بعد ہی چلتا ہے۔''

اسی دوران میں حاشہ کو ڈائریکٹر کی طرف سے آواز آئی کہ شاٹ ریڈی ہے۔ حاشہ مسلسل اٹھارہ گھنٹے سے ریکارڈنگ کرا رہی تھی۔ تھک کر چُور تھی۔ پاؤں سوج چکے تھے لیکن جب بھی شاٹ کی آواز پڑتی تھی، وہ اپنے اندر ایک نامعلوم توانائی کی لہر محسوس کرتی تھی۔ پورا یونٹ حیران تھا کہ یہ نرم و نازک لڑکی اتنی مشقت کا بوجھ کیونکر اٹھا پا رہی ہے۔

اگلے پندرہ بیس روز بے حد مصروفیت والے تھے اور اس سے اگلے دو ہفتے اس سے بھی زیادہ۔ میڈیا اور پرنٹ میڈیا میں ڈرامے کے بارے میں تو کوئی اچھی رائے نہیں تھی مگر حاشہ کے حوالے سے بڑے مثبت تبصرے موجود تھے۔ اس کی خداداد خوبصورتی اور جاذبیت نے ہر کسی کو متاثر کیا تھا۔ اس کی مسکراہٹ کو ماضی کی ایک معروف آرٹسٹ دیبا کی مسکراہٹ سے ملایا جا رہا تھا اور اسے معصومیت اور پاکیزگی کا سمبل قرار دیا گیا تھا۔ ڈراما سیریل میں اس کا کردار بھی کچھ ایسا ہی صاف شفاف اور روح پرور تھا۔ شاید سچ ہی کہتے ہیں کہ یورپ اور امریکا میں مقابلۂ حسن کے نام سے اسٹیج پر جو تماشے لگتے ہیں اور جن خوبروؤں کو تاج پہنائے جاتے ہیں، وہ حقیقت میں شاید اس کی مستحق نہیں ہوتیں۔ دنیا کے دور دراز علاقوں میں، دیہاتوں، قصبوں میں اور باپردہ معاشروں میں نہ جانے کتنے حسین چہرے ایسے ہوتے ہیں جو ان تاج پوش حسیناؤں سے کہیں بہتر ہوتے ہیں.....

ریکارڈنگ کی مصروفیت اتنی زیادہ تھی کہ اہم اداکاروں کو سر کھجانے کی فرصت نہیں تھی۔ حاشہ کے لیے دُہرا مسئلہ سخت سیکیورٹی کا بھی تھا۔ وہ فیروز ہاؤس سے روانہ ہوتی تو سیکیورٹی ایجنسی کی ایک فلی لوڈڈ گاڑی اس کے ساتھ ہوتی۔ وہ اور تیمور جتنی دیر حویلی کی لوکیشن پر رہتے، وہاں بھی کڑا پہرا موجود ہوتا۔ دو تین روز کی شوٹنگ آؤٹ ڈور میں ہوئی تو وہاں سیکیورٹی کا اضافی انتظام کرنا پڑا۔ تیمور ریکارڈنگ اور ایڈیٹنگ کے ساتھ ساتھ پلے کو کسی اچھے چینل سے آن ائر کرنے کے لیے کاروباری معاملات بھی طے کر رہا تھا۔ اسی دوران میں اطلاع ملی کہ ڈراما فیلڈ میں ان کے حریف اے کے بیدل نے انہی دنوں میں اپنی سیریل آن ائر کرنے کا اعلان کر دیا ہے جن دنوں ''راز'' کے آن ائر ہونے کی امید تھی۔ اے کے بیدل کی ڈراما سیریل میگا کاسٹ پر مشتمل تھی۔ اس کا مجموعی بجٹ بھی کافی بڑا تھا۔ وہ ایک معروف چینل کے ذریعے منظرِ عام پر آ رہی تھی جبکہ دوسری طرف ''راز'' کے ساتھ یہ ''سیٹ بیک'' تھا کہ اسے بہتر ساکھ والا انٹرٹینمنٹ چینل دستیاب نہیں ہوا تھا۔

تیمور ان ساری مشکلات کے باوجود ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا۔ درحقیقت وہ کشتیاں جلا کر اس میدان میں آیا تھا۔ نہ صرف اس کی اپنی جمع پونجی لگ چکی تھی بلکہ حاشہ بھی اپنی مختصر پراپرٹی کے زیادہ تر حصے سے محروم ہو چکی تھی۔ بس ایک دھن تھی جو ان دونوں کو اس سیریل کی تکمیل کے لیے مسلسل مہمیز کر رہی تھی۔ یہ ساری کوشش کسی مادی فائدے کے لیے نہیں تھی۔ بس ایک جنون تھا جس نے حاشہ کو اپنے گھیرے میں لیا ہوا تھا اور حاشہ کے سبب تیمور بھی اس حصار میں تھا۔

حویلی کے اندر بھاگ دوڑ کے ایک طویل سین میں نوآموز حاشہ کو اتنی مشقت کرنا پڑی کہ اس کے پاؤں کی نازک انگلیوں سے خون رسنے لگا۔ وہ پھر بھی بریک لینے کو تیار نہیں تھی۔ تیمور نے اسے باقاعدہ ڈانٹ کر کرسی پر بٹھایا اور اس کی بینڈیج کرائی۔ یونٹ کے لوگ حیرت سے حاشہ کو دیکھ رہے تھے جیسے وہ جیتی جاگتی انسان نہ ہو، کوئی مافوق الفطرت کردار ہو۔

''ایک دو روز آرام کرلیں۔'' تیمور نے اس کی جانب دیکھے بغیر کہا۔ وہ اب اس کی طرف کم ہی دیکھتا تھا۔

''نہیں تیمور! یہ ریکارڈنگ والی بھاگ دوڑ جتنی جلدی ختم ہوجائے، اتنا ہی بہتر ہے۔ آپ کو پتا ہے وہ لوگ آپ کی تاک میں ہیں۔ اس مضافاتی علاقے میں وہ آپ کو کسی بھی وقت نقصان پہنچا سکتے ہیں۔''

''مجھے زیادہ فکر آپ کی رہتی ہے۔ میں اپنی حفاظت

کرسکتا ہوں۔''

''چلیں ایسے ہی سہی لیکن یہ ریکارڈنگ جلد ختم ہونی چاہیے۔''

اسی اثنا میں حاشہ کے فون کی بیل ہوئی۔ دوسری طرف بساط تھی۔ وہ ہر دوسرے تیسرے روز فون کرتی تھی اور وسیم کی تلاش کے حوالے سے تازہ ترین صورت حال دریافت کرتی تھی۔ کوششیں بدستور جاری تھیں مگر ابھی کامیابی کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دی تھی۔ اب تو کسی وقت حاشہ کو شبہ ہونے لگتا تھا کہ کہیں اس روز سی ٹی وی پر اسے واقعی دھوکا نہ ہوا ہو۔

حاشہ نے بے دلی سے کال ریسیو کی۔ دونوں باتیں کرنے لگیں۔ بساط نے غمزدہ لہجے میں اسے بتایا۔ ''حاشی! پتا ہے آج کیا ہے؟ آج سالگرہ ہے۔''

''کس چیز کی سالگرہ؟'' حاشہ نے حیرانی سے پوچھا۔

''محبت کی سالگرہ۔ شاید تم بھی بھول گئی ہو۔ برسوں پہلے آج ہی کے دن اس نے ایک خط کے ذریعے مجھ سے اظہارِ محبت کیا تھا اور میں نے اسے جواب دیا تھا۔ وہ اس کو محبت کی سالگرہ کہتا تھا اور کبھی یہ سالگرہ بھولتا نہیں تھا۔ آج سارا دن مجھے یہ آس رہی کہ شاید وہ کہیں سے مجھے فون کرے..... کوئی میسج بھیجے..... مجھے بتائے کہ وہ جہاں کہیں بھی ہے، مجھے بھولا نہیں لیکن ..... دیکھو سارا دن گزر گیا ہے۔ شام ہوگئی ہے، رات بھی ہوجائے گی۔ وہ کچھ نہیں بتائے گا کہ کہاں ہے.....'' آخری الفاظ کہتے کہتے اس کی آواز بھرا گئی۔

حاشہ کا اپنا دل بھی بھر آیا تھا۔ اس نے اس سے تسلی تشفی کی باتیں کیں اور پھر ڈراما سیریل کا ذکر چھیڑ دیا جو تکمیل کے آخری مراحل میں تھی۔ ایک طرح سے یہ بھی وسیم کی واپسی کے حوالے سے امید کی ایک کرن ہی تھی۔

بساط سے بات ختم کرنے کے بعد وہ گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ مصیبتوں نے جیسے وسیم کے گھر کا راستہ دیکھ لیا تھا۔ وسیم کی تلاش میں مارا مارا پھرنے کے بعد چھوٹا بھائی عثمان بھی بیمار پڑا تھا۔ انکل فیروز کی مہربانی تھی کہ انہوں نے اسے مع تنخواہ کے رخصت دے رکھی تھی۔ تیمور بھی بے جی اور عثمان کا خیال رکھ رہا تھا۔

'..... کہاں ہو وسیم بھائی.....؟' حاشہ نے بڑے کرب کے ساتھ سوچا۔

☆☆☆

.....قریباً ایک ماہ بعد جیسے تیسے ڈراما سیریل ''راز'' آن ائر ہوگئی۔ چینل بے شک سیکنڈ کیٹیگری کا تھا لیکن پرومو وغیرہ اچھے بنے تھے..... پری ریلیز ایڈورٹائزمنٹ بھی مناسب ہی تھی۔ شروع کی دو تین قسطوں میں ناظرین نے دلچسپی لی اور اچھی ریٹنگ آئی۔ یہ تسلی بخش صورتِ حال تھی..... مگر زیادہ دیر برقرار نہیں رہی۔ چوتھی قسط پر ریٹنگ ایک دم ڈاؤن ہوگئی۔ شاید یہاں کہانی کا پلاٹ کچھ کمزور پڑا تھا۔ تاہم ایک بڑی وجہ اے کے بیدل والی میگا کاسٹ اور بڑے بجٹ کی سیریل بھی تھی۔ اس کا ''ٹائم سلاٹ'' بھی وہی تھا جو ''راز'' کا تھا۔ تبصرہ کرنے والوں کو یہی لگا کہ سیریل ''راز'' دبنگ مصنف اے کے بیدل کی سیریل کے ہاتھوں بری طرح پچھاڑی گئی ہے..... لیکن پھر ایک انہونی ہوئی۔ یوں لگا جیسے کسی کرشمے نے کروٹ لی ہے..... جیسے کوئی غیر متوقع لہر چلی ہے اور اس لہر نے دیکھتے ہی دیکھتے اپنا حجم بڑھانا شروع کردیا ہے..... اور یہ سب کچھ چھٹی قسط کے بعد شروع ہوا۔ ایک گمنام مصنف کی متنازعہ لیکن اچھوتی کہانی نے اپنا جادو چلانا شروع کردیا تھا۔ کسی بھی تخلیقی شاہکار کو مقبولِ عام کرنے میں سینہ گزٹ کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ بات سینہ بہ سینہ پھیلتی ہے اور چلتی ہے اور یہ ایسی ایڈورٹائزمنٹ ہوتی ہے جس کا کوئی ثانی نہیں ہوتا۔ یکا یک سیریل ''راز'' کے ساتھ بھی یہی کچھ ہونا شروع ہوا۔ بے شک یہ ڈراما ایک دوسرے درجے کے چینل سے دوسرے تیسرے درجے کے فنکاروں کے ساتھ آن ائر ہورہا تھا..... مگر دیکھتے ہی دیکھتے اس کی شہرت کو پر لگنے شروع ہوگئے۔ جیسے سخت حبس میں ایک دم تیز ہوا چلنے لگتی ہے۔ جیسے جنگل کی آگ پھیلتی چلی جاتی ہے۔ یہ بات چار سو گردش کرنے لگی کہ ''راز'' ایک دیکھے جانے کے قابل ڈراما ہے۔ خاص طور پر ساتویں آٹھویں قسط کے بعد اس نے جو موڑ لیا تھا، اس نے ناظرین کو جکڑ کر رکھ دیا تھا۔ تبصرہ نگار، نقاد اور تجزیہ کار جو پہلے اس سیریل کو درخور اعتنا نہیں سمجھ رہے تھے..... متوجہ ہونے لگے..... ڈرامے کی ریٹنگ ایک بین ثبوت تھا کہ ایک جادو ہے جو چل گیا ہے..... اور چل رہا ہے۔

تیمور اور اس کے ہم کار اس غیر متوقع کامیابی پر حیران تھے اور خوش بھی۔ اس کہانی کی طاقت پر تو ان سب کو پہلے دن سے پختہ یقین تھا لیکن یہ کہانی اس طرح خاص و عام کو اپنے سحر میں جکڑے گی، انہیں بھی امید نہیں تھی۔ سیریل کا ٹائٹل سونگ بھی جو بساط نے خود لکھا تھا، تیزی سے

مقبولیت کے مدارج طے کر رہا تھا اور کہنے والے کہہ رہے تھے کہ اس ٹائٹل سونگ نے ڈرامے کی روز افزوں مقبولیت میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

سیریل کی دسویں قسط پورے یونٹ نے فیروز ہاؤس میں اکٹھے دیکھی۔ حاشہ نے بساط، اس کے والد انکل احتشام، پبلشر غفار احمد اور عثمان وغیرہ کو خصوصی طور پر مدعو کیا تھا۔ بیماری کے باوجود عثمان بھی چلا آیا تھا۔ سب موجود تھے..... بس وہی موجود نہیں تھا جس نے اپنے خونِ جگر سے یہ کہانی لکھی تھی اور پھر اسے لے کر در بدر بھٹکتا بھی رہا تھا۔ ایڈیٹروں، پبلشروں اور دانشوروں سے اس کہانی کا حق مانگتا رہا تھا..... کہاں تھا وہ؟ کس تاریک کونے میں جا چھپا تھا۔ آج وہ یہاں ہوتا، یہ سب دیکھتا تو شاید پھر سے جی اٹھتا بلکہ اپنے قد کو آسمان تک بلند محسوس کرتا۔

قسط ختم ہونے کے بعد عثمان تو اپنی طبیعت کی خرابی کے باعث زیادہ دیر نہ رک سکا اور ماموں احتشام کے ساتھ واپس چلا گیا۔ تیمور، حاشہ، بساط اور انکل فیروز علیحدہ کمرے میں آن بیٹھے۔ حاشہ آنکھوں میں نمی لے کر بولی۔

''آج وسیم بھائی کی کمی ہمیشہ سے زیادہ محسوس ہو رہی ہے۔''

فیروز حسن نے کہا۔ ''پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے کہ وہ بھی ڈرامے کے بارے میں اور اس کی کامیابی کے بارے میں جان چکا ہوگا..... یا پھر بہت جلد جان جائے گا۔ ہوسکتا ہے کہ حالات کی یہی کروٹ اس کی واپسی کا سبب بن جائے۔''

بساط نے ایک آہ بھری۔ ''ڈرامے کے بارے میں تو انہیں تب پتا چلے گا جب ..... وہ.....'' وہ فقرہ مکمل نہ کرسکی، چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔

وہ سسک اٹھی تھی۔ ایک طرح سے وہ وسیم کی زندگی کی طرف سے ناامیدی کا اظہار کر رہی تھی۔

فیروز حسن نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ ''مایوسی گناہ ہے بیٹی..... ہم سب کے دل گواہی دیتے ہیں کہ وہ زندہ ہے۔ ہمیں اس کے لیے دعا کرنی چاہیے اور پوری پوری کوشش بھی۔''

تیمور نے کہا۔ ''اے آئی جی عطا صاحب کی مہربانی سے دو تین اعلیٰ افسران پورا تعاون کر رہے ہیں۔ انہوں نے لاہور کے مختلف حصوں میں اپنے انفارمرز کو بھی الرٹ کیا ہے۔ سوشل میڈیا پر عثمان خود کمپین چلا رہا ہے۔ وسیم کی والدہ کی طرف سے اخبارات میں بدستور اشتہار بھی دیا جا رہا ہے۔ ان شاء اللہ ضرور کوئی نتیجہ نکلے گا۔''

حاشہ بولی۔ ''ڈاکٹر انصار بھی اپنی سی کوشش کر رہے ہیں۔ لاہور کے تمام سرکاری اور پرائیویٹ اسپتالوں کے آرتھو پیڈک وارڈز پر انہوں نے نظر رکھی ہوئی ہے۔''

تیمور نے ذرا توقف سے کہا۔ ''آپ لوگوں کے لیے ایک اور اچھی خبر ہے..... بلکہ بہت اچھی۔'' سب سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ دبے دبے جوش سے بولا۔ ''ہماری سیریل ''راز'' کے حوالے سے دو بڑی آفرز ہیں۔ ان میں سے ایک آفر کے بارے میں آپ کو بتا سکتا ہوں۔''

سب تجسس سے تیمور کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ بولا۔ ''ایمازون کے ریجنل ڈائریکٹر نے مجھ سے رابطہ کیا ہے۔ وہ ہماری اس سیریل کے رائٹس میں دلچسپی ظاہر کر رہے ہیں۔''

سب کے چہرے خوشی سے تمتما گئے۔ اس حوالے سے گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا تو دیر تک چلا۔ سب نے اس سلسلے میں اپنی اپنی آراء کا اظہار کیا۔

ڈنر کے بعد سب ایک ایک کر کے فیروز ہاؤس سے رخصت ہوگئے۔ وہ سب لوگ سرشار تھے جنہوں نے نہایت مشکل حالات میں اس سیریل کے لیے کسی نہ کسی طور پر کام کیا تھا۔ اس کامیابی کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا اور سیریل کی انٹرنیشنل پہچان کے بعد یہ عالمگیر حقیقت پھر واضح ہو رہی تھی کہ کسی بھی طرح کے ڈرامے یا فلم وغیرہ کی اصل بنیاد اس کی کہانی ہی ہوتی ہے۔

مہمان چلے گئے۔ مہمانوں کی آخری ٹولی کو سی آف کرنے کے لیے فیروز حسن صاحب پورچ کی طرف گئے تو حاشہ اور تیمور نشست گاہ میں اکیلے رہ گئے۔ تیمور بھی جانے کے لیے تیار نظر آتا تھا۔ حاشہ کی جانب دیکھے بغیر بولا۔

''آپ نے اس دوسری آفر کے بارے میں نہیں پوچھا جو اس مشہور ادارے نے کی؟''

حاشہ پلکیں جھپکا کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ نیلی ساڑی اور ہلکے میک اپ میں نہایت دلکش نظر آ رہی تھی۔

تیمور بولا۔ ''وہ ایک ایسی آفر کر رہے تھے جسے میں قبول نہیں کرسکتا اور آپ کے قبول کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ یہ آپ کی پہلی اور آخری ڈراما سیریل ہے۔ وہ ایک بہت بڑے پروجیکٹ کے لیے آپ کو کام کرنے کی آفر دے رہے تھے۔ آپ سے پوچھے بغیر میں نے انکار کیا۔ آپ کو برا تو نہیں لگا؟''

''نہیں..... لیکن اب جو کچھ آپ پوچھ رہے ہیں، یہ برا لگا ہے۔'' اس کے روشن ماتھے پر شکنیں ابھر آئی تھیں۔

''میں نے اپنی زندگی کا یہ باب ہمیشہ کے لیے کلوز کر دیا ہے۔''

''مجھے یقین تھا کہ آپ کا جواب یہی ہوگا۔''

اسی دوران فیروز حسن مہمانوں کو رخصت کر کے واپس آ گئے۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تیمور!

''جگری دوست'' آج کل بہت پھڑک رہا ہے۔ میرا مطلب اے کے بیدل سے ہے۔ کل بھی ایک چینل پر بیٹھا ہوا تھا اور ''راز'' پر تنقیدی حملے کر رہا تھا۔ دراصل اس کے پیٹ میں وہی درد ہے جس کے بارے میں ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔ ''راز'' کی روز افزوں مقبولیت نے اس کی سیریل کو لمبا لٹا دیا ہے۔ سنا ہے اب وہ ہفتے میں ایک بار آن ائر ہو رہی ہے۔''

''جلنے والے کا منہ اسی طرح کالا ہوا کرتا ہے انکل! پنجابی میں کہا جاتا ہے نا کہ فلاں بندے کے دانے مک گئے ہیں۔ بیدل کے دانے بھی مک گئے ہیں۔ بس پرانی مشہوری کے زور پر ہی چلتا جا رہا ہے۔ چل بھی کیا رہا ہے، بس گھسٹ رہا ہے۔''

''سنا ہے ڈاکٹروں نے بائی پاس کا مشورہ دیا ہوا ہے۔'' فیروز حسن نے کہا۔

''اور وہ انہیں بائی پاس کر رہا ہے۔'' تیمور مسکرایا۔

پھر گفتگو کا رخ اس اہم ترین پیشرفت کی طرف مڑ گیا جس کا ذکر ابھی تیمور نے مہمانوں کے سامنے کیا تھا۔ ایک بڑے ادارے کی طرف سے پیشکش کا ہونا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ انڈیا کے پروجیکٹس کو تو وہ لوگ قابلِ توجہ جانتے تھے مگر پاکستان کے حوالے سے ایسا شاذ و نادر ہی ہوا تھا۔ یہ ایک سنسنی خیز صورتِ حال تھی۔

☆☆☆

اے کے بیدل کی عمر ایسی تھی کہ اب اسے آرام کرنا چاہیے تھا لیکن اس کے برعکس ہر گزرنے والے دن کے ساتھ وہ اپنی زندگی کی رفتار تیز بلکہ تند و تیز کرتا جا رہا تھا۔ بیوی سے طلاق کے بعد اس کی ازدواجی زندگی کوئی تیس سال قبل ختم ہو چکی تھی۔ اس کے بعد اس نے یہ جھنجٹ پالنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی تھی۔ اس کے بقول جب دودھ مل رہا تھا تو پھر بھینس کا بکھیڑا پالنے کی کیا ضرورت تھی۔

اس وقت بھی وہ اپنے بیڈ روم میں تھا اور اکیلا نہیں تھا۔ یوں تو اس کی وحشتوں کے ساتھی بدلتے رہے تھے لیکن آج کل زیادہ زور عروسہ پر ہی تھا۔ ویک اینڈز پر نوجوان ہیروئن عروسہ اکثر بیدل کی تنہائی چمکانے کے لیے اس کے پاس پہنچ جاتی تھی۔ آج بھی وہ سرِشام اپنے جلوؤں کی چکاچوند کے ساتھ آن موجود ہوئی تھی۔ کمرے میں ساغر و مینا کی کھنک بھی موجود تھی۔ بوڑھے بیدل نے پھولدار شرٹ اور ہاف پینٹ پہن کر کم عمر نظر آنے کی ناکام کوشش کی ہوئی تھی۔

عروسہ یوں تو بیدل کی گود میں سر رکھے لیٹی تھی لیکن وہ کچھ برہم سی دکھائی دیتی تھی۔ ناراض لہجے میں بولی۔ ''برا نہ مانیے گا۔ اب تو یہی لگ رہا ہے کہ آپ کی خاطر تیمور کی آفر ٹھکرا کر میں نے گھاٹے کا سودا کیا۔ اپنے جس پلے کے لیے آپ زمین آسمان کے قلابے ملا رہے تھے، اس کے ساتھ کیا ہوا..... اور ''راز'' کو دیکھیں کہاں سے کہاں نکل گیا۔ ایمازون کی طرف سے بھی رابطے ہو رہے ہیں اس کے لیے۔''

''یہ ایمازون والی بیل کبھی منڈھے نہیں چڑھے گی..... تم دیکھ لینا۔'' اے کے بیدل نے مخمور انداز میں کہا اور پھر حریص انداز میں عروسہ کے شفاف رخسار پر انگلی چلائی۔

''ایسا کیوں ہوگا؟''

''راز کی کہانی میں جس طرح روحانیت کو ڈسکس کیا گیا ہے، وہ ایک نازک معاملہ ہے۔ خاص طور سے غیر ملکیوں کے لیے۔ کہانی میں حیلے بہانوں سے خدا کے وجود کو منوانے کی کوشش کی گئی ہے۔ وہ لوگ اس حوالے سے بڑے محتاط ہوتے ہیں پھر اسٹوری لائن پر جو چربے کا الزام ہے، وہ بھی اپنی جگہ ہے۔''

''لیکن یہ الزام بھی تو ہم نے ہی لگایا ہے ورنہ ہم بھی جانتے ہیں کہ وہ چربہ نہیں ہے۔''

''جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔'' بیدل نے عروسہ کے چمکیلے چہرے پر جھکتے ہوئے کہا۔ وہ بیزاری سے کسمسا کر رہ گئی۔

اپنا چہرہ اس کی آغوش سے نکالتے ہوئے بولی۔ ''سنا ہے آپ کی ٹیم نے کوئی خط بھی لکھا ہے ایمازون والوں کو؟''

بیدل نے مشروب کا کڑوا گھونٹ بھرا۔ ''کہا ہے نا کہ محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے..... ایمازون والوں کو بھی تو خبر ہونی چاہیے کہ اس سیریل پر کیا کیا الزامات لگے ہیں۔''

الکحل اے کے بیدل کے دماغ کو چڑھ رہی تھی۔ اس نے کمرے کی تیز روشنیاں بجھانے کے لیے سوئچ بورڈ

کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ یہی وقت تھا جب انٹر کام کا بزر بج اٹھا۔ اس نے جھلا کر ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف اس کا ذاتی ملازم تھا۔ ''کیا بات ہے؟'' بیدل پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولا۔

''سر! ایک بندہ ملنے آیا ہے آپ سے..... ہم نے بہت روکا لیکن وہ زبردستی اندر چلا آیا ہے۔ ڈرائنگ روم میں موجود ہے۔ آپ سے ملنے کا کہہ رہا ہے۔''

''ہے کون وہ؟'' بیدل دہاڑا۔

''نام بھی نہیں بتا رہا جی۔''

اے کے بیدل نے ملازم کی شان میں دو چار قصیدے پڑھے پھر بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ عروسہ بھی اپنا بے ترتیب لباس درست کرنے لگی۔ بیدل دروازہ کھول کر تیز قدموں سے باہر نکلا۔ ڈرائنگ روم میں تیمور چودھری کو دیکھ کر اس کا نشہ تو ہرن ہو گیا مگر رگ و پے میں چنگاریاں سی چھوٹ گئیں۔ ''تم..... یہاں؟'' وہ پھنکارا۔

تیمور بھی بڑے غصیلے موڈ میں تھا، بلا تمہید بولا۔

''بیدل صاحب! ایمازون کے ریجنل ہیڈ کو ہمارے بارے میں ''محبت نامہ'' تم نے لکھا ہے؟''

''کیا بکواس ہے؟ کس..... محبت نامے کی بات کر رہے ہو؟''

''بھولے مت بنو بیدل! تم سب جانتے ہو۔''

''دیکھو، تم اپنی زبان سنبھالو۔ میں یہ لہجہ سننے کا عادی نہیں ہوں۔''

''سننا تو اب تمہیں بہت کچھ پڑے گا بیدل.....! کیونکہ تمہارے ''کام'' سننے والے ہی ہیں۔ کیا سمجھتے ہو تم؟ اس طرح کی لاف زنی کر کے تم ''راز'' کے پر کاٹ سکتے ہو؟ نہیں کر سکتے ایسا۔ چاند پر تھوکو گے تو اپنے ہی منہ پر پڑے گا۔''

''تم اپنی زبان کو لگام دیتے ہو یا پھر میں کچھ کروں تمہارا؟'' بیدل کا لہجہ خطرناک ہو گیا۔ اس کا جسم کانپنے لگا۔

تیمور نے زہر خند انداز میں کہا۔ ''تم کچھ کرنے کے قابل نہیں ہو اب۔ تمہاری عیاشیاں حکیموں، ڈاکٹروں کی مرہونِ منت ہیں اور تمہارا قلم چوری چکاری کی سیاہی سے چلتا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ تمہاری پھونک نکل چکی ہے۔''

''اوئے، میں کہتا ہوں دور ہو جا میری نظروں سے۔ نہیں تو ابھی کتے چھوڑ دوں گا تیرے اوپر۔''

''دھمکیاں مت دے۔ تو جتنے جوگا ہے، میں جانتا ہوں۔ مجھے میرے سوال کا جواب چاہیے۔ خط کیوں لکھا تم نے؟'' تیمور نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر کہا۔ لگتا تھا کہ وہ جان بوجھ کر بیدل کو غصہ چڑھا رہا ہے۔

اور اسے غصہ چڑھ رہا تھا۔ اس کے گلے کی رگیں پھولتی جا رہی تھیں اور سوکھی سڑی ٹانگوں کے اوپر تھوڑی سی ابھری ہوئی توند کو مسلسل ہچکولے لگ رہے تھے۔

اس نے ایک واکنگ اسٹک اٹھائی اور تیمور پر پل پڑا۔ تیمور نے اسٹک کی ضربیں اطمینان سے اپنے بازوؤں پر روکیں۔ اسٹک ٹوٹ گئی۔ آگ بگولا بیدل نے پیتل کا ایک وزنی گلدان اٹھایا اور تیمور کے سر کو نشانہ بنانا چاہا۔ تیمور نے اس کی کلائی پکڑ لی۔ ''تیرے بڑھاپے کی حیا کر رہا ہوں۔ ہوش میں آجا ورنہ ہڈی پسلی تڑوا لے گا۔'' تیمور نے کہا۔

اندرونی کمرے میں موجود عروسہ نے کھڑکی میں آ کر چلّانا شروع کر دیا تھا۔ بیدل کا نوجوان اسسٹنٹ اور ایک ملازم موقع پر پہنچ گئے۔ اسسٹنٹ بڑے جارحانہ موڈ میں آیا تھا مگر پھر ٹھٹک گیا۔ اس کے تاثرات سے ظاہر ہونے لگا کہ وہ تیمور کو جانتا ہے اور اس کی حیثیت کو بھی۔

بیدل اب بھی اچھل اچھل جا رہا تھا۔ اسسٹنٹ دونوں کے درمیان آیا اور معاملے کو مزید بگڑنے سے بچانے کی کوشش کی۔ وزنی گلدان اب بیدل کی گرفت سے نکل چکا تھا۔ اسسٹنٹ نے بیدل کو اپنی بانہوں کے کلاوے میں لے لیا۔ ''سر! جانے دیں..... سر! جانے دیں۔'' وہ بار بار کہہ رہا تھا۔ وہ اسے تھوڑا دھکیلتا ہوا تیمور سے دور لے گیا۔ دور ہونے کے باوجود بیدل گالیاں بک رہا تھا اور زہریلی دھمکیاں دے رہا تھا۔

تیمور نے اپنی ٹائی کی ناٹ درست کرتے ہوئے کہا۔ ''لے جا اس مُردے کو کمرے میں..... اور اس کی ماں کی گود میں ڈال دے۔ چلّا رہی ہے اندر۔''

..... پھر وہ مڑا اور لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر نکل گیا۔ گیٹ پر اس کی گاڑی کھڑی تھی۔

..... اے کے بیدل نے اپنی ہمت و طاقت سے بڑھ کر ری ایکشن دکھایا تھا۔ تیمور اور اس کی ٹیم کو خطرناک ترین نتائج کی دھمکیاں دی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ اس رات اس کی طبیعت خراب ہوئی۔ اسے پنجاب کارڈیالوجی میں لے جایا گیا۔ وہ دو دن وہاں ایڈمٹ رہا..... تیسرے دن شام کو..... راہی عدم ہو گیا۔

؎ مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

(جاری ہے)

پُراسرار

میاں محمد احمد

شاید بعض رشتے اتنے مضبوط ہوتے ہیں جو موت کے بعد بھی ساتھ نبھاتے ہیں... وہ جو زندگی اور موت کے درمیان احساسات کی کہانی لکھ رہا تھا کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کی حقیقت کیا ہے مگر... ایک دن جب سچ پر سے پردہ چاک ہوا تو سب کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔

ایک رات کے پُراسرار میزبانوں کی پُرلطف ضیافت کا احوال

رات کے 10 بجے ایک جھٹکا لگنے سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے ہڑبڑا کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ ایک پرانا، ویران اور بدحال ریلوے اسٹیشن دکھائی دیا۔ میں اور باقی مسافر حیران تھے کہ دو دن سے مسلسل چلتی ٹرین اس ویرانے میں آخر کیوں رکی ہوئی ہے..... میں نے اپنا سامان سنبھالا اور اٹھ کر کنڈیکٹر کے پاس جا کر پوچھا۔

''ہم یہاں کتنی دیر تک رکیں گے؟''

وہ بولا۔ ''جناب! انجن میں کچھ مسئلہ ہوا ہے۔ امید ہے دس پندرہ منٹ تک ٹھیک ہو جائے گا۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیا میں تھوڑی دیر چہل قدمی کرلوں؟ کچھ دیر میں آجاؤں گا۔'' ابھی میں بات مکمل ہی کر پایا تھا کہ چار پانچ لڑکے ٹرین سے اتر کر اپنی کمر کو سیدھا کرنے کی کوشش کرنے لگے۔

کنڈیکٹر نے میری طرف دیکھ کر نیم غنودگی جیسے عالم میں کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ ٹرین کے سیٹی بجانے پر آجانا ورنہ تمہارا سامان اس ویران اسٹیشن پر اتار کر ہم چلے جائیں

گے۔'' اس کے بعد وہ ان لڑکوں سے مخاطب ہوا اور انہیں بھی میری طرح تنبیہہ کی۔ میں اپنا بٹوا اور ضروری سامان ہاتھ میں پکڑ کر ٹرین سے اتر گیا۔

چودھویں کا چاند اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے بہت بھلے لگ رہے تھے۔ یہ اسٹیشن اپنے دور کی شاندار عمارت تصور کی جاتی ہوگی کیونکہ اس کے کھنڈر بھی بہت سی کہانیاں بیان کررہے تھے۔ اس کے صرف ایک کمرے میں لالٹین جل رہی تھی جہاں ایک بوڑھا اسٹیشن ماسٹر اور اس کا ساتھی گارڈ بیٹھا ہوا تھا۔ باقی تمام اسٹیشن کھیتوں سے گھرا ہوا تھا۔ میں اردگرد کا جائزہ لے کر اسٹیشن سے باہر نکل آیا۔ یہاں کھیتوں کو دیکھ کر بہت لطف آیا۔ میں خوبصورت چاندنی اور ٹھنڈی ہوا میں کھیتوں کو عبور کرتا ہوا رہائشی علاقے تک آگیا۔ یہاں کافی فاصلے پر کچھ عالیشان کوٹھیاں تھیں جو قدیم طرز پر بنی تھیں۔ کچھ میں بے شمار لالٹین روشنی کررہی تھیں اور چند اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ ان کے پاس ہی ایک بستی کے آثار نظر آرہے تھے جو غالباً مقامی کسانوں کے جھونپڑوں پر مشتمل تھی۔ ایک جگہ مجھے ایک درخت نظر آیا جو اس طرح سے گرا ہوا تھا کہ... بہ آسانی دو سے چار آدمی اس پر بیٹھ سکتے تھے۔ میں موسم کا لطف اٹھانے وہاں بیٹھ گیا۔ بیٹھے بیٹھے نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی اور ٹرین کے دوسری دفعہ سیٹی بجانے پر میں بوکھلا کر اٹھا اور اسٹیشن کی طرف اندھا دھند بھاگنے لگا۔ وہاں پہنچا تو ٹرین کی آخری سرخ بتی میرا منہ چڑا رہی تھی۔

میں بے بسی کے عالم میں خود کو کوسنے لگا۔ اتنے میں اسٹیشن ماسٹر نے مجھے آواز دی۔ ''بابو صاحب! بابو صاحب! ادھر آیئے۔'' میں بوجھل قدموں کے ساتھ اس کی کھڑکی کے پاس گیا۔

وہ بولا۔ ''جناب! گاڑی آپ کے انتظار میں پورے پانچ منٹ کھڑی رہی، آخر کنڈیکٹر نے آپ کا سامان میرے حوالے کر کے ٹرین چلوادی۔''

میں نے ایک طرف پڑے اپنے سفری بیگ کو دیکھا اور پھر اسٹیشن ماسٹر کی طرف متوجہ ہوکر بولا۔ ''جناب! دراصل میری آنکھ لگ گئی تھی۔ اب بتایئے کہ اگلی ٹرین کب آئے گی؟''

اسٹیشن ماسٹر اپنی بڑی بڑی آنکھیں نکال کر بولا۔ ''جناب! یہ ویران اور اجاڑ اسٹیشن صرف مال گاڑیوں کے لیے ہے۔ مسافر ٹرینیں تو صرف کبھی کبھار ہی ادھر کا رخ کرتی ہیں۔ وہ بھی غلطی سے۔'' وہ مسکرایا اور دوبارہ بولا۔ ''خیر، آپ کی قسمت اچھی ہے کہ صبح گیارہ بجے ایک اور مسافر ٹرین آئے گی۔ آپ کو ہم اس میں سوار کروادیں گے۔''

میں نے پوچھا۔ ''تب تک میں کہاں رکوں گا؟''

گارڈ نے جواب دیا۔ ''جناب! آپ کو یہاں تو کوئی سہولت نہیں ملے گی۔ ہم بھی تھوڑی دیر بعد اپنے گھر چلے جائیں گے اور صبح صبح آجائیں گے۔ بہتر ہوگا کہ آپ آک فیلڈ کے کسی کسان کے گھر رات گزار لیں۔ وہ آپ کو کچھ سہولیات دے دیں گے۔''

میں نے چونک کر کہا۔ ''کیا کہا؟ آک فیلڈ.....؟''

وہ بولا۔ ''ہاں، یہ آک فیلڈ اسٹیشن ہے۔''

میرا ذہن اچانک چند ماہ پہلے کے واقعات سے بھر گیا جب میرے یونیورسٹی میں آخری دن تھے اور وہاں میرا سب سے گہرا دوست فیروز اجمل بھی اپنے گاؤں واپس جانے کی تیاریاں کررہا تھا۔ وہ میرا نہایت قریبی ساتھی تھا۔ اس کا تعلق آک فیلڈ سے تھا۔ اس نے بارہا مجھے اپنے گاؤں چلنے کی دعوت دی مگر میں ٹالتا رہا۔ آج قسمت مجھے خود اس کے گاؤں لے آئی تھی۔ میں نے اسٹیشن ماسٹر سے پوچھا۔

''جناب! کیا یہاں چودھری اجمل رہتے ہیں جن کا بیٹا فیروز اجمل کچھ ماہ قبل اپنی پڑھائی مکمل کر کے لوٹا ہے؟''

میری بات سن کر دونوں نے ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھا پھر گارڈ بولا۔ ''ہاں، اسٹیشن سے کچھ فاصلے پر موجود کوٹھیوں میں سے سفید سنگِ مرمر کی آخری کوٹھی ان ہی کی ہے۔''

میں نے ان کی مزید کوئی بات نہ سنی اور اپنا سامان اٹھا کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گارڈ کی بتائی ہوئی کوٹھی کے سامنے جا پہنچا۔ یہ کوٹھی باقی کوٹھیوں کی نسبت کافی عالیشان تھی مگر وہاں سے صرف..... مدھم سی روشنی باہر آرہی تھی۔ اس کے سامنے جنگلی جڑی بوٹیاں اگ چکی تھیں جیسے کافی عرصے سے اس کی صفائی نہیں کی گئی ہو۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازہ بجایا جس کی آواز پورے گھر میں گونج اٹھی۔

کچھ دیر بعد قدموں کی آواز سنائی دی اور پھر دروازہ کھل گیا۔ اندر مدھم سی روشنی میں ایک دبلا پتلا لڑکا باہر نکلا۔ یہ فیروز ہی تھا۔ مجھے اسے پہچاننے میں دقت ہورہی تھی کیونکہ اس کا رنگ اڑ چکا تھا اور جسم بھی لاغر اور کمزور ہو چکا تھا۔ اس نے مجھے گھور کر دیکھا اور پھر ''آدم..... آدم'' کہتا ہوا مجھ سے لپٹ گیا پھر بولا۔ ''یار! تم اچانک..... سچ پوچھو، مجھے تمہاری آمد سے بہت خوشی ہوئی۔ چلو اندر چلو۔'' اس نے آگے بڑھ کر میرا سامان اٹھالیا۔ میں نے اسے روکنے کی کوشش بھی کی

مگر وہ سامان اٹھا کر اندر چل پڑا۔ میں اس کے ساتھ حویلی کے اندر داخل ہوا۔ اندر ایک ہال تھا جس کے ارد گرد کافی کمرے تھے اور وسط میں ایک میز پڑی تھی جس کے اوپر ایک خوبصورت فانوس روشن تھا۔ اچانک ایک کمرے کا دروازہ کھلا اور اندھیرے میں سے تین افراد نکل کر ہماری جانب بڑھے۔ فانوس کی روشنی میں، میں نے دیکھا کہ وہ فیروز کے والدین اور ایک چھوٹا بچہ تھا۔

فیروز نے ان سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''ابو، امی! یہ آدم ہے، میرا دوست!''

اس کی والدہ نے آگے بڑھ کر شفقت سے کہا۔

''خوش آمدید بیٹا! اسے اپنا گھر سمجھنا۔ فیروز تمہارا بہت ذکر کرتا ہے۔''

فیروز نے آٹھ سالہ بچے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''یہ میرا بھائی باسط ہے۔''

میں اسے پیار کرنے کے لیے آگے بڑھا مگر وہ بھاگ کر اپنی ماں کے پیچھے چھپ گیا۔ اس کی ماں نے کہا۔

''بیٹا! اپنے دوست کو اس کا کمرا دکھاؤ۔ میں تب تک نسیم سے کہہ کر کھانے کا بندوبست کر دیتی ہوں۔'' میں فیروز کے والد کو سلام کر کے فیروز کے ساتھ اوپری منزل کی طرف چل پڑا۔ وہاں بھی کئی کمرے تھے۔ ان میں سے ایک کمرا کھول کر فیروز نے میرا سامان وہاں رکھا اور کہا۔

''تم تازہ دم ہو جاؤ۔ میں ابھی آتا ہوں۔'' میں منہ ہاتھ دھو کر پلنگ کے سامنے لگے بڑے سے آئینے میں اپنا عکس دیکھ رہا تھا اور نیچے ہونے والے ایک انوکھے واقعے کے بارے میں بھی سوچنے لگا...... وہ یہ کہ جب میں اور فیروز فانوس کے نیچے کھڑے تھے تو میرا اور اس کا سایہ تو بن رہا تھا مگر اس کے والدین اور بھائی کا سایہ بالکل بھی نہیں تھا۔ میں اسے اپنا وہم سمجھ رہا تھا کہ اتنے میں شیشے میں سے نظر آیا کہ کسی نے کمرے کا دروازہ کھولا ہے اور پھر بند کیا ہے مگر کوئی اندر نہیں آیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو حیرت کا جھٹکا لگا کیونکہ میرے پیچھے باسط کھڑا عجیب انداز میں مسکرا رہا تھا۔

میں نے پھر شیشے میں دیکھا تو وہاں صرف میرا عکس تھا۔ باسط کا نام و نشان تک نہ تھا۔ یہ دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔ اتنے میں فیروز کمرے میں داخل ہوا اور بولا۔

''چلو، کھانا لگ گیا ہے۔ نیچے چلتے ہیں۔ نسیم آنٹی نے کھانا لگا دیا ہے۔''

اتنے میں باسط مسکراتا ہوا باہر نکل گیا اور میں بھی لڑکھڑاتا ہوا فیروز کے ساتھ نیچے آ گیا جہاں میز پر اس کے والدین کھانے کے لیے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ فیروز کی والدہ نے سب کو کھانا پیش کیا۔

کھانے کے دوران میں نے اپنے آنے کی وجہ بتائی اور یہ بھی کہ میں صبح چلا جاؤں گا۔ فیروز نے رکنے کے لیے اصرار کیا مگر میں صرف مسکرا کر رہ گیا۔ کھانا بہت لذیذ تھا۔ ایسا کھانا پہلے کبھی نہیں کھایا تھا۔ کھانے کے دوران میں نے یہ دیکھا کہ میرے اور فیروز کے علاوہ کوئی اور کھانا نہیں کھا رہا تھا۔ باقی لوگ کھانے کو منہ تک لے کر جاتے مگر منہ میں ڈالنے کے بجائے واپس پلیٹ میں ڈال دیتے۔

میں اپنا کھانا کھا کر اوپر چلا گیا جہاں کافی دیر فیروز سے باتیں کرتا رہا۔ آخر وہ بھی چلا گیا اور کچھ دیر بعد میں بھی سو گیا۔ رات کے تیسرے پہر مجھے سردی محسوس ہوئی۔ میں نے اٹھ کر دیکھا تو کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ میں ابھی اسے بند کرنے کے لیے اٹھنے ہی لگا تھا کہ کمرے کے باہر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں فوراً بستر پر آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ اچانک دروازہ کھلا اور باسط اندر آیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے والدین بھی اندر آ گئے۔ باسط میرے قریب آیا

انسان

انسان عجیب مخلوق ہے۔ خود تماشا ہے اور خود ہی تماشائی۔ انسان خود میلا لگاتا ہے اور خود ہی میلا دیکھنے نکلتا ہے۔ ہجوم میں ہر انسان ہجوم کا حصہ ہے اور ہر انسان اپنے علاوہ انسانوں کو ہجوم کہتا ہے۔ تنہائیاں اکٹھی ہو جائیں تو میلے بن جاتے ہیں۔ ننھے چراغ مل کر چراغاں بن جاتے ہیں۔

(واصف علی واصف)

رحمت کا سایہ

جب آپ کے ماں باپ بڑھاپے کی طرف مائل ہوں تو ان سے اپنی طاقت اور ہاتھ علیحدہ نہ کرنا، ان کے لیے رحمت کا سایہ بنے رہنا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہر چیز حاصل ہو جائے لیکن یہ حسرت رہ جائے کہ ان کی خدمت نہیں کی۔ پھر اس کا مداوا نہیں ہوگا۔

(واصف علی واصف)

(مرسلہ: وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ)

TAGPK.COM

اور میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کے ہاتھ برف سے بھی زیادہ ٹھنڈے معلوم ہو رہے تھے مگر میں ضبط کیے لیٹا رہا پھر اس کی والدہ آگے بڑھیں اور اپنے ہاتھ سے کوئی چیز میرے سرہانے رکھ دی اور میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور مسکرانے لگیں۔

مجھے لگا جیسے انہیں معلوم ہو گیا ہے کہ میں درحقیقت جاگ رہا ہوں پھر فیروز کے والد نے کھڑکی سے باہر دیکھا اور وہ لوگ آپس میں کانا پھوسی کرنے کے بعد کمرے سے نکل گئے۔ ان کے زرد چہرے اور پتھرائی ہوئی آنکھیں اور ٹھنڈے جسم مجھ پر خوف اور دہشت طاری کر چکے تھے۔ مجھ سے اتنا بھی نہ ہوا کہ میں کھڑکی بند کر سکوں۔ میں وہیں لیٹے لیٹے سو گیا۔ صبح ساڑھے نو بجے کے قریب میری آنکھ کھلی۔ میں رات کے واقعے کو خواب سمجھتے ہوئے نہانے چلا گیا۔

جب میں باہر آیا تو فیروز بستر پر میرا ناشتا لیے بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ بولا۔ ''میں پہلے بھی دو دفعہ آیا تھا مگر تم سو رہے تھے اس لیے میں نے جگایا نہیں۔ امی نے نسیم آنٹی سے ناشتا بنوا دیا تھا، کھالو۔''

میں چپ چاپ ناشتا کرنے لگا۔ اچانک میری نظر سرہانے پڑے لکڑی کے چھوٹے سے خوبصورت ڈبے پر پڑی جو رات کو اس کے والدین رکھ گئے تھے۔ میں نے جھجکتے ہوئے اسے اٹھالیا۔

فیروز بولا۔ ''والدہ نے یہ تمہارے لیے تحفہ دیا تھا۔ امید ہے تمہیں پسند آئے گا۔'' اس کے بعد میں نے گفتگو کا موضوع بدلا اور ہم دیر تک پرانی یادیں تازہ کرتے رہے۔ ساڑھے دس بجے کے قریب میں نے گفتگو ختم کی اور اپنا سامان درست کیا۔ فیروز نے میرے رکنے پر اصرار کیا مگر میں نے اسے اپنے ہاں آنے کی دعوت دی اور دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے اس کی تسلی کروائی۔ اس کے بعد میں اور فیروز نیچے آئے۔

میں نے اس سے کہا۔ ''یار! امی، ابو اور چھوٹے کو بلا لو تاکہ ان سے مل کر میں روانہ ہو جاؤں۔''

فیروز بولا۔ ''وہ تو صرف رات کو ہی آئیں گے۔'' پھر وہ ہوا میں گھورنے لگا۔ میں فوراً حویلی سے باہر نکل آیا۔ فیروز نے اسٹیشن تک ساتھ چلنے کی ضد کی مگر میں نے اسے آرام کرنے کا کہا اور اکیلا ہی اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔

اسٹیشن پہنچا تو اسٹیشن ماسٹر حقہ پیتے ہوئے بولا۔ ''جناب! میں ابھی گارڈ کو بھیجنے ہی والا تھا کہ وہ آپ کو لے آئے کیونکہ ٹرین آنے ہی والی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''شکریہ! مگر میں خود ہی آ گیا ہوں۔''

گارڈ نے پوچھا۔ ''جناب! فیروز صاحب اب کیسے ہیں؟''

میں نے حیرانی سے پوچھا۔ ''کیوں، انہیں کیا ہونا ہے؟ وہ تو بالکل ٹھیک ہیں اور اپنے گھر والوں کے ساتھ خوش ہیں۔ ویسے اس کے والدین کافی خوش اخلاق اور ملنسار ہیں۔''

میری بات سن کر دونوں مجھے ایسے گھورنے لگے جیسے میں پاگل ہوں۔ اسٹیشن ماسٹر حقہ چھوڑ کر میرے قریب آ گیا۔ اتنے میں ٹرین بھی اسٹیشن کی طرف آنے لگی۔ اس نے میرے قریب آ کر کہا۔

''کیا کہا آپ نے..... اس کے والدین ملے تھے آپ سے؟''

میں نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''ہاں، انہوں نے میری بہت اچھی میزبانی کی اور بہت شفقت سے پیش آئے۔''

گارڈ بھی یہ سب سن رہا تھا اور آہستہ آہستہ کانپ بھی رہا تھا۔ ٹرین اسٹیشن پر رک چکی تھی اور اس کا کنڈیکٹر میرا سامان اٹھا کر ڈبے میں لے گیا۔ میں بھی آہستہ آہستہ چلنے لگا۔

اسٹیشن ماسٹر نے میرے ڈبے پر سوار ہوتے ہی کہا۔ ''جناب! شاید آپ کو معلوم نہیں ہے کہ چودھری اجمل، ان کی بیوی اور چھوٹے بیٹے باسط کا آج سے سات ماہ پہلے انتقال ہو چکا ہے۔ ان سب کو چیچک کا مرض لگ گیا تھا۔ اس وقت فیروز صاحب پڑھائی مکمل کر رہے تھے۔ انہوں نے فیروز کو بلوانے کی بہت کوشش کی مگر ان سے رابطہ نہ ہو پایا۔ فیروز صاحب ان کے انتقال کے چند دنوں بعد ہی اپنی پڑھائی مکمل کر کے واپس لوٹ آئے تھے۔ تب سے انہوں نے خود کو گھر میں بند کر لیا ہے۔ رات کے وقت تو کوئی بھی ان کے گھر نہیں جاتا کیونکہ عجیب و غریب باتیں گردش کرتی ہیں۔ جیسے آپ.....''

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا مگر انجن نے سیٹی بجائی اور ٹرین آہستہ آہستہ چل پڑی۔ میں اس حال میں تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ میں نے وہ ڈبا کھولا جو اس کی والدہ نے دیا تھا۔ اس میں ایک خوبصورت گھڑی تھی۔ جی چاہا کہ اسے باہر پھینک دوں مگر کسی انجانے احساس نے ایسا کرنے سے روک دیا۔

آج بھی جب میں اس گھڑی کو دیکھتا ہوں تو خوف کی لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ جاتی ہے کہ آخر وہ پراسرار میزبان تھے کون؟

⌘⌘⌘

پردیس جانے والوں کی دائمی جدائیوں کی پُرسوز روداد

زندہ رہنے کے لیے صرف سانس کی ہی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ اس زندگی کی گاڑی کو دھکیلنے کے لیے دیگر لوازمات کی بھی ضرورت ہوتی ہے خاص طور پر... کوئی ایسا مقصد جو سانس کی ڈوری کو برقرار رکھنا ضروری بنادے۔ بنا کسی مقصد کے وہ لوگ بھی جیتے جی مرگئے تھے... پھر کسی کی قربانیوں نے ان کے مردہ دلوں میں زندگی کی روح پھونک دی۔

زندہ لوگ

ڈاکٹر شیر شاہ سیّد

اٹلی کے چھوٹے سے شہر کے قبرستان میں بائیس تابوت ایک ساتھ رکھے ہوئے تھے۔ 17 تابوتوں کے اوپر لکھا ہوا تھا کہ نامعلوم جبکہ دو تابوت پاکستانیوں کے تھے، تین دوسرے تابوتوں میں تین عراقیوں کی لاشیں تھیں۔

نامعلوم اور غیر شناخت شدہ لاشوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ شاید ان میں سے کچھ کا تعلق عراق یا فلسطین سے ہو اور کچھ پاکستانی لگتے تھے۔

میں اٹلی کے شہر روم میں واقع انسانی حقوق سے

متعلق ایک تنظیم کا ملازم تھا۔ آپریشن اومیگا نام کی یہ تنظیم دنیا بھر میں انسانی حقوق کے حوالے سے ان کے حقوق کی پاسداری کے لیے کام کرتی ہے۔ یہ تنظیم ایک ایسی مالدار بیوہ نے بنائی تھی جس کا شوہر افریقا میں قتل کر دیا گیا تھا۔ وہ افریقا میں کافی کے کاشت کاروں کو حقوق دلانے کے لیے جدوجہد کر رہا تھا۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ افریقا میں کافی کے کاشت کاروں کو مقامی اور بین الاقوامی کمپنیوں کے گٹھ جوڑ سے نقصان پہنچایا جا رہا ہے۔ بین الاقوامی منڈی میں کافی بہت مہنگی بیچی جاتی ہے جبکہ مقامی کاشت کاروں کو اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں ملتا ہے۔ پھر افریقا میں ہی اسے مار دیا گیا تھا کیونکہ اس کی چلائی ہوئی مہم سے کاشت کار منظم ہو کر کافی کی کمپنیوں کے خلاف متحرک ہونے لگے تھے۔ اس کے قتل کے بعد مہم تیزی سے دبا دی گئی تھی۔ اس کے قتل کا مقصد ہی یہی تھا۔ وہ لوگ کامیاب ہو گئے تھے جو کاشت کاروں کی کامیابی نہیں چاہتے تھے۔ اس کے مرنے کے بعد اس کی بیوی نے اس کی دولت سے اس کی یاد میں ایک ایسی تنظیم بنائی جو خاص طور پر غیر قانونی تارکین وطن کے حقوق اور ان کی فلاح کے لیے مصروفِ عمل تھی۔ شروع میں میرا تقرر لندن میں ہوا تھا جہاں دو سال کام کرنے کے بعد مجھے روم بھیج دیا گیا تھا۔

اٹلی میں میری ذمے داریوں میں ایک ذمے داری یہ بھی تھی کہ یورپ میں داخل ہونے والے وہ غیر یورپی جو غیر قانونی طور پر یورپ میں داخل ہونے کی صورت میں موت کا شکار ہو جاتے ہیں یا پولیس کے ہاتھوں پکڑے جاتے ہیں یا شدید بیماری کی صورت میں اسپتالوں میں داخل ہوتے ہیں، ان کے مسائل کو سمجھ کر انہیں مدد فراہم کرنے کا انتظام کروں۔ میں اس کام میں کافی مصروف رہتا تھا۔ غریب ملکوں کے بے شمار لوگ ہر تھوڑے دنوں کے بعد کسی نہ کسی طرح سے بُرے سے بُرے حالات میں پہنچتے تھے جن کے لیے تنظیم کی طرف سے بہت کچھ کرنا پڑتا تھا۔ یہ سلسلہ بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ ایشیا اور افریقا کے ملکوں میں غیر قانونی آنے والوں کی تعداد بڑھتی چلی جا رہی تھی اور میرا کام بھی بڑھ رہا تھا۔ اس کام میں اٹلی کی حکومت کا محکمۂ داخلہ تعاون کرتا تھا۔ وہاں کے افسران سے میری کافی دوستی ہو گئی تھی۔ گو کہ مجھے آئے ہوئے صرف چھ ماہ ہوئے تھے لیکن کام کے ساتھ ساتھ اٹلی بھی مجھے اچھا لگنے لگا تھا۔

اٹلی کے لوگ ہنسنے بولنے والے لوگ ہیں جو بڑے ذوق و شوق کے ساتھ پیزا کھاتے ہیں اور نئے نئے طریقوں سے پیزا بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہاں کی زندگی بھی ٹھنڈے اور گرم پیزے کی طرح ہے۔ گرم پیزا ہر ایک کو اچھا لگتا ہے۔ ٹھنڈا پیزا سب ہی لوگ ٹھکرا دیتے ہیں۔ جس طرح پیزا آسانی سے بن جاتا ہے اور آسانی سے ختم بھی ہو جاتا ہے۔ اسی طرح سے اٹلی میں زندگی بھی آسانی سے شروع ہوتی ہے اور آسانی سے ختم بھی ہو جاتی ہے۔ ہنسنا بولنا، ناچنا گانا، پینا پلانا اور کام کے وقت کام کرتے ہوئے موت آجائے تو مر جانا۔ مجھے تو ایسا ہی لگتا تھا۔ جیسے جیسے میری دوستی اٹلی کے لوگوں سے ہوتی گئی، ویسے ویسے یہ لوگ مجھے سمجھ میں آتے چلے گئے۔ یہ لوگ کئی پرتوں میں رہتے ہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے پیزا کی مختلف پرتیں ہوتی ہیں۔

ہر طرح کا اطالوی اندر سے اپنی تاریخ پر بڑا گھمنڈی ہوتا ہے۔ میں سوچتا تھا کہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے قبل ایک عظیم الشان تہذیب و ثقافت اور حکومت کے ساتھ اگر یہ گھمنڈی ہیں تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔ زندہ رہنے کے لیے جہاں آکسیجن کی ضرورت ہوتی ہے، وہاں تاریخ کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ جن قوموں کی تاریخ ہوتی ہے اور انہیں اپنی تاریخ کا پتا بھی ہوتا ہے، ان قوموں کا انداز بھی مختلف ہوتا ہے۔ تاریخ اچھی ہو یا بُری۔ قوموں کے لیے وہ آکسیجن کی ہی طرح ہوتی ہے۔ وہ اچھے دنوں کو یاد کر کے زندہ رہنے کی کوشش کرتے ہیں یا بُرے دنوں کی تاویلوں کی بنیاد پر جیتے ہیں یا تاریخ سے سبق سیکھ کر اپنی نئی تاریخ بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

اٹلی کی حکومت کے اہلکار اپنا کام کر چکے تھے۔ تمام لاشوں کی تصاویر لی جا چکی تھیں۔ ان کے ڈی این اے کے نمونے حاصل کر کے پانچ پانچ علیحدہ شیشیوں میں ڈال کر علیحدہ علیحدہ ڈبوں میں بند کر دیا گیا تھا۔ 17 لاشیں، جن کی کوئی شناخت نہیں ہو سکتی تھی، ان کو دفنانے کے لیے مجھے ہی انتظامات کرنا تھے۔ اس کام کے لیے اسی شہر کی ایک کمپنی سے ہم لوگوں کا معاہدہ تھا۔ میں نے انہیں فون پر بتا دیا تھا کہ 17 لاشوں کو دفن کرنا ہے جس کے لیے انہوں نے انتظامات شروع کر دیے تھے۔ ان کی گاڑیاں آنے والی تھیں۔ لاشوں کو مردہ خانے میں کچھ دن کے لیے محفوظ رکھا جانا تھا اور تمام تر قانونی کارروائیوں کے بعد انہیں دفن کرنا تھا۔

تین عراقیوں کی شناخت تو ان کے جسم سے بندھے ہوئے تین پاسپورٹوں سے ہوئی۔ اسی طرح سے ایک

پاکستانی کی لاش کے ساتھ بھی پلاسٹک کی تین تھیلیوں کی پرتوں کے اندر اس کا پاسپورٹ محفوظ تھا۔ اس کا تعلق پنجاب کے سرائیکی علاقے سے تھا۔ میں نے لاشوں کو روم شہر کے ایک برف خانے بھجوادیا جہاں لاشوں کو دیر تک محفوظ رکھنے کے انتظامات تھے۔ اس امید کے ساتھ کہ اگلے کچھ دنوں میں ان کے عزیز و اقارب کا پتا لگ جائے گا تو آگے کا سوچا جائے گا۔

ابرائو کے ساحلی شہر سے میں واپس روم شام تک پہنچ سکا تھا۔ دوسرے دن روم میں پاکستان کے سفارت خانے جاکر کوشش کرنا تھی کہ ان پاکستانیوں کے عزیز و اقارب کا پتا لگے۔

اس طرح کے واقعات اب عام ہوگئے تھے۔ ہر تھوڑے دنوں کے بعد مجھے یہی سب کچھ کرنا پڑتا تھا۔ نوجوان لوگوں کی لاشیں، ان کے جوان چہرے بھربھرے بالوں والے سر، ہونٹوں کے اوپر ہلکی ہلکی مونچھوں والے نوجوان جو اپنی زندگی بنانے کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار تھے اور نہ جانے کیسے کیسے، کہاں کہاں سے ہوتے ہوئے دھکے کھاتے ہوئے اپنی امنگوں، اپنے خوابوں اور اپنے گھر والوں کے دکھوں کے ساتھ یورپ کے سمندروں کا شکار ہوجاتے تھے۔ میں ان لاشوں کے چہروں کو غور سے دیکھتا۔ یہ کبھی ہنستے ہوں گے، زور سے قہقہہ لگاتے ہوں گے، ان کی آنکھوں میں چمک ہوتی ہوگی، ان کے ہونٹوں نے اپنی ماؤں بہنوں کے ماتھوں کو چوما ہوگا۔ کسی محبوبہ کے خواب دیکھے ہوں گے اور ان سے بچھڑتے وقت اپنی نم آنکھوں کو چھپاتے ہوئے دوبارہ ملنے کا وعدہ کیا ہوگا۔ وہ خواب، وہ ہنسی، وہ قہقہہ، وہ بوسہ سب کچھ سمندروں کی بے درد نمک زدہ لہروں کی نذر ہوجاتا ہے۔

پاکستان میں ایک مافیا کام کررہی تھی۔ شہروں اور دیہاتوں کے لوگ ان نام نہاد کارندوں کو لاکھوں روپوں کی صورت میں رقم دیتے تھے۔ ان کے پاسپورٹوں پر ایران و عراق کے زیارت کے ویزے لگائے جاتے پھر انہیں بلوچستان کے راستے ایران لے جایا جاتا، کبھی عراق اور کبھی شام جہاں سے انہیں چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں سوار کیا جاتا یا جہازوں کے کنٹینروں میں مویشیوں سے بھی بدتر صورتوں میں بند کردیا جاتا۔ کبھی انہیں ایران کے راستے ترکی کی سرحدوں پر لاکر ترکی میں دھکیل دیا جاتا جہاں سے وہ مختلف سمندری اور خشکی کے راستوں سے یورپ کے مختلف ملکوں میں گھسنے کی کوشش کرتے اور نہ جانے کتنے ان ہی راستوں پر جان دے دیتے تھے۔

ہر تھوڑے دنوں کے بعد عجیب عجیب باتیں علم میں آتی تھیں۔ ایک دفعہ لاش ٹرک کے پیٹرول کی ٹنکی سے ملی جسے تقسیم کرکے ایک حصے میں انسانوں کو اسمگل کیا جاتا تھا۔ کسی لاری کے خفیہ خانے میں تابوت بنا کر لیٹے ہوئے آدمی کی جان چلی گئی۔ ریل کی مال گاڑی میں سفر کرتے ہوئے سردی سے جان کھو بیٹھے۔ میں ان چہروں، ان لاشوں، ان جسموں، ان جوان لوگوں کے مردہ خوابوں کو دیکھ کر محسوس کرکے پریشان ہوجاتا تھا مگر میرے بس میں کچھ بھی نہیں تھا۔ جن لوگوں کے بس میں تھا وہ اسلام آباد، لاہور اور کراچی کے عظیم الشان محلوں میں بیٹھ کر اپنی اور اپنے بچوں، اپنے خاندانوں، اپنے دوستوں کی شاندار زندگی کو سنوارنے، گزارنے میں لگے ہوئے تھے۔ میرا دل خون کے آنسو روتا تھا۔ میرے بس میں یہی تھا۔ اس کے علاوہ میں کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔

دوسرے دن پاکستان ایمبیسی میں بیٹھ کر میں نے بہاولپور اور خان پور کے درمیان ایک چھوٹے سے شہر کے لوگوں کے مختلف فون نمبرز حاصل کیے تاکہ ان مرنے والوں کے وارثوں کا سراغ مل سکے۔ مجھے فون پر امتیاز احمد کے نام کے ایک شخص نے بتایا کہ وہ اس گاؤں سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔ انہیں جب میں نے تفصیلات بتائیں تو وہ مدد کرنے کے لیے آمادہ ہوگئے۔ انہوں نے مجھے چھ گھنٹے کے بعد فون کرنے کے لیے کہا تھا۔

پاسپورٹ کی تفصیلات کے مطابق مرنے والوں میں سے ایک کا نام محمد رفیق ولد محمد سعید تھا۔ اس کا گاؤں امتیاز صاحب کے گھر سے قریب تھا۔ میں نے امتیاز صاحب سے درخواست کی کہ اگر ممکن ہوسکے تو وہ کسی کو اس کے گاؤں بھیج دیں یا خود چلے جائیں اور گھر والوں کو اس اندوہناک واقعے کی خبر کریں یا میری ان سے بات کرادیں تاکہ میں خود انہیں اس بارے میں بتاؤں۔ چار گھنٹے کے بعد امتیاز صاحب کا ایس ایم ایس آگیا کہ میں انہیں فون کروں۔ وہ اس وقت اس گاؤں میں ہی تھے۔ وہ محمد رفیق کے گھر والوں سے مل کر فون کا انتظار کررہے تھے۔

میں نے انہیں فوراً ہی فون کیا۔ انہوں نے بتایا کہ انہوں نے محمد رفیق کے خاندان کو تلاش کرلیا ہے جو بہت ہی خراب حالات میں ہیں۔ اتنے خراب حالات میں ہیں کہ انہیں اس بات کی ہمت ہی نہیں ہوئی کہ وہ انہیں بتاسکیں کہ ان کے بیٹے کی موت سمندر میں ڈوب

جانے سے ہو چکی ہے۔

میں نے انہیں آمادہ کیا کہ وہ ان کے پاس جائیں اور اپنے فون پر میری ان سے بات کرادیں یا ممکن ہو سکے تو ان کے گاؤں کے کسی آدمی کا فون نمبر لے لیں تو میں خود انہیں فون کرلوں گا۔ امتیاز صاحب نے کہا کہ وہ تھوڑی دیر میں مجھے بتاتے ہیں۔

چالیس منٹ کے بعد ان کے ایس ایم ایس کے بعد میں نے انہیں فون کیا۔ انہوں نے مجھے مرنے والے کے ماموں کا فون نمبر دیا تھا۔

اسی عرصے میں مجھے میرے آفس سے میرے ساتھ کام کرنے والی ایولن لونارا کا فون آگیا کہ عراقی خاندان کا پتا نہیں چل پا رہا ہے اور روم میں رہنے والے مقامی عراقیوں کے سرگرم افراد کو ساری لاشوں کی تفصیلات دے دی گئی ہیں۔ اگر ایک ہفتے میں کچھ نہیں پتا لگا تو مقامی عراقیوں کا خیال ہے کہ انہیں مقامی طور پر ہی دفن کر دیا جائے۔

پاکستان میں شام کے وقت میں نے مرنے والے کے ماموں کو فون کر کے بتایا کہ محمد رفیق کی لاش سمندر سے ملی ہے۔ اس کے ساتھ کچھ اور پاکستانیوں کی لاشیں بھی ہیں۔

عام طور پر پاکستانیوں کی لاشیں روم میں رہنے والے مقامی پاکستانیوں کے تعاون سے اگر ممکن ہو تو پاکستان بھیجی جاتی ہیں یا دفن کر دی جاتی ہیں۔ محمد رفیق کا ماموں یہ خبر سن کر فون پر رونے لگا تھا۔ ہچکیوں کے درمیان اس نے بتایا تھا کہ وہ بہت پریشان تھا۔ اس کے خاندان پر بڑا قرضہ تھا اور وہ بچہ اس قرضے کو ہر صورت اتارنا چاہتا تھا۔ ایجنٹ نے پانچ لاکھ روپے لیے تھے اور یہ وعدہ کیا تھا کہ اسے لے کر جائیں گے اور نوکری بھی دلائیں گے مگر سارے وعدے غلط ثابت ہوئے اور سارا کاروبار دھوکے کے سوا کچھ نہ تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ میں انہیں دوسرے دن دوبارہ فون کروں گا۔

شام ہو چلی تھی اور پاکستانی کمیونٹی کے کچھ لوگ آپریشن اومیگا کے آفس پہنچ چکے تھے۔ میں نے انہیں بتایا کہ بائیس لاشوں میں چودہ لاشیں پاکستانیوں کی لگتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ سارے کے سارے ایک ہی علاقے کے رہنے والے تھے۔ طویل بحث و مباحثے کے بعد یہ طے ہوا کہ اتنی ساری لاشوں کو پاکستان بھیجنے کا خرچہ بہت ہوگا۔ اگر کوئی شخص پاکستان سے آکر لاشوں کو شناخت کرے تو اس کے بعد کمیونٹی اسے دفن کرنے کا انتظام کر دے گی اور اگر کوئی نہیں آنا چاہتا تو کمیونٹی پھر بھی انہیں دفن کرنے کو تیار ہے۔ پاکستانی کمیونٹی کے لوگ پاکستان سے آنے والے کے کرائے کا بھی بندوبست کرنے کو تیار تھے۔

دوسرے دن میں نے پھر محمد رفیق کے ماموں کو فون کیا۔ انہوں نے بتایا کہ رفیق کے ساتھ اس علاقے کے نو اور خاندانوں نے بھی اپنے بیٹوں کے لیے پیسے جمع کرائے تھے اور ان لوگوں کی بھی کوئی خبر نہیں ہے۔ پورے گاؤں میں ایک کہرام مچ گیا ہے۔ لوگوں کا رو رو کر برا حال ہے۔ رفیق کی ماں سینہ کوٹ کوٹ کر بیٹے کا ماتم کر رہی ہے۔ اس کا جوان بیٹا اپنی امنگوں اور اپنی ماں کے خوابوں کے ساتھ کھو گیا تھا۔

میں افسوس کے علاوہ کیا کر سکتا تھا۔ یہ کیسا ملک ہے ہمارا۔ کیسے لوگ ہیں ہم۔ ہمارے پاس ایٹم بم ہے مگر اپنے بچوں کے لیے تعلیم نہیں ہے۔ ہم اربوں روپے اسلحہ جات پر خرچ کر دیتے ہیں لیکن اپنے کسانوں کے بچوں کو روزگار نہیں دے سکتے۔ ہم لوگ موٹروے، بائی پاس، انڈر پاس اور نہ جانے کیا کیا بنانے میں کروڑہا کروڑ خرچ کر رہے ہیں لیکن ان نوجوانوں کو سمندر میں غرق ہونے سے نہیں بچا سکتے جو اپنی ماؤں کو چھوڑ کر اپنے بھائی، بہنوں، خاندانوں، دوستوں، یاروں سے دور دیس جا کر جانیں دے رہے ہیں۔ جتنا میں سوچتا تھا، اتنا ہی مجھے غصہ آتا تھا۔

میں نے محمد رفیق کے ماموں کو بتایا کہ اگر وہ چاہیں تو کسی کو بھیجنے کے بارے میں سوچیں تو میں یہاں سے ویزے کا انتظام کر دوں گا اور یہاں رہنے والے پاکستانی لوگ ٹکٹ کا انتظام کر دیں گے۔ اس طرح سے لاشوں کی شناخت ہو جائے گی۔

اگلے دن ان سے دوبارہ بات ہوئی اور انہوں نے بتایا کہ محمد رفیق کے بڑے بھائی کو بھیجنے کو تیار ہیں جو علاقے کے ان نوجوانوں کو جانتا بھی تھا۔ وہ بھی آنے کا خواہش مند تھا مگر رقم کا بندوبست نہ ہونے کی بنا پر چھوٹا بھائی زندگی بدلنے کے لیے نکل کھڑا ہوا تھا۔

میں نے کہا کہ اس کا پاسپورٹ بنوائیں اور تفصیلات مجھے بھیجیں اور ساتھ ہی میں نے پاکستانی کمیونٹی کو اس بارے میں اطلاعات فراہم کر دی تھیں۔ لاشوں کو مردہ خانوں میں ہی رکھے رہنے دیا گیا۔ عراقیوں کے لیے فیصلہ کیا گیا کہ عراق میں صورتِ حال اتنی خراب ہے کہ وہاں سے کسی بھی قسم کا رابطہ ممکن ہی نہیں ہو رہا ہے۔

یہی فیصلہ ہوا کہ لاشوں کی تصاویر لے کر لاشوں کو مقامی قبرستان میں دفن کر دیا جائے۔

بیس دن کے اندر ہی اٹلی میں ہی محمد رفیق کے بھائی کا ٹکٹ خریدا گیا اور اس کے آنے کے تمام انتظامات کرا دیے گئے تھے۔ آپریشن اومیگا کے ذریعے اس کے ویزے کا انتظام بھی ہو گیا تھا۔ میں ہی اسے ائرپورٹ لینے گیا۔ اسے ائرپورٹ پر پہچاننے میں مجھے کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ اس نے شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی اور ایک لمبا سا کالا کوٹ سردی سے بچاؤ کے لیے پہنا ہوا تھا جو شاید بہاولپور یا ملتان کے پرانے کپڑوں کی دکان سے لیا گیا ہوگا۔

وہ میرے گلے لگتے ہی رو دیا۔ یہ میری اس سے پہلی ملاقات تھی لیکن بھائی کے مرنے کا غم اس کی آنکھوں سے سیلاب کی صورت بہہ رہا تھا۔ میں اسے اپنی گاڑی میں بٹھا کر اپنے آفس لایا۔ اس کے رہنے کا انتظام ایک پاکستانی کے گھر پر کیا گیا تھا۔ آپریشن اومیگا اس کے ہوٹل کا خرچ برداشت کرنے کو تیار تھی مگر پاکستانیوں کا خیال تھا کہ وہ کسی کے ساتھ رہے تو بہتر ہے۔ گاؤں کا آدمی ہوٹل میں نہیں رہ سکے گا۔ کہاں ملتان کا ایک گاؤں اور کہاں اٹلی کا ایک ہوٹل۔ مناسب یہی تھا کہ وہ کسی پاکستانی خاندان کے ساتھ رہے۔ میرا بھی یہی خیال تھا۔

وہ میرے آفس میں بھی مسلسل روتا رہا۔ سرخ آنکھوں سے مسلسل آنسو بہتے رہے تھے اور وہ بے آواز رو رہا تھا۔ میں بڑی دیر تک اس سے باتیں کرتا رہا۔

اس نے بتایا کہ وہ سب نو بھائی بہن ہیں۔ دو بہنوں کا انتقال ہو چکا ہے۔ رفیق اور وہ دو بھائی تھے اور باقی پانچ بہنیں جن میں کسی کی بھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ ان کا باپ گاؤں کے ایک جھگڑے میں قتل کر دیا گیا تھا۔ اس کی ماں اور وہ سب لوگ مقامی زمیندار کی زمینوں پر کام کرتے تھے اور بال بال اسی کے قرضوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ رفیق گاؤں سے بھاگ کر لاہور بھی گیا تاکہ وہاں کام کر کے قرضہ بھی اتارے اور بہنوں کے ہاتھ بھی پیلے کرے۔ لاہور میں تو کچھ نہیں ہوا مگر وہ لاہور میں کسی ایجنٹ کے ہتھے چڑھ گیا جس نے اس سے کہا تھا کہ اگر وہ آٹھ بندوں کا انتظام کر لے تو وہ اس سے آدھے پیسے لے کر یورپ بھیج دیں گے۔ محمد رفیق اور اس نے مل کر علاقے میں سارے بندے جمع کر لیے تھے۔ ان سب نے مل کر یورپ آنے کا منصوبہ بنایا تھا۔

''کچھ لڑکوں کے خاندانوں نے منع بھی کیا مگر ان سب کے ذہنوں پر یورپ، نوکری، پیسا، اچھی زندگی، بہنوں کی شادی، زمیندار کا قرضہ اور آزادی سوار تھی۔ ان سب کا خیال تھا کہ وہ قرض لے کر بھی جائیں گے تو اتنا کما لیں گے کہ آسانی سے قرض اتر جائے گا۔ لاہور کے ایجنٹ نے انہیں ایسے ہی خواب دکھائے تھے۔ ایک ایسا یورپ جہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہہ رہی تھیں۔ جہاں کی حسینائیں ان کے انتظار میں بیٹھی تھیں۔ بس صرف ان کے پہنچنے کی دیر تھی۔ نوکری بھی مل جاتی اور زندگی کے سارے آرام بھی۔ ایسی جنت میں کون نہیں جانا چاہتا۔ وہ سب تیار ہو گئے تھے اس جنت کو خریدنے کے لیے۔'' وہ آہستہ سے بولا پھر خاموش ہو گیا۔ میں اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ سب کچھ تھا اس کے چہرے پر۔ بے چارگی، غم، غصہ اور مایوسی۔ ایسا تو میں روز ہی دیکھتا تھا مگر اس مایوسی کو دیکھ کر مجھے اندر سے رونا آ گیا۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

''قرض تو نہیں اترا مگر سب کی جان چلی گئی۔'' مجھے اس کی آواز آئی۔ ''ہمارا علاقہ جیسے ویران ہو گیا ہے۔ ایک ساتھ اتنے لوگ پہلی دفعہ مرے ہیں، وہ بھی گھر سے دور سمندر میں ڈوب گئے۔ ایسا کس نے سوچا تھا۔'' اس نے کہا۔ ''میں اور میرے ماموں لاہور گئے تھے کہ اس ایجنٹ سے پتا کریں کہ اصل میں ہوا کیا ہے مگر نہ وہاں کوئی آفس تھا نہ ایجنٹ ملا اور نہ ہی کوئی نشان۔ پتا نہیں اس نے کیا کیا۔ نہ پولیس کو پتا تھا نہ سرکاری افسروں کو، نہ ہمارے علاقے کے سیاست دان آگاہ تھے۔ کسی کو کچھ پتا نہیں تھا مگر سب شامل ہیں صاحب، سب شامل ہیں اس کام میں۔ سب پیسا کھاتے ہیں، سب کا حصہ ہے۔ ہمارے جیسے لوگ اگر مر بھی جائیں تو کچھ فرق نہیں پڑتا۔ ان کے پیٹ بھرتے رہنے چاہئیں۔ ان کے پیٹ بھر رہے ہیں۔''

دوسرے دن ہمارے ساتھ وہ مردہ خانے گیا اور اپنے علاقے کی نو لاشوں کو شناخت کر لیا تھا۔ ان نو لاشوں کی تصاویر اس کے حوالے کر دی گئیں اور یہی فیصلہ ہوا کہ سارے پاکستانیوں کو اٹلی میں ہی دفن کر دیا جائے۔

جمعے کو ان سب کی نمازِ جنازہ مقامی مسجد میں پڑھی گئی اور ایک مقامی قبرستان میں مسلمانوں کی جگہ پر ان سب کو دفن کر دیا گیا۔ یہ پہلی دفعہ ہوا تھا کہ نو پاکستانیوں کو اس طرح سے دفن کیا گیا۔ مقامی اخباروں میں چھوٹی سی خبر تھی۔

TAGPK.COM

پاکستان کے حالات کے بارے میں سچی جھوٹی کہانیاں تھیں۔ نہ جانے کتنے دنوں تک میرا دل بوجھل بوجھل سا رہا۔ ہنستا تھا تو ایسا لگتا تھا جیسے کوئی جرم کر رہا ہوں۔

دس دن کے بعد مجھے پتا چلا کہ محمد رفیق کا بھائی محمد نصیب پاکستان واپس نہیں گیا بلکہ نامعلوم ہوگیا ہے۔ مجھے اندازہ تھا کہ اسے نامعلوم کرنے میں مقامی کمیونٹی کا ہی ہاتھ ہوگا۔

پانچ سال گزر گئے۔ ایک دن میں کسی کام سے میلان گیا تو محمد نصیب مجھے نظر آیا۔ اس نے پینٹ قمیص اور کوٹ پہنا ہوا تھا۔ وہ ایک لڑکی کے ساتھ ایک اسٹور سے نکل رہا تھا۔ میں اسے دیکھ کر ٹھٹک کر کھڑا ہوگیا۔

اس نے بھی مجھے پہچان لیا اور میرے پاس آگیا۔ اس کے چہرے پر تازگی تھی اور وہ اس لڑکی کے ساتھ اچھا لگ رہا تھا۔ میں نے اس سے ہاتھ ملانے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا تو وہ میرے گلے لگ گیا۔

''بہت خوش لگ رہے ہو۔'' میں نے اس سے اردو میں کہا۔

''میں ٹھیک ہوں۔ بہت خوش ہوں۔ یہ میری بیوی ہے، صوفیہ! یہ میلان کی رہنے والی ہے۔'' اس نے اٹالین زبان میں مجھے جواب دیا۔

میں نے صوفیہ سے بھی ہاتھ ملایا اور دونوں کو سامنے ہی موجود پیزا کیفے میں کھانے کی دعوت دے دی۔ وہ دھیرے سے مسکرائی۔ مجھے پتا تھا کہ اس کی مسکراہٹ بناوٹی نہیں تھی۔

محمد نصیب فوراً ہی راضی ہوگیا اور وہ بھی خوش دلی سے تیار ہوگئی۔ صوفیہ مجھے اچھی لگی تھی اور وہ دونوں ہی مجھے خوش لگ رہے تھے۔ گرم گرم اٹالین پیزا کھاتے کھاتے اس نے اپنی زندگی کے پرت کھول دیے۔

''مجھے پتا ہے کہ آپ ناراض ہوں گے کیونکہ میں غائب ہوگیا تھا۔ میں ایسا سوچ کر آیا نہیں تھا۔ میں نے تو سوچا تھا کہ بھائی کی لاش کے ساتھ واپس چلا جاؤں گا مگر جن کے گھر ٹھہرا تھا، انہوں نے ہی کہا کہ میں رک جاؤں۔ کام کی کوئی کمی نہیں ہے یہاں پر۔'' ہماری اردو میں باتیں سن کر صوفیہ کھانے کے بعد یہ کہہ کر چلی گئی تھی کہ اسے کچھ چیزیں لینی ہیں اور وہ تھوڑی دیر میں یہاں واپس آجائے گی۔ ہم دونوں کو ہی کوئی اعتراض نہیں تھا اس پر۔

''مجھے یہاں کے ایک گاؤں میں کھیتوں پر کام مل گیا تھا پھر صوفیہ بھی وہیں مل گئی تھی اور وہیں شادی کر کے میں اٹالین ہوگیا ہوں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے دوسری پرت اٹھائی۔

''سب پاکستانی یہی کرتے ہیں۔ تم نے کیا تو کیا بُرا کیا۔'' میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

''کسی کو تو قرض اتارنا تھا صاحب!'' نصیب کے لہجے میں بڑا درد تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میرے دل پر لگی ہوئی پرانی چوٹ تازہ ہوگئی ہے۔

''ہمارا بہت سا قرض اتر گیا ہے۔ میری دو بہنوں کی شادی ہوگئی ہے صاحب! بہت کام کرتا ہوں میں یہاں پر۔ میں اور صوفیہ ہم دونوں کام کرتے ہیں۔ یہ بہت اچھی لڑکی ہے صاحب! نہ جانے مجھے کیسے مل گئی۔ اسے سب بتایا ہے میں نے۔ وہ سب سمجھتی ہے۔ میں بہت قسمت والا ہوں کہ میری اس سے شادی ہوگئی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگیا۔

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے پانی کا ایک بھرا ہوا گلاس پیا اور کھوئی کھوئی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور بڑے دھیمے سے بولا۔

''رفیق مرگیا تو ہم سب مرگئے صاحب! سب مرگئے۔ آپ نے مرے ہوئے زندہ لوگ نہیں دیکھے ہوں گے۔ میری ماں، میری بہن سب ہی زندہ ہیں مگر سب مرگئے تھے۔ مرے ہوئے زندہ لوگ۔ لیکن میرے یہاں ہونے سے وہ لوگ زندہ ہو رہے ہیں۔ آہستہ آہستہ ان میں جان پڑ رہی ہے۔ ان کے چہروں پر روشنی آرہی ہے۔ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ مچلنے لگی ہے۔ اب میری چوتھی بہن کی شادی ہو رہی ہے۔ بڑے اچھے لڑکے کے ساتھ۔ میری ماں نے بڑی خوشی سے مجھے بتایا ہے۔ وہ زندہ ہو رہی ہے صاحب! وہ زندہ ہو رہی ہے۔ ہم دونوں شادی پر جائیں گے اور اس شادی پر میں اپنی پانچویں بہن کا بھی رشتہ طے کردوں گا۔ میں نے کافی پیسے جمع کرلیے ہیں صاحب! کافی پیسے۔ مجھے پتا ہے میری ماں رفیق کو کبھی نہیں بھولے گی لیکن جب آخری بہن کے ہاتھ بھی پیلے ہوجائیں گے تو وہ تھوڑی سی سکھی تو ہوجائے گی۔ اسی سکھ کے لیے تو میں یہاں رک گیا تھا، آپ سے چھپ کر۔ کچھ غلط تو نہیں کیا صاحب میں نے یہاں رہ کر؟''

اس نے گہری نظروں سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی نظروں میں سوال تھا۔ بہت بڑا سوال۔

پیزا کے اس آخری پرت نے میری آنکھوں میں آنسو بھر دیے۔ ''نہیں، کچھ بھی بُرا نہیں کیا۔''

⌘⌘⌘

طبرستان کے مشہور شہر آمل کو پانچویں صدی ہجری میں اس اعتبار سے بڑی اہمیت حاصل رہی کہ یہاں ایک ایسے شخص کو بڑا عروج حاصل ہوا جو لکھنا پڑھنا بالکل نہیں جانتا تھا لیکن معرفت کا یہ حال تھا کہ جب بھی جس موضوع پر زبان کھولی، سننے والوں کے دل و دماغ میں روشنی پیدا ہوگئی اور اسے سینوں اور کتابوں میں محفوظ کرلیا گیا۔ ان کے والد قصاب تھے لیکن خود بلاغت و فصاحت کے شیخ وقت تھے۔ نام احمد بن محمد بن عبدالکریم تھا لیکن شہرت حاصل کی اپنی کنیت ابوالعباس سے۔

شیخ ابوالعباس قصاب

ضیا تسنیم بلگرامی

آمل کے شیخ کو لکھنا پڑھنا نہیں آتا تھا۔ باپ کی خواہش تھی کہ بیٹا آبائی پیشہ اختیار کرے لیکن بیٹے نے کوئی اور فیصلہ کرلیا۔ باپ کا خیال تھا کہ ان پڑھ بیٹا تصوف کی پرخار وادی میں برہنہ پا کس طرح سفر کرے گا لیکن بیٹے نے عملاً ثابت کردیا کہ وہ اس راہ کا میر کارواں ہے۔ جو آنکھ حرف تہجی سے ناآشنا تھی، وہ چہروں سے اتر کر دلوں میں جذب ہوجاتی تھی۔ زبان سے وہ کچھ نکلتا تھا جو روحوں کو مضطرب کردیتا تھا۔ نہایت پڑھے لکھے حضرات ان کی شاگردی اور مریدی کو اپنے لیے سرمایۂ افتخار سمجھتے تھے۔ مرجع خاص و عام۔ ایک انقلابی انسان، ایک سرتاپا روحانی شخص، اس کی شہرت آمل اور فارس سے نکل کر کئی ملکوں میں پھیل گئی۔

ایک ایمان پرور اور جاں فزا معلوماتی تحریر

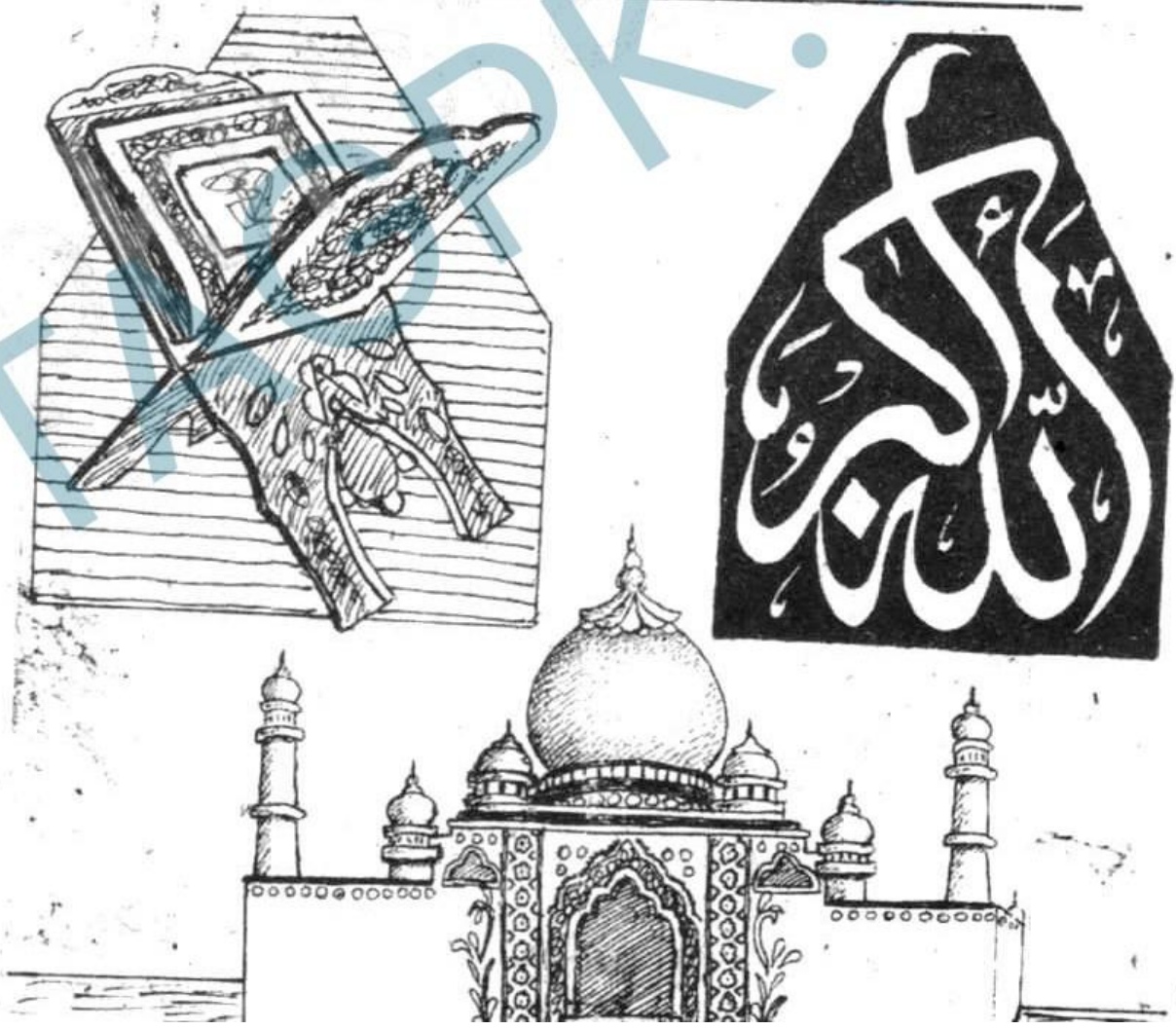

ابھی لڑکپن کا دور تھا۔ باپ کی خواہش تھی کہ بیٹا بھی دکانداری میں ان کا ہاتھ بٹائے لیکن بیٹے کا رجحان کسی اور طرف تھا۔ ان کی نظر میں دنیا کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔ یہاں رشتوں کی روایات تو تھیں لیکن دلوں میں خلوص کہیں بھی نہ تھا۔ ہر شخص جاہ و منصب اور مال و زر کا دیوانہ ہو رہا تھا۔ ہر طرف ھل من مزید کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ کوئی زر کے پیچھے بھاگ رہا تھا، کوئی زمین کے پیچھے۔ کسی کو عورت کی فکر تھی۔ بادشاہوں کے دربار اور امراء کی سرکار میں بڑی چہل پہل، بڑی رونق تھی۔ تجارت بھی زوروں پر تھی۔ کسب نے بھی عوام کو دیوانہ بنا رکھا تھا۔ ہنرمندوں کو اپنے ہنر پر ناز تھا۔ ان حالات اور اس ماحول میں محمد قصاب کے بیٹے نے ہوش کی آنکھ کھولی تھی۔

محمد قصاب کچھ عرصے سے اپنے بیٹے کو ہوش و حواس سے عاری محسوس کر رہے تھے۔ یہ اسے اپنے ساتھ کام میں لگا لینے کے خواہشمند تھے لیکن سمجھ دار بیٹے نے کسی اور ہی دکان کا پتا چلا لیا تھا اور اسی دکان میں بیٹھ جانے کا خواہشمند تھا۔ شہر کے ایک گوشے میں محمد بن عبداللہ کی خانقاہ تھی اور یہ بزرگ بغداد کے مشہور صوفی شیخ ابو محمد جریری کے مرید تھے اور اب طبرستان میں محمد بن عبداللہ ہی کی وہ بابرکت ذات تھی جس سے طالبانِ حق اپنی پیاس بجھاتے تھے۔

آمل کے لوگوں نے محمد قصاب کے بیٹے کو کھویا کھویا جو دیکھا تو سوچنے لگے کہ بچے ایسے تو نہیں ہوتے۔

باپ نے بیٹے کو دکان کے سامنے سے گزرتے جو دیکھا تو بلند آواز میں مخاطب کیا۔ ''احمد بیٹے! ذرا ادھر میرے پاس تو آنا۔''

بیٹے نے باپ کے پاس جا کے آہستہ سے پوچھا۔ ''باوا جان! کیا بات ہے؟''

باپ نے جواب دیا۔ ''بیٹے! تُو دیکھ رہا ہے کہ میں اپنی دکانداری کو کس انہماک اور لگن سے چلاتا ہوں اور ایک تُو ہے کہ میرا ہاتھ بھی نہیں بٹاتا۔ میں یہ کام تنہا کب تک انجام دیتا رہوں گا۔ کیا تُو میرا ہاتھ نہیں بٹائے گا؟''

بیٹے نے کمال استغنا سے جواب دیا۔ ''باوا جان! آپ اتنی محنت کیوں کرتے ہیں؟ جبکہ پیٹ بھرنے اور زندہ رہنے کے لیے اس سے کم محنت سے بھی کام چل جائے گا۔''

باپ کو بیٹے کا یہ طرزِ استدلال بالکل اچھا نہیں لگا، کہا۔ ''تُو تو نصیحتیں کرنے لگا۔ تیری ابھی عمر ہی کیا ہے۔ زندگی گزارنا اور پیٹ بھر لینا ہی اس دنیا کے اصل مسئلے نہیں ہیں۔''

بیٹے نے جواب دیا۔ ''میں نے جو کچھ کہا، اس میں سچائی ہے۔ میں آپ کو نصیحتیں نہیں کر رہا۔ اللہ ہم سب پر رحم فرمائے۔ ہم اس غلاظت میں گلے گلے تک ڈوب چکے ہیں۔''

باپ کے غصے میں اضافہ ہو گیا۔ ''میں نے تجھ کو پڑھایا لکھایا نہیں۔ کیا تُو یہ سمجھتا ہے کہ تُو صوفیوں میں شامل ہو جائے گا اور وہاں تجھ کو کوئی مقام حاصل ہو جائے گا، ہرگز نہیں۔ یہ مقام بھی پڑھے لکھوں ہی کو ملتا ہے۔''

بیٹے نے ہمت نہیں ہاری اور جواب دیا۔ ''بہرحال میں اپنی کوشش سے باز نہیں آؤں گا۔ میرے دل و دماغ میری مخالفت نہیں کر رہے اس لیے میں نے اپنے لیے جس راستے کا انتخاب کیا ہے، اس سے اِدھر اُدھر نہیں ہونا چاہتا۔''

احمد نے یہاں سے محمد بن عبداللہ کی خانقاہ کا رخ کیا۔ جب یہ خانقاہ میں داخل ہوئے تو محمد بن عبداللہ نے ان کا چند قدم چل کے استقبال کیا اور کہا۔ ''جب مجھے یہ بتایا گیا کہ احمد بن محمد قصاب آ رہے ہیں تو مجھ سے اپنی جگہ پر بیٹھا نہیں گیا۔ کہو، باپ سے اختلاف کر کے چلے آئے!''

انہوں نے محمد بن عبداللہ کے قدموں کی خاک اپنی آنکھوں سے لگائی اور کہا۔ ''حضرت! اب میں یہاں سے کہیں اور نہیں جاؤں گا۔ میرے لیے بھی کوئی ٹھکانا بنا دیجیے۔''

محمد بن عبداللہ نے جواب دیا۔ ''میں تو تمہارا انتظار ہی کر رہا تھا۔ اب یہیں میرے پاس رہو۔''

یہ خانقاہ میں اپنے پیر مرشد سے تربیت حاصل کرنے لگے۔

یہ دنیا ہی اور تھی۔ یہاں تزکیۂ نفس کی تعلیم نہایت دل نشیں طریقے سے عملاً دی جاتی تھی۔ ان کا وقت بہت اچھی طرح گزرنے لگا۔ محمد بن عبداللہ کو ایک بات نے بہت حیرت میں ڈال دیا۔ یہ نیا مرید پڑھا لکھا نہیں تھا مگر ان کی ہر بات سب سے زیادہ یہی مرید سمجھتا تھا۔ انہیں اپنے اس مرید سے لگاؤ بڑھتا چلا گیا۔

احمد نے اپنے پیر مرشد سے سوالات کرنا شروع کر دیے۔ یہ سوالات بھی معمولی نہیں ہوتے تھے۔ دوسرے مریدان پر رشک کرتے تھے۔

ان کے والد نے اپنے بیٹے کا یہ حال دیکھا تو دوسرے پڑھے لکھے مریدوں سے پوچھنے لگے۔ ''کیوں بھائی! یہ احمد کیسا جا رہا ہے تم سب میں؟''

ایک مرید نے جواب دیا۔ ''بہت اچھے۔ ان پر پیر مرشد کی نظرِ کرم بھی کچھ زیادہ ہے۔''
باپ نے کہا۔ ''لیکن احمد نے تو کچھ پڑھا لکھا بھی نہیں پھر یہاں کی علمی اور پیچیدہ باتیں اس کی سمجھ میں کس طرح آجاتی ہیں؟''
اسی مرید نے جواب دیا۔ ''ہمیں اس کا کوئی خاص سبب تو معلوم نہیں مگر یہ ضرور جانتے ہیں کہ وہ ہر بات بہ آسانی سمجھ لیتے ہیں اور کبھی کبھی خود بھی ایسے سوالات کر گزرتے ہیں کہ پیر مرشد بھی چکرا جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ساری باتیں خداداد ہیں۔''
باپ کو ان باتوں نے چکرا دیا۔ وہ بیٹے سے ملے بغیر ہی واپس چلے گئے۔
کچھ عرصے بعد باپ اپنے بیٹے سے ملنے کے لیے خانقاہ گئے۔ اس وقت محمد بن عبداللہ توحید پر تقریر فرما رہے تھے۔ یہ ایک کونے میں خاموشی سے بیٹھ گئے۔
دورانِ وعظ ابلیس کا ذکر آگیا۔ ایک مرید نے دورانِ تقریر پوچھا۔ ''پیر مرشد! اگر ابلیس ہمارے سامنے انسانی شکل میں آجائے تو ہمیں اس کے ساتھ کیسا سلوک کرنا چاہیے؟''
محمد بن عبداللہ نے جواب دیا۔ ''اس کو دار پر چڑھا دینا چاہیے کیونکہ اس کے بعد مخلوق اس کے شر سے محفوظ ہو جائے گی۔''
احمد بن محمد قصاب نے کھڑے ہو کر اس قیاس سے اختلاف کیا اور کہا۔ ''پیر مرشد! اگر اجازت دیں تو میں بھی کچھ عرض کروں؟''
محمد بن عبداللہ نے اجازت دے دی۔ ''میری طرف سے اجازت ہے۔''
احمد بن محمد قصاب نے کہا۔ ''ابلیس تو پہلے ہی کشتۂ خداوندی ہے۔ اس کشتۂ الٰہی کو سنگسار کر دینا یا دار پر چڑھا دینا شجاعت کے منافی ہے اور پھر یہ کہ اللہ کی مخلوق کو سزا یا جزا دینا ہمارا کام نہیں ہے۔ یہ اللہ کا کام ہے اور اس کے لیے اللہ نے ایک دن مقرر کر دیا ہے پھر ہم اس کی مشیت میں دخل کیوں دیں۔''
محمد بن عبداللہ نے اپنے اُن پڑھ مرید کو اپنے پاس بلایا اور تحسین آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اللہ نے تجھ کو ایسا علم دے دیا ہے کہ اس پر میں بھی رشک کرنے لگا ہوں۔ واللہ میں لاجواب ہو گیا۔''
باپ نے اپنے بیٹے کی باتیں جو سنیں اور یہاں جو قدر و منزلت دیکھی تو ان کے سارے گلے جاتے رہے۔
تقریر کے خاتمے پر اپنے بیٹے سے ملے اور سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''بیٹے! میں تیرے مقام سے آگاہ نہیں تھا اس لیے تجھے پریشان کرتا رہا لیکن آج میں تیرا قائل ہو گیا اور اس وقت بے حد خوش ہوں کہ تو نے اپنے لیے جو راہ پسند کی ہے وہی صحیح راہ ہے۔ خدا تجھے خوش رکھے اور کامیابیوں سے ہمکنار کرے۔''
احمد نے آہستہ آہستہ رونا شروع کر دیا۔ وہ آنسو بہا رہے تھے اور باپ سے کہہ رہے تھے۔ ''باوا جان! میں نے آپ کا بہت دل دکھایا۔ شرمندہ ہوں اور یہ بھی اس لیے ہوا کہ اس وقت آپ میری بات نہیں سمجھ سکتے تھے اور میں بھی آپ کی بات نہ تو اس وقت سمجھ سکتا تھا اور نہ آج سمجھ سکتا ہوں لیکن آج آپ کی سمجھ میں میری بات آگئی۔''
باپ کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں، کہا۔ ''بہر حال آج میں بہت خوش ہوں اور میری دعا ہے کہ اللہ تجھے ہمیشہ خوش و خرم رکھے۔''
یہ باپ بیٹے کی یادگار ملاقات تھی۔ اس کے بعد باپ نے اپنے بیٹے کا ہر جگہ فخریہ ذکر کیا۔
شادی باپ کی مرضی سے ہوئی اور جب بیٹا پیدا ہوا تو اس کا نام عباس رکھا گیا اور بیٹے کے نام کی وجہ سے یہ ابوالعباس ہو گئے۔ یہ کنیت ہی ان کا نام بن گئی اور ہر طرف سے انہیں ابوالعباس ہی کہا جانے لگا۔ چونکہ ان کا وطن آمل تھا اس لیے ابوالعباس آملی کہلائے۔ آباؤ اجداد قصاب تھے اس لیے لفظ قصاب بھی نام کا ایک جزو بن گیا اور ان کا پورا نام شیخ ابوالعباس آملی قصاب قرار پایا۔

☆☆☆

اپنے پیر مرشد کے ساتھ کافی وقت گزارنے کے بعد مرشد کی ہدایت پر آپ نے علیحدگی اختیار کر لی اور اب ان کے پاس ارادت مند آنے لگے۔ ان کی شہرت آمل اور طبرستان سے نکل کر پورے فارس اور پھر بغداد اور اس کے نواح تک پھیل گئی۔ آپ کی باتوں نے ایک زمانے کا دل موہ لیا تھا۔
ہر طرف آپ کا یہی شہرہ تھا کہ آپ پڑھنا لکھنا بالکل نہیں جانتے لیکن باتیں ایسی کرتے ہیں کہ دلوں میں اتر جاتی ہیں اور بڑے بڑے عالم بھی ویسی باتیں نہیں کر سکتے۔ علماء کو حسد ہوا اور کچھ آپ کا امتحان لینے پہنچ گئے۔
ایک عالم نے آپ سے پوچھا۔ ''حضرت! ہم نے سنا ہے کہ آپ لکھنا پڑھنا بالکل نہیں جانتے۔ کیا یہ درست ہے؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''ہاں بھائی! تم نے جو کچھ سنا درست سنا۔ میں پڑھنا لکھنا بالکل نہیں جانتا۔''
دوسرے عالم خاموش رہے۔ ان کے خیال میں ان کے لیے ایک ہی عالم کافی تھا۔

اس عالم نے پوچھا۔ ''کیا آپ توحید پر گفتگو کر سکتے ہیں؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''کیوں نہیں، اس میں کیا قباحت ہو سکتی ہے۔''
عالم نے پوچھا۔ ''اچھا، اب آپ یہ بتائیں کہ کیا علمِ ظاہری سے توحید کے نکات بیان کیے جا سکتے ہیں اور کیا ان نکات کی رسائی توحید کی روح تک ممکن ہے؟''
آپ نے فرمایا۔ ''اے شخص! علمِ ظاہری وہ جوہر ہے کہ دنیا بھر کے انبیاء علومِ ظاہری ہی کے ذریعے دعوتِ حق اور دعوتِ توحید دیتے رہے اور کامیابیاں حاصل کیں اور اے شخص! اب میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اس کو غور سے سن اور اس پر غور کرتا رہ، ایک نہ ایک دن کسی نتیجے پر پہنچ ہی جائے گا۔ یاد رکھ، اگر اللہ تعالیٰ اس جوہر کے ذریعے حجابِ توحید اٹھا دے تو یہ علومِ ظاہری خود ہی پردۂ عدم میں روپوش ہو جائیں۔''
عالموں کے سر چکرانے لگے۔ یہ اَن پڑھ انسان کیسی عالمانہ باتیں کر رہا ہے۔ یہ سوچ سوچ کر آماسِ سر ہوا جا رہا تھا۔
دوسرے عالم نے پوچھا۔ ''حضرت! آپ اللہ کے بارے میں ہمیں کیا بتائیں گے؟ یعنی وہ نور ہے، ظلمت ہے، فانی ہے، باقی ہے؟ وہ کیا ہے؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''وہ برتر از قیاس و گمان ہے۔ وہ لامحدود ہے اور جب ہم یہ مان لیتے ہیں تو اس کو ظلمت، نور، فانی یا باقی کہہ کر قیاس و گمان میں لا کر محدود کر دینا ہماری کم علمی اور بے بضاعتی سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔''
علماء شرمسار ہو رہے تھے۔ یہ ان جوابوں سے مختلف جواب تھا جو اس سوال کے جواب میں ہمیشہ دیے جاتے رہے تھے۔
تیسرے عالم نے سوال کیا۔ ''حضرت! دنیا میں دو قسم کے انسان ملتے ہیں۔ ایک تو وہ جو دنیا کے ہو رہے اور عقبیٰ کا خیال تک ان کے دل میں نہیں آتا اور دوسرے وہ جو عقبیٰ کی خاطر دنیا سے لاتعلق ہو گئے۔ ان دونوں میں سے آپ خود کو کس قسم میں شمار کریں گے؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''کسی میں بھی نہیں۔ ان دو میں ایک تیسری قسم کو بھی شامل کر لو۔''
عالم نے پوچھا۔ ''تیسری قسم؟ وہ کون سی؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''اگر میں ان تینوں کو اپنی زبان میں کہوں گا تو اس طرح کہوں گا۔ ایک تو وہ جو دنیا کے لیے سب کچھ بھلا بیٹھے، دوسرے وہ جو عقبیٰ کے لیے دنیا کو فراموش کر بیٹھے۔ تیسرے وہ ہیں جنھوں نے دنیا کے ہر عیش اور ہر عشرت کو اہلِ دنیا کے لیے چھوڑ دیا اور عقبیٰ کی تمام راحتیں اہلِ عقبیٰ کے لیے چھوڑ دیں اور یہ خود اللہ تعالیٰ کے لیے ہر شے سے بے نیاز ہو گئے۔ ان کو اس پر فخر بھی ہے کہ خدا نے بارگاہِ ربوبیت میں مرتبۂ عبودیت عطا کر کے اپنا بندہ ہونے کا اعزاز عطا فرمایا۔ اس لیے ہمیں دین اور دنیا میں اس کے سوا کسی دوسری شے کی احتیاج باقی نہیں رہی۔''
علماء آپ سے مرعوب ہو چکے تھے۔ پہلے عالم نے ایک نیا سوال کر دیا۔ ''آپ کے نزدیک اللہ کا خوش قسمت بندہ کون ہے؟''
آپ نے فرمایا۔ ''وہ بندہ جس کو اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے اس کی ہستی پر آگاہ فرما دے۔''
اب تو علماء لاجواب ہو چکے تھے۔ وہ سب آپ کی علمیت اور فہم و رسا کے قائل ہو چکے تھے۔ انہوں نے بیک زبان اعتراف کیا۔ ''حضرت! ہم شرمندہ ہیں کہ آپ کے بارے میں سوئے ظنی کے مرتکب ہوئے۔ یہ سب اللہ کی دین ہے، جس کو چاہے نواز دے۔''
علماء چلے گئے تو آپ نے اپنے مریدوں سے کہا۔ ''عالم ہو کر انہیں اتنا بھی نہیں معلوم کہ وہ جس کو چاہے نواز دے اور جس کو چاہے محروم کر دے۔''
آپ کے مریدوں میں سے ایک نے کہا۔ ''حضرت! میں نے سنا ہے کہ بغداد میں ایک ایسے بزرگ بھی موجود ہیں جو علمِ کیمیا سے واقف ہیں اور وہ سونا بنا لیتے ہیں۔ کیا ایسا ممکن ہے؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''کیمیا کیا ہے؟'' پھر کچھ توقف کے بعد خود ہی جواب بھی دیا۔ ''وقت بذاتِ خود کیمیا ہے۔ جو لوگ وقت کی قدر کرتے ہیں، وہ گویا سونا بنا لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ میں کسی علمِ کیمیا سے واقف نہیں۔''
اس رات آپ کچھ زیادہ ہی پریشان نظر آئے۔ آپ کو مریدوں نے اس حال میں دیکھا کہ سجدے میں پڑے گڑگڑا رہے ہیں۔ ''اے اللہ! تیرے مثل کوئی چیز نہیں۔ تو یکتا ہے، لاثانی ہے۔ تیرا کوئی ہمسر نہیں۔ میری نظر میں کوئی شے باقی نہیں رہی۔''
آپ اپنے مریدوں میں توحید اور معرفت پر باتیں کر رہے تھے۔ اسی عالم میں ایک مسافر کو اندر آتے ہوئے دیکھا۔ اس کے کپڑے گرد آلود ہو رہے تھے۔ وہ ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ آپ نے اس کو کئی بار سرسری نظروں سے دیکھا اور وعظ فرماتے رہے۔
وعظ کے خاتمے پر آپ نے اس کو اپنے پاس بلایا اور پوچھا۔ ''تو کون ہے اور یہاں کیا لینے آیا ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''میں کرمان شاہ سے آیا ہوں۔ میرا کیا نام ہے، یہ جان کر کیا کریں گے؟''

آپ نے پوچھا۔ ''پھر بھی۔ تیرا تعارف کس طرح ہوگا؟''

اس نے کہا۔ ''مجھے شیخ ابوالنصار نے بھیجا ہے۔ آپ تو ان سے واقف ہی ہوں گے۔ کرمان شاہ کے مشہور صوفی۔''

آپ نے فرمایا۔ ''اچھا پھر؟ یہ تو ہوا تیرا تعارف۔ اب یہ بتا کہ تُو یہاں کیوں آیا ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''حضرت! پورا کرمان شاہ خشک سالی کا شکار ہو رہا ہے۔ بارش کا کوئی امکان نہیں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''پھر؟ پھر میں کیا کروں؟ بارش کرادوں؟ یہاں کے بادل وہاں بھیج دوں؟ کیا رائے ہے تیری؟''

اس نے جواب دیا۔ ''حضرت! میری بات کا جواب درکار ہے۔''

آپ نے دریافت کیا۔ ''کس بات کا جواب؟ مجھے ناقص اور ادھوری باتوں کا جواب دینا نہیں آتا۔''

آنے والے نے عرض کیا۔ ''حضورِ والا! قبلہ ابوالنصار نے آپ سے استدعا کی ہے کہ بارش کے لیے دعا فرمادیں۔ اللہ آپ کی دعا قبول فرماتا ہے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''یہ وہ کس طرح کہہ سکتا ہے کہ اللہ میری دعا قطعی قبول فرمالیتا ہے؟''

قاصد نے جواب دیا۔ ''حضرت! میں اپنی طرف سے کچھ بھی نہیں کہہ رہا۔ میں نے دوسروں سے جو کچھ سنا، عرض کردیا۔''

آپ نے ایک بار پھر پوچھا۔ ''ہاں، اب بتا کہ تُو کیا چاہتا ہے؟''

قاصد نے عرض کیا۔ ''دعا، صرف دعا۔ بارش کے لیے دعا۔ کرمان شاہ میں بارش کے لیے دعا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''تُو کہتا ہے تو دعا کردوں گا۔ تیرے شیخ ابوالنصار بھی خوب ہیں۔ خود چاہیں تو دعا کردیں مگر معلوم نہیں کیوں اس کام کے لیے میرا انتخاب کیا۔''

آپ قاصد اور مریدوں کے ساتھ ایک ٹیلے پر چڑھ گئے اور قبلہ رو سجدے میں گر کر دعائیں کرنے لگے۔ ''اے اللہ! تیرا برگزیدہ بندہ ابوالنصار میرے بارے میں حسنِ ظن کا شکار ہوگیا ہے۔ وہ مجھ پر یقین رکھتا ہے کہ اگر میں دعا کردوں تو کرمان شاہ میں بارش ہوجائے گی۔ خدایا! اس حسنِ ظن کا بھرم رکھ لے۔ مجھے شرمندگی سے بچالے۔ میں اس کے لیے تیری ربوبیت کو وسیلہ بناتا ہوں۔ رسول مقبول ﷺ کے طفیل کرمان شاہ کو بارش سے نواز دے۔''

آپ کے رخسار آنسوؤں سے تر ہوگئے۔ آپ کے ساتھ مرید بھی اشکبار تھے۔ وہ بھی رو رہے تھے۔

جب طبیعت قابو میں آئی تو آپ نے قاصد سے کہا۔ ''اب تو جاسکتا ہے۔ اللہ نے چاہا تو بارش ہوجائے گی۔''

قاصد کرمان شاہ واپس چلا گیا۔ جب وہ اپنے پیر مرشد کے شہر میں داخل ہوا تو پورا شہر جل تھل ہو رہا تھا۔ بارش نے پورے شہر اور اس کے نواح کو تر بتر کردیا تھا۔ ابوالنصار نے پوچھا۔ ''آمل میں شیخ ابوالعباس سے ملاقات ہوگئی تھی؟''

قاصد نے جواب دیا۔ ''جی ہاں، ملاقات ہوگئی تھی۔''

شیخ نے پوچھا۔ ''پھر کیا ہوا، تُو نے میرا پیغام پہنچادیا تھا؟''

قاصد نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں نے آپ کا پیغام من وعن پہنچادیا تھا۔''

شیخ نے کہا۔ ''تم نے وہاں اور کیا دیکھا؟''

قاصد نے جواب دیا۔ ''میں نے وہاں ایسے مرید دیکھے جو ان کے اشارے پر اپنی جانیں قربان کرسکتے ہیں۔ وہ خود کو اللہ کا عاجز بندہ سمجھتے ہیں۔ جب وہ دعا مانگ رہے تھے تو میں نے ان کے چہرے کو آنسوؤں سے تر دیکھا۔ وہ خود بھی رو رہے تھے اور مریدوں کو بھی رلا رہے تھے۔''

ابوالنصار نے اپنے مریدوں کو بتایا۔ ''دیکھو، اگر تم لوگ کچھ جاننا، کچھ سیکھنا چاہتے ہو تو ابوالعباس سے سیکھو۔ ان کے حالات دوسروں سے سنو اور اس پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرو۔ اس طرح کچھ بن جاؤ گے۔''

آمل میں جب کسی نے ان کو یہ بتایا کہ کرمان شاہ میں بارش ہوگئی اور کرمان شاہ اور اس کی نواحی بستیاں بارش سے جل تھل ہوگئیں تو انہیں بڑی خوشی ہوئی اور وہ ایک بار پھر سجدے میں گر کر اپنے اللہ کا شکر ادا کرنے لگے۔

☆☆☆

ایک درویش کے پاس کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ اس نے آپ سے درخواست کی۔ ''برائے کرم میرے رہنے کا انتظام کردیں۔''

آپ نے پوچھا۔ ''تُو تنہا ہے یا کوئی اور بھی ہے تیرے ساتھ؟''

درویش نے جواب دیا۔ ''میں تنہا ہوں اور میں دنیا کے بکھیڑوں سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا۔''
آپ نے اپنے گھر کا ایک حصہ اس کو دے دیا اور کہا۔ ''میں اس حصے میں نماز ادا کرتا ہوں۔ بس خیال کرنا کہ میری نماز میں کسی قسم کا خلل نہ پڑے۔''
درویش نے وعدہ کیا۔ ''میں درزی کا کام کرتا ہوں اور یہ کام خاموشی سے کرتا رہتا ہوں۔ اس کام سے تو نماز میں خلل پڑنے سے رہا۔''
آپ نے رہنے کی اجازت دے دی کیونکہ درزی کے کام سے نماز میں کیا خلل پڑ سکتا تھا۔
درویش رہتا رہا اور اپنا کام کرتا رہا۔ دونوں کا آمنا سامنا نہیں ہوتا تھا۔ ایک دن درویش نے آپ کے داہنی طرف بیٹھ کر اپنا کام شروع کر دیا۔ آپ نے سلام پھیرا تو دیکھا وہ سلائی ادھیڑ رہا ہے۔ آپ نے منہ پھیر لیا اور درویش سلائی ادھیڑ کر دوبارہ سلائی کرنے لگا۔
کئی دن بعد آپ نے پھر وہی منظر دیکھا۔ وہ اپنی ہی سلائی کو ادھیڑ دیتا اور دوبارہ سلائی میں مشغول ہو جاتا اور پھر یہ منظر بار بار دیکھنے میں آنے لگا۔
ایک دن آپ نے سلام پھیرا تو دیکھا وہ سلے ہوئے کُرتے کو ٹانکے توڑ کے کھول رہا ہے۔ آپ نے پوچھا۔ ''یہ تُو کیا کر رہا ہے؟''
درویش نے جواب دیا۔ ''سلائی ادھیڑ رہا ہوں۔''
آپ نے پوچھا۔ ''وہ کیوں؟ یہ کُرتہ تو پہلے ہی سل چکا تھا، تیار تھا پھر یہ ادھیڑنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی؟''
درویش نے جواب دیا۔ ''میں اس کی پہلی سلائی سے مطمئن نہیں تھا۔''
آپ نے فرمایا۔ ''مگر اس کی پہلی سلائی میں خرابی کیا تھی؟''
درویش نے بدمزگی سے جواب دیا۔ ''خرابی میں جانتا ہوں، آپ کیا جانیں۔''
آپ نے تحمل سے کہا۔ ''خرابی تُو ہی جانتا ہے، میں کیا جانوں۔ اسی لیے تو پوچھ رہا ہوں کہ اس میں کیا خرابی تھی؟''
درویش نے جواب دیا۔ ''میں درزی ہوں اور اس کام کو برسوں سے کر رہا ہوں۔ سلائی کی جس اچھی بری چیز کو میں دیکھ یا محسوس کر سکتا ہوں، اس کو لفظوں میں بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ اس لیے میں کیا بتاؤں کہ سابقہ سلائی میں کیا خرابی تھی۔''
آپ نے درویش کو مشورہ دیا۔ ''بہتر ہے لیکن جو کچھ تُو کرتا ہے، اس سلسلے میں میرا یہ مشورہ ہے کہ تُو اس میں اتنا وقت مت برباد کیا کر۔''
درویش نے عرض کیا۔ ''میں وقت برباد نہیں کرتا بلکہ جو کچھ کرتا ہوں اپنے سکونِ قلب کے لیے کرتا ہوں۔ اگر یہ نہ کروں تو سارا دن پریشان رہوں گا۔''
آپ نے فرمایا۔ ''عجیب بات ہے کہ تُو درویش ہے مگر نماز نہیں پڑھتا۔ جو خشوع و خضوع نماز میں دکھانا چاہیے، وہ کپڑے کی اُدھیڑ بُن میں دکھاتا رہتا ہے۔''
درویش کو غصہ آ گیا۔ کہنے لگا۔ ''آپ نے رہنے کو جگہ کیا دے دی کہ میرا حساب کتاب ہی کرنے لگے۔ کہیے تو یہاں سے چلا جاؤں؟''
آپ نے فرمایا۔ ''واللہ، میری یہ نیت ہرگز نہ تھی۔ میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ تجھ کو نماز ضرور پڑھنا چاہیے۔''
درویش کوئی جواب دیے بغیر ہی آپ کے سامنے سے ہٹ گیا اور رات گئے تک واپس نہیں آیا۔
دوسرے دن صبح فجر کی نماز کے وقت بھی درویش اپنے کام میں مصروف اور منہمک نظر آیا۔ آپ نماز میں مشغول ہو گئے اور درویش سلائی میں۔ پھر جب آپ نے سلام پھیرا تو وہی منظر پھر نظر آیا۔ درویش کُرتے کی آستینیں، سلائی ادھیڑ کے الگ کر رہا تھا۔
آپ نے فرمایا۔ ''درویش! پھر وہی کام؟''
درویش نے جواب دیا۔ ''میرا تو کام ہی یہی ہے۔ پھر وہی کام سے آپ کی کیا مراد ہے؟''
آپ نے فرمایا۔ ''دیکھ بھائی! سچی بات تو یہ ہے کہ میری نمازیں اور میرا یہ انہماک تجھ کو نماز کی طرف مائل نہ کر سکا اور میں تیری سلائی اُدھڑائی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس لیے میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں کہ یہاں سے کہیں اور چلا جا۔''
درویش نے پوچھا۔ ''کہاں چلا جاؤں؟ آپ ہی وہ جگہ بھی بتا دیں۔''
آپ نے جواب دیا۔ ''میں کیا بتاؤں کہ تو کہاں چلا جائے۔ میں تو تیری عبادت سے تنگ آ گیا ہوں۔''
درویش کو آپ کے جواب پر بڑی حیرت ہوئی۔ پوچھا۔ ''حضرت! یہ کیا فرما دیا آپ نے؟ میری عبادت سے آپ تنگ آ گئے ہیں۔ کون سی عبادت؟ میں کب عبادت کرتا ہوں؟''
آپ نے فرمایا۔ ''تُو اپنے کام کو جس انہماک اور توجہ سے انجام دیتا ہے، میں اس کو تیری عبادت سمجھتا ہوں۔''

درویش نے عرض کیا۔ ''ہاں، یہ تو ہے کیونکہ میں اپنے کام میں اتنا مشغول اور غرق ہوجاتا ہوں کہ آپ کی نماز کی طرف میرا دھیان ہی نہیں جاتا اور آپ نماز اس طرح پڑھتے ہیں کہ آپ کی ساری توجہ میری سلائی ادھڑائی پر رہتی ہے۔''

آپ نے نہایت بردباری سے فرمایا۔ ''تُو ٹھیک کہتا ہے۔ میں بھی تجھ سے یہی کہنا چاہتا ہوں کہ آں تو صنمی، آں تو صنمی (یہ تیرا صنم ہے، یہ تیرا صنم ہے)۔ تُو اپنے صنم کی پرستش کر رہا ہے۔ اگر تو اس بت کی پرستش کرنے کے بجائے اللہ کی پرستش کرے تو تیرا یہ انہماک تجھ کو معلوم نہیں کہاں پہنچا دے لیکن اس صنم کی پرستش سے تجھے کیا حاصل ہوگا؟ کچھ بھی نہیں، سوائے پریشانی، بے قراری اور اُدھیڑ بُن کے۔''

اس جواب نے تو درویش کی کایا ہی پلٹ دی۔ اس نے جواب دیا۔ ''حضرت! میں آپ کے پاس اسی لیے آیا تھا کہ آپ کو لاجواب کر دوں لیکن آپ نے مجھ کو لاجواب کر دیا۔ واللہ! اب میں آپ کے کہنے پر عمل کروں گا۔''

اس کے بعد درویش نے نماز میں وہ انہماک اور استغراق دکھایا کہ اس میدان میں اپنے بہت سے ہم عصروں کو پیچھے چھوڑ دیا۔

☆☆☆

اب آپ کو فکر ہوئی کہ مشہورِ زمانہ بزرگوں سے بھی ملاقات کی جائے۔ اس غرض سے آپ نے بغداد کا سفر کیا۔ وہاں مشہور بزرگ ابوبکر شبلیؒ سے ملاقات کی۔ انہوں نے آپ سے مل کر بڑی خوشی کا اظہار کیا اور آپ کو بہت زیادہ سراہا۔ ابوبکر شبلیؒ نے پوچھا۔ ''اے ابوالعباس! وہ کیا چیز تھی جس نے آپ کو اس طرف راغب کر دیا؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''حضرت! مجھ کو میرے باپ نے آبائی پیشے میں مشغول کر دینا چاہا لیکن دل نہیں مانا اور میں محمد بن عبداللہ کی صحبت میں اٹھنے بیٹھنے لگا اور وہاں پختہ ہوتا چلا گیا اور آج میں جو کچھ ہوں آپ کے سامنے ہوں۔''

یہاں سے آپ مکہ معظمہ چلے گئے اور مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کا رخ کیا۔ یہاں آپ نے رسول مقبول ﷺ کے روضے پر حاضری دی اور رو رو کر اظہارِ مدعا کرتے رہے۔ آپ کہہ رہے تھے۔ ''اے میری قلب و جان کے سکون! میں کچھ بھی نہیں۔ میں ایک حقیر سا ذرہ ہوں مگر آپ ﷺ کی نسبت نے مجھے بڑا کر دیا ہے۔ میری آپ ﷺ سے استدعا ہے کہ اس نسبت کی لاج رہے اور میں دین اور دنیا اور عقبیٰ کی شرمندگی سے محفوظ رہوں۔''

آپ نے روتے روتے برا حال کر لیا۔ جب خود ہی سکون آ گیا تو انہیں اطمینان ہو گیا کہ ان کی دعا مقبول ہو گئی۔

مدینہ منورہ سے بیت المقدس روانہ ہو گئے اور بیت المقدس کی زیارت گاہوں کا دیدار کیا۔

مسجدِ عمر میں فجر کی نماز ادا کی تو ایک بزرگ نے ان سے پوچھا۔ ''کہاں سے آئے ہو؟''

انہوں نے جواب دیا۔ ''مدینہ منورہ سے۔''

بزرگ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں، تم آمل سے آئے ہو اور وہاں کے ایک قصاب کے بیٹے ہو۔''

آپ کو بڑی حیرت ہوئی کہ انہوں نے آپ کو کس طرح پہچان لیا؟

ان بزرگ نے کہا۔ ''ابوالعباس! پریشان مت ہو۔ تم میرے مہمان ہو۔ بیت المقدس میں تم میرے پاس رہو گے۔''

آپ نے دریافت کیا۔ ''لیکن آپ ہیں کون؟''

بڑے میاں نے جواب دیا۔ ''میں کون ہوں۔ یہ بات تو میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ فی الحال یہ سمجھ لو کہ اللہ نے مجھے تمہاری میزبانی اور تربیت پر مامور کیا ہے۔ اس لیے تم چند روز میرے ساتھ رہو پھر چلے جانا۔''

آپ نے اصرار نہیں کیا اور ان کے ساتھ ان کے گھر چلے گئے۔ یہ گھر کیسا تھا؟ آبادی سے دور جنگل میں ایک جھونپڑا بنا ہوا تھا۔ اس جھونپڑے میں داخل ہوتے ہوئے ان بزرگ نے آپ سے کہا۔ ''ابوالعباس! میں کوئی متمول آدمی تو ہوں نہیں۔ جو روکھا سوکھا مجھے میسر ہے وہی تم بھی کھاؤ گے۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''میرے لیے یہی بہت کافی ہے کہ اس پردیس میں آپ نے میری میزبانی کی۔ میرے لیے بس یہی کافی ہے۔''

ان بزرگ نے کئی دن تک انہیں مہمان بنائے رکھا۔ اس دوران وہ انہیں بڑے کام کی باتیں بھی بتاتے رہے، بالکل کسی معلم کی طرح۔

ابوالعباس ان بزرگ کے ایک ماہ مہمان رہے اور اس ایک ماہ میں ابوالعباس کو ان بزرگ سے جو کچھ حاصل ہوا وہ غیر معمولی تھا۔

ایک ماہ بعد ان بزرگ نے کہا۔ ''ابوالعباس! میرا کام ختم ہوا۔ تم چاہو تو آمل واپس جاؤ۔''

آپ یہاں کے اتنے عادی ہو گئے تھے کہ ان بزرگ کی یہ بات انہیں اچھی نہیں لگی لیکن یہ بھی جانتے تھے کہ ایک مہمان کسی کے گھر میں کتنے دن رہ سکتا ہے۔

یہ ان بزرگ سے گرمجوشی سے مل کر آمل کے لیے روانہ ہو گئے۔ جنگل سے نکلنے کے بعد ان بزرگ نے آپ کا ساتھ چھوڑ دیا اور کہا۔ ''بس اب تم جا سکتے ہو۔''

اس بار ابوالعباس نے ان بزرگ کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا۔ ''حضرت! اب میں یہاں سے اس وقت تک نہیں جاؤں گا جب تک آپ اپنے بارے میں مجھ کو نہیں بتائیں گے۔''

ان بزرگ نے جواب دیا۔ ''ٹھیک ہے۔ اگر تم ضد ہی کر رہے ہو تو سنو، میں خضر ہوں اور یہاں محض تمہاری وجہ سے آیا تھا اور اب اپنے مہمان کو رخصت کر کے میں بھی کہیں چلا جاؤں گا۔''

اسی وقت ان کو اپنے پیچھے کچھ آہٹ سی محسوس ہوئی۔ آپ نے اپنے پیچھے مڑ کر دیکھا، وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ آپ نے اب خواجہ خضرؑ سے پوچھا۔ ''محترم خضرؑ! آپ کو بھی کوئی آہٹ محسوس ہوئی تھی ابھی؟''

لیکن وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ خضرؑ کا کہیں نام و نشان تک نہیں تھا۔ ان کے دل و دماغ اس بات سے بہت خوش تھے کہ خواجہ خضرؑ نے انہیں ایک ماہ تک اپنا مہمان بنائے رکھا تھا۔ آپ خوش خوش آمل واپس آ گئے۔

اب آپ کی حیثیت اور مرتبہ متعین ہو چکے تھے اور اب آپ مخلوقِ خدا کی خدمت میں مشغول ہو گئے۔

آپ نماز میں مشغول تھے کہ آپ کو ایسا لگا جیسے کوئی لمحہ بھر کے لیے آیا اور کسی وجہ سے واپس چلا گیا۔ سلام پھیرنے کے بعد آپ نے اپنے ایک مرید سے پوچھا۔ ''ابھی کچھ دیر پہلے یہاں کوئی آیا تھا؟''

مرید نے جواب دیا۔ ''حضرت! ایک نوجوان مہنہ سے آیا ہوا ہے اور آپ سے ملنا چاہتا ہے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''بلاؤ اسے۔''

اس نوجوان کو بلایا گیا۔ وہ سامنے آیا تو آپ نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟''

نوجوان نے جواب دیا۔ ''میرا نام ابوسعید ہے اور میں ابوالخیر کا بیٹا ہوں جو غزنی میں دوائیں بیچتے رہے ہیں۔''

آپ نے پوچھا۔ ''پھر میرے پاس کیوں آئے ہو؟''

ابوسعید نے جواب دیا۔ ''آپ سے کچھ حاصل کرنے۔''

آپ نے ابوسعید میں کشش محسوس کی اور فرمایا۔ ''اگر واقعی تمہارا یہ خیال ہے تو تم میری خانقاہ میں میرے ساتھ رہ سکتے ہو۔''

ابوسعید آپ کے پاس رہنے لگے۔ آپ کے حجرے کے برابر جو حجرہ تھا، وہ ابوسعید کو دے دیا گیا۔

آپ نے ایک نوجوان کو دیکھا جو بہت زیادہ نمازیں پڑھتا تھا۔ رات کو آپ بھی دیر تک نمازیں پڑھتے رہتے تھے اور پھر ابوسعید بھی ان دو میں شامل ہو گئے۔

ایک رات نصف شب کے بعد آپ نے دیکھا دونوں نماز میں مشغول ہیں۔ یہ ان دونوں کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔ جب سلام پھیرا گیا تو آپ نے اس نوجوان کو سمجھایا۔ ''تو راتوں کو جاگ کر نمازیں کیوں پڑھا کرتا ہے؟ کیا تجھ کو نہیں معلوم کہ رسول اللہ ﷺ اس کو دوسروں کے لیے پسند نہیں فرماتے تھے۔''

نوجوان نے جواب دیا۔ ''حضرت! آپ کے سوال اور میرے جواب سے ہمیں واہ واہ کے سوا کچھ بھی نہیں ملے گا۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''ہاں ایسا ہی ہوگا۔''

نوجوان نے پوچھا۔ ''پھر میں کیا کروں؟''

آپ نے فرمایا۔ ''نمازوں میں بہت زیادہ وقت نہ دیا کر۔''

نوجوان نے پوچھا۔ ''کیا میں تہجد نہ پڑھا کروں؟''

آپ نے فرمایا۔ ''میں تہجد سے کیوں روکوں گا؟ میں تو وقت کے بے تحاشا استعمال کی بات کر رہا ہوں۔''

نوجوان نے پوچھا۔ ''پھر میں کیا کروں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''راتیں سونے کے لیے بنائی گئی ہیں۔ اس لیے راتوں کو سو جانا چاہیے۔''

نوجوان آپ کی بات مان گیا اور اپنے حجرے میں چلا گیا۔ آپ بھی اپنے حجرے میں چلے گئے۔

کچھ دیر بعد ایک مرید نے آپ کو مطلع کیا۔ ''حضرت! ابوسعید اب بھی نمازیں پڑھ رہے ہیں۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''اس کو پڑھنے دو۔''

مرید مایوس ہو کر چلا گیا۔

کچھ دیر بعد دوسرا مرید آیا اور عرض کیا۔ ''حضرت! ہم نے ابوسعید کو مطلع کر دیا کہ رات سونے کے لیے بنائی گئی ہے اس لیے آپ آرام کریں جا کر لیکن ابوسعید نہیں مانے اور نمازوں میں مشغول رہے۔''

آپ نے پوچھا۔ ''پھر میں کیا کروں؟''

مرید نے عرض کیا۔ ''ابوسعید کو نمازیں پڑھنے سے روک دیں۔''

آپ نے پوچھا۔ ''مگر کیوں؟ آخر کیوں؟''

مرید ڈر گیا۔ خوفزدہ لہجے میں جواب دیا۔ ''آپ ہی نے تو فرمایا تھا کہ راتیں سونے کے لیے.....''

آپ نے جواب دیا۔ ''ہاں میں نے یہ بات کہی تھی لیکن یہ بات سب کے لیے نہیں ہے۔''

مرید خاموش ہو کر واپس جانے لگا۔

آپ نے اسے روک لیا۔ ''ٹھہر جا۔''

مرید ٹھہر گیا اور کن انکھیوں سے آپ کی طرف دیکھنے لگا۔

آپ نے اسے اپنے پاس بٹھا لیا اور سمجھانے لگے۔ ''راتیں سونے کے لیے بنائی گئی ہیں لیکن سب کے لیے نہیں۔ میرے لیے نہیں، ابوسعید کے لیے نہیں لیکن بہت سے دوسرے لوگ، اگر ان کو جاگنے پر مجبور کر دیا جائے تو وہ ایک نہ ایک دن نماز سے بیزار ہو جائیں گے۔ اس لیے ایسے لوگوں کو رات کی جگائی سے روک دینا چاہیے۔ ابوسعید ان میں شامل نہیں ہے۔''

مرید اپنے حجرے میں واپس چلا گیا۔

مصر کے ایک عالم صوفی نے آپ کا ذکر جو سنا تو سیدھا آمل پہنچ گیا اور یہاں کے مختلف الخیال افراد سے ملاقات کی۔ ان سے پوچھا۔ ''یہ ابوالعباس کیسے آدمی ہیں؟''

ایک تاجر نے جواب دیا۔ ''بہت اچھے آدمی ہیں اور ان کا کمال یہ ہے کہ پڑھنا لکھنا نہیں جانتے مگر علم لدُنی سے مالا مال ہیں۔''

مصر کے صوفی عالم نے ایک دکاندار سے پوچھا۔ ''اگر میں ان کے پاس جاؤں تو وہ مجھ سے کس طرح پیش آئیں گے؟''

دکاندار نے جواب دیا۔ ''وہ بہت با اخلاق ہیں اس لیے یقین ہے بہت اچھی طرح پیش آئیں گے۔''

ایک بزاز سے پوچھا۔ ''اگر میں آمل میں مستقلاً رہ جاؤں تو کیا یہاں کے لوگ مجھ کو گوارا کر لیں گے۔''

بزاز نے جواب دیا۔ ''اگر تم میں کچھ ہوگا تو وہ تمہاری بڑی عزت کریں گے اور اگر خالی نکلے تو لوگ آمل سے نکال باہر کریں گے۔''

مصر کے صوفی عالم کی اب بھی تشفی نہیں ہوئی تھی۔ ایک عالم سے پوچھا۔ ''جناب والا! یہ ابوالعباس کیسے آدمی ہیں؟''

عالم نے جواب دیا۔ ''بہت اچھے آدمی ہیں۔ تمہیں ایک بھی آدمی ایسا نہیں ملے گا جو ان سے متاثر اور مطمئن نہ ہوا ہو۔''

مصر کے صوفی عالم نے کہا۔ ''آپ لوگ ان کے گرد رہتے ہیں۔ وہ آپ کے ہم وطن ہیں اسی لیے ان کی بڑھ چڑھ کے تعریفیں کر رہے ہیں لیکن اب ایسا نہیں ہوگا۔ کم از کم میں، جس نے جامعہ ازہر سے بہت سا علم حاصل کیا ہو اور جس کو تصوف سے بہت زیادہ واقفیت حاصل ہو۔ وہ ابوالعباس جیسے جاہل صوفی کا اتباع کیوں کرے۔''

عالم نے جواب دیا۔ ''پہلے ان سے مل لے، پھر باتیں کرنا۔''

مصری عالم نے کہا۔ ''میں ان کی خانقاہ میں جا رہا ہوں اور جس کو دیکھنا ہو، وہاں چل کے دیکھ لے، کیسا زلزلہ آ جائے گا وہاں میرے پہنچنے سے۔''

کچھ لوگوں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے، ہم یہ تماشا ضرور دیکھیں گے۔''

مصری عالم آپ کی خانقاہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے تماشائی چلے۔ کچھ دور جا کے مصری عالم نے تماشائیوں کو ملامت کی، کہنے لگا۔ ''یہ کیا بھیڑ لگا رکھی ہے تم لوگوں نے۔ اپنے گھروں کو واپس جاؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی مصیبت میں پھنس جاؤ۔''

بھیڑ بھاڑ کم ہو گئی۔ زیادہ تر واپس چلے گئے۔

مصری عالم آپ کی خانقاہ میں داخل ہوتے ہی تکبرانہ انداز میں اِدھر اُدھر نظریں ڈالتا ہوا غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔ آپ بھی سامنے ہی موجود تھے لیکن اس نے آپ کو دیکھا تک نہیں۔ پاس ہی ابوسعید بھی بیٹھے تھے۔ انہوں نے اپنے مرشد ابوالعباس سے پوچھا۔ ''حضرت! یہ کون گستاخ ہے کہ آپ کو سلام تک نہیں کیا۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''علمیت کے نشے نے اس کو آپے سے باہر کر دیا ہے۔''

مصری عالم نے غسل خانے میں داخل ہوتے ہی بدھنے (مٹی کے لوٹے) توڑنا شروع کر دیے۔ بعض بدھنوں سے استنجے کا کام لیا حالانکہ ان بدھنوں سے وضو کیا جاتا تھا۔

ایک مرید نے غسل خانے کے در پر کھڑے ہو کر ان کی توڑ پھوڑ کا تماشا دیکھا۔ مصری عالم کو جیسے ہی یہ محسوس ہوا کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے تو وہ پلٹا اور مرید کو پکڑ لیا۔ مرید ڈر گیا۔ مصری عالم نے اس سے پوچھا۔ ''تو یہاں کیا کر رہا ہے؟''

مرید نے جواب دیا۔ ''آپ ہمارے مہمان ہیں۔ میں یہاں یہ معلوم کرنے آیا تھا کہ آپ کو یہاں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔''

مصری عالم نے برا سا منہ بنایا اور کہا۔ ''مجھے کِلا درکار ہیں کِلا (بدھنے)۔''

مرید نے عرض کیا۔ ''خوب! حیرت تو یہ ہے کہ یہاں جو بدھنے موجود تھے، انہیں آپ نے توڑ ڈالا اور اب آپ کو مزید بدھنے توڑ پھوڑ کے لیے درکار ہیں۔''

مصری عالم نے جواب دیا۔ ''اے شخص! میں یہاں باتیں یا بحث کرنے نہیں آیا۔ مجھے مسجد کے لیے بدھنے درکار ہیں۔''

مرید نے عرض کیا۔ ''آپ کو مسجد کے لیے نہیں، اپنے لیے درکار ہیں اور آپ ان کو بھی توڑ ڈالیں گے۔''

مصری عالم نے غصے میں پوچھا۔ ''کہاں ہے تیرا شیخ۔ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں اور یہاں میں یہ سنگ بھی دکھا دوں گا جو عمارتوں کی.....''

مرید نے جواب دیا۔ ''سنگ؟ کون سا سنگ؟ تم یہ کیسی باتیں کر رہے ہو؟''

مصری عالم نے کہا۔ ''میں فضول باتیں نہ کرتا ہوں اور نہ سنتا ہوں۔ تُو نے میری بات نہیں سنی۔ اپنے شیخ سے کہہ کہ مجھے کِلا درکار ہیں۔ فوراً منگوا دے مجھے۔''

مرید، مرشد کے پاس گیا اور پوری صورتِ حال بتا کر کہا۔ ''حضرت! وہ تو کلا کی بات کر رہا تھا۔ کہتا تھا مجھے فوراً کِلا منگوا دو۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''اگر وہاں بدھنے موجود نہیں ہیں تو بازار سے خرید کر غسل خانے میں پہنچا دو۔''

مرید نے عرض کیا۔ ''حضرت! جس طرح غسل خانے کے بدھنے توڑ دیے گئے ہیں، اسی طرح یہ بدھنے بھی توڑ دیے جائیں گے۔ اس لیے میرے خیال میں بازار سے ایک بدھنا بھی نہ منگوایا جائے۔''

آپ نے درشت لہجے میں فرمایا۔ ''جو میں کہہ رہا ہوں وہ کر۔ بدھنے اسی وقت منگوائے جائیں۔''

مرید اسی وقت بدھنوں کی خریداری کے لیے بازار چلا گیا۔

مصری عالم برہمی کی حالت میں غسل خانے سے نکلا اور بہ آوازِ بلند کہا۔ ''کہاں ہیں بدھنے؟ اگر وہ خانقاہ میں موجود نہیں ہیں تو اپنے شیخ سے کہو، وہی میرے پاس آجائے تاکہ میں اس کی ڈاڑھی سے استنجا کروں۔''

آپ کو یہ سن کر غصہ آگیا اور اپنی جگہ کھڑے ہو گئے، بولے۔ ''تو قصاب کے بیٹے کا کام اب یہاں تک پہنچ گیا کہ اس کی ڈاڑھی کسی کے کام آجائے۔ خوب، ذرا میں بھی تو اس مصری عالم کی بدمستی کو دیکھوں۔''

آپ نے اپنی ڈاڑھی مٹھی میں پکڑ رکھی تھی۔ مصری عالم کو اپنے اندر ایک ارتعاش محسوس ہوا۔ یہ ارتعاش بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ پورا وجود جھٹکے محسوس کرنے لگا۔ وہ گھبرا کر آپ کے قدموں میں گر گیا۔ کہنے لگا۔ ''حضرت! میں اپنی نادانی پر شرمسار ہوں۔ مجھے معاف کر دیجیے۔''

اس کی آواز بھی کپکپا رہی تھی۔ آپ نے پوچھا۔ ''تُو نے جو کچھ کہا، اس سے میں اس شبہے میں پڑ گیا کہ تُو مسلمان بھی ہے یا نہیں؟''

مصری عالم نے جواب دیا۔ ''میرا دل اندھیروں میں تھا۔ اب میں اس اندھیرے کو اسلام کی روشنی سے دور کر دینا چاہتا ہوں۔ میں دوبارہ مسلمان ہونا چاہتا ہوں۔''

آپ نے اس کو دوبارہ مسلمان کیا۔ اس نے توبہ کی۔ آپ نے اس کو دعائیں دیں اور وہ کچھ دیر بعد اپنی اصل حالت میں آگیا۔

☆☆☆

آپ بازار سے گزر رہے تھے۔ آپ نے ایک اونٹ کو اس حال میں دیکھا کہ اس پر بہت زیادہ بوجھ لدا ہوا تھا۔ اونٹ کی مہار ایک لڑکے کے ہاتھ میں تھی۔ اونٹ سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ آپ نے لڑکے سے کہا۔ ''لڑکے! اس پر اتنا بوجھ کیوں لاد دیا کہ اس کو چلنا دوبھر ہو رہا ہے۔''

لڑکے نے کوئی جواب نہیں دیا اور آپ کے پاس سے گزرتا چلا گیا۔

کچھ دیر بعد آپ نے بازار کے نکڑ پر لوگوں کا ہجوم دیکھا۔ آپ وہاں گئے اور پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟ یہ ہجوم کیسا ہے؟''

بازار کا ہر شخص آپ سے واقف تھا۔ آپ کو دیکھ کر راستہ دے دیا۔ ایک شخص نے کہا۔ ''حضرت! آپ خود دیکھ لیں کہ یہ ہجوم یہاں کیوں ہے؟''

آپ نے دیکھا اونٹ پھسل کر زمین پر گر چکا ہے اور اس کا سامان زمین پر بکھر گیا ہے۔ یہ اونٹ جہاں پر پھسلا تھا، وہاں خاصا کیچڑ تھا۔

آپ نے روتے ہوئے لڑکے سے کہا۔ ''لڑکے! تُو روتا کیوں ہے۔ اونٹ پر سامان بار کر اور اپنے گھر کی راہ لے۔''

لڑکے نے روتے ہوئے کہا۔ ''حضرت! میں سامان کیا بار کروں۔ شاید آپ نہیں جانتے کہ پھسل کر گر جانے سے اونٹ کے پاؤں کی ہڈی ٹوٹ چکی ہے۔ اس وقت یہ میرے کام ہی کا نہیں رہا۔ یہی تو رونا ہے کہ میں اس سامان کو گھر تک کس طرح لے جاؤں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''تُو نے اس پر بوجھ بھی تو بہت زیادہ لاد دیا تھا۔''

لڑکے نے زار و قطار رونا شروع کر دیا۔ آپ کو اس پر رحم آ گیا۔ آپ نے اونٹ کی مہار پکڑ لی اور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''خدایا! میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ مجھ سے اس لڑکے کا رونا نہیں دیکھا جاتا۔ مجھ پر اور اس لڑکے پر رحم فرما۔ اس کے اونٹ کو صحیح کر دے تاکہ یہ اپنا سامان لے کر یہاں سے چلا جائے۔''

دعا مانگتے مانگتے دل کو قرار سا آ گیا اور لڑکے سے پوچھا۔ ''لڑکے! کیا بات ہے؟ تُو نے اپنے اونٹ کو اچھی طرح سے دیکھا بھی تھا یا یوں ہی شبہے میں یہ کہہ رہا ہے کہ اس کا پاؤں ٹوٹ گیا۔ ایک بار پھر اس کے پاؤں کو اچھی طرح دیکھ بھال لے۔''

لڑکے نے جواب دیا۔ ''جنابِ والا! میں نے اس کے ٹوٹے ہوئے پاؤں کو کئی بار دیکھا ہے اور اسی بنیاد پر میں یہ کہتا ہوں کہ اونٹ کا ایک پاؤں ٹوٹ چکا ہے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''ایک بار میرے کہنے سے پھر دیکھ لے۔ مجھے تو اونٹ صحیح سلامت نظر آ رہا ہے۔''

لڑکا اونٹ کے پاس گیا اور اس کی چاروں ٹانگوں کا خوب اچھی طرح معائنہ کیا۔ کسی پاؤں میں بھی ٹوٹ پھوٹ نہیں تھی۔ اس نے شرمندگی سے سر اوپر اٹھایا اور کہا۔ ''پیر مرشد! اونٹ تو صحیح سلامت نظر آ رہا ہے۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''اگر اونٹ صحیح سلامت ہے تو اس پر اپنا سامان بار کر اور اپنے گھر کی راہ لے۔''

لڑکے نے جلدی جلدی اونٹ پر اپنا سامان لادا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

آپ نے اپنے مریدوں کو تلقین کی۔ ''دیکھو، تم اللہ تک رسائی کے لیے مجھے واسطہ بناتے ہو جو میرے نزدیک درست نہیں۔ ہر شخص کو اپنے مالک سے خود تعلق پیدا کرنا چاہیے۔ اگر ایسا نہیں کیا جائے گا تو تکلیف اٹھانا پڑے گی۔''

ایک مرید نے پوچھا۔ ''پیر مرشد! آپ کو واسطہ بنانے سے دل کو ایک گونہ سکون حاصل ہو جاتا ہے لیکن اس سے براہِ راست تعلق پیدا کرنے سے ہمیں کیا فائدہ حاصل ہوگا، بس یہ بتا دیں ہمیں۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''اگر تم اس سے خوگرفتہ ہو جاؤ گے تو جب تم پر کوئی بلا نازل ہوگی تو تم کو خدا کا سہارا براہِ راست حاصل ہوگا اور یہ تعلق بلا کی شدت کو کم کر دے گا۔''

ایک مرید نے پوچھا۔ ''کیا ایسا ممکن نہیں ہے کہ اللہ ہماری مرضی اور پسند کے مطابق بلا کو ٹال دے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''ایسا کبھی نہ سوچنا ورنہ بہت دکھ میں رہو گے۔ اللہ بندوں کی پسند یا ناپسند سے اپنے نوشتے اور تقدیر کو تبدیل نہیں کرتا۔ جب تم اپنے دل میں یہ بٹھا لو گے تو اللہ کی ہر مشیت اور حکم کو بہ آسانی جھیل جاؤ گے۔ جو بھی اس سے خوگرفتہ ہو جائے گا، خوش رہے گا۔''

آپ کی ہر نصیحت اور ہر ہدایت سننے والوں کے دلوں میں اتر جاتی تھی۔ مہنہ کے ابوسعید کے دل پر ان کا کچھ زیادہ ہی اثر ہوتا تھا۔

آپ کے پاس دو شخص آئے اور بیٹھ گئے۔ پاس ہی ابوسعید بھی بیٹھے تھے۔ آپ نے ابوسعید سے پوچھا۔ ''ان دونوں کی شکلیں بتاتی ہیں کہ کسی مسئلے نے انہیں پریشان کر رکھا ہے۔ ان سے پوچھا، کیا بات ہے؟''

ابوسعید نے ان سے پوچھا تو ایک نے کہا۔ ''حضرت! کچھ دیر پہلے ہم دونوں میں ایک بحث چھڑ گئی۔ میں کہتا ہوں کہ

اندوہ وغم ازلی اور کامل ہیں اس لیے ساتھ ہی ابدی بھی لیکن میرا یہ دوست کہتا ہے کہ نشاطِ ازل، ازلی اور ابدی ہیں بلکہ کامل تر بھی۔ اب آپ ہی فیصلہ فرمائیں کہ کون درست کہتا ہے اور کون غلط فہمی میں مبتلا ہے؟''

آپ نے دونوں کی باتوں پر غور کیا اور پھر آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ ''یہ تم دونوں کس خام خیالی میں مبتلا ہو۔ سوچنے اور فکر کرنے کا یہ کون سا انداز ہے؟''

اس کے بعد آپ نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور کہنے لگے۔ ''الحمدللہ کہ قصاب کا یہ بیٹا اس طرح نہیں سوچتا۔ اس کی منزل نہ تو غم ہے نہ شادی۔ (تمہارے رب کے پاس نہ صبح ہے نہ شام) شادی اور غم تو تمہاری صفت ہیں اور یہ حادث ہیں۔ حادث کا قدیم کی طرف کوئی راستہ نہیں۔ قصاب کا فرزند اللہ کا بندہ ہے۔ امر و نہی کی اطاعت اور پابندی اور رسول مقبول ﷺ کی سنت کی پیروی اس کا راستہ ہے اور یہ ان کا مطیع ہے۔ اگر کوئی شخص جواں مردوں میں راہِ مستقیم پر گامزن ہونے کا مدعی ہے تو اس کی یہی گواہی ہے۔''

دونوں نے آپ کا فیصلہ مان لیا اور آپ کے پاس سے چلے گئے۔

ابوسعید نے ان دونوں کے بارے میں پوچھا۔ ''کیا آپ ان دونوں سے واقف ہیں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں ان سے واقف ہوں۔ ان میں سے ایک تو ابوالحسن خرقانی تھے اور دوسرے ابو عبداللہ داستانی۔''

آپ اپنے مریدوں کو بتا رہے تھے۔ ''لوگو! اللہ کی جملہ مخلوق آزادی کی طالب رہتی ہے لیکن میں اس سے بندگی کا طالب ہوں کیونکہ بندے کی سلامتی اس کی بندگی میں ہے۔ آزادی طلب کرنے سے بندہ ہلاکت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔''

جب ایک مرید نے آپ سے کہا۔ ''حضرت! میں بہت پریشان ہوں اور آپ سے دعا کا طالب ہوں۔''

تو آپ نے فرمایا۔ ''تو جانتا ہے کہ ہم دونوں کے مابین کیا فرق ہے؟''

مرید نے کہا۔ ''نہیں، میں نہیں جانتا۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''بس یہ کہ تو اپنا مدعا مجھ سے بیان کرتا ہے اور میں اپنا مدعا خدا سے بیان کرتا ہوں۔''

مرید شرمندہ ہو گیا۔ آپ نے مزید فرمایا۔ ''تم مجھے دیکھتے اور سنتے ہو اور میں اس کو دیکھتا اور سنتا ہوں حالانکہ انسان ہونے میں ہم دونوں برابر ہیں۔''

مریدوں نے اپنے سر جھکا لیے۔ آپ کی نظریں ان سب پر باری باری پڑ رہی تھیں۔ مریدوں میں وہ لوگ بھی موجود تھے جن کا تعلق درباروں سے تھا اور وہ دربار کے اعلیٰ منصب داروں کی خوشامد درآمد میں لگے رہتے تھے۔ آپ نے ان کو بطورِ خاص مخاطب کیا۔ ''لوگو! کیا تم جانتے ہو کہ ثواب کس چیز میں ہے؟''

کئی آوازیں بلند ہوئیں۔ ''ارشاد، آپ بتائیں گے تو ہم جانیں گے۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''اہلِ دنیا کی محبت سے زیادہ ثواب اس چیز میں ہے کہ بھوک میں ایک لقمہ کم کھایا جائے۔ تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ اہلِ دنیا جس شے کو عزت و توقیر کی نظروں سے دیکھتے ہیں، عقبیٰ میں ان کی حیثیت ذرہ برابر بھی نہیں ہوگی۔''

اجتماع پر سناٹا طاری تھا۔ آپ کا لہجہ پُرجوش ہوتا چلا گیا۔ آپ فرماتے رہے۔ ''میری اطاعت اور معصیت دو چیزوں سے وابستہ ہے۔ اول جب میں کھانا کھاتا ہوں تو میرے اندر ارتکابِ معصیت کا جذبہ رونما ہوتا ہے۔ دوم یہ کہ جب میں کھانا نہیں کھاتا تو جذبۂ عبادت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کھانے سے عبادتِ الٰہی سے نفرت اور رغبتِ گناہ پیدا ہوتی ہے اور فاقہ کشی سے نفسانی خواہشات ختم ہو جاتی ہیں اور دل خود بخود عبادتِ الٰہی کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ترکِ غذا بذاتِ خود ایک ایسی عبادت ہے جو عبادت کی رغبت پیدا کرتی ہے۔''

آپ نے دنیا کے بارے میں بطورِ خاص فرمایا۔ ''دنیا تو نجس ہے لیکن وہ قلب اس سے بھی زیادہ نجس ہے جس نے دنیا کی محبت اختیار کر لی۔''

آپ کی باتوں میں بڑا مزہ آ رہا تھا۔ اسی وقت ایک شخص مجلس میں کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا۔ ''آپ بڑی کارآمد باتیں کرتے ہیں۔ اب ذرا کرامات کی باتیں ہو جائیں۔''

آپ نے پوچھا۔ ''یہ کرامات کی باتیں کیا ہوتی ہیں؟''

سوال کرنے والے نے جواب دیا۔ ''آپ اس دور کے ولی ہیں اور ولیوں سے کرامات کا ظہور ہوتا ہے۔ آپ بھی

کرامات دکھائیں۔''

آپ نے فرمایا۔''یہاں کون سی بات ہے جو کرامت نہیں ہے۔ میری باتیں غور سے سن اور دیکھ کہ اس میں کتنی کرامتیں موجود ہیں۔''

سوالی نے کہا۔''ارشاد، فرمائیں۔''

آپ نے کہا۔''میں قصاب کا بیٹا ہوں۔ باپ نے قصابی سکھائی مگر اس کو کچھ ایسا دکھایا گیا کہ اس نے اپنے آبائی پیشے کو چھوڑ دیا پھر اس کو بغداد لے جایا گیا۔ وہاں سوز گرم رکھنے والے صوفی ابوبکر شبلیؒ سے ملاقات کرائی گئی اور پھر مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ سے اٹھا کے بیت المقدس پہنچا دیا گیا۔ وہاں خواجہ خضرؑ سے ملاقات کرادی گئی۔ خواجہ خضرؑ سے ملاقات اور ان کی خاطر تواضع مجھے ہمیشہ یاد رہیں گی۔''

سوال کرنے والے کا سر فخر سے اونچا ہو گیا۔ وہ خوش تھا کہ اس کا وجود ابوالعباس قصاب کے سامنے یوں باتیں کر رہا تھا جیسے وہ دونوں ایک دوسرے کے گہرے دوست ہوں۔

آپ نے سکوت اختیار کیا۔ کچھ دیر بعد سوال کرنے والے نے اپنا سوال پھر دہرایا۔''حضرت! کوئی کرامت دکھائیں۔''

آپ نے کہا۔''پھر وہی سوال۔ کیا تو نے میرا جواب نہیں سنا؟''

اس نے جواب دیا۔''جواب سنا کیوں نہیں۔''

آپ نے فرمایا۔''مزید یہ کہ کیا یہ کرامت نہیں ہے کہ میں نے ایک دنیا کو اپنی طرف متوجہ کرلیا ہے۔ اندھیروں سے آنے والے خراباتی یہاں سے روشنی لے کر واپس جاتے ہیں۔ وہ توبہ کرتے ہیں۔''

اس نے پھر وہی بات کی۔''حضرت! میں کرامت کی بات کر رہا ہوں۔ مجھے کوئی کرامت دکھائیں۔''

آپ نے جواب دیا۔''قصاب کا فرزند جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتا، وہ بزرگوں کا صدر نشیں قرار پایا۔ دیوار اس پر نہیں گرتی، مکان اس پر نہیں گرتا۔ مُلک اور ملک کے بغیر صاحب ولایت ہے۔''

ابوسعید نے مداخلت کی اور کہا۔''آپ ایک ایسے شخص کو سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں جو لفظ کرامت کے معنی و مفہوم سے بھی واقف نہیں۔''

آپ نے فرمایا۔''تو بھی صحیح کہتا ہے۔'' پھر سوال کرنے والے سے کہا۔''تیری یہاں ضرورت ہی نہیں۔ اب یہاں سے چلا جا۔''

وہ شخص چلا گیا اور اس کے چلے جانے کے بعد آپ نے حاضرین سے کہا۔''لوگو! یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ دنیا میں شہرت اور مقام ان کو ملتا ہے جو کم کام کرتے ہیں۔ اسی طرح میرا خیال ہے کہ ہم اندھیروں پر قابو پا کر بھی اندھیروں سے بہت کم نجات پاتے ہیں۔''

آپ نے اپنے اقوال اور مجاہدات سے ایک زمانے کو متاثر کرلیا۔

☆☆☆

شیخ الاسلام ابوعبداللہ ہروی کا بچپن تھا۔ انہوں نے ابوالعباس آملی کا ذکر بہت سنا تھا۔ ہرات سے آمل دور تھا اس لیے آپ اپنے بزرگ اعزا سے یہ کہا کرتے تھے کہ مجھے آمل کے اس بزرگ سے ملوا دو۔

بزرگ وعدہ کر لیتے کہ جب بھی آمل کی طرف جانا ہوا، ساتھ لے جا کے ملوا دیا جائے گا۔

یہاں آمل میں آپ اپنی خانقاہ کے ایک حجرے میں چالیس اکتالیس سال تک موجود رہے اور وہیں نمازیں ادا کرتے رہے۔

ابوسعید آپ کے بہت پیارے مرید تھے۔ خانقاہ میں جو بھی تھا اس بات کا امیدوار تھا کہ آپ کی طرف سے جو بھی فیضان ہو، اسی کو ہو۔

آپ کبھی کبھی فصد کھلوایا کرتے تھے۔ اس روز بھی آپ نے اپنی فصد کھلوائی اور خون رکنے کا انتظار کرنے لگے۔ خون نہیں رکا۔ ابوسعید اب تو جانے کی اجازت بھی نہیں مانگ سکتے تھے۔ یہاں سے ان کو اب تک جو کچھ ملا تھا، وہ ناکافی تھا۔

فصد کھلوا کے آپ باہر نکلے تو ان کے پیچھے پیچھے ابوسعید بھی نمودار ہوئے اور آپ کے خون آلود کپڑے دیکھ کر سوال کیا۔

''حضرت! یہ کیا، یہ سرخ سرخ نشان؟ یہ کیوں؟''

انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ابوسعید نے ان سے درخواست کی۔''حضرت! یہاں اس وقت کوئی نہیں ہے۔ آپ

اپنے خون آلود کپڑے مجھے دے دیں۔ میں انہیں دھو کر پھیلا دوں گا۔
آپ نے پوچھا۔ ''اگر میں اپنے کپڑے تجھ کو دے دوں تو پہنوں گا کیا؟''
ابوسعید نے جواب دیا۔ ''رات کے اندھیرے میں آپ میرے کپڑے پہن لیں۔ جب آپ کے کپڑے سوکھ جائیں گے، میں انہیں آپ کے حوالے کر دوں گا۔ آپ میرے کپڑے مجھ کو واپس کر دیجیے گا۔''
آپ نے کہا۔ ''بہتر ہے۔''
ابوسعید نے دیوار کی آڑ سے اپنے کپڑے ان کو دے دیے اور خود ان کا خون آلود لباس دھونے لگے۔
کچھ دیر بعد آپ نے ابوسعید سے کہا۔ ''اے ابوسعید! جب میرے کپڑے خشک ہو جائیں تو انہیں تم پہن لینا۔''
ابوسعید نے جواب دیا۔ ''بہتر ہے۔''
وہ دیر تک رگڑ رگڑ کر لباس دھوتے رہے۔ خون کے دھبے ہلکے تو پڑ گئے مگر کپڑے پر موجود تھے۔ ابوسعید نے انہیں سوکھنے کے لیے پھیلا دیا اور خود اندھیرے میں ایک جگہ بیٹھ گئے۔
صبح لوگوں نے یہ دلچسپ منظر دیکھا کہ ابوالعباس کا خون کے دھبوں والا لباس تو ابوسعید کے جسم پر ہے اور ابوسعید کا لباس ان کے پیر مرشد کے جسم پر۔
ایک مرید نے آپ سے پوچھا۔ ''حضرت! یہ کیا؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''لوگو! تمہیں کیا معلوم، کل رات رحمتوں کا نزول ہو رہا تھا۔ وہ سب کی سب ابوسعید کو مل گئیں۔ اے ابوسعید! تمہیں مبارک ہو۔''
اس دن آپ نے ابوسعید کو اپنے وطن جانے کی اجازت دے دی۔

☆☆☆

ابوعبداللہ ہروی اس روز بھی ضد کر رہے تھے۔ ''آخر آپ لوگ مجھے آمل کیوں نہیں لے جاتے؟''
ان کے چچا نے کہا۔ ''میں پرسوں آمل جاؤں گا۔ میرے ساتھ تم بھی چل سکتے ہو۔''
ابوعبداللہ نے آمل جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ان کے چچا بھی ابوالعباس کی ولایت اور بزرگی کے بہت قائل تھے۔
وہ دن آ گیا اور ابوعبداللہ ہروی اپنے چچا کے ساتھ آمل روانہ ہو گئے۔ ہرات سے آگے نیشاپور تھا۔ نیشاپور میں ان کے قافلے کو ایک دوسرا قافلہ مل گیا۔ یہ قافلہ جرجستان سے آیا تھا۔
آپ نے میر قافلہ سے پوچھا۔ ''کیا آپ لوگ جرجستان سے آ رہے ہیں؟''
میر قافلہ نے جواب دیا۔ ''ہاں، ہم وہیں سے آ رہے ہیں۔ کیوں، کوئی خاص بات؟''
آپ نے کہا۔ ''میں آمل کے شیخ ابوالعباس کے پاس جا رہا ہوں۔ میں خود تو ان سے بارہا مل چکا ہوں لیکن میرا بھتیجا ان سے ایک بار بھی نہیں ملا۔''
میر قافلہ نے اپنا سر جھکا لیا، پوچھا۔ ''آپ ابوعبداللہ کو ابوالعباس سے کس طرح ملائیں گے؟''
انہوں نے پوچھا۔ ''کیوں، تم یہ سوال کیوں کر رہے ہو مجھ سے؟''
میر قافلہ نے جواب دیا۔ ''میں نے یہ سوال اس لیے کیا کہ میں ان کے بارے میں آخری اور تازہ معلومات تم تک پہنچاؤں۔ ان کو وصال فرمائے چھ ماہ گزر چکے ہیں۔ تمہیں اس کا پتا ہی نہیں۔''
اس خبر نے دونوں ہی کو بے قرار کر دیا۔ ابوعبداللہ ہروی کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ بے قراری سے پوچھا۔ ''عم محترم! اب کیا ہوگا؟ اب میں ان سے کس طرح ملوں گا؟''
چچا نے جواب دیا۔ ''اب تم ان سے کبھی بھی نہیں مل سکو گے۔ افسوس، صد افسوس۔''
ان کے چچا نیشاپور ہی سے واپس ہرات چلے گئے۔
ابوعبداللہ ہروی بعد میں شیخ الاسلام ہو گئے۔ انہیں زندگی بھر اس کا ملال رہا کہ وہ ابوالعباس آملی سے ملاقات نہیں کر سکے۔

ماخذات

(تذکرۃ الاولیاء، شیخ فرید الدین عطار۔ نفحات الانس، مولانا عبدالرحمٰن جامی۔
الطبقات الاولیاء، علامہ عبدالوہاب الشعرانی۔ نزھت البساتین، عمر یافعی یمنی)

اسے ڈکیتی کہیں یا نوسربازی..... ایک عجیب و شاطرانہ واردات تھی۔ کہتے ہیں..... ''جب تک دنیا میں لالچی لوگ موجود ہیں، ٹھگ بھوکے نہیں مریں گے۔'' اس واردات میں بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ وسیم عرف وسدا، ایک شاطر اور ذہین وارداتیا تھا۔ ہر واردات کا ایک نیا انداز اور طریقہ ہوتا تھا۔ اس بار بھی ایک منفرد طریقہ اختیار کیا۔ وسدا ملتان گھنٹا گھر چوک پر پہنچا۔ یہاں متعدد دِہاڑی دار مزدور صبح سویرے ہی اپنی روزی کی تلاش میں بیٹھے ہوتے تھے۔ امتیاز نامی مزدور

دلوں میں بڑھتی رنجشوں سے جنم لینے والی سازشوں کا قصہ

واردات کوئی بھی ہو... ہمیشہ قیمتی مال کا ہی نقصان ہوتا ہے... جبکہ واردات سے قبل ہونے والی سازشیں اکثر مطلوبہ لوگوں کے سامنے ہی ترتیب دی جارہی ہوتی ہیں مگر... لاعلمی عیاری کے ساتھ ہاتھ باندھے کھڑی رہتی ہے اور قیامت ڈھانے والے قیامت ڈھاکر گزر بھی جاتے ہیں لیکن... کہیں نہ کہیں قدرت ان کا راستہ روکے کھڑی ہوتی ہے جس کے سامنے تمام عیاروں کی عیاری ہاتھ جوڑے پناہ مانگ رہی ہوتی ہے لیکن قدرت کبھی کسی کو معاف نہیں کرتی۔

سید غضنفر محمود

انوکھی واردات

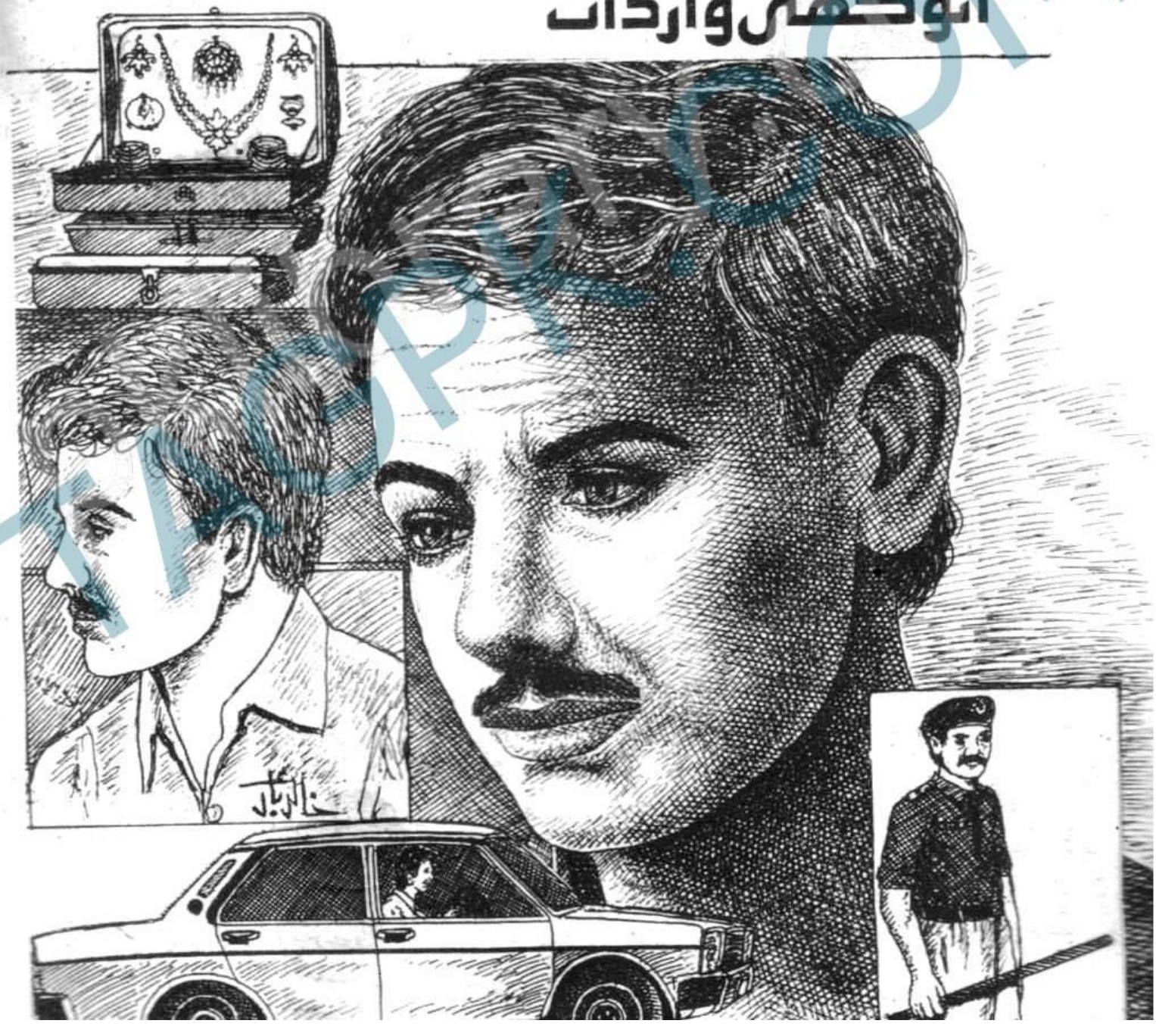

بھی مزدوری کے لیے فٹ پاتھ پر بیٹھا کسی ایسے شخص کے انتظار میں تھا جو اسے مزدوری کے لیے لے جائے۔ گو کہ امتیاز شادی شدہ نہیں تھا، میٹرک کر چکا تھا، والد کی وفات کے بعد گھر کی ذمے داریاں اس کے کندھوں پر آ گئی تھیں، چند بیگھہ زمین بھی تھی۔ اتنی کم زمین سے آمدنی بھی بہت کم تھی۔ غربت کے باعث اسے تعلیم چھوڑنا پڑی تھی۔ اسے روزانہ ہی اپنی بستی ٹاٹے پور سے ملتان مزدوری کے لیے آنا پڑتا تھا۔ تین روز سے آ رہا تھا لیکن مزدوری نہیں ملی تھی۔ وہ شدید مایوس تھا..... اچانک اس کی نظر وسیم عرف وسدا پر پڑی۔ وسیم سفید کلف والے کاٹن کے کپڑوں میں ملبوس ایک امیر شخص لگ رہا تھا۔ وسیم نے بھی امتیاز کی طرف دیکھا اور پہلی ہی نظر میں سمجھ گیا کہ یہ مزدور اس کی واردات کے لیے انتہائی معقول ہے۔

''کام کرو گے؟'' وسدے نے قریب آ کر امتیاز سے پوچھا۔

''جی صاحب! ہم مزدوری کے لیے ہی بیٹھے ہیں۔'' امتیاز نے عاجزی سے جواب دیا۔

وسدے نے امتیاز کو بتایا۔ ''میرا پورے دن کا کام نہیں، صرف تین یا چار گھنٹے کا کام ہے۔''

''صاحب! آپ چار گھنٹے کام کروائیں یا آٹھ گھنٹے، مزدوری تو پوری ہوگی۔'' امتیاز نے وضاحت کی۔

وسدا بولا۔ ''ہاں بھئی کیوں نہیں، مزدوری تو میں تمہیں پوری ہی دوں گا، آؤ میرے ساتھ۔''

وسدے نے اشارے سے ساتھ چلنے کا کہا۔ وہ دونوں پیدل ہی کچھ دور چل کر ایک چائے کے ہوٹل میں آئے۔ وسدا کہنے لگا۔ ''پہلے چائے پی لیتے ہیں پھر کام کے لیے چلتے ہیں۔''

امتیاز حیران تھا کہ آج سے پہلے کسی نے بھی اس طرح چائے کا نہیں پوچھا اور نہ ہی کوئی اسے ہوٹل لے کر گیا۔

''دراصل میرا کام مختلف نوعیت کا ہے۔ تمہیں کوئی راج گیری کا کام تو کرنا نہیں ہے، بس میرے ساتھ رہنا ہوگا۔ کچھ لوگوں سے ملوں گا اگر تھوڑا بہت سامان اٹھانا پڑا تو تمہیں اٹھانا ہوگا' میں ایک دن کی دِہاڑی سے زیادہ تمہیں مزدوری دوں گا۔'' وسدے نے امتیاز کو وضاحت سے سمجھایا۔

امتیاز سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ یہ کس قسم کا شخص ہے۔ دونوں نے تسلی سے چائے پی۔ اس دوران وسدے نے کوئی بات نہ کی۔ چائے پی چکے تو وسدا، امتیاز کے کپڑوں کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ ''تمہارے کپڑے صاف نہیں ہیں، میں تمہیں ایک نیا شلوار سوٹ دلوا دیتا ہوں۔ اسے پہن کر میرے ساتھ چلنا کیونکہ مجھے ایک دو دفاتر اور چند بڑی دکانوں پر جانا ہوگا۔ وہاں جانے کے لیے تمہارے یہ کپڑے کچھ مناسب نہیں۔'' امتیاز یہ سن کر حیران رہ گیا۔ شلوار سوٹ کے ملنے پر خاصا خوش بھی تھا۔ دونوں چائے کے ہوٹل سے باہر نکلے اور چلتے ہوئے نزدیکی مارکیٹ کی ایک گارمنٹس شاپ میں داخل ہوئے۔ بغیر مول تول کیے امتیاز کے لیے ایک کاٹن کا سوٹ خرید لیا۔ سوٹ خریدنے کے بعد وسدا، امتیاز کو ایک مین سیلون میں لے گیا۔ اس سیلون میں حمام بھی تھا۔ امتیاز نہایا، شیو بنوائی اور نیا خریدا گیا شلوار سوٹ پہن لیا، وہ اب بالکل مزدور نہیں لگ رہا تھا۔ وسدا بھانپ چکا تھا کہ امتیاز مکمل طور پر اس کے اعتماد میں آ چکا ہے۔ سیلون سے نکل کر دونوں چند قدم پیدل چلے پھر وسدے نے ایک رکشا کو رکنے کا اشارہ کیا۔ رکشا قریب آ کر رک گیا۔ رکشے والے نے وسدے کو استفساریہ انداز میں دیکھا۔

وسدا بولا۔ ''موٹر سائیکل مارکیٹ جانا ہے، جہاں استعمال شدہ موٹر سائیکل فروخت ہوتی ہیں۔''

''بیٹھیں۔'' رکشے والے نے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

امتیاز سوچ رہا تھا کہ یہ شخص خاصا پیسے والا لگتا ہے لیکن اس کے پاس گاڑی کیوں نہیں؟

''صاحب! آپ کے پاس گاڑی نہیں؟'' امتیاز نے ہمت کرتے ہوئے پوچھا۔

''ہے، بالکل ہے، میں لاہور سے یہاں اپنی تاجر پارٹیوں سے ریکوری کے لیے آیا ہوں۔ کبھی کبھار کسی مزدور کی ضرورت بھی پڑ جاتی ہے اس لیے آج تمہیں اپنے ساتھ لے لیا۔ آج صبح ہی سے لاہور سے ملتان پہنچا ہوں، اس لیے اپنی ذاتی گاڑی لانے کی ضرورت نہ تھی۔'' وسدے نے سمجھایا، امتیاز مطمئن ہو گیا۔

موٹر سائیکل مارکیٹ پہنچ کر وسدے نے کئی موٹر سائیکل شوروم کا باہر سے جائزہ لیا۔ وہ دونوں ایک شوروم میں داخل ہوئے۔ شوروم میں دو افراد بیٹھے تھے۔ یقیناً ایک مالک اور دوسرا ملازم تھا۔ ان کی عمریں بھی زیادہ نہیں تھیں۔ لگتا تھا کہ انہوں نے موٹر سائیکلیں فروخت کرنے کا نیا کام شروع کیا ہے۔ وسدا اور امتیاز موٹر سائیکلوں کو دیکھنے لگے۔ شوروم کا مالک بھی وسدے کے قریب آ گیا۔ وسدے نے ایک موٹر سائیکل پسند کی جو تقریباً نئی ہی تھی۔ ریٹ طے کرنے میں وسدے نے کافی بحث کی۔ امتیاز بھی وسدے

کی ہاں میں ہاں ملاتا گیا۔ بحث کا مقصد صرف یہ تھا کہ موٹر سائیکل خریدنے کا معاملہ پکا ہو جائے اور شوروم مالک کو کسی قسم کا شک بھی نہ ہو۔ وسدا کیونکہ ایک چرب زبان شخص تھا، جلد ہی شوروم کے مالک پر اپنا اعتماد قائم کرلیا۔ وسدے نے امتیاز کو ذرا فاصلے پر رکھی کرسی پر بیٹھ جانے کا کہا اور خود شوروم کے مالک کے ساتھ اس کے کاؤنٹر کے قریب بیٹھ گیا۔ پسند کی گئی موٹر سائیکل کا ریٹ طے ہوگیا۔ شوروم کے مالک نے ان کے لیے چائے بھی منگوائی۔

وسدا بولا۔ ''جناب! میں نے موٹر سائیکل کی ٹرائی بھی کرنی ہے۔ اس کے بعد آپ کو پے منٹ کر دیتا ہوں۔''

''کیوں نہیں، آپ چائے پی لیجیے پھر موٹر سائیکل کی ٹرائی بھی لے لیجیے گا۔'' شوروم کے مالک نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

چائے پینے کے دوران وسدا شوروم کے مالک سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ چائے ختم کی اور بولا۔ ''اگر اجازت دیں تو موٹر سائیکل کی ٹرائی لے لوں۔ میرا ساتھی.....'' اس نے امتیاز کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہاں آپ کے پاس بیٹھا رہے گا۔ میں پانچ سات منٹ میں چکر لگا کر آتا ہوں۔''

شوروم کا مالک کہنے لگا۔ ''ضرور ضرور، میں اس کی رسید اور کاغذات تیار کرتا ہوں، اتنے میں آپ ٹرائی لے کر واپس آجائیں۔''

وسدے نے امتیاز سے کہا۔ ''تم تھوڑی دیر بیٹھو میں ٹرائی لے کر آتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے صاحب! میں یہیں بیٹھا ہوں۔'' امتیاز نے عاجزی سے جواب دیا۔

وسدا موٹر سائیکل لے کر شوروم سے نکلا، اس نے واپس کہاں آنا تھا۔ اصل ٹارگٹ تو اس کا کچھ اور ہی تھا۔ اس کے منصوبے کا یہ مرحلہ کامیابی سے مکمل ہوگیا تھا۔ وہ سوچنے لگا اگر واپس شوروم نہ پہنچا تو مزدور امتیاز کا کیا بنے گا؟ اس کے ساتھ کچھ بھی ہو وہ تو میرے منصوبے کا ایک مہرہ تھا پھر شاید اس سے کبھی ملاقات بھی نہ ہو۔ سفا کی سے امتیاز کے خیال کو ذہن سے جھٹکا اور موٹر سائیکل پر آگے بڑھتا گیا۔ اسے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے قلیل وقت میں سرعت سے کام کرنا تھا۔ وہ چند منٹ بعد ہی کاروں کے شوروم والے علاقے میں پہنچ گیا۔ ایک شوروم میں داخل ہوا اور مختلف گاڑیوں کا جائزہ لینے لگا۔ وسدے کو دیکھ کر شوروم ملازم قریب آگیا۔ اس نے ملازم سے گاڑیوں کی قیمتیں معلوم کیں، ان گاڑیوں کی قیمتیں بھی معلوم کیں جو شوروم میں موجود نہیں تھیں۔ اس طرح ایک کے بعد دوسرے اور تیسرے شوروم میں گیا اور پھر واپس پہلے شوروم میں آگیا جو یقیناً وسدے کا ٹارگٹ تھا۔

وسدے نے بہترین کنڈیشن کی ایک سولہ سو سی سی کار پسند کی اور قیمت بھی طے کرلی۔ یہاں بھی اپنی چرب زبانی سے شوروم کے مالک کو اعتماد میں لے لیا۔ شہر کی کئی اہم کاروباری شخصیات سے اپنے قریبی تعلقات ظاہر کیے۔ شوروم کا مالک، وسدے سے متاثر ہو چکا تھا۔ وسدے نے جیب سے چیک بک نکالی اور مطلوبہ رقم کا چیک کاٹ کر شوروم مالک کے ہاتھ میں تھما دیا۔ وسدے نے شوروم کے مالک کو اپنے اسی نام سے تعارف کرایا تھا جو چیک بک پر لکھا تھا۔ یقیناً وہ چیک بک بھی کسی کی چوری کی گئی ہوگی۔

وسدا کہنے لگا۔ ''میں اتنی بڑی رقم جیب میں رکھ کر تو نہیں چل سکتا، آپ اپنے ملازم کو میرے ساتھ بھیج دیں۔ میں بینک سے رقم نکلوا دیتا ہوں۔ دوسرا طریقہ یہ بھی ہے کہ آپ چیک رکھ لیں، اپنے بینک میں جمع کرا دیجیے گا، کل پے منٹ ہونے پر میں گاڑی لے جاؤں گا لیکن اس سے قبل آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں گاڑی کی ٹرائی لینا چاہوں گا۔ اتنی دیر میری موٹر سائیکل بھی آپ کے شوروم میں کھڑی رہے گی۔'' وسدے نے یہ سب باتیں شوروم کے مالک کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے کی تھیں۔ اگر شوروم کا مالک اپنا ملازم بینک بھیجنے یا اگلے دن چیک کیش ہونے والی بات سے متفق ہو جاتا تو وسدے کو کوئی نیا حربہ اختیار کرنا پڑتا۔

شوروم کا مالک مسکراتے ہوئے بولا۔ ''کیسی باتیں کرتے ہیں، آپ نے شہر کی کئی اہم تاجر شخصیات سے تعلق کا ذکر کیا ہے۔ آپ کا چیک بھی ہمارے پاس آگیا ہے۔ آپ شوق اور تسلی سے گاڑی کی ٹرائی لیں۔''

وسدا، کار لے کر شوروم سے باہر آیا۔ اس کا آدھے سے زیادہ منصوبہ کامیابی سے مکمل ہوگیا تھا۔ واردات کا آخری مرحلہ انتہائی اہم تھا۔ یہی مرحلہ اصل ٹارگٹ تھا۔ موٹر سائیکل اور کار حاصل کرنا تو واردات کے ضمنی حصے تھے۔ طے شدہ منصوبے کے تحت وسدے نے ایک مشہور جیولرز مارکیٹ کے سامنے کار روکی۔ چند ساعت کار میں بیٹھا رہا تاکہ سامنے کی جیولر شاپ کے مالک اور اس کے ملازم اسے کار میں بیٹھا ہوا دیکھ لیں۔ وسدا اعتماد سے کار سے اترا، مارکیٹ کا راؤنڈ لگا کر مطلوبہ جیولر شاپ میں داخل ہوگیا اور شوکیس میں رکھے سونے اور ڈائمنڈ کے سیٹ دیکھنے لگا۔

''جی، میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟'' ایک سیلز مین قریب آیا اور ادب سے مخاطب ہوا۔

''ہم نے کچھ سیٹ خریدنے ہیں۔ میری فیملی آپ کی شاپ کی پچھلی گلی میں شادی کے کپڑوں کی خریداری کررہی ہے۔ وہ وہاں سے فارغ ہوکر آجائیں پھر یہاں آپ سے سونے کے سیٹ پسند کرتے ہیں۔'' وسدے نے نہایت اعتماد اور بے اعتنائی سے سیلز مین کو جواب دیا۔ چند سیکنڈ خاموش رہا پھر بولا۔

''اگر آپ کچھ سیٹ نکال کر مجھے دکھادیں تو میں اپنی فیملی کے آنے سے قبل کچھ نہ کچھ فائنل کرلوں گا۔'' وسدے نے سیلز مین کو اعتماد میں لیتے ہوئے کہا۔

جیولر شاپ کا مالک بھی دور بیٹھا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ سیلز مین سیٹ نکال کر وسدے کو دکھانے لگا۔ وہ شوکیس سے پانچ سیٹ باہر نکال چکا تھا، وسدا کہنے لگا۔ ''مزید ڈیزائن دکھائیں۔''

سیلز مین نے مزید تین سیٹ نکالے جو ڈائمنڈ سیٹ تھے۔

''تمام سیٹ ہی خوبصورت ہیں۔ ٹھیک ہے انہیں بند کردیں، میری فیملی ابھی چند منٹ میں آنے والی ہے، انہی کی پسند فائنل ہوگی۔'' وسدے نے سیٹوں کو سیلز مین کی طرف سرکاتے ہوئے کہا۔

سیلز مین نے سیٹوں کے ڈبے بند کردیے۔ وہ سیٹ شوکیس میں واپس رکھنے لگا تو وسدا بولا۔ ''انہیں اندر رکھنے کی ضرورت نہیں، ابھی میری فیملی آنے ہی والی ہے پھر آپ کو دوبارہ نکالنے کی زحمت ہوگی۔''

سیلز مین نے تمام سیٹوں کے ڈبے کاؤنٹر پر ہی رہنے دیے۔ تمام سیٹ ہی آٹھ دس تولے سے زیادہ وزن کے تھے۔ ان میں کچھ ڈائمنڈ سیٹ بھی تھے۔ واردات کے آخری لمحات تھے جس کے لیے بڑی پُراعتمادی دکھانی تھی۔ ذرا سی غلطی سے بنا بنایا کھیل بگڑ جانا تھا۔ وسدا اپنی فیملی کے بے تابی سے انتظار کی کیفیت ظاہر کرنے لگا۔ بار بار اپنی کلائی میں بندھی گھڑی اور کبھی شاپ کے باہر دیکھتا۔ ایک بار شاپ میں بیٹھے ہوئے ہی باہر کھڑی اپنی کار کو ریموٹ سے ان لاک اور لاک بھی کیا تاکہ سیلز مین اور مالک بھی دیکھ لیں..... وہ اضطرابی کیفیت ظاہر کررہا تھا۔ یہ ایک چانس ہی تھا کہ اس دوران جیولر شاپ میں کوئی دوسرا کسٹمر نہیں آیا تھا اور شاید اس نے دوپہر کا وقت بھی اسی لیے چنا تھا کہ رش کم ہو۔ وسدا سیلز مین کے پاس آیا۔ ''میری فیملی ابھی آئی نہیں ہے۔ گاڑی سامنے کھڑی ہے اور چابی آپ کے سامنے رکھی ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو یہ سونے کے سیٹ اپنی فیملی کو آپ کی شاپ کے پیچھے کپڑے کی دکان میں دکھالاؤں؟ اس طرح پسند کرنے میں ٹائم بچ جائے گا، ہم نے پھر سفر بھی کرنا ہوگا۔''

''میں اپنے طور پر کوئی فیصلہ نہیں کرسکتا، مالک سے بات کرتا ہوں۔'' سیلز مین نے جواب دیا اور مالک کے پاس پہنچ گیا۔ سیلز مین نے جیولر شاپ مالک کو ساری بات بتائی تو مالک نے رضامندی ظاہر کردی۔

''ٹھیک ہے، مالک رضامند ہے۔ آپ گاڑی کی چابی چھوڑ جائیں اور دس منٹ میں سیٹ پسند کروالائیں۔'' سیلز مین نے وسدے کو سیٹوں کے ڈبے دیتے ہوئے کہا۔

جیولر شاپ پچھلی گلی کی طرف آر پار تھی۔ سیلز مین نے سیٹوں کے ڈبے ایک بڑے شاپنگ بیگ میں ڈال کر وسدے کے حوالے کردیے۔ وسدا، جیولر شاپ کے اندر ہی سے پچھلی طرف نکل کر مارکیٹ میں آگیا۔ وسدے کو باہر نکلنے کا ہی موقع چاہیے تھا۔ وہ چند قدم جیولر شاپ سے دور ہوا اور مارکیٹ سے باہر آگیا۔ ایک رکشا کو سر کی جنبش سے اشارہ کیا۔ رکشا قریب آگیا۔ وسدے نے احتیاط سے اپنے پیچھے جیولر شاپ پر نظر ڈالی، اسے کوئی نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ رکشے میں بیٹھا اور موقع سے فرار ہوگیا۔

☆☆☆

امتیاز کو موٹر سائیکل شوروم میں بیٹھے ایک گھنٹے سے زیادہ ہوگیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وسدا ابھی تک کیوں نہیں آیا؟ شوروم کا مالک بھی حیران تھا کہ موٹر سائیکل ٹرائی پر لے جانے والا ابھی تک واپس کیوں نہیں پہنچا.....؟

موٹر سائیکل شوروم مالک نے امتیاز سے پوچھا۔ ''تمہارا دوست ابھی تک نہیں آیا..... کہاں چلا گیا؟''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔'' امتیاز نے جواب دیا۔ شوروم مالک کی پریشانی بڑھنے لگی تھی۔

''تم کہاں رہتے ہو؟'' شوروم مالک نے پوچھا۔

''جی، میں ٹاٹے پور میں رہتا ہوں۔'' امتیاز نے جواب دیا۔

''اور تمہارا دوست بھی ٹاٹے پور میں رہتا ہے؟'' شوروم مالک نے دوبارہ سوال کیا۔

امتیاز بولا۔ ''وہ کہاں رہتا ہے مجھے کیا معلوم.....''

''حیرت ہے، تمہارا دوست ہے اور تمہیں معلوم نہیں کہ وہ کہاں رہتا ہے؟'' شوروم مالک حیرت سے کہنے لگا۔

''جی وہ میرا دوست نہیں ہے، میں تو ایک مزدور ہوں۔'' امتیاز نے وضاحت کی۔

موٹر سائیکل شوروم مالک کو کچھ کچھ سمجھ آنے لگی تھی۔ وہ پریشان ہونے لگا۔ اس نے سوالوں کی بوچھاڑ شروع کردی۔ امتیاز نے شروع سے موٹر سائیکل شوروم پہنچنے تک ساری کہانی سنا دی۔ موٹر سائیکل شوروم مالک نے اردگرد کے موٹر سائیکل شوروم مالکان کو اکٹھا کیا اور ساری تفصیل بتائی۔ شوروم مالکان اور ان کے ملازمین نے امتیاز کی خوب پٹائی کی۔ امتیاز کا ایک ہی مؤقف تھا کہ وہ تو مزدوری کے لیے اس کے ساتھ نکلا تھا۔ اسے کیا پتا تھا کہ وہ کوئی فراڈیا ہے۔ شوروم مالکان نے امتیاز کو پولیس کے حوالے کردیا۔

☆☆☆

پولیس اس مختلف طرح کی واردات پر حیران تھی۔ تمام حربے اختیار کرنے کے باوجود امتیاز اپنے مؤقف سے ٹس سے مس نہ ہوا۔

دوسری طرف جیولر شاپ مالک نے آدھا گھنٹا انتظار کیا، وسدا واپس نہ پہنچا تو اپنے سیلز مین کو اپنی شاپ کے پیچھے مارکیٹ میں جانے کا حکم دیا۔ سیلز مین نے پچھلی مارکیٹ میں تمام کپڑے کی دکانیں چیک کرلیں، وسدے کا کہیں نشان نہ پایا۔ مالک کی پریشانی دیدنی تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ وہ انجان شخص اس کے ساتھ ہاتھ کرگیا تھا۔ اس نے واویلا کرنا شروع کیا، دیگر جیولرز اور دکاندار بھی اکٹھے ہوگئے۔ پولیس کو بلالیا گیا۔ جیولرز اور دکانداروں کی موجودگی میں ایف آئی آر درج کرلی گئی۔ دو گھنٹے بعد کار شوروم سے کار لے اڑنے کی اطلاع بھی پولیس کو مل گئی۔ تینوں وارداتیں مختلف تھانوں کے علاقے میں ہوئی تھیں۔ پولیس نے تمام کڑیاں ملائیں تو پوری واردات سمجھ میں آگئی کہ کس طرح ایک نوسر باز نے تین تاجروں کو بے وقوف بنایا اور اس نوسر باز کا اصل ٹارگٹ جیولر ہی تھا۔

پولیس نے امتیاز کے پس منظر کے بارے میں تمام معلومات حاصل کرلی تھیں۔ امتیاز کا جرائم پیشہ افراد سے کبھی تعلق نہ رہا تھا۔ پولیس انسپکٹر ذوالفقار کا تعلق بھی ٹاٹے پور کے نزدیکی گاؤں سے تھا۔ ذوالفقار نے ایک شرط پر امتیاز کو چھوڑا کہ جب کبھی اسے وسدا نظر آئے تو فوراً اس کے نمبر پر اطلاع دے۔ انسپکٹر ذوالفقار سمجھتا تھا کہ امتیاز ہی وسدے کو پہچان سکتا ہے اور اسی کی مدد سے وسدے کی گرفتاری ممکن ہے۔ امتیاز نے انسپکٹر کو یقین دلایا کہ جیسے ہی وسدا نظر آیا وہ فوراً اطلاع دے گا۔ پندرہ دن حوالات میں رہنے سے امتیاز کی حالت بری ہوگئی تھی۔ وہ اپنے گاؤں پہنچا تو اس کے گھر والوں نے سکون کا سانس لیا۔ طبیعت بحال ہونے پر امتیاز پھر محنت مزدوری کے لیے نکلا۔ اس نے اب ملتان کے بجائے خانیوال کا رخ کیا۔ امتیاز کو اپنے گاؤں سے خانیوال آتے جاتے کئی ماہ ہو چکے تھے۔ اب اس نے ڈاڑھی رکھ لی تھی۔ گو ڈاڑھی زیادہ بڑی نہ تھی لیکن پہلے سے مختلف نظر آنے لگا تھا۔ ایک روز وہ مزدوری ملنے کے انتظار میں دیگر مزدوروں کے ہمراہ فٹ پاتھ پر کافی دیر تک بیٹھا رہا۔ خاصا وقت ہوگیا تھا، مزدوری ملنے کی امید نہ رہی تھی۔ امتیاز اٹھا اور چائے پینے کی غرض سے ایک ہوٹل میں داخل ہوگیا۔ اس کا مقصد تھوڑی دیر ہوٹل میں پنکھے کے نیچے بیٹھ کر چائے پینا اور وقت گزار کر گھر واپس جانا تھا۔ ہوٹل میں بیٹھے کافی وقت گزر چکا تھا۔ چائے کے پیسے ادا کیے، ابھی اٹھنے کا ارادہ ہی کررہا تھا کہ وسدے کو ہوٹل میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ وہ وسدے کو اچھی طرح پہچان گیا تھا۔ امتیاز کو انسپکٹر ذوالفقار کی بات یاد آئی اور فوراً ہی موبائل نکال کر انسپکٹر ذوالفقار کا نمبر ملایا۔ امتیاز کے موبائل میں اتنا بیلنس ہی کہاں تھا لیکن بیل انسپکٹر ذوالفقار کو پہنچ گئی۔ چند منٹ بعد انسپکٹر ذوالفقار کی کال آئی۔ امتیاز جلدی سے ہوٹل سے باہر نکلا اور بے تابی سے موبائل فون آن کیا۔ دوسری طرف سے ذوالفقار بول رہا تھا.....

''ہاں امتیاز! کیا اطلاع ہے؟ مجھے تمہارے فون کا ہر وقت انتظار رہتا تھا۔''

''جی سر! وسدا نامی شخص ہوٹل میں موجود ہے۔'' امتیاز نے جلدی سے کہا۔

''تم اس وقت کہاں ہو؟''

امتیاز نے اپنی خانیوال میں موجودگی اور ہوٹل کی لوکیشن کے بارے میں تمام تفصیل بتائی۔

''ٹھیک ہے، تم وہیں موجود رہو، میں خانیوال پولیس سے بات کرتا ہوں۔ جلد ہی پولیس پہنچ جائے گی۔'' انسپکٹر ذوالفقار نے امتیاز کو ہدایات دیں اور وسدے پر نظر رکھنے کا کہا۔

بیس منٹ بعد خانیوال پولیس موقع پر پہنچ گئی اور وسدے کو گرفتار کرلیا گیا۔ ذوالفقار بھی خانیوال پہنچ گیا۔ وسدے نے کئی بڑی وارداتوں کا اعتراف کیا۔ مسروقہ مال برآمد اور وسدے کی نشاندہی پر اس کے گینگ کے کئی ساتھی بھی گرفتار کرلیے گئے۔

امتیاز ابھی اوورایج نہیں ہوا تھا۔ میٹرک تک تعلیم تھی لہٰذا ذوالفقار کی سفارش سے امتیاز کو پولیس میں بطور کانسٹیبل ملازمت مل گئی۔

⌘⌘⌘

بے وفائی

صبا مغل

کیسی عجیب بات ہے جھوٹ اور فریب کی اس دنیا میں محبت کرنے والے دلوں کو سچے اور مخلص جذبوں کی تلاش رہتی ہے... اور اگر اس میں دھوکا ہو جائے تو پھر یہی حال ہوتا ہے جو ان باوفا لوگوں کا ہوا... اور جو محبت کرنے والے دلوں پر قیامت گزری اس کا بیان ناممکن ہے... وہ تو زندگی کے ہر ایک لمحے کو جینا چاہتی تھی... ہر دن کی چادر میں خوب صورت یادوں کو سمیٹ کر خوش ہونا چاہتی تھی... مگر کیا خبر تھی کہ خوابوں کی تعبیر اور تقدیر کے فیصلوں میں یوں جنگ چھڑ جائے گی کہ ہر لمحہ، ہر یاد دل میں پھانس بن کر اتر گئی... اس کے باوجود دل کی بے ایمانی نے اسے کبھی بدگمان نہیں ہونے دیا کیونکہ وہ اپنی محبت کے تاج محل کو ہر میلی نظر اور گرد و باراں سے محفوظ رکھنے کا ہنر جانتی تھی۔

محبت کی گرفت میں پل پل بے کل رہنے والے

عاشقوں کے استقلال اور آبلہ پائی کی عبرت اثر داستان

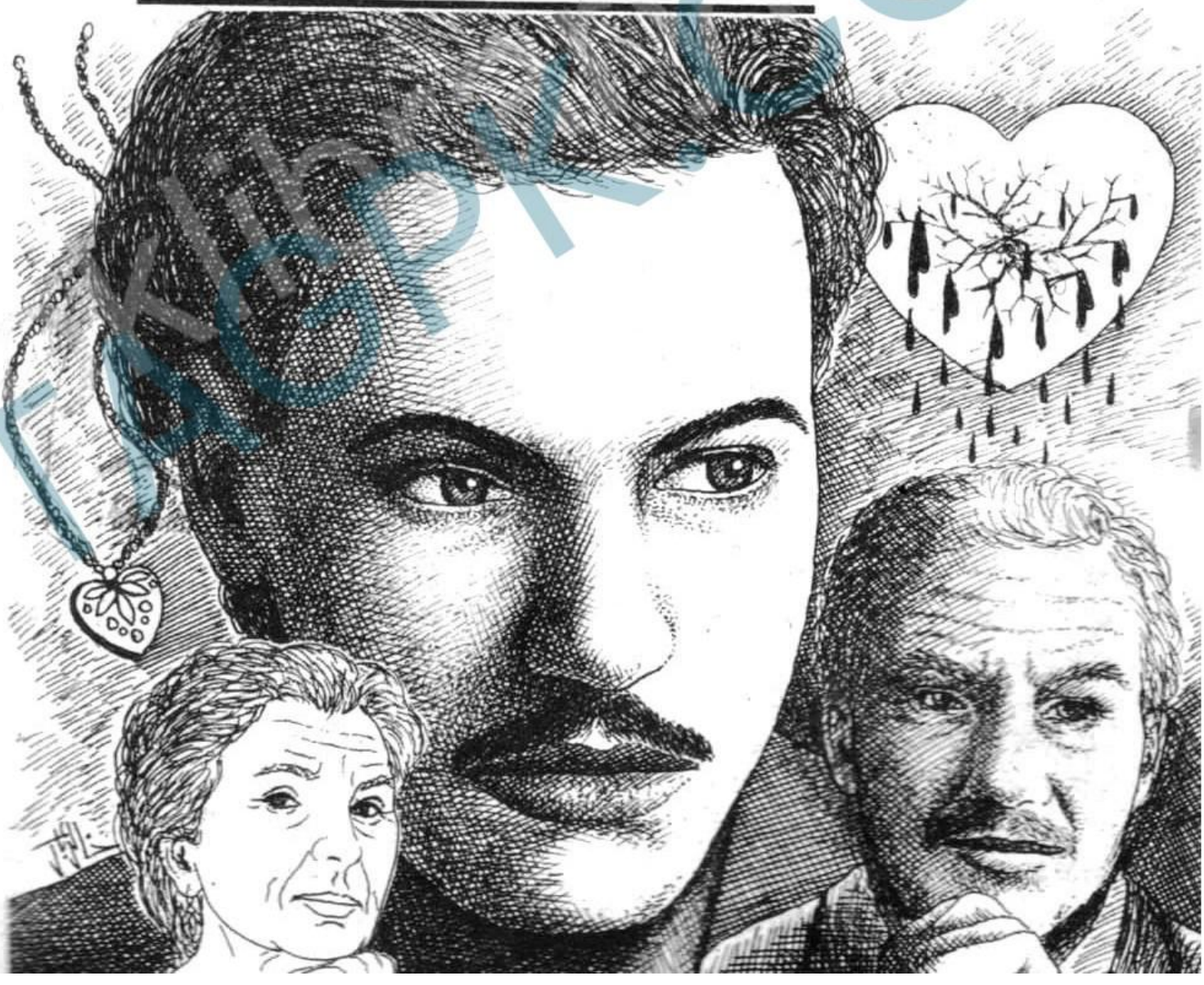

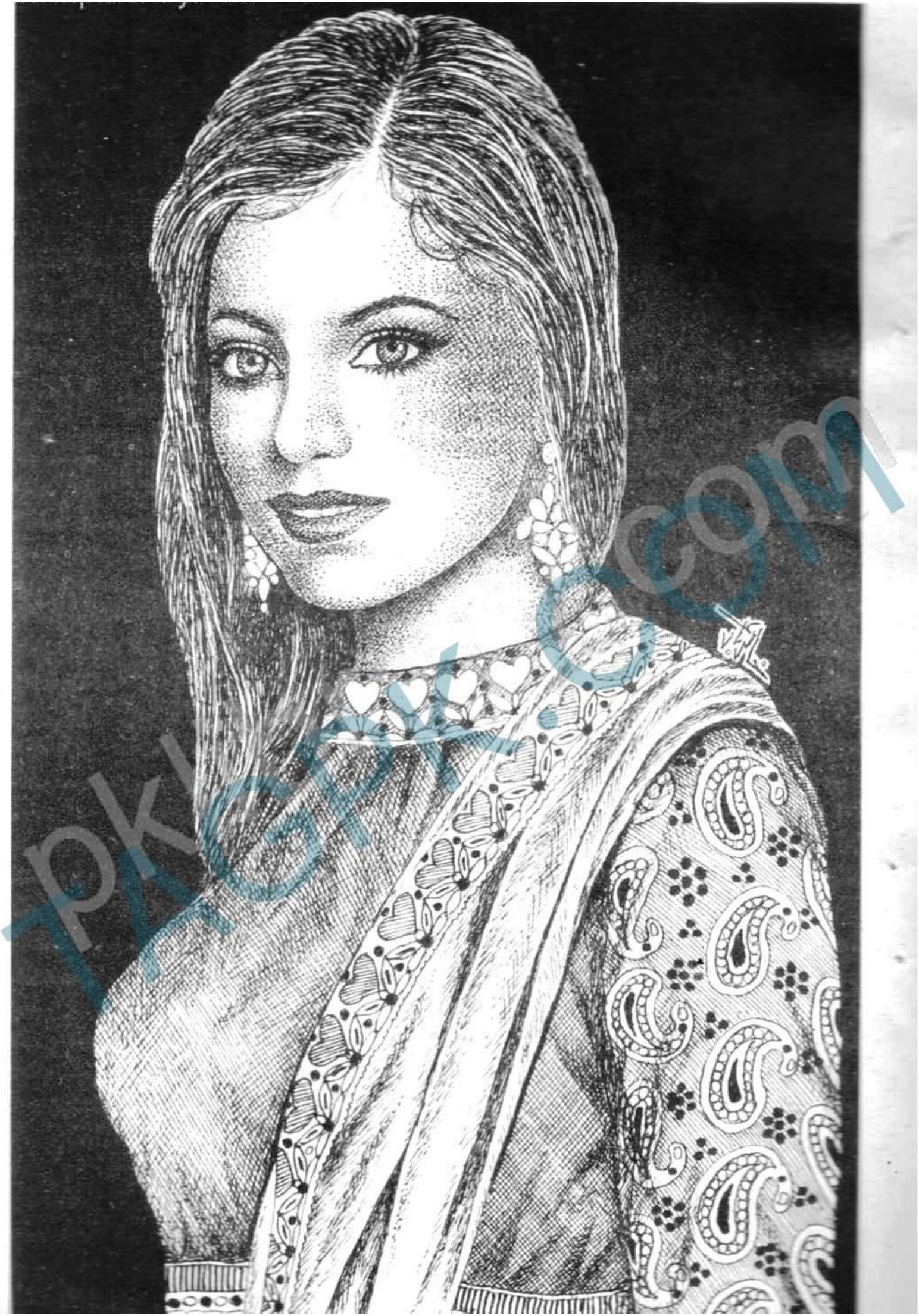

بڑی حسین اور نکھری نکھری سی شام تھی۔ وہ دونوں لکڑی کے ایک بینچ پر بیٹھے تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ ان کی نگاہیں سامنے دریا کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ دریا کے شفاف پانی پر چھوٹی بڑی کشتیاں اور تفریحی بجرے تیر رہے تھے۔ دریا کے کنارے سبز گھاس کے درمیان جاگنگ ٹریک تھا۔ ہر عمر کے مرد و زن بھاگتے یا تیز تیز چلتے ٹریک پر سے گزر رہے تھے۔

لکڑی کے بینچ پر بیٹھے شخص نے دبیز شیشوں والی عینک کے پیچھے سے اپنی ساتھی خاتون کو دیکھا..... اور ہولے سے مسکرا کر گلاب کی ایک کلی اس کی گود میں رکھ دی۔ اس شخص کی عمر اسّی سال سے اوپر ہی رہی ہوگی، خاتون کی عمر پچھتر کے لگ بھگ تھی اور وہ اس کی بیوی رابعہ تھی۔ دونوں پچھلے قریباً دو گھنٹے سے یہیں اسی بینچ پر بیٹھے اردگرد کے خوبصورت ماحول کو اپنے اندر جذب کر رہے تھے۔ یہ جرمنی کا معروف شہر فرینکفرٹ تھا اور ان کے سامنے جو دریا بہہ رہا تھا وہ دریائے مائنز کہلاتا تھا۔ اس معمر جوڑے کی یہ پسندیدہ ترین جگہ تھی۔ پچھلے پچیس تیس برسوں میں وہ کم از کم آٹھ دفعہ یہاں آچکے تھے۔ یوں تو وہ جب بھی پاکستان سے چلتے تھے جرمنی اور اٹلی ان کے لیے خاص کشش کے حامل ہوتے تھے لیکن جرمنی کا یہ شہر فرینکفرٹ اور فرینکفرٹ میں دریائے ''مائنز'' کا یہ حصہ ان کے دل کو ہمیشہ غیر معمولی طور پر لبھاتا تھا۔ فرینکفرٹ میں ان کے کچھ عزیز بھی تھے لیکن وہ ہمیشہ ایک قریبی ہوٹل میں رہنا پسند کرتے تھے۔ ہاں، جب وہ اٹلی جاتے تھے تو انہیں گھر کا سا ماحول میسر آتا تھا کیونکہ وہاں ان کا بیٹا ارسلان اپنی فیملی سمیت آباد تھا۔

سورج کی ترچھی کرنیں، دریا کے پانی پر اٹکھیلیاں کر رہی تھیں۔ نیم سرد ہوا کا ایک جھونکا آیا اور اس نے ان دونوں کے بال بکھیر دیے۔

رابعہ نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بولی۔ ''فہد! مجھے لگتا ہے کہ اب آپ واقعی بوڑھے ہونا شروع ہو گئے ہیں۔''

فہد ہنسا تو ساتھ ہی کھانسی بھی آگئی۔ سفید رومال سے ہونٹ صاف کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ''بہت خوب، یعنی بڑھاپا شروع ہو رہا ہے۔ ارے بھئی! اب شروع نہیں ہو رہا بلکہ ختم ہو رہا ہے۔ اب تو کسی بھی وقت آپ کے مجازی خدا کو خدا کا بلاوا آسکتا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ.....''

رابعہ نے شوہر کو فقرہ مکمل نہیں کرنے دیا اور اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ ''کتنی دفعہ کہا ہے، ایسی باتیں نہ کیا کریں۔ جب جانا ہے، تب تو جانا ہی ہے لیکن ابھی آپ بہت جئیں گے اور یہ بھی یقین رکھیں، میں آپ سے پہلے جاؤں گی۔''

''اب تم چاہتی ہو کہ میں تمہارے منہ پر ہاتھ رکھوں..... چلو خیر..... چھوڑو ان باتوں کو۔ یہ بتاؤ کہ میرے سر کی طرف دیکھ کر ایکدم میرے بوڑھے ہونے کا خیال کیسے آگیا؟''

رابعہ نے فہد کے سر پر کنپٹی سے تھوڑا اوپر انگلی چبھوئی اور بولی۔ ''آپ کے بال زیادہ ہی ہلکے ہوتے جا رہے ہیں، کل آپ نے کٹنگ بھی کرائی تھی، شاید اس لیے آپ کے سر کی جلد نظر آرہی ہے اور وہ چوٹ بھی جو آپ نے ایک دفعہ پھرتی سے سیڑھیاں اترتے ہوئے کھائی تھی۔ آپ کو ایک لیٹر وصول کرنے کی بڑی جلدی تھی۔ لیٹر تو نہیں ملا تھا لیکن آپ کو ڈاکٹر سے ملنا پڑ گیا تھا۔''

فہد مسکرایا اور بے ساختہ ہاتھ اٹھا کر اس پرانی چوٹ کو ٹٹولنے لگا..... ''میرا خیال ہے دو ٹانکے بھی لگے تھے۔'' اس نے کہا۔

''دو نہیں جناب، تین..... اور تینوں کا مدھم نشان بھی ہے اب تک۔'' رابعہ نے کہا اور پھر ذرا توقف سے بولی۔ ''اور وہ لیٹر بھی نہیں تھا، پیکٹ تھا شاید۔''

ان دونوں کے سامنے جیسے ایک دم ماضی کا وہ منظر تازہ ہو گیا اور وہ اس کی یاد میں کھو سے گئے۔ اکثر ایسے ہی بیٹھے بیٹھے زندگی کے کسی دور کا کوئی اہم منظر ایک دم ان کی نگاہوں کے سامنے آجاتا تھا اور وہ اس کی یادوں میں کھوئے دیر تک خاموش بیٹھے رہتے تھے۔

فہد نے ایک لمبی سانس لے کر کہا۔ ''ان دنوں کتنا کریز تھا ہمیں پاکستان سے کہیں باہر جانے کا۔ تھائی لینڈ تفریحی لحاظ سے کوئی بہت اہم جگہ تو نہیں ہے لیکن ہم وہاں جانے کے لیے بھی تڑپ اٹھے تھے۔''

''زیادہ تڑپ تو آپ ہی کو تھی، اسی لیے تو سیڑھیوں سے گرے تھے۔'' رابعہ نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔ فہد خاموشی سے پانی کی لہروں کو دیکھتا رہا۔ رابعہ اپنے سفید بالوں کو کانوں کے پیچھے اڑس کر بولی۔ ''ویسے فہد! اگر میں چلی جاتی تو میں نے کوئی نہ کوئی انعام ضرور لے آنا تھا۔ ان دنوں کٹنگ کا شوق جنون کی حد تک تھا۔''

''ہاں یہ بات تو ہے۔'' فہد بدستور دریا کی رواں لہروں کو دیکھتا رہا۔ تقریباً چالیس سال گزرنے کے باوجود رابعہ کو وہ سب اچھی طرح یاد تھا۔ تھائی لینڈ کے شہر بنکاک

میں کلنگ کا کوئی بین الاقوامی مقابلہ ہوا تھا۔ اس میں مختلف طرح کی سوئٹس اور بسکٹس وغیرہ بنائے جانے تھے۔ مقابلے کے منتظمین نے شوق رکھنے والوں کو آفر کیا تھا کہ وہ اپنی ریسی پیز اور نمونے وغیرہ بذریعہ پارسل بھجوائیں۔ اگر وہ مقابلے کے لیے منتخب ہوئے تو پھر انہیں بنکاک کا ہوائی ٹکٹ اور چار روز کی رہائش فراہم کی جائے گی۔ رابعہ نے بھی اپنا نمونہ پارسل کیا تھا اور پھر ایک روز فہد اپنے آفس سے اندھا دھند بھاگتا ہوا گھر آیا تھا۔ وہ خاصا ایکسائیٹڈ لگ رہا تھا۔ اس نے رابعہ سے پوچھا تھا کہ اس کے نام پر کوئی ڈاک یا کوریئر وغیرہ تو نہیں آیا۔ رابعہ نے جواب دیا تھا کہ ابھی تک تو نہیں آیا۔ فہد نے بتایا تھا کہ اسے آفس کے نمبر پر کوئی فون کال آئی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ آپ کی وائف مقابلے میں حصہ لینے کے لیے سلیکٹ ہوئی ہیں۔ چند دن میں آپ کو ہوائی ٹکٹ اور ہوٹل کی بکنگ وغیرہ بھیجی جائے گی۔ فی الحال مقابلے کے حوالے سے کچھ ہدایات وغیرہ مسز رابعہ کے ایڈریس پر ارسال کی گئی ہیں، وہ وصول کرلیں۔

ہدایات والا لفافہ ابھی تک موصول نہیں ہوا تھا لیکن فہد بہت جذباتی ہو رہا تھا۔ اسے شک ہوا کہ لفافہ کہیں پھسل کر برآمدے یا گیراج کی طرف نہ چلا گیا ہو۔ وہ کونے کھدروں میں جھانکنے کے لیے تیزی سے سیڑھیاں اترا تھا اور لڑکھڑا کر شیشے کی ایک سجاوٹی کارنس سے ٹکرا گیا تھا۔ نتیجے میں اسے قریبی کلینک پہنچ کر مرہم پٹی کرانا پڑی تھی۔

تھائی لینڈ سے کوئی ڈاک تو موصول نہیں ہوئی تھی لیکن اگلے تین چار روز تک فہد دیوانہ سا پھرتا رہا تھا۔ دو دن تک تو وہ اس ڈاک کے انتظار میں گھر سے ہی نہیں نکلا تھا پھر اس نے پوسٹ آفس اور کوریئر سروس والوں کی طرف بھی چکر لگائے تھے۔ مقابلے کی تاریخ بالکل قریب تھی اور مقابلے کی انتظامیہ کو رسپانس کرنا ضروری تھا..... فہد کا کہنا تھا کہ فون پر بھی انتظامیہ سے کوئی رابطہ نہیں ہوسکا۔ آٹھ دس دن کے انتظار کے بعد انہوں نے دو چار لمبی لمبی اور ٹھنڈی سانس بھر کر امید ہی چھوڑ دی تھی۔ انہیں یہ احساس ہوگیا تھا کہ شاید یہ سارا معاملہ ہی فراڈ تھا۔ بعد میں بھی وہ کبھی کبھی اس واقعے کو یاد کرکے ہنستے رہے تھے..... اور آج قریباً چالیس سال بعد دریائے مائنز کے کنارے ہوا کے ایک شریر جھونکے نے وہ سب کچھ ان کے ذہنوں میں پھر سے تازہ کردیا تھا۔ گزرے ہوئے ماضی کی تلخ وشیریں یادیں ایسے ہی بے سبب یا بہ سبب انہیں اپنے سحر میں جکڑ لیتی تھیں۔

ٹھنڈ تھوڑی سی بڑھ گئی تھی۔ رابعہ نے اپنے شوہر کے شانوں پر شال درست کی اور بولی۔ ''میرا خیال ہے کہ اب کمرے میں چلیں۔''

فہد نے اپنی جھریوں بھری کلائی کو گھما کر گھڑی دیکھی اور کہا۔ ''دس پندرہ منٹ مزید رابعہ..... پتا نہیں کہ اس خوبصورت جگہ پر ایسی دلکش شامیں ہم دوبارہ دیکھ بھی سکیں گے یا نہیں۔''

''پھر وہی باتیں۔'' رابعہ نے ایک بار پھر شوہر کے منہ کو اپنے ہاتھ سے ڈھانپ دیا۔

دلکشی اور موزونیت صرف جوانی سے ہی تو مشروط نہیں ہوتی۔ رابعہ اس بڑھاپے میں بھی جاذبیت سے خالی نہیں تھی۔ اس کے بڑھاپے میں ایک طرح کی پاکیزگی اور دل موہ لینے والی دلکشی تھی۔ یقیناً جوانی اور درمیانی عمر میں بھی وہ خوبصورت رہی ہوگی۔ فہد کا جسم تھوڑا سا فربہ ضرور ہوچکا تھا اور سر کے برف جیسے سفید بال بھی اب جدا ہوتے جارہے تھے تاہم وہ اسٹک کے سہارے چل پھر لیتا تھا اور مسکراتے ہوئے اس کے مصنوعی دانت اچھے لگتے تھے۔

دونوں لکڑی کے بینچ پر بیٹھے، ڈوبتے ہوئے سورج کو دیکھتے رہے۔ ایک جرمن خاتون جس کی عمر ستر کے لگ بھگ تھی، ہیڈفون لگائے اپنے چھوٹی نسل کے کتے کے ساتھ جاگنگ کرتی ٹریک پر جارہی تھی۔ اس نے بڑی محویت سے ان دونوں کی طرف دیکھا پھر..... مسکراتی اور ہاتھ ہلاتی ہوئی گزر گئی۔ اس چھوٹے سے کتے نے اپنے دوڑنے کی رفتار کو اپنی مالکن کی رفتار سے باندھ رکھا تھا۔ انیس بیس کا فرق بھی محسوس نہیں ہوتا تھا۔ ان دونوں کی نظریں اس خوش باش جرمن عورت کو دور تک دیکھتی رہیں۔ اپنی عمر اور اس سے جڑے خدشات سے لاتعلق وہ جیسے اپنی ہی دھن میں مست تھی۔

فہد نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''اپنے آپ میں مگن رہتے ہیں یہ لوگ۔ ماضی یا مستقبل کی پریشانیوں کو اپنا محاصرہ نہیں کرنے دیتے۔''

رابعہ نے کہا۔ ''مستقبل کی پریشانیوں کو تو ذہن میں رکھنا اچھا نہیں ہوتا جناب! اب اٹھ جایئے۔ ٹھنڈ بڑھ رہی ہے۔ کھانسی شروع ہوجائے گی اور رات کو ٹھیک سے سو بھی نہیں سکیں گے۔''

اس نے فہد کو مجبور کیا اور وہ دونوں دریا کنارے سے اٹھ گئے۔ ہوٹل کا مین دروازہ بس تیس چالیس قدم کی دوری پر تھا۔ وہ دونوں آہستہ آہستہ چلتے گئے۔ ایک دو جگہ رک کر سانس لیا اور پھر لفٹ کے دروازے پر پہنچ گئے۔ لفٹ

بوائے نے ادب سے جھک کر اس جانے پہچانے معمر جوڑے کو..... سلام کیا اور ہوٹل کی چوتھی منزل پر لے آیا۔ ان کا روم بھی لفٹ کے پاس ہی واقع تھا..... چند قدم اٹھا کر وہ اپنے نیم گرم کمرے میں پہنچ گئے۔

ان کے بیٹے ارسلان کا گھر روم کے سٹی سینٹر میں تھا۔ وہ اس کے گھر سے بذریعہ فضائی سفر یہاں پہنچے تھے۔ ارسلان انہیں اس ''پسندیدہ ہوٹل'' میں چھوڑ کر واپس گیا تھا۔ وہ روزانہ تین چار بار اسکائپ پر وڈیو کال کر کے ان کی خیر خیریت دریافت کرتا تھا۔ تین روز بعد ہوٹل کی بکنگ ختم ہوجانا تھی اور ارسلان نے یہاں آکر انہیں واپس لے جانا تھا۔ پچھلے سے پچھلے برس بھی وہ بالکل اسی طرح سے آکر اس ہوٹل میں رہے تھے۔

کمرے کے گرم ماحول میں دم بدم بڑھتی ہوئی سردی کا احساس نہیں تھا تاہم کھڑکیوں سے باہر دیکھنے پر اندازہ ہوجاتا تھا کہ اکتوبر کی یہ ٹھٹھری ہوئی شب دھیرے دھیرے شہر کو اپنے برفیلے پنجوں میں جکڑ رہی ہے۔ بلڈ پریشر اور یورک ایسڈ وغیرہ تو بڑھاپے کی جانی پہچانی بیماریاں ہیں۔ کچھ عرصے سے فہد کو کبھی کبھی دمے کی شکایت بھی ہوجاتی تھی۔ قریباً دس سال پہلے فہد کا ایک بائی پاس آپریشن بھی ہوچکا تھا۔ آپریشن کے بعد سے رابعہ، شوہر پر خصوصی توجہ دینے لگی تھی۔

رابعہ نے وال کلاک پر نگاہ دوڑائی، فہد کی دوا کا وقت ہوچکا تھا۔ اس نے فہد سے کچھ کھانے کے بارے میں پوچھا اور پھر روم سروس والوں کو فون کر کے چکن سوپ اور ابلی ہوئی مچھلی کے چند پیس منگوائے۔ وہ فہد کو اپنے سامنے کھانا کھلاتی تھی کیونکہ وہ اکثر بے پروائی کر جاتا تھا۔ کھانے کے بعد اس نے ترتیب سے ساری دوائیں فہد کو دیں..... پھر کولیسٹرول کی اپنی دوا بھی کھائی۔ فہد کے سر میں ہلکا درد تھا۔ فہد کے منع کرنے کے باوجود وہ اس کے سرہانے بیٹھ کر اس کا سر دبانے لگی۔ وہ ایک ہاتھ سے سر دبا رہی تھی کیونکہ دوسرا ہاتھ فہد کے ہاتھ میں تھا۔

کچھ دیر بعد فہد سو گیا۔ اس کی بوجھل سانسوں کی گونج کمرے میں سنائی دینے لگی۔ وہ تھوڑی دیر تک محبت اور محویت سے شوہر کے چہرے کو دیکھتی رہی پھر بہت آہستگی کے ساتھ اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑایا اور کمبل کو اوپر کر کے اس کے سینے اور گردن کو اچھی طرح ڈھانپ دیا۔ اسے خود ابھی نیند نہیں آرہی تھی لہٰذا کمرے کی روشنی بالکل مدھم کر کے وہ دوسرے کمرے میں چلی آئی۔ گھڑی کی سوئیاں رات دس بجے کا وقت بتا رہی تھیں۔ ہوٹل کے ''ہیٹنگ سسٹم'' میں شاید کچھ خرابی تھی، کمرے پوری طرح گرم نہیں ہو رہے تھے۔ یہاں الیکٹرک آتش دان بھی موجود تھا۔ آتش دان کے قریب بیٹھنا اور کوئی دلچسپ کتاب پڑھنا رابعہ کو ہمیشہ سے اچھا لگتا تھا لیکن جب سے اس کی آنکھ کا آپریشن ہوا تھا وہ زیادہ مطالعہ نہیں کر پاتی تھی۔ اس نے آتش دان کو روشن کر دیا۔ دو تین منٹ کے اندر ہی دونوں کمروں کا ٹمپریچر بہتر محسوس ہونے لگا۔

وہ..... کرسی پر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر پہلے دریا کے کنارے بیٹھے بیٹھے اس نے فہد کے سر پر جوٹ کا وہ برسوں پرانا نشان دیکھا تھا۔ اس نشان نے زندگی کا وہ پورا دور رابعہ کے ذہن میں تازہ کر دیا تھا۔ وہیں کرسی پر بیٹھے ہوئے وہ ماضی کے دھندلکوں میں کھو گئی۔ پردۂ تصور پر ماضی کے ماہ وسال کسی فلم کی طرح متحرک ہوگئے..... ہاں، وہ بہت خوبصورت تھی..... جوان تھی..... اور اس کی آنکھوں میں خوش رنگ سپنے سجے رہتے تھے۔

یہ خواب اس نے سیکڑوں مرتبہ دیکھا تھا اور تب سے دیکھا تھا جب اس نے بچپن سے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا۔ جب ایک اَن دیکھے چہرے کو دیکھنے کی خواہش اور انجانے جذبوں کی آہٹ اکثر و بیشتر سنائی دینے لگتی ہے۔ یہ کوئی کھلی آنکھوں کا سپنا نہیں تھا۔ یہ بند آنکھوں کا خواب تھا۔

گلاب کی سیج اور اس کی مہک نے چاروں طرف سے اسے اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے۔ خوبصورت مسہری پر سرخ جوڑا پہنے، سر جھکائے، کمرے کی زرد روشنی میں وہ کسی کے قدموں کی آہٹ کا انتظار کر رہی ہے۔ باہر سنائی دیتی مختلف آوازوں اور قہقہوں میں وہ کسی ایک آواز کو سننے کی کوشش کر رہی ہے اور پھر..... وہی انجانے اور بہت ہی مانوس قدموں کی آہٹ اسے کمرے سے باہر سنائی دیتی ہے۔ سینہ توڑتی ہوئی دھڑکنیں..... میٹھی میٹھی درد کی لہریں پورے جسم میں پھیلتی ہیں۔ دروازہ کھلتا ہے۔ وہ اندر آتا ہے اور پھر دروازہ بند ہونے کی آواز آتی ہے۔ کچھ دیر کے لیے قدموں کی آواز رکتی ہے پھر اس کی طرف بڑھتی ہے.... کن انکھیوں سے وہ دیکھتی ہے تو اس کے قدموں پر ہی نظر پڑتی ہے۔ وہ بس اتنا ہی اندازہ لگا سکتی ہے کہ وہ ایک دراز قد آشنا اجنبی ہے پھر وہ اس کے سامنے اس کے پاس آکر بیٹھتا ہے اور اس سے پہلے کہ اس کی نظریں اس کے چہرے کی طرف اٹھتیں..... اس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ اس نے برسوں یہ خواب دیکھا اور پھر کچھ ایسا ہوا کہ اس خواب سے وابستہ

جذبات اس کے دل کا رستہ بھول گئے۔ نہ جذبات رہے اور نہ ہی خواب اور آج..... کئی برس بعد وہی خواب حقیقت کا روپ دھارے اس کے سامنے تھا۔ وہ چند لمحوں کے لیے گم سی ہوگئی۔ ان بھاری خواب ناک لمحوں سے بے نیاز وہ ماضی کی کھڑکی سے دور جھانکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ہاں ہاں..... یہ وہی خواب ہے..... پر حقیقت کے روپ میں۔ پھر وہ اس کے سامنے اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ یہ اس کی شادی کی رات تھی۔

''السلام علیکم!'' اس نے مصنوعی انداز میں گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں شیرینی تھی، گداز اور بوجھل پن تھا۔ رابعہ نے آنکھیں اٹھا کر دیکھا۔ اس کی دلکش دبی دبی مسکراہٹ نے ایک لمحے کے لیے اسے جیسے مبہوت کر دیا۔ اس نے شرما کر آنکھیں جھکا لیں۔

''سلام کا جواب تو میرا حق ہے۔ سوچ لیجیے۔'' اس نے بدستور اسی لہجے میں کہا۔

''وعلیکم السلام۔'' رابعہ کو اپنی آواز اجنبی سی لگی۔

''نام ہے فہد۔'' اس نے دوبارہ گلا صاف کیا۔

''رابعہ۔'' رابعہ نے بھی چنچل انداز میں کہا۔

''خالی رابعہ؟'' فہد نے سر کو ہلکے سے جنبش دے کر استفسار کیا۔

''رابعہ فہد۔'' رابعہ کے لہجے میں ہچکچاہٹ واضح تھی۔

''شکریہ.....'' فہد نے اپنا ہاتھ پیشانی تک لے جا کر مسکراتے ہوئے کہا۔

رابعہ کی دھڑکنیں تیز سے تیز تر ہو رہی تھیں۔ اس کی وجہ وہ روایتی ڈر اور خوف نہیں تھا جو لڑکیاں اس موقع پر محسوس کرتی ہیں بلکہ وہ ارادہ تھا، وہ پکا ارادہ جس پر وہ عمل پیرا ہونے جا رہی تھی۔ فہد اچانک کھڑا ہوا اور سائڈ ٹیبل پر پڑے ایپل جوس کو ڈبے سے دو گلاسوں میں انڈیلنے لگا۔

''میں آپ سے کچھ.....'' اندر کے جذبات میں لپٹی ہوئی آواز ذرا اونچی تھی۔ فہد نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ الفاظ جیسے پھر سے اس کے حلق میں اٹک سے گئے۔ پھر وہ یکدم ڈھیلی پڑتے ہوئے بولی۔ ''میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔''

''میں بھی آپ سے بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں۔'' فہد نے ایک گلاس اس کے مہکتے حنائی ہاتھوں میں تھمایا۔

فہد کے لہجے کی نرمی اور شیرینی رابعہ کے اعصاب کو پرسکون کر رہی تھی۔ کمرے سے باہر اب دور دور تک خاموشی تھی۔ فہد نے دھیمی رفتار میں چلتے ہوئے سیلنگ فین کو بند کیا۔ اے سی کی اسپیڈ تیز کی اور واپس اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گیا۔ جوس کا ایک سپ لیتے ہوئے بولا۔ ''جی فرمایئے..... ہمہ تن گوش ہوں۔'' وہ ایسی کیا بات تھی جو وہ اس موقع پر کہنا چاہ رہی تھی۔ اس خیال نے اسے ذرا بے چین کر دیا۔

رابعہ نے چند لمحے کے لیے اپنی آنکھیں بند کیں۔ فہد جو اس کے چہرے سے نظریں ہٹا نہیں پا رہا تھا۔ اسے لگا کہ کمرے میں ایک دم اندھیرا چھا گیا ہے۔ رابعہ نے اپنی تمام تر قوتِ گویائی اور قوتِ ارادیت کو سمیٹا اور بولی۔

''میں اپنے بارے میں آپ سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں رکھنا چاہتی۔ ماضی کا کوئی بھی ورق۔ کوئی بھی سطر۔'' جھپ جھپ کرتی آنکھیں، دراز پلکیں جن پر مصنوعی ہونے کا گماں ہوتا تھا، یقین کی چمک سے مزید خوبصورت ہوگئی تھیں۔

فہد نے مسکراتے ہوئے، حیرت بھرے تاثرات لیے اسے دیکھا، کمرے میں اچھی خاصی کولنگ ہونے کے باوجود رابعہ کی پیشانی عرق آلود ہو رہی تھی۔ جسم میں اچھی خاصی کپکپاہٹ تھی جس کو اس نے سمیٹ کر ہلکی سی لرزش کی صورت دے رکھی تھی۔ فہد کے لیے صورت حال پر غور کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ ایک طرف اس کا آتشیں حسن تھا جو اس کو اپنی جانب کھینچ رہا تھا۔ دوسری طرف ایک نازک موضوع۔ رابعہ اپنے چہرے پر اس کی نظروں کی تپش کو مسلسل محسوس کر رہی تھی اور اس کی گھبراہٹ میں اضافہ ہو رہا تھا۔ دوسری طرف فہد گم صم اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ اب پوری طرح اس کے سامنے تھا۔ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ یہ لڑکی واقعی اتنی حسین ہے یا اس کو اتنی حسین لگ رہی ہے۔

''اف خدایا۔ بندہ خوبصورت ہو۔ پر اتنا بھی کیا خوبصورت ہونا۔'' وہ زیر لب بڑبڑایا۔ ''تانیہ بھابی ٹھیک ہی کہہ رہی تھیں۔''

''جی؟'' سوالیہ آنکھیں پلکوں کا وزن اٹھائے چند لمحوں کے لیے اٹھیں۔

''نہیں..... کچھ نہیں۔'' فہد نے ایک گھونٹ میں بقیہ جوس کا نصف سے کچھ زیادہ بھرا ہوا گلاس اپنے حلق میں انڈیلا۔ رابعہ کی طرف سے کی گئی توجہ طلب بات نے اس کے ذہن کی بتی جلائی پھر یکدم سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔

''جی میں سن رہا ہوں۔ آپ کہیے۔''

''وہ اصل میں آپ کو ویسے تو میرے بارے میں سب پتا ہوگا۔ میری ایجوکیشن، جاب اور گھر کے حالات۔ سب کچھ اور ویسے بھی میری پچھلی زندگی اور معمولات کے بارے میں کوئی خاص بات ہے بھی نہیں۔'' فہد نے اپنے

دل میں شکر ادا کیا۔

رابعہ کی بات سے دل میں یکدم اٹھنے والے خیالات اور واہمے دبتے محسوس ہوئے۔

''سوائے ایک بات کے.....!'' رابعہ نے اپنے حنائی ہاتھوں کی لمبی خوبصورت انگلیاں مروڑتے ہوئے کہا۔

''اور وہ کیا ہے؟'' فہد رابعہ کی گھبراہٹ کو بخوبی بھانپ چکا تھا۔

''دیکھیں رابعہ فہد۔ آپ کھل کر بات کریں۔ ہر طرح کے خدشات کو بالائے طاق رکھ دیں۔ آپ کے سامنے جو بندہ بیٹھا ہے، وہ کوئی روایتی قسم کا شوہر نہیں ہے۔ یہی ہے وہ پہلی بات جو میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں۔ اپنے بارے میں..... چلیں اب آپ بولیں۔''

''اور یہ لیں۔ یہ پکڑیں۔'' ایک بڑا سا چاکلیٹ بار فہد نے رابعہ کو تھمایا۔ رابعہ نے چاکلیٹ لے لی۔ وہ مسکرا کر بولا۔ ''اپنی بے قصور انگلیوں کو توڑنے کے بجائے اپنی طاقت اس پر آزمائیں۔'' اس بات پر رابعہ بے اختیار مسکرا اٹھی۔ ایک جھماکا سا ہوا اور جیسے ہر طرف چاندنی پھیل گئی۔ فہد بھی مسکرا اٹھا اپنی بات پر یا اپنے دل کے حالات پر، وہ جان نہ سکا۔ اب رابعہ کی حالت قدرے بہتر تھی۔ وہ نظریں جھکائے ہوئے بولی۔

''بات دراصل یہ ہے کہ بچپن میں، میں اپنے ایک کزن کو پسند کرتی تھی۔ یہ بات تب کی ہے جب مجھے شادی کے معنی بھی صحیح طرح معلوم نہ تھے۔ میں..... اسے پسند کرتی تھی۔'' فہد کے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی جسے اس نے بخوبی اپنی دلکش مسکراہٹ میں چھپالیا۔

''اچھا..... پھر؟'' اس نے بے حد تھوڑا سا مزید جوس گلاس میں ڈالا اور واپس اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا۔

''پھر کچھ بھی نہیں۔ وہ مجھ سے عمر میں کافی بڑا تھا۔ اس کے ماں باپ کو اس کی شادی کرنا تھی اور انہوں نے اس کی شادی کہیں اور کر دی۔'' اس نے گلا کھنکھارا اور پھر بولی۔ ''پر میرے دل میں اب اس کی کوئی یاد نہیں ہے۔ بچپن کی بات تھی۔ بھولے ہوئے بھی عرصہ گزر گیا ہے اور اب آپ کی وجہ سے ہی یہ بات ذہن میں آ گئی۔ میں چاہتی ہوں آپ سے میری کوئی بات چھپی نہ ہو کیونکہ آپ ہی میرے.....'' اس نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ بڑا ہی روایتی انداز تھا، روایتی خوبصورتی لیے۔ اسے زندگی میں پہلی بار یہ احساس بڑی شدت سے ہو رہا تھا کہ وہ کس قدر خوش قسمت ہے۔ پھر وہ بلا ارادہ ایک سوال کر بیٹھا۔

''اچھا ایک بات پوچھوں۔ تمہارے اس کزن نے کوشش نہیں کی کہ وہ اپنے والدین کو اس شادی سے منع کر دے۔''

''نہیں..... وہ بھلا ایسا کیوں کہتا۔ وہ تو میں اسے پسند کرتی تھی وہ تھوڑی کرتا تھا۔'' رابعہ نے بے حد معصومیت سے کہا۔

''اور لو.....'' جوس کا ایک فوارہ تھا جو بے ساختہ ہنسی کو روکتے ہوئے اس کے منہ سے نکلا۔ اگر بروقت فہد اپنا منہ دوسری طرف نہ کر لیتا تو یقیناً رابعہ کا سارا حسن جوس سے گیلا ہو جاتا۔ وہ کھانسی روکتے ہوئے واش روم کی طرف لپکا جبکہ رابعہ حیران پریشان اسے جاتا دیکھتی رہی۔ دس پندرہ منٹ بعد وہ لباس تبدیل کیے پھر اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ سفید شلوار قمیص پہنے، آستین چڑھائے، دبی دبی مسکراہٹ سے سرخ ہوتا چہرہ۔ وہ اسے اور بھی بھلا لگا جو اس کے قریب مسہری پر بیٹھتے ہوئے ہلکے پھلکے موڈ میں نظر آ رہا تھا۔

''اصل میں، میں سمجھ نہیں پایا تھا کہ یہ ''ون سائڈڈ'' پسندیدگی تھی۔'' فہد نے بیڈ کشن اپنی گود میں رکھتے ہوئے کہا۔ اصل میں وہ یہ بھی نہیں سمجھ پایا تھا کہ ''اس'' کو کوئی ناپسند کیسے کر سکتا ہے۔

''جی صرف پسندیدگی اور اس سے بڑھ کر کچھ نہیں اور نہ کبھی اظہار کی کوشش کی۔'' رابعہ نے سادگی سے کہا۔

''درست فرمایا آپ نے۔ ویسے اس طرح کے معاملات میں اظہار کرنے کی نوبت سنا ہے صرف شدید محبت میں آتی ہے جب انسان کے پاس اور کوئی چارہ ہی نہیں رہتا۔'' رابعہ کے دل کی بات اس نے خود ہی کہہ دی اور اس کا باقی کام آسان کر دیا۔ رابعہ کا سر جھکا ہوا تھا اور نظریں گود میں رکھے حنائی ہاتھوں پر تھیں۔ ایسے میں اس کی بندیا اس کی چاند سی پیشانی سے الگ ہو گئی تھی اور اب جیسے اس کے موتی جھول جھول کر اپنے چاند سے دوبارہ مل جانے کے لیے بے تاب تھے۔

''ویسے یہ محبت کیا بلا ہے۔ اس سے کبھی ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔'' وہ بغور اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ اسے ریلیکس کرنے میں وہ کافی حد تک کامیاب ہو چکا ہے۔

''آپ کو واقعی نہیں معلوم؟'' رابعہ نے اپنی جھپ جھپ کرتی سیاہ آنکھیں اٹھا کر مصنوعی حیرت سے پوچھا۔ اس کے لہجے میں بھی اب ہلکی ہلکی سی شوخی اتر آئی تھی۔

''یا خدا تیرے سادہ دل بندے۔'' فہد نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''یقین کریں مسز فہد۔ کبھی بھی نہیں۔

کالج سے لے کر یونیورسٹی تک ایک دو دفعہ کوئی لڑکی بس دور دور سے دیکھنے میں اچھی ضرور لگی مگر وہ جو کہتے ہیں ناں کہ دل میرا دھڑکن کسی کی۔ آنکھیں میری سپنا کسی کا۔'' اب بے ساختہ ہنسنے کی باری رابعہ کی تھی۔

فہد اب بڑے پُرسکون انداز میں اس کے سامنے چوکڑی مارے، گود میں بیڈ کشن رکھے اور ٹھوڑی پر ہاتھ جمائے اس کا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ وہ ہمیشہ سے ایسا ہی تھا۔ کسی کی پریشانی، گھبراہٹ اسے بے چین کر دیتی تھی اور وہ اسے مطمئن کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتا اور یہ لڑکی تو پھر اس کی بیوی تھی جس کے چہرے پہ مسکان دیکھ کر اس کے دل کو ٹھنڈک کا احساس ہو رہا تھا۔

''اچھا چلیں چھوڑیں۔'' فہد نے ہنستے ہوئے اس کی گود سے چاکلیٹ بار اٹھائی۔

''ہم یہ کھاتے ہیں۔'' پیکٹ کھولتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا۔

''ہم پہلی دفعہ ملے ہیں اور مجھے آپ سے تو بہت باتیں کرنا تھیں مگر اب فی الحال دو ہی ذہن میں آ رہی ہیں۔'' وہ اس کی طرف دیکھ کر رسان سے بولا۔

''آپ بہت خوب صورت ہیں۔'' فہد نے چاکلیٹ کا ایک ٹکڑا رابعہ کے منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''اور دوسرا یہ کہ آپ کا دل اس سے بھی زیادہ خوبصورت اور شفاف ہے۔'' فہد نے شادی کی ہیرا جڑی چاندی کی انگوٹھی والا ہاتھ اس کے سمٹے ہوئے ہاتھوں پر رکھ دیا۔ رابعہ کو ایسے لگا جیسے بارش میں بھیگتے ہوئے سر پر اچانک سائبان آ گیا ہو۔

''جو اعتماد اور بھروسا آج آپ نے مجھے دیا ہے۔'' فہد نے بات ادھوری چھوڑ کر جیسے اس کی جھکی ہوئی نظروں کے دروازوں پر دستک دی۔ رابعہ نے پلکیں اٹھائیں اور فہد کو اس کی آنکھوں میں اپنا عکس پہلے ستارے کی طرح چمکتا دمکتا دکھائی دیا۔ ''عمر بھر مان رکھوں گا اس کا۔'' اور اس کے لہجے میں سچائی اور ارادے کی ایسی جھلک تھی، جس سے اسے اپنے ماضی کے کالے سائے، واہموں اور خدشات سے بھرے سمندر بھاپ بنتے محسوس ہوئے۔ وہ فہد کو پہلی مرتبہ نظر بھر کر دیکھ رہی تھی اور... سوچ رہی تھی۔

''یہ شخص واقعی اتنا خوبصورت ہے یا صرف مجھے دکھائی دے رہا ہے!''

ایک دم وہ ماضی کی بھول بھلیوں میں سے نکل آئی۔ وہ وہیں فرینکفرٹ کے ہوٹل کے آرام دہ کمرے میں کرسی پر بیٹھی تھی۔ ساتھ والے کمرے میں فہد سو رہا تھا اور خاموش رات دھیرے دھیرے آگے سرک رہی تھی..... دراصل آج صبح سے ہی موسم خنک تھا اور شام تک سردی میں بتدریج اضافہ ہوتا رہا تھا۔ کھڑکی کے شیشے پوری طرح دھندلا سے گئے تھے اور وہاں سے نظر آنے والا شیشم کا درخت آنکھوں سے بالکل اوجھل تھا۔ بہرحال ''انٹرنل ہیٹنگ سسٹم'' کی وجہ سے کمرے کے اندر سردی کا احساس بالکل ناپید تھا۔ کافی کا گرم گرم سیاہ محلول اس کے اندر کے زخموں کو ٹکور کرنے لگا لیکن عین اسی وقت دماغ نے بغاوت شروع کر دی۔ اس کی سوچوں کے بے لگام گھوڑوں کو ماضی کی شاہراہوں پر لا کر چھوڑ دیا۔

ڈیرہ اسماعیل ان کا آبائی علاقہ تھا۔ وہ، اس کی آپی، چھوٹا بھائی اور والدہ وہیں پر آسودہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ والد چودھری اکبر کی وفات کے بعد بھی ان کی گزر اوقات اچھے طریقے سے ہو رہی تھی۔ وہاں پر ان کی کچھ اراضی اور فارم ان کے لیے مستقل آمدنی کا ذریعہ تھے۔ چودھری نے اپنی زندگی میں اپنی بڑی بیٹی کا رشتہ اپنے تعلقات کی بنیاد پر چودھری شجاع کے بیٹے سے طے کر دیا تھا۔ اگرچہ اماں کچھ زیادہ مطمئن تو نہ تھیں پر والد کی وصیت کے مطابق انہوں نے آپی کی شادی کر دی۔ والدہ کے خدشات بالکل درست ثابت ہوئے۔ جب شادی کے ایک ڈیڑھ مہینے بعد آپی گھر آئیں اور انہوں نے متورم آنکھوں اور شکستہ لہجے میں اپنے شوہر چودھری باقر کے شکی مزاج اور بدلحاظ رویے کے متعلق آگاہ کیا۔ والدہ اپنے بچوں سے بے پناہ محبت کرتی تھیں مگر ان کے کچھ نظریات میں قدامت پسندی اور روایتی پن تھا۔ انہوں نے آپی کو اپنے شوہر نامدار کو رام کرنے اور اس کے دل میں جگہ بنانے کے لیے آمادہ کیا اور واپس بھیج دیا پھر یہ سلسلہ کچھ عرصہ یونہی جاری رہا۔ اماں نے بھی ایک دو دفعہ جا کر اس کے شوہر اور سسرالیوں سے خود بات کرنے کی کوشش کی مگر اس سے حالات مزید بگڑ گئے۔ آپی بھی اماں کی خراب طبیعت کی وجہ سے بہت کچھ چھپاتی رہیں اور تن تنہا لڑتی رہیں۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ وہ اکتوبر کی ایک سہانی صبح تھی۔ آپی رات کو ہی کچھ دنوں کے لیے رہنے آئی تھیں۔ ہوا میں ہلکی سی خنکی تھی۔ موسم پلٹا کھانے کی تیاری کر رہا تھا۔ رات وہ اور آپی دیر تک بیٹھے بیتے دنوں اور بچپن کی یادوں کو تازہ کرتے رہے۔ ان کا ارادہ تھا کہ صبح ناشتا کر کے وہ فارم کی سیر کے لیے جائیں گی لہٰذا وہ ناشتا کر کے جانے کے لیے نکلنے ہی والے تھے کہ چودھری باقر، انسان کے روپ میں درندہ آن ٹپکا۔ اس کی شعلہ بار آنکھیں دیکھ کر سب سہم گئے۔ آپی کا رنگ لٹھا ہوتا دکھائی دیا۔ انہوں نے

پہلی دفعہ دیکھا تھا کہ وہ شخص نشے میں دھت دکھائی دے رہا تھا۔

''رات کو فون کر رہا تھا۔ اٹھا کیوں نہیں رہی تھی۔ کس یار سے باتیں ہو رہی تھیں۔ بے غیرت اولاد.....'' وہ پاگلوں کی طرح گرجا۔ آپی جیسے گنگ ہو کر رہ گئیں۔

''پورا ایک گھنٹا مصروف جاتا رہا فون تیرا.....'' اس کی آنکھوں میں بے پناہ درندگی عود کر آئی تھی۔

''وہ..... مجھے آپ کے فون کا پتا نہیں چلا۔ میں..... وہ..... میں اپنی کالج کی سہیلی سے بات کر رہی تھی۔'' آپی نے سراسیمہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

اس بدبخت شکی مزاج نے ادھر کھڑے کھڑے آپی سے اس نمبر پر دوبارہ کال کرنے کو کہا جہاں وہ رات بات کر رہی تھیں۔

''میرے پاس بیلنس نہیں ہے.....'' آپی نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ اس نے پھر اپنے موبائل سے اس نمبر پر کال کی۔ دوسری طرف آپی کی دوست نے نمبر اجنبی جان کر اپنے بھائی کو پکڑا دیا۔ اس خبیث نے بڑے آرام سے فون بند کر کے اپنی جیب میں رکھا اور پاس ہی تنور کے ساتھ پڑا لکڑی کا ڈنڈا اٹھا کر آپی کو مارنا شروع کر دیا۔ وہ اس وقت ایک بپھرا ہوا سانڈ دکھائی دے رہا تھا۔ اس نشئی کو پیچھے دھکیلنے کی کوشش میں اماں کا سر پھٹ گیا اور رابعہ کا ایک ہاتھ بری طرح زخمی ہو گیا..... ہاں..... یہی وہ منظر تھا جو رابعہ کی آنے والی زندگی کا سب سے بڑا روگ بن گیا تھا۔ ان کی دلخراش چیخوں نے وہاں کے پُرسکون ماحول میں کہرام برپا کر دیا تھا۔ جس ڈنڈے سے وہ آپی کو مار رہا تھا اس میں ایک قطار کی صورت میں کئی کیل ٹھکے ہوئے تھے۔ اس نے اس نازک سی لڑکی کے جسم کو ادھیڑ کر رکھ دیا۔ جب تک محلے والے پہنچتے بہت دیر ہو چکی تھی۔ اس کی آپی کا خون میں لت پت جسم کسی گٹھڑی کی صورت صحن میں ساکت پڑا تھا۔ آپی قریباً تین ماہ تک اسپتال میں رہنے کے بعد چل بسی تھیں۔

بادل زور سے گرجا۔ پر اندر بارش نجانے کب سے شروع ہو چکی تھی۔ رابعہ کی..... گردن آنسوؤں سے تربتر تھی۔ وہ کچھ دیر یونہی لیٹی رہی اور آنسو بہاتی رہی۔ ہچکیوں میں اس نے اس جان لیوا درد کو سمیٹنے کی کوشش کی لیکن درد اور بڑھ گیا مگر اس کی سوچوں کے گھوڑوں کو اس منظر پر نہیں رکنا تھا۔ ورنہ اس منظر کا درد اس کی جان لے لیتا۔ اس نے کافی کو ایک مرتبہ پھر گرم کیا اور واپس چیئر پر آ گئی۔ فرینکفرٹ کی رات بھیگتی چلی جا رہی تھی۔ اس نے ''رخشِ خیال'' کو آگے بڑھایا اور پھر ماضی کے دھندلکے میں چلی گئی۔ اس دلخراش واقعے نے اس کی چھوٹی سی فیملی کو بری طرح متاثر کیا لیکن رابعہ..... وہ تو زندہ لاش کی طرح بن کر رہ گئی تھی۔ اس واقعے نے اس معصوم سی لڑکی کی بنیادوں تک ہلا دیا۔ اس کی سوچوں کے تمام زاویے بدل کر رکھ دیے۔ اس وقت وہ ایف۔ایس۔سی پری میڈیکل کے پہلے سال میں تھی۔ اس نے اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ دی۔ سارا سارا دن چپ چاپ وہ گھر کے کاموں میں لگی رہتی یا پھر چھپ چھپ کے روتی رہتی۔ اس کی اماں اپنی ہمت کے مطابق اسے اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لیے زور دیتیں۔ پھر وہ بھی تھک ہار کر چپ ہو گئیں۔ گھر سے باہر نکلنے کا خوف، گھر کی ڈور بیل بجنے یا دروازے پر کھٹکے کا خوف اسے گھن کی طرح کھائے جا رہا تھا۔ اس کی آپی کی ازدواجی زندگی کربناک رہی تھی۔ باقر جب بھی ان کے گھر آتا اس کا انداز ایک جابر حاکم کا سا ہوتا تھا اور اب آپی کے مرنے کے بعد بھی وہ ان کی زندگی میں دخل دیتا رہتا تھا۔ چودھری باقر کی دھمکیوں کے خوف اور اپنے واحد محسن اپنے چچا کے مشورے پر وہ ڈیرہ اسماعیل والا گھر اور کچھ اراضی بیچ کر لاہور آ گئے۔ یہاں کچھ دن اپنی پھپھو کے پاس رہے اور ایک متوسط علاقے میں پانچ مرلے کا مکان بنا لیا۔ رابعہ کی پھپھو کو ان سب سے دلی ہمدردی تھی۔ خاص طور پر رابعہ کا وہ بے حد خیال رکھتی تھیں۔ وہ ایک پڑھی لکھی عورت تھیں۔ اتنی خوبصورت اور قابل لڑکی کے اعتماد کی زبوں حالی ان سے دیکھی نہ جاتی تھی۔ انہوں نے رابعہ کی نفسیات کو پرکھا اور مثبت سوچ کی تعمیرِ نو کی۔ ان کے ہی توسط سے رابعہ نے پرائیویٹ ایف۔اے اور پھر بی اے کیا اور اس دوران وہ ایک اچھے انگلش میڈیم اسکول میں ٹیچنگ بھی کرتی رہی جہاں اس کی یہ پھپھو پرنسپل تھیں۔ اس عرصے میں اس کے لیے بڑے اچھے رشتے بھی آتے رہے پر اس کے ذہن اور دل سے جیسے ازدواجی رشتے کا احساس کسی نے کھرچ کر نکال دیا تھا۔ پر کہتے ہیں کہ کبھی کوئی ایسا محسن مل جاتا ہے جسے آپ چھوڑنا چاہیں بھی تو وہ آپ کو نہیں چھوڑتا۔ اسی اسکول میں اس کی پھپھو پرنسپل تھیں۔ انہوں نے اپنی بھتیجی کے ساتھ بڑی نیکی کی اور چار پانچ سال میں دوستی، پیار محبت اور کونسلنگ سے اس کے شکستہ اعصاب اور منفی احساسات کو بہت حد تک ''نارملائز'' کیا اور پھر ایک دن انہی پھپھو کے توسط سے آیا ہوا رشتہ اس کے چھوٹے بھائی،

اماں اور بادل ناخواستہ اس نے خود بھی قبول کیا اور وہ بیاہ کر فہد کے گھر آ گئی۔

رابعہ کی زندگی نے ایک زبردست پلٹا کھایا تھا۔ وہ کبھی کبھی یقین نہ کر پاتی کہ یہ کسی حسین خواب جیسی حقیقت ہے یا پھر خوبصورت حقیقت جیسا خواب۔ شادی کے اوائل دنوں میں ڈپریشن نے پھر اسے دبوچ لیا تھا۔ فہد نے ایک دو دفعہ اس کے سہمے رہنے کی وجہ پوچھی پر اسے زیادہ کریدا نہیں۔ رابعہ شادی سے پہلے ہی اپنی اماں اور بھائی کو کہہ چکی تھی کہ بڑی بہن کی موت کی اصل وجہ اور اس کے ساتھ رونما ہونے والا واقعہ اس کے سسرال میں کسی کو پتا نہیں چلنا چاہیے اور اب فہد کی طرف سے اپنے رویے پر اٹھنے والے سوال سے وہ ہمیشہ کترا کر گزر جاتی۔ اچھے ساس سسر نے گھر اور زندگی کو مزید خوبصورت بنا دیا تھا اور فہد کی سنگت بھی دھیرے دھیرے اس کے زخموں کو مندمل کرتی گئی۔ بالکل ایسے ہی جیسے کسی دھول میں اٹے ہوئے شیشے کو صاف کر کے اسے چمکا دیا جائے۔ فہد ایک سافٹ ویئر انجینئر تھا اور کمپیوٹر گیمز سے اسے خاصا شغف تھا۔ اس شوق میں اس نے رابعہ کو بھی اپنے ساتھ ملا رکھا تھا۔ وہ جمعے کی رات کو اپنے کمرے میں لیپ ٹاپ اور پی سی کمپیوٹر کی نیٹ ورکنگ کر کے ایک مشہور وار گیم کھیلتے رہتے فجر کی اذان تک وقتاً فوقتاً ان کے نعرے بلند ہوتے رہتے۔ ہفتے کی رات کو ان کی مختصر سی فیملی کا ڈنر ریسٹورنٹ میں پکا ہوتا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا ایک ہفتے کی رات ٹی وی پر نیا گرافال پر بنی ''ڈاکومینٹری'' فلم دیکھتے ہوئے رابعہ نے کہا۔ ''اف..... کتنی خوبصورت جگہ ہے فہد۔ چلیں چلتے ہیں یہاں۔'' رابعہ تجسس بھرے انداز میں آنکھوں میں شوخی لیے بولی۔ فہد بڑی محویت سے ٹی وی دیکھ رہا تھا۔

''ہاں ٹھیک ہے۔ میں باہر جا کر گاڑی اسٹارٹ کرتا ہوں۔ تم سامان پیک کر کے پہنچو۔'' رابعہ نے شوخی سے صوفے کا کشن اٹھا کر اسے دے مارا۔ فہد بھی ہنس پڑا۔ کچھ دنوں سے رابعہ کی طبیعت بڑی چڑچڑی ہو رہی تھی۔ وہ سب سے بہت کم بات کرتی۔ زیادہ تر دن کے وقت بھی اپنے کمرے میں رہتی۔ ان کی شادی کو ایک سال گزر چکا تھا اور ابھی تک اولاد کی امید نہ بندھنے کی وجہ سے وہ جب کبھی پریشان ہوتی تو اس کی طبیعت ایسی ہی..... بیزار ہو جاتی تھی۔ ایک صبح فہد جاگا تو اس نے دیکھا کہ رابعہ سامنے سیٹھی پر سر جھکائے بیٹھی ہے۔ وہ اٹھا اور بجلی کی تیزی سے اس کے پاس پہنچا۔

''کیا ہوا؟'' فہد اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔

''رابعہ.....'' اس نے اس کا چہرہ اٹھایا جو آنسوؤں سے تر تھا۔

''کچھ نہیں۔ بس طبیعت تھوڑی عجیب ہو رہی ہے۔ کمرے میں دم گھٹ رہا ہے۔'' وہ دوبارہ آنسو بہانے لگی۔ فہد نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا اور تسلی دینے لگا۔

''گھر کی یاد تو نہیں آ رہی؟'' وہ جواب میں خاموش رہی۔

''چلو ایسا کرتے ہیں کہ نیاگرا چلتے ہیں۔''

''امریکا.....'' رابعہ نے اسے حیرت سے دیکھا۔

''ہاں واقعی..... اس میں ایسی کونسی بڑی بات ہے۔'' وہ مسکرایا۔

''ہم مہینے کے بجٹ میں سے آٹھ دس مہینے سیونگ کرتے ہیں۔ پھر چلیں گے۔''

''چلو جی اتنی لمبی پلاننگ؟'' رابعہ ہنس پڑی۔

''ہاں ایسا ہی ہے لیکن فی الحال تو میں تمہیں تمہاری امی کی طرف چھوڑ دیتا ہوں۔ دیکھو کتنے کالے بادل آ رہے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ رستے میں ہی بارش شروع ہو جائے اور تمہیں کہیں کوئی نیاگرا فال بھی نظر آ جائے۔'' فہد نے مذاق کرتے ہوئے اس کے سر کو پکڑ کر ہلایا۔

''ٹھیک ہے۔ اگر باہر کے ملک سیر کرنے جانا ہے تو میں اپنی پھپھو کی طرف جرمنی جانا پسند کروں گی۔ یورپ کی سیر بھی ہو جائے گی اور میں اپنی پھپھو سے بھی مل لوں گی۔'' فہد پُرسوچ لہجے میں بولا۔

''ویسے یہ بات زیادہ قابلِ عمل ہے۔ ٹھیک ہے بھئی اوکے ہو گیا پلین۔ پر آٹھ دس مہینے تو ویٹ کرنا ہی پڑے گا۔''

''واؤ..... نکسٹ ٹو یورپ۔'' رابعہ نے نعرہ لگایا اور اپنی امی کے گھر جانے کی تیاری کرنے لگی۔

شام کو فہد رابعہ سے ملنے گیا تو رابعہ ابھی تک کمرے میں سو رہی تھی۔ رابعہ کی والدہ ممتاز آنٹی فہد کے لیے چائے کی ٹرے لے کر اندر داخل ہوئیں اور مسکراتے ہوئے بولیں۔

''فہد بیٹا۔ آپ کو بہت مبارک ہو۔ آپ کے گھر نئے مہمان کی آمد کا پیغام ہے۔'' فہد اس وقت چائے کا کپ اٹھانے لگا تھا اور اگر وہ اٹھا چکا ہوتا تو اس وقت وہ یقیناً چھلک چکا ہوتا۔ وہ کچھ دیر اس نویدِ مسرت سنانے والی ہستی کے مسکراتے تابندہ چہرے کو دیکھتا رہا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ اٹھ کر ان کے ہاتھ چوم لے۔

☆☆☆

زندگی کے سمندر میں خوشیوں کے جزیرے آتے

رہے۔ جن پر انہوں نے اپنے خوبصورت اور نایاب تعلق سے سرشار ہوکر محبت اور چاہت کے انمٹ نقوش چھوڑے اور اسی سمندر میں کچھ غموں اور دکھوں کے بھنور بھی آئے جن میں رابعہ کی والدہ کی وفات اور فہد کے والدین کی وفات کے بڑے نقصانات بھی شامل تھے۔ اللہ پاک نے انہیں تین بیٹوں سے نوازا۔ ارسلان، شایان اور اسد۔ فہد اور رابعہ کی دیرینہ خواہش تھی کہ ان کے ہاں بیٹی بھی ہو۔ اللہ کی رضا پر راضی ہوگئے۔ ان کے مالی حالات اب پہلے سے کافی بہتر تھے۔ کمپیوٹر پروگرامنگ کی ایک نئی جاب میں فہد کو خاصی کامیابی ملی تھی۔ سوفٹ ویئر کی ایک پرائیویٹ فرم میں اس نے ایک دوست سے شراکت داری بھی کرلی تھی۔ وہ متوسط درجے سے نکل آئے تھے اور اب آسودگی سے گزر بسر کررہے تھے۔ اس دوران انہوں نے کئی دفعہ اپنی یورپ کی سیر کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی لیکن ہر دفعہ کوئی نہ کوئی مصروفیت آڑے آتی رہی۔ مری کے گیسٹ ہاؤس کی بالکونی میں کھڑے وہ دونوں نیچے لان میں اپنی چھوٹی سی دنیا کو کھیلتے، قہقہے لگاتے دیکھ رہے تھے۔ ان کے تینوں بچے نیچے لان میں فٹ بال کھیل رہے تھے۔ بڑا بیٹا ارسلان بھرپور جوان تھا اور فہد کے چہرے پر ہلکی سی ڈاڑھی تھی جس میں اب اِکّا دُکّا سفید بال تھے مگر رابعہ..... وہ اب بھی ویسی ہی دلکش تھی۔ اس کی نوجوان اولاد کا سن کر یقیناً ہر کوئی چونکتا ہوگا۔ کسی جھرنے کے شفاف پانی جیسی چمک اور پاکیزگی تھی اس کے چہرے پر اور وہ دونوں..... اب بھی ویسے ہی تھے۔ ہنستے کھیلتے، ایک دوسرے پر چٹکلے چھوڑتے، ایک دوسرے پر کشنز اٹھاتے، ویڈیو گیمز لگاتے، کسی اور ہی دنیا کے باسی لگتے تھے۔

''پچھلے کئی سالوں سے مری یا پھر گلیات ہی آتے ہیں۔ جگہیں تو بہت خوبصورت ہیں پر اب دل بھر گیا ہے۔ کوئی اور جگہ دیکھیں گے اگلے سال۔'' رابعہ نے کہا۔

''چلو صحیح ہے۔'' فہد نے اپنا چشمہ صاف کرتے ہوئے جواب دیا پھر مسکراتے ہوئے بولا۔

''بہو لے آؤ گھر۔ جوان سپوت ہے تمہارا۔ پھر ہم دونوں مائی بابا یورپ کی سیر کو نکل جاتے ہیں۔ ایسا نہ ہو یہ خواہش..... خواہش ہی رہ جائے۔'' فہد نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔

''صحیح کہہ رہے ہیں آپ۔ پر مائی بابا والی بات ٹھیک نہیں ہے۔ ابھی ہم نے دیکھا ہی کیا ہے۔'' رابعہ نے ایک مرتبہ پھر نظر نیچے لان میں چہکتے ہوئے بچوں پر ڈالی۔

''اسی لیے تو کہہ رہا ہوں۔ شادی کردو بیٹے کی۔ ہماری بیٹی کی خواہش بھی پوری ہوجائے گی۔''

''اور پوتے پوتیوں کی بھی۔'' رابعہ نے چہکتے ہوئے کہا۔ انہوں نے اپنے اردگرد ایک نامانوس سی آہٹ کو محسوس کیا۔ دیوانہ کردینے والی مہک چہارسو پھیل گئی۔ زندگی کے اس پہلو کے بارے میں تو انہوں نے پہلے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ہی رابعہ کی آنکھوں میں اپنے چھوٹے بھائی کی بیٹی آمنہ کی شبیہہ گھومنے لگی۔

ڈیرہ اسماعیل میں اس کے چچا کے گھر ان کی سب سے چھوٹی بیٹی کی شادی کا فنکشن دھوم دھام سے جاری تھا۔ رابعہ فہد سے ضد کرکے یہاں اتنی دور شادی اٹینڈ کرنے آئی تھی۔ وہ فہد کو اپنے بھائی کی بیٹی آمنہ سے بھی ملوانا چاہتی تھی۔ فہد اس شرط پر یہاں آنے کے لیے راضی ہوا تھا کہ جمعے کو برات کا فنکشن اٹینڈ کرکے ایک رات کا وہاں اسٹے لے کر صبح انہیں ہر صورت نکلنا ہوگا کیونکہ آفس جانے کے لیے اتوار والے دن کا ریسٹ اس کے لیے ضروری تھا۔ ارسلان اور شایان گھر ہی میں تھے جبکہ چھوٹا بیٹا اسد ان کے ساتھ آیا تھا۔ انہوں نے ایک وسیع کیٹرنگ کررکھی تھی۔ برقی قمقموں کی جھالریں اور فانوس جابجا لگے ہوئے تھے۔ برات آچکی تھی اور کھانا کھلنے ہی والا تھا۔ فہد اور رابعہ میز کرسیوں سے پیچھے کچھ فاصلے پر کھڑے اورنج جوس کے گلاس تھامے جیسے ماحول سے کٹے ہوئے تھے۔ ان کے لبوں پر بیتے لمحوں کے تذکرے تھے۔ اس وقت کے تذکرے جب یہ موقع ان کی زندگی میں آیا تھا۔ وہ ایک دوسرے کی باتوں کو، مسکراہٹ کو، چہروں کو صاف دیکھ رہے تھے، سن رہے تھے اور باقی سب جیسے دھند میں لپٹا ہوا تھا۔

''السلام علیکم!'' کسی نے بالکل پاس آکر کہا۔ فہد اور رابعہ نے چونک کر دیکھا۔ یہ عمر تھا۔ رابعہ کا وہی کزن جسے رابعہ نے کبھی بچپن میں پسند کیا تھا۔ چچی کی وفات پر جب وہ لوگ ڈیرہ اسماعیل خاں آئے تھے تو اس وقت بھی فہد اور اس کی سرسری سی ملاقات ہوئی تھی۔

''وعلیکم السلام!'' دونوں نے اکٹھے جواب دیا۔ فہد نے مصافحہ کیا۔ وہ فہد سے عمر میں کچھ بڑا دکھ رہا تھا لیکن اس بات سے انکار نہیں تھا کہ اپنی جوانی میں وہ بلاشبہ ایک وجیہہ اور خوبصورت شخص رہ چکا تھا۔

''کیسی ہو رابی؟'' اس کا لہجہ اور انداز بے تکلف تھا اور یہ لہجہ فہد کو بڑا کھٹکا۔

''بھائی میں ٹھیک ہوں۔ آپ کیسے ہیں اور بھابی

کدھر ہیں؟'' رابعہ نے مسکراتے ہوئے بڑے رکھ رکھاؤ سے جواب دیا۔

''بھئی بھابی تو تمہاری لاہور میں ہیں۔ اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی اس لیے شادی پر نہیں آسکی۔ اصل میں اب میں لاہور میں ہی ہوتا ہوں۔'' اس نے ایک مشہور شاپنگ سینٹر کا نام لیا۔

''وہاں جیولری کی شاپ ہے۔'' اس نے فہد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا پھر رابعہ کی طرف متوجہ ہوا۔

''گولڈا سمتھ ہے بھائی تمہارا۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''کبھی ضرورت پڑے تو یاد ضرور کرنا۔'' کچھ دیر رسمی باتیں ہوتی رہیں پھر وہاں کھانا کھل گیا۔

فہد کی طبیعت عجیب ہو رہی تھی۔ اس نے کھانا نہیں کھایا تھا بلکہ گرین ٹی کا ایک کپ لیا اور اپنی ٹیبل پر بیٹھ گیا۔ اس کے سر میں درد ہو رہا تھا۔

''مجھے اس شخص کا نظر آنا اور ادھر اس کی موجودگی اتنی بری کیوں لگ رہی ہے؟'' اس نے خود سے سوال کیا اور پھر خود ہی بولا۔

''وہ اسے رابی کہتا ہے۔ میں نے خود اسے کبھی اس نام سے نہیں بلایا تو اس کی یہ جرأت کیسے ہوئی۔'' اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

''اف خدایا! یہ کیا ہو رہا ہے۔ جس چیز کا کوئی وجود ہی نہیں، میں اسے کیوں سوچ رہا ہوں۔''

دلہن بیاہ کے اپنے گھر جا چکی تھی۔ گھر کی وسیع و عریض اور کسی قدر پرانی عمارت پر جلنے والے برقی قمقمے اس کے در و دیوار پر چھا جانے والی اداسی کو کم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس سے لڑ رہے تھے۔ نجانے رات کا کون سا پہر تھا جب فہد نے رابعہ کو جھنجوڑ کر اٹھایا۔

''اٹھ جاؤ۔ واپس جا رہے ہیں ہم۔'' رابعہ گھبرا کر اٹھی اور فہد کو دیکھنے لگی۔ فہد سوٹ کیس کو دیوار کے ساتھ لگا رہا تھا۔

''فہد..... لیکن ہوا کیا ہے۔ ایسے کیوں جا رہے ہیں؟'' وہ ہکا بکا اسے دیکھ رہی تھی۔

''دیکھو رابعہ پلیز۔ مجھ سے اس وقت سوال نہ کرنا میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں نے سامان سب سمیٹ دیا ہے۔ تم بس اسد کو اٹھاؤ اور چلو۔'' اس نے یہ بات بڑے تحمل سے رابعہ کو کہی۔ رابعہ نے دیکھا کہ فہد کی آنکھیں رت جگے کی غماز تھیں۔ رابعہ نے کوئی بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور وہ لوگ چپ چاپ منہ اندھیرے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ آنے والے دنوں میں بھی فہد نے اپنے اس دن کے رویے کی اصل وجہ رابعہ کو بتانا مناسب نہ سمجھی۔ اس نے رابعہ کو بس اتنا ہی کہا۔

''مجھے وہ جگہ، وہ ماحول پتا نہیں کیوں ''سوٹ'' نہیں کیا۔ طبیعت بوجھل ہونے لگی تھی۔''

☆☆☆

ماضی کی ترش و شیریں یادوں کا تانا بانا ایک دفعہ پھر ٹوٹ گیا۔ کافی کا خالی کپ نجانے کب سے اس کے ہاتھوں کے سہارے اس کی گود میں پڑا تھا۔ ساتھ والے کمرے سے دو تین بار فہد کے کھانسنے کی مدھم آواز آئی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی، خالی کپ ٹیبل پر رکھا اور شال لپیٹ کر باہر کوریڈور میں آ گئی۔ تیز بارش بالکونی کے بند گلاس ونڈو پر لکیروں کی صورت میں عجیب منظر کشی کر رہی تھی۔ وہ لکیریں اسے بالکل ڈھلتے آنسوؤں کے مانند لگ رہی تھیں، یہ منظر اسے دھیرے دھیرے ایک بار پھر ماضی کے دھندلکوں میں لے گیا۔

''لیکن آمنہ میں کیا مسئلہ ہے۔ اتنی خوبصورت، پڑھی لکھی اور شریف لڑکی ہے؟'' رابعہ نے چادر تہ کرتے ہوئے کہا۔ فہد آفس جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔

''یار اس میں کوئی مسئلہ نہیں لیکن ادھر رشتہ نہیں کرنا۔ ارم ارسلان کے لیے بالکل ٹھیک لڑکی ہے۔ بس..... تھوڑی سی موڈی ہے کیونکہ بچی ہے ابھی۔ ادھر آئے گی تو ہمارے ہی رنگ میں رنگ جائے گی۔ اس کی فکر نہ کرو اور میرا خیال ہے ارسلان کو بھی پسند ہو گی۔''

''جی نہیں۔ ارسلان نے کبھی اپنی پسند ناپسند کا اظہار نہیں کیا۔ وہ کہتا ہے جہاں آپ لوگ مناسب سمجھیں وہیں پر کر دیں۔'' رابعہ نے وارڈ روب کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں..... بے چارہ اس معاملے میں مجھ پر جو گیا ہے۔'' فہد نے ٹائٹ باندھتے ہوئے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

''اوہو..... آپ اتنے سادہ دل.....'' رابعہ بھی ہنسنے لگی۔

''اور مجھے آمنہ ہر لحاظ سے مناسب لگتی ہے اس کے لیے اور پھر شروع سے میری خواہش بھی یہی ہے۔'' اب کی بار فہد کے تاثرات کچھ گمبھیر ہو گئے۔

وہ بولا۔ ''تمہیں صرف اپنی خواہش کی پڑی ہوئی ہے۔ میری بات کا کوئی لحاظ نہیں تمہیں۔ میری ہی غلطی تھی جو تمہیں ادھر شادی پر لے گیا۔ یار حد ہوتی ہے ہر چیز کی..... اس دن سے تم میرا سر کھانے لگی ہوئی ہو۔ شوہر کی بات تو تمہیں آتی ہی نہیں ماننا۔'' فہد کا غصہ آسمان کو چھونے لگا تھا۔

اس نے آج پہلی دفعہ شوہر ہونے کا ریفرنس دے کر کوئی بات کہی تھی۔ رابعہ ایک دم گم صم سی ہوگئی۔ اس نے خاموش نظروں سے فہد کو دیکھا۔ ''تم نے مجھے اب ناشتا دینا ہے یا پھر میں دفع ہوجاؤں۔'' اس نے ہاتھ کو سوالیہ انداز میں حرکت دیتے ہوئے غصے میں کہا۔ اس سے پہلے کہ رابعہ حرکت میں آتی فہد گرجا۔ ''رہنے دو تم.....'' اس نے ٹائی اتار کر ایک طرف پھینکی اور گاڑی کی چابیاں پکڑ کر پاؤں پٹختا ہوا باہر نکل گیا۔

''اس کو کیا ہوگیا ہے؟'' حیران و پریشان گم صم کھڑی رابعہ زیرلب بڑبڑائی۔ آنکھوں کے کٹورے آنسوؤں سے بھرنے لگے۔ ارسلان کی آہٹ پر بڑی صفائی سے اس نے وہ گرم گرم درد اپنے حلق میں انڈیلا..... اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ فہد کے اندر یہ غصہ کافی دنوں سے دبا ہوا تھا جو آج اچانک باہر امڈ آیا ہے۔ اس نے ایک دو دفعہ فہد کو کال کی پر اس کا موبائل آف ملا۔ رات نو بجے کے قریب آفس سے اس کے ایک دوست کا فون آیا اور اس نے بتایا کہ کچھ دیر پہلے فہد کا فون آیا تھا۔ اس نے جگہ کا نام تو نہیں بتایا بس کہا ہے کہ میں شمالی علاقہ جات کی طرف آیا ہوں اور کچھ دن یہیں رہوں گا۔

رابعہ تو جیسے اپنی جگہ سن ہو کر رہ گئی۔ کتنی دیر وہیں صوفے پر بیٹھے بیٹھے آنسو بہاتی رہی۔ کچھ دیر بعد ارسلان آفس سے آیا تو اس نے ساری بات بیٹے کو بتائی۔ وہ دو تین دن رابعہ اور بچوں پر بہت ٹینشن والے گزرے۔ فہد کی بڑی بہن اور کزنز بھی آئے اور انہیں دلاسا دیا۔ فہد کی طرف سے ابھی تک کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا اور اس کا فون بھی آف جارہا تھا۔

اس دن کچن میں کام کرنے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے آنسو پونچھ رہی تھی۔ جب سے فہد گیا تھا اسے دن کے وقت بھی ڈر سا لگتا رہتا تھا۔ بچے چلے جاتے تو وہ بار بار دروازے چیک کرتی رہتی تھی۔ پہلے بھی وہ اکیلی ہی رہتی تھی۔ پر اب دوری کے احساس نے اسے کچھ ڈسٹرب اور بے چین سا کردیا تھا۔ اب بھی اسے یاد آیا کہ سیکنڈ مین ڈور بند کرنا بھول گئی ہے۔ چولہا بند کرکے اس نے جلدی سے دروازے کو بولٹ کیا اور اپنے بیڈروم میں آگئی۔ ایک دم وہ ٹھٹکی۔ تین چار دن بعد وہ خوشبو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی تو اس نے پوری طرح اسے محسوس کیا۔ اس سے پہلے کہ وہ پلٹتی فہد نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ جی بھر کر مکے برسائے اس نے فہد پر۔ پھر اس کے سینے سے لگ کر رونے لگی۔

''ذرا خیال نہیں آیا آپ کو میرا اور بچوں کا۔'' فہد نے اسے کچھ اور زور سے اپنے ساتھ بھینچ لیا۔ فہد کے چہرے پر بھی بے تحاشا تھکن کے آثار تھے اور آنکھیں بھاری بھاری تھیں جیسے بڑی دیر سے نہیں سویا۔

''تم جیسا کہو گی ویسا ہی کریں گے۔ میں نے تمہیں رلایا، پریشان کیا۔ آئی ایم سوری۔'' فہد نے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔

''نہیں جیسا آپ کہیں گے ویسا ہی ہوگا۔ فہد، ارسلان بھی ارم کی طرف سے مطمئن ہے اور دوسری طرف کہاں ڈیرہ اسماعیل سسرال بنے گا اس کا۔ کہاں ہفتے دو ہفتے بعد اپنی بیوی کو اس کے میکے اتنی دور لے کر جائے گا۔ خوار ہوگا۔'' رابعہ نے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔ فہد اپنی محبت کو بڑی محویت سے دیکھ رہا تھا پھر مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔

''ہائے..... ویسے یہ سسرال والا مشورہ کوئی ہم مسکینوں کو بھی دے دیتا۔'' اس نے تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے ایک لمبی آہ بھری۔

''کیا.....'' رابعہ کا ہاتھ بجلی کی تیزی سے بیڈ کشن کی طرف بڑھا۔ دونوں طرف انا کی دیوار مسمار ہوئی تو ایک بڑا مسئلہ آپوں آپ حل ہوگیا تھا۔

☆☆☆

ڈھیروں شگن اور چاہتیں سمیٹے نومبر کی ایک خنک رات میں ارم ارسلان کی دلہن بن کر فہد اور رابعہ کے گھر آگئی۔

گھر کی دہلیز میں قدم رکھتے ہی رابعہ نے ارم کو گلے سے لگایا اور کہا۔

''ارم آج میں بہت خوش ہوں۔ آج میری فیملی مکمل ہوگئی۔ میری بیٹی میرے گھر آگئی۔'' رابعہ نے اپنا چھوٹا چھوٹا زیور، اپنے بچپن کی یاد کو ہمیشہ سنبھال کے رکھا تھا۔ اس کے دل میں ہمیشہ سے تھا کہ وہ یہ اپنی بیٹی کو دے گی۔ اس کو بیٹی تو نہ ملی لیکن جب ارسلان کی دلہن کے روپ میں وہ بیٹی کو بیاہ کر گھر لائی تو کچھ دن بعد اس نے وہ سارا چھوٹا چھوٹا زیور ارم کو دے دیا اور اس سے جڑے اپنے جذبات واحساسات سے اسے آگاہ کیا۔ یہ شادی کے پانچ چھ ماہ بعد کی بات ہے۔ سردی نے اپنا پورا زور دکھایا تھا۔ تین دن کی وقفے وقفے سے جاری رہنے والی جھڑی کے بعد آج پہلے دن دھوپ نے اپنی شکل دکھائی تھی۔ صبح کے گیارہ بج رہے تھے رابعہ نے فریج سے نکالی ہوئی ٹھنڈی ٹھار سبزی پکڑی اور باہر لان میں آگئی۔ لان کے ایک کونے میں دھوپ پڑ رہی تھی۔ اس نے اسی کونے میں چارپائی بچھائی اور سبزی

کاٹنے بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر میں ارسلان اور ارم بھی نیچے آنے والے تھے۔ یہ اتوار کا دن تھا اور شادی کے ایک دو ہفتے بعد سے ہر اتوار کو ان کا معمول تھا کہ وہ گیارہ بارہ بجے تک اٹھتے اور پھر بغیر ناشتا کیے باہر نکل جاتے۔ ارم پہلے اپنی امی کی طرف جاتی اور پھر رات گئے تک نجانے کہاں کہاں گھومتے پھرتے رہتے وہ لوگ۔ شاید ہی کوئی ویک اینڈ انہوں نے گھر والوں کے ساتھ گزارا ہو۔ ارسلان اپنی بیوی کے سب الٹے پلٹے چونچلے پورے کرنے کی کوشش کرتا اور اس کے پیچھے ایک وجہ ہوتی تھی۔ ایک مقصد تھا، وہ چاہتا تھا کہ ارم اس کی ماں کا سہارا بنے۔ وہ ارسلان کی پسند سے ہی اس کو بیٹی بنا کر لائی تھیں تو اب وہ بھی ان کو اپنی ماں کا درجہ دے مگر سر توڑ کوشش کے باوجود اس کی یہ خواہش فی الحال پوری ہوتی نظر نہیں آرہی تھی۔ ان کی شادی کو چھ ماہ ہو گئے تھے اور اس دوران پانچ یا چھ دفعہ ہی ایسا ہوا تھا کہ اس نے کچن میں قدم رکھا ہو۔ ارسلان کو صبح بھوکا آفس جاتے دیکھ کر رابعہ خود ہی اٹھ جاتی اور اسے ناشتا بنا کر دیتی۔ ارم ڈیڑھ دو بجے تک نیچے آتی اور اپنا بریڈ انڈے کا ناشتا کر کے دوبارہ اوپر چلی جاتی۔ ڈنر کی تیاری بھی رابعہ کو اکیلے ہی کرنا ہوتی۔

ایک دن فہد اٹھا تو اس نے دیکھا کہ رابعہ کا جسم بخار میں تپ رہا تھا۔ اس نے خود ہی اپنے اور رابعہ کے لیے ناشتا بنایا اور پھر اسے دوا پلائی اور آفس چلا گیا۔ کچھ دیر تک دوا کا اثر رہا پھر رابعہ کا جسم دوبارہ بخار میں جلنے لگا۔ بچے بھی اس کا حال احوال پوچھ کر اپنے اپنے کاموں کو جا چکے تھے اور ارم..... اس نے کھانا یا دوا در کنار رابعہ کا حال پوچھنا تک گوارا نہ کیا۔ بس ایک دفعہ وہ نیچے آئی اور دروازے میں کھڑے کھڑے بولی۔

''دھلنے والے کپڑوں کی باسکٹ رکھ دی ہے۔ کام والی آئے گی تو اس کو کہہ دینا کہ میرے کپڑے دھو دے۔''

یہ کہہ کر کھٹاک سے دروازہ بند کر کے وہ اوپر اپنے کمرے کی طرف چلتی بنی۔ رابعہ سارا دن بے یار و مددگار اپنے کمرے میں بخار میں جلتی رہی۔ کام والی عورت کال بیلز دے دے کر واپس چلی گئی تھی۔ سارا گھر بے ترتیب اور کچن گندا پڑا تھا۔ شام کو پہلے فہد گھر آیا اور پھر ارسلان اور وہ پہلا دن تھا جب ارسلان نے ارم کی اچھی خاصی کلاس لی۔ اس کے بعد سے ارم کا رویہ رابعہ کے ساتھ مزید روکھا ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے ارسلان کا ناشتا تو خود بنانا شروع کر دیا پر جب بھی وہ نیچے آتی تو رابعہ کو چھوٹی چھوٹی باتوں پر روکتی ٹوکتی اور اس سے جھگڑا کرتی۔ فہد اور رابعہ یہ سب دیکھ رہے تھے مگر خاموش تھے کیونکہ انہیں اپنے بچے کا ذہنی سکون عزیز تھا اور وہ گھر میں تناؤ کا ماحول نہیں چاہتے تھے۔

دھوپ ذرا تیز ہوئی تو جسم میں سکون اتارتی چلی گئی۔ رابعہ کی سبزی بھی تقریباً کٹ چکی تھی اور تب اندر سیڑھیوں سے ارم اور ارسلان کے اترنے کی آوازیں آئیں۔ ارم کے ہیل کی ''کھٹ کھٹ'' کبھی کبھی اس کے دل پر لگتی۔ اس نے کبھی نہیں کہا تھا۔ ''امی آج آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں۔''

ہر دفعہ کی طرح ارم لانگ ہیل پہنے، بال شانوں پر بکھیرے، گلے میں دوپٹا ڈالے بڑی بے نیازی سے سلام کیے بغیر گاڑی کی طرف بڑھنے لگی۔

''ارم، ارسلان! بیٹا رات کو میں نے اپنی پھپھو کو کھانے پر بلایا ہے۔ وہ لوگ واپس جرمنی جا رہے ہیں ناں..... تو ڈنر کی تیاری تو میں کر لوں گی۔ بس آپ لوگ کھانے کے ٹائم تک گھر آجانا۔''

''جی امی جان ٹھیک ہے۔'' ارسلان بولا اور ارم کا منہ پھول گیا۔ ارسلان کوئی چیز لینے واپس اندر گیا تو رابعہ نے ارم کو بڑے پیار سے اپنے پاس بلایا۔

''ارم بیٹا آپ جب گھر سے باہر جایا کرو ناں تو سر پر دوپٹا لے کر رکھا کرو۔ ورنہ بیٹا مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں ننگے سر ہوں۔'' رابعہ نے نہایت انسیت اور اپنایت سے کہا اور پھر اتنا ہی کہنا تھا کہ ارم کے اندر ابالے کھاتا غصہ آتش فشاں بن کر اس کے منہ سے باہر نکلنے لگا۔

''آپ کیا ہر وقت مجھے روکتی ٹوکتی رہتی ہیں۔ میں اپنے میاں کے ساتھ جا رہی ہوں، جیسے مرضی جاؤں۔ آپ کو کیا مسئلہ ہے۔'' اس نے آنکھیں پھاڑ کر تقریباً چلاتے ہوئے کہا۔

''ہوا کیا ہے؟'' ارسلان اب موقع پر پہنچ چکا تھا۔

''اور تم اپنی آواز آہستہ رکھو۔'' اس نے ارم کو گھورتے ہوئے کہا۔ ارم نے تیز لہجے میں رابعہ کی بات ارسلان کو بتائی۔ رابعہ ڈر سی گئی پر اسے اس وقت ارم پر غصہ بھی بہت آیا۔

''انسان کا باطن اچھا ہونا چاہیے۔ ظاہر پر نہیں جانا چاہیے۔'' ارم اسی کاٹ دار لہجے میں بول رہی تھی۔

''ارم بیٹا ہمارا ظاہر اور باطن دونوں اللہ کی دین ہیں اور ہمیں ان دونوں میں اس کے احکام کا خیال رکھنا چاہیے۔'' وہ جو دوسری طرف منہ کیے کھڑی تھی دوبارہ رابعہ کو گھورنے لگی۔

''ارم امی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ کم از کم.....'' ارسلان

کی بات درمیان میں ہی رہ گئی۔
"آپ تو چپ رہیں۔ آپ کو تو اپنی ماں کی کوئی بات کبھی بری لگ ہی نہیں سکتی۔ میرا یہی لائف اسٹائل ہے اور میں ایسی ہی رہوں گی۔ اپنی امی سے کہیں کہ اپنے ظاہر باطن پر غور کریں...... اس کی فکر کریں۔ سارا پتا ہے ان کے ظاہر باطن کا بھی۔" ارسلان جو نجانے کب سے ارم کی بدتمیزیاں اور بے پروائی برداشت کرتا رہا تھا، بھک سے اس کا دماغ اڑ گیا۔
"تڑاخ......" ایک زوردار طمانچہ ارم کے گال پر پڑا جس نے ارم کو کیا رابعہ کو بھی ہلا کر رکھ دیا۔
"کیا کہا ہے تو نے میری ماں کو۔" ارسلان کا ہاتھ ارم کی گردن پر تھا اور وہ آنکھیں پھاڑے اب بھی بے یقینی کے عالم میں ارسلان کو دیکھے جا رہی تھی۔
"ارسلان ہوش کرو۔ پاگل ہو گئے ہو کیا۔" رابعہ نے آگے بڑھ کر ارسلان کو ارم سے پیچھے ہٹایا۔ ارم روتی دھوتی اپنے میکے چلی گئی۔ وہاں اس کے باپ نے اس کا بھرپور ساتھ دیا جبکہ اس کی ماں چپ چاپ اس کی ساری دہائیاں سنتی رہی۔ جب ماں بیٹی کو تنہائی میسر آئی تو اس کی ماں فاخرہ بیگم بولیں۔
"دیکھو ارم تم میری اولاد ہو اور میرے سامنے ایک کھلی کتاب کی طرح ہو۔ تمہاری اچھائیاں اور برائیاں سب مجھے معلوم ہیں۔ تمہاری بات میں نے بڑے غور سے سنی ہے۔ شرم آنی چاہیے تمہیں اپنی ماں جیسی ساس سے اس درجہ بدتمیزی کرتے ہوئے۔ تمہاری زبان کی تیزی اور اس کا بے قابو ہو جانا سب میرے سامنے ہے۔ جن بداخلاقیوں اور بدتمیزیوں کی وجہ سے تمہیں یہ تھپٹر پڑا ہے، وہ تمہیں نہیں پڑا۔ میری تربیت کے منہ پر پڑا ہے۔ جا کر رابعہ سے معافی مانگو...... جو تمہیں بیٹی بنا کر اپنے گھر لے کر آئی اور ایک بات میں تمہیں کہہ دیتی ہوں۔ شام سے پہلے پہلے ارسلان کو فون کرو اور اپنے گھر جاؤ...... ورنہ میرا یقین کرو کہ میں اس گھر سے چلی جاؤں گی تمہارے باپ اور بھائی کو چھوڑ کر۔" ارم کا وہ حال تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔
فاخرہ ارم کے پاس سے اٹھی اور چپ چاپ اپنے شوہر کے کپڑے استری کرنے لگی۔
☆☆☆
اس دن رابعہ کے اندر کوئی چیز بڑی بری طرح ٹوٹی تھی۔ وہ چپ چاپ سارا دن اپنے دل میں بنے خوش فہمی کے شیش محل کی کرچیاں دل سے باہر کہیں ویرانوں میں پھینکنے میں مصروف رہی۔ فہد کو بھی اس نے یہ سارا معاملہ اور ارم کی بدزبانی کو حد درجہ کم کر کے بتایا تھا اور ارسلان کو اس کے ناشائستہ رویے پر سخت سرزنش کی تھی لیکن اس کے دل کی دنیا میں تو ماتم برپا تھا۔ ارم کا وہ زہریلا فقرہ بار بار اس کے کانوں میں گونجتا تھا اور اس کی ہستی کو تہ و بالا کر دیتا تھا۔ اس نے یہ بات کیوں کہی تھی کہ مجھے بھی آپ کے ظاہر باطن کا سب پتا ہے۔ اتنی بڑی اور بے بنیاد بات اس نے کیوں منہ سے نکالی تھی۔ نجانے رات کا کون سا پہر تھا جب فہد کی آنکھ کھلی اور اس نے رابعہ کو اپنے پاس نہیں پایا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر سائڈ ٹیبل لیمپ آن کیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کمرے کے ایک کونے میں جائے نماز بچھائے رابعہ کسی کمان کی طرح جھکی ہوئی تھی۔ فہد اٹھا اور آنکھیں ملتا ہوا بڑی آہستگی کے ساتھ اس کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کی گود میں وہ چھوٹا زیور پڑا تھا جو بھی اس نے ارم کو دے دیا تھا۔ فہد نے ہاتھ بڑھا کر اس کا چہرہ اوپر کیا۔ بڑی بڑی غزالی آنکھیں متورم تھیں، چاند چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ ستواں ناک کی چونچ سے آنسو اب بھی "ٹپ۔ ٹپ" اس کی جھولی میں گر رہے تھے۔ اس نے تڑپ کر اسے سینے سے لگا لیا اور اس کا ایک بازو سہلانے لگا۔
"رابعہ تم نے یہ زیور تو ارم کو دیا تھا ناں......" اس نے مدھم لہجے میں استفسار کیا۔
"جی دیا تھا...... پر آج گھر سے جاتے ہوئے وہ زیور کا لفافہ میرے بیڈ پر پھینک گئی تھی۔" رابعہ بہ مشکل اتنا کہہ پائی اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ فہد کی آنکھوں میں بھی آنسو امڈ آئے۔ اس نے فوراً اسے دوبارہ سینے سے لگا لیا۔ رابعہ کی تکلیف چاہے کسی نوعیت کی ہو، یونہی اس کی آنکھوں کو پرنم کر دیتی تھی اور وہ بھی بڑی صفائی سے انہیں چھپا لیتا تھا۔ وہ کچھ دیر ایسے ہی بیٹھے رہے۔ باہر کی دھند نے کھڑکی کے شیشے کو اندھا کر رکھا تھا۔ انہیں ایک دوسرے کے وجود سے گرمائش کا احساس ہو رہا تھا۔ فہد نے تسلی دینے والے انداز میں رابعہ سے کہا۔
"میں جانتا ہوں رابعہ۔ ارم نے بہت بے ہودہ اور بے تکی باتیں کی ہیں۔ پر اب وہ شرمندہ ہے۔ معاف کر دینا بہت بڑی بات ہوتی ہے۔ اسے معاف کر دو۔" رابعہ خاموش رہی پھر یونہی رابعہ کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے فہد کے لبوں کو ایک شریر مسکراہٹ چھو گئی۔
"رابعہ یار...... ہم دونوں کو ہمیشہ ایک بیٹی کی خواہش رہی اور یہ جو میڈم ارم ہیں یہ تو فی الحال خواہش پوری کرتی

نظر نہیں آرہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ شاید حقیقی بیٹی ہی بیٹی ہوتی ہے۔ بہو۔۔۔ بہو ہی رہتی ہے۔" رابعہ اس کے ساتھ لگے، جائے نماز پر بے وجہ انگلی گھمائے جارہی تھی۔

"تو میں کہہ رہا تھا کہ۔۔۔۔۔ ہم ابھی اتنے بوڑھے بھی نہیں ہوئے کہ بچے کی دیکھ بھال نہ کرسکیں تو میرے خیال سے ہمیں اب بھی امید رکھنی چاہیے۔" رابعہ اب سر اٹھا کر اسے گھور رہی تھی۔

"میرا مطلب ہے۔۔۔۔۔" فہد نے بے ساختہ ہنستے ہوئے کہا۔ رابعہ نے فوراً فہد کو پیچھے دھکیلا۔

"فا۔۔۔۔۔ حد۔"

فہد کے مذاق اور رابعہ کی ہنسی نے فوراً ان کے آسمان پر چھائی دکھ کی گرد صاف کردی اور ستارے ان کے ساتھ مل کر مسکرانے لگے۔

☆☆☆

ارسلان ارم کو اس کی امی کی طرف سے لے کر گھر آچکا تھا۔ وہ اندر نہیں گیا تھا۔ اس نے باہر سے ہی ہارن بجایا تھا اور دو تین منٹ بعد ارم اپنے سامان سمیت گاڑی میں موجود تھی۔ گھر آکر اسے آفس کی طرف سے دو تین ای میلز بھیجنی تھیں۔ یہ سارا وقت ان دونوں نے آپس میں کوئی بات نہیں کی۔ ارسلان بیڈ پر نیم دراز لیپ ٹاپ کے ساتھ مصروف تھا اور ارم کپڑے تبدیل کرکے منہ دوسری طرف کیے لیٹ چکی تھی۔ آنسو اب بھی اس کی متورم آنکھوں سے تکیے میں جذب ہو رہے تھے۔ ارسلان ایک لمبی سانس بھر کر لیپ ٹاپ کو بند کرتے ہوئے بولا۔

"میں تمہاری اور اپنی زندگی اور اس گھر کے نظام کو ایک ٹریک پر لانے کی کوشش کر رہا ہوں اور تم اس سلسلے میں میری پریشانیوں اور مشکلات میں مسلسل اضافہ کر رہی ہو۔ تم مجھے بتاؤ جیسے تم مجھے یوں تکلیف دے رہی ہو، میں نے کہاں تمہاری خوشیوں کا خیال نہیں رکھا۔" ارسلان بند لیپ ٹاپ پر ہاتھ رکھے بڑی اضطرابی کیفیت میں اس سے استفسار کر رہا تھا اور ارم بالکل خاموش تھی۔

"میں تم سے بات کر رہا ہوں ارم۔" ارسلان کے لہجے کے ارتعاش نے ارم کو بادل ناخواستہ اٹھنے پر مجبور کیا۔ وہ سر جھکائے بیٹھ گئی۔ ریشمی ڈھلکے ہوئے بالوں نے اس کا آدھا دکھائی دینے والا چہرہ بھی ڈھانپ رکھا تھا۔ اپنے ہاتھوں کی انگلیاں مضبوطی سے ایک دوسرے میں پیوست کیے ہوئے وہ بولی۔

"اور آپ نے آج جو کچھ کیا اس نے ہر چیز پر پانی

خدارا۔۔۔ خدارا

شوگر کے مریض

مایوس نہ ہوں۔ کیونکہ مایوسی تو گناہ ہے۔ ہم نے طویل ریسرچ کے بعد دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک خاص قسم کا ہربل۔ شوگر نجات کورس۔ تیار کیا ہے۔ جس سے انشاء اللہ آپ کو شوگر سے مستقل نجات مل سکتی ہے۔ شفا من جانب اللہ پر ایمان رکھیں۔ شوگر انسانی جسم کے اعصاب کو دیمک کی طرح اندر ہی اندر کھوکھلا۔ کمزور۔ بے جان بنا کر اعصابی کمزوری۔ جوڑوں کی درد اور ہر وقت کی تھکاوٹ سے بے بس۔ لاچار اور ناکارہ بنا دیتی ہے۔ آج ہی فون پر اپنی شوگر کی تمام علامات سے آگاہ کرکے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP شوگر نجات کورس منگوالیں۔ خدا کیلئے آپ ایک دفعہ ہمارا شوگر نجات کورس آزما کر تو دیکھ لیں۔ آج ہی فون کریں۔

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)

ضلع حافظ آباد پاکستان

فون صبح 10 بجے تا رات 9 بجے تک

0300-6526061

0301-6690383

پھیر دیا۔'' یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ایسا نہیں تھا کہ ارسلان کو اس سے محبت نہیں تھی پر جو کچھ اس نے آج صبح کیا تھا، کہا تھا وہ اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ کیا اس نے اس کی ماں کے مقدس، پارسا دامن پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش کی تھی۔ ارم کے کہے ہوئے الفاظ سارا دن اسے اذیت دیتے رہے تھے۔ اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی بازو بڑھا کر اس کو اپنے ساتھ لگالیا۔ وہ چاہ رہا تھا کہ وہ اسے بتائے کہ کیسے غصے اور حماقت میں ایسے جملے اس کے منہ سے نکل گئے جن کی کوئی حقیقت ہی نہیں۔

''تم نے امی کے بارے میں اس طرح کے گھٹیا اور بے بنیاد الفاظ کیوں استعمال کیے؟'' اس کے لہجے میں ضبط کے ساتھ ساتھ درد بھی تھا۔ وہ جواب میں خاموش رہی۔

''تمہیں تھپڑ مار دینا بالکل ایک غیر ارادی عمل تھا اور اس کی وجہ وہی الفاظ تھے جو تم نے بولے تھے۔'' اس کی آنکھوں کے ڈورے سرخ ہو رہے تھے۔ غصے اور درد کو بیک وقت پینا مشکل ہوتا ہے۔ ارم کچھ دیر خاموش رہی پھر بولی۔

''یہ میرے اسکول کے زمانے کی بات ہے۔ ایک دفعہ دادی، امی کو کچھ سمجھا رہی تھیں تو انہوں نے رابعہ آنٹی کی مثال دی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ رابعہ بہت کھری اور صاف گو لڑکی ہے۔ کچھ بھی ہو وہ فہد سے نہیں چھپاتی۔'' پھر انہوں نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

''اس نے تو فہد کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ بچپن میں وہ اپنے کسی کزن کو پسند کرتی تھی پر اب اس کے دل میں اس کی زندگی میں فہد ہی فہد ہے۔'' اتنا کہہ کر ارم خاموش ہوگئی اور پھر ذرا توقف سے بولی اور پھر ایک دفعہ میں نے پرانی البم میں ایک تصویر بھی دیکھی تھی... جو رابعہ آنٹی کے بچپن کی ایک گروپ فوٹو تھی۔ سات آٹھ بچے ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ رابعہ آنٹی کے ساتھ جو بھی تھا اس کی فوٹو کو قینچی سے کاٹ دیا گیا تھا اور پھر ایک دفعہ جب شادی کی دعوت پر ہم عمر انکل کے گھر گئے تھے، وہاں بھی وال فوٹوز میں وہی والی تصویر لگی ہوئی تھی۔ وہاں وہ تصویر مکمل تھی اور رابعہ آنٹی کے ساتھ وہ عمر انکل ہی تھے۔ بس ایسے ہی دو تین چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں جن کی وجہ سے میرے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ.....'' وہ کہتے کہتے رک گئی۔

''کیا بات بیٹھ گئی ہے؟'' ارسلان نے استفسار کیا۔

وہ ہچکچا کر بولی۔ ''سوری ارسلان..... شاید میں غلطی پر ہوں..... لیکن..... مجھے ایسا لگتا ہے کہ..... آنٹی اور..... عمر انکل ایک ساتھ زندگی گزارنا چاہتے تھے مگر ان کے راستے میں رکاوٹیں آئیں اور وہ ایک دوسرے سے دور کر دیے گئے۔''

کمرے میں کچھ دیر گمبھیر خاموشی طاری رہی پھر ارسلان ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''ارم تم ایک سمجھدار لڑکی ہو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ کون سا انسان ایسا ہے جس کی زندگی میں نشیب و فراز نہیں آتے۔ ہر انسان کی زندگی کے مختلف دور ہوتے ہیں اور ماضی کے کسی دور کو حال یا مستقبل کے کسی دور سے جوڑنا کسی طور پر عقلمندی نہیں ہوتی.....''

''سوری ارسلان..... میں اس بات پر دل سے شرمندہ ہوں۔'' ارم نے کہا۔ اس کی آنکھوں میں پھر آنسو جھلملانے لگے تھے۔ ارسلان نے اسے اپنے ساتھ لگالیا۔

ارم گھر واپس آچکی تھی۔ اس نے اگلے دن ارسلان کے کہنے پر فہد اور رابعہ سے معافی بھی مانگ لی۔ اس نے انہیں یقین دلایا کہ وہ شرمندہ ہے مگر..... اندر کی صورتِ حال کچھ اور تھی۔ ان سب چیزوں نے مل کر جو آگ اس کے اندر سلگائی تھی وہ دن کے فارغ اوقات اور رات کے پہروں میں اسے جلانے لگی۔ وقت تھوڑا اور گزرا۔ اللہ نے انہیں ایک خوبصورت بیٹے سے نوازا۔ اس کی آمد نے ان کے آنگن کو نا آشنا آہٹوں، شریر مسکراہٹوں، چھوٹے چھوٹے قدموں اور اس کے وجود کی ایک مانوس سی مہک سے متعارف کروایا۔ دوسری طرف رابعہ کے دل میں ارم کے متعلق جو توقعات تھیں، فہد کے سمجھانے بجھانے پر اس نے ان کو ترک کیا اور ارم کے انداز اور عادتوں کو ایک نرم مزاج اور اولاد کی خاطر سمجھوتا کرنے والی ساس کی نظر سے دیکھنا شروع کر دیا۔ دوسری طرف ارم نے بھی زبردست پینترہ بدلا تھا۔ رابعہ کے ساتھ اس کا رویہ بظاہر بہت مثبت ہوگیا تھا۔ باقی گھر والوں کی موجودگی میں وہ اکثر ''امی جی، امی جی'' کہتی نظر آتی مگر..... در پردہ بس وہ ایک موقع کی تلاش میں تھی۔ ایک زبردست موقع جہاں وہ اپنے حریف پر کاری ضرب لگا سکے۔ پتا نہیں کیا بات تھی وہ تھپڑ اس کے دل و دماغ سے نکلتا ہی نہیں تھا جو ایک روز صرف اور صرف اپنی ساس کی وجہ سے اس کے گال پر پڑا تھا۔

ایسے میں بے خیالی میں اس کا ہاتھ اٹھتا وہ اپنے گال کو سہلانے لگتی جس پر آج بھی وہ ارسلان کے تھپڑ کی تپش محسوس کرتی تھی۔

اکتوبر نومبر کے دن فہد کو بہت اچھے لگتے تھے۔ ان دنوں دیگر پھلوں کے ساتھ ساتھ دکانوں اور ٹھیلوں پر

قندھاری انار بھی نظر آنا شروع ہوجاتے تھے۔ قندھاری اناروں کے ساتھ نجانے کیوں فہد کو اپنی شادی بھی یاد آجاتی تھی۔ اسی موسم میں تو ہوئی تھی اس کی اور رابعہ کی شادی۔ وہ قندھاری انار بڑے شوق سے کھاتی تھی۔ ان دنوں وہ اتنی سرخ وسپید تھی کہ فہد نے اسے قندھاری کہہ کر چھیڑنا شروع کردیا تھا۔

اب ان کی شادی کو ”پچیس“ برس گزر چکے تھے...... وہ قندھاری انار کی طرح سرخ تو نہیں رہی تھی مگر اب بھی اس کے اندر ایک خاص دلکشی اور جسمانی موزونیت موجود تھی۔ وہ اپنی عمر کی عورتوں سے کہیں زیادہ جاذب اور خوبصورت نظر آتی تھی۔ فہد ڈرائیونگ کرتے ہوئے سوچنے لگا، کیا وہ صرف اس لیے رابعہ سے اتنی محبت کرتا ہے کہ وہ اب بھی اسے پہلے کی طرح شاداب اور دلکش لگتی ہے...... اگر وہ ایسی نہ ہوتی تو کیا اب اس درمیانی عمر میں بھی وہ اس کے دل کے سنگھاسن پر یوں ہی براجمان ہوتی۔ جواب ہاں میں تھا۔ کبھی کبھی فہد کو یوں لگتا تھا کہ رابعہ سے اسے محبت نہیں عشق ہے اور یہ عشق اس کی ظاہری شخصیت سے آگے گزر کر اس کی روح اور روح کی اتھاہ گہرائیوں تک جاتا ہے۔ کسی وقت تو اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ رابعہ کے بارے میں کسی ٹین ایجر کی طرح سوچتا ہے...... کسی ٹین ایجر کی طرح اسے چاہتا ہے۔

اور پھر اسے یاد آیا کہ اس کی شادی کی پچیسویں سالگرہ آنے والی ہے۔ وہ ہر سال ہی یہ سالگرہ اہتمام سے مناتے تھے، اس مرتبہ کچھ مزید اہتمام کی ضرورت تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ وہ رابعہ کو کیا تحفہ دے گا۔

وہ گھر پہنچا تو برادران لا مصطفیٰ صاحب آئے ہوئے تھے۔ وہ بڑے خوش باش اور جولی آدمی تھے۔ ہلا گلا پسند کرتے تھے۔ ویسے بھی بیوی بچوں کے ساتھ کوئی تین سال بعد انگلینڈ سے لوٹے تھے اور پندرہ بیس روز تک انہیں واپس بھی چلے جانا تھا۔ آج کل تفریحات میں لگے ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا۔ ”فہد! تمہارا ہی انتظار کررہا تھا۔ پکنک کا ایک بڑا زبردست پروگرام بنا ہے یار! لاہور میں جتنے بھی پاس پاس کے عزیز ہیں سب اپنی اپنی گاڑیوں پر جائیں گے، اپنا اپنا کھانا بھی ساتھ لائیں گے یعنی ون ڈش...... پارک کا ارادہ ہے۔ تم نے بھی مع اہل وعیال بہرصورت چلنا ہے......“

فہد نے نیم رضامندی ظاہر کردی لیکن کچھ دیر بعد جب اسے پتا چلا کہ رابعہ کے کزن عمر کی فیملی بھی جارہی ہے تو وہ تذبذب میں نظر آنے لگا۔ پتا نہیں، کیا بات تھی، وہ کبھی بھی

قارئینِ بیرون ملک متوجہ ہوں!

محکمہ ڈاک نے دوسری مرتبہ **بیرون ملک ڈاک خرچ** پر تقریباً 200 سے 250 **فیصد** اضافہ کردیا ہے جس کی وجہ سے ہم بحالت مجبوری بیرون ملک ڈاک خرچ میں اضافہ کررہے ہیں۔

جو کہ اس ماہ نومبر 2020 سے لاگو ہوگا جس کی تفصیل تمام رسائل میں فراہم کردی گئی ہے۔

سرکولیشن منیجر
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

TAGPK.COM

اس طرح کی صورتِ حال کو قبول نہیں کر سکا تھا۔ اس کے لیے یہ جیسے ایک نفسیاتی سا مسئلہ بن چکا تھا۔ وہ اچھے بھلے موڈ میں گھر آیا تھا لیکن یہ موڈ برقرار نہیں رہ سکا۔ اس نے کہا۔ ''مصطفیٰ بھائی! آج کل کام کا لوڈ زیادہ ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ شاید ہفتے کے دن بھی آفس جانا پڑے گا۔ اگر کوئی گنجائش نکلی تو پھر ضرور حاضر ہوں گے، ورنہ بچے تو ضرور شریک ہوں گے۔''

شایان اور اسد شور مچانے لگے کہ نہیں..... اگر جانا ہے تو سب ہی چلیں گے۔

مصطفیٰ بھائی نے رابعہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''بھئی! وزارتِ داخلہ بھی تو تھوڑا سا دباؤ ڈالے ناں لیڈر آف دی ہاؤس پر۔''

وہ مسکرائی۔ ''یہ دباؤ ماننے والے کہاں ہیں۔ زیادہ زور لگائیں گے تو الٹا ہمیں دباؤ میں لے آئیں گے۔ ویسے کام تو آج کل واقعی زیادہ ہے ان کو۔''

''لو جی..... جن پر تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے۔'' مصطفیٰ صاحب بولے۔

تھوڑی دیر تو بہت شور مچا۔ فہد نے بمشکل اس صورتِ حال کو ہینڈل کیا۔ اس نے کہا کہ وہ کل آفس میں بات کرے گا اور شریک ہونے کی پوری کوشش بھی کرے گا۔

.....لیکن اس طرح ہوا نہیں۔ جب ہفتے کا دن آیا تو اس نے آدھے دل کے ساتھ رابعہ کو بچوں کے ساتھ بھیج دیا مگر خود نہیں گیا۔ دفتر میں کوئی خاص کام نہیں تھا۔ وہ کمپیوٹر پروگرامنگ سے وابستہ تھا۔ فائنل اسائنمنٹ جا چکی تھی۔ ویسے بھی یہ ہاف ڈے تھا۔ وہ گھر جلدی آ گیا اور کمروں میں بے چین سا پھرتا رہا..... اسے رابعہ اور عمر کو ایک ساتھ دیکھنا کبھی بھی اچھا نہیں لگا تھا، چاہے یہ دیکھنا کسی غمی خوشی کے موقع پر ہی ہو۔ پتا نہیں کیا بات تھی۔ وہ بتدریج بہت حساس ہو گیا تھا اس معاملے میں۔ حتیٰ کہ ٹی وی پر کسی ڈرامے یا فلم میں عمر نام کا کوئی کردار بھی آ جاتا تھا تو اسے الجھن سی ہونے لگتی تھی۔ بعض اوقات اسے یوں لگتا تھا کہ وہ کسی وقت... بر سبیل تذکرہ عمر کا لفظ بھی ادا کرنے لگتا ہے تو وہ اس کے گلے میں اٹک جاتا ہے۔ عجب نفسیاتی گرہ تھی۔

پکنک سے گھر والوں کی واپسی کا وقت شام سات بجے تھا۔ اس نے بے چینی سے انتظار کیا۔ سات بجے کے لگ بھگ گھر والے واپس آ گئے لیکن پتا چلا کہ رابعہ ابھی نہیں آئی۔

ارسلان نے بتایا۔ ''امی دوسری گاڑی میں پھپھو حجاب اور آنٹی صفیہ کے ساتھ آ رہی تھیں۔ وہ گاڑی شالیمار باغ کے قریب خراب ہو گئی ہے۔ اب ٹھیک کروا رہے ہیں، تھوڑی دیر میں پہنچ جاتے ہیں۔''

یہ دوسری گاڑی عمر والی تھی۔ فہد کو یہ سب بہت برا لگا۔ ہمیشہ کی طرح سینے میں گھٹن بھر گئی۔

رابعہ قریباً ڈیڑھ گھنٹا تاخیر سے واپس پہنچی۔ فہد بے چین سا کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ اس نے گاڑی کی آواز سن کر کھڑکی میں سے جھانکا۔ رابعہ گاڑی سے اتر رہی تھی۔ گاڑی میں صرف عمر تھا اور وہ ڈرائیونگ سیٹ پر تھا۔ اس نے ہنس کر کچھ کہا۔ رابعہ نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔ پھر اسے ''بائے'' کہتی ہوئی اور ساڑی سنبھالتی ہوئی گھر کے گیٹ کی طرف بڑھ آئی۔

اس واقعے کے بعد دو تین دن تک فہد کا موڈ سخت ابتر رہا۔ مگر کسی ایسے موقعے پر وہ رابعہ پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیتا تھا۔ اس روز واپس آ کر رابعہ نے اسے بتایا تھا کہ عمر بھائی نے پہلے تایا جان کی بیٹی کو اس کے گھر اتارا، پھر آپا حجاب (فہد کی بڑی بہن) کو ڈراپ کیا، اس لیے پہنچتے پہنچتے دیر ہو گئی۔

.....عین ممکن تھا کہ دو چار ہفتے بعد یہ واقعہ بھی کئی دوسرے واقعات کی طرح فہد کے ذہن سے نکل جاتا مگر انہی دنوں ایک اور چھوٹا سا واقعہ ہوا جس نے فہد کو پھر چار پانچ روز کے لیے جذباتی مدوجزر کے حوالے رکھا۔ شادی کی پچیسویں سالگرہ کے موقع پر فہد اور رابعہ نے خصوصی اہتمام کیا تھا۔ بچے بھی پُرجوش تھے، چند قریبی عزیزوں کو بھی بلایا گیا تھا۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک رہا۔ دونوں بہت خوش تھے۔ جب تحفے دیے جا رہے تھے، اچانک بہو ارم نے رابعہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''امی! وہ کوریئر والا تحفہ تو بھول ہی گئیں آپ۔''

''اوہ ہاں۔'' رابعہ نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ ''ذہن سے نکل گیا۔''

''کوریئر سروس سے کیا آیا بھئی؟'' فہد نے پوچھا۔

رابعہ اپنے ریشمی بالوں کو کانوں کے پیچھے اڑستے ہوئے بولی۔ ''عمر بھائی اور صفیہ باجی (عمر کی بیوی) نے بکے بھیجا تھا۔ میں ابھی لائی۔''

وہ دوسرے کمرے میں گئی اور ایک لارج سائز کا بکے لے آئی۔

سالگرہ کی خوبصورت تقریب اس کے بعد بھی جاری رہی تھی مگر فہد کے اندر کی خوشی جیسے کہیں دور گہری تاریکی میں کھو گئی تھی۔

فہد کی خوبی یہ تھی کہ وہ اپنی اندرونی کیفیت کو ظاہر نہیں

ہونے دیتا تھا۔ بڑی کامیابی سے سب کچھ اپنے اندر ہی اندر جھیل لیتا تھا..... اور شاید یہی وجہ تھی کہ اس گمبھیر صورتِ حال کے سلسلے میں رابعہ تقریباً بے خبر ہی تھی۔

ارم کا رویہ رابعہ کے دل پر لگے پرانے زخموں کو مندمل کر رہا تھا۔ بہو کے روپ میں بیٹی مل جانے کا احساس دوبارہ اس کے دل کو باغ باغ کر رہا تھا۔ دوسری طرف ان دونوں کا یورپ کی سیر کا پلان آخری مراحل میں تھا۔ ان کے ویزے آچکے تھے اور فہد نے دو ہفتے بعد کی ٹکٹ بک کروائی تھی۔ انہیں اسی دوران میں جانے کی تیاری کرنا تھی اور ارم کے بھائی کی شادی میں بھی شرکت کرنا تھی۔

ارم کی والدہ کافی عرصے سے بیمار تھیں اور مرنے سے پہلے اپنے بیٹے کے سر پر سہرا دیکھنا چاہتی تھیں۔ ارم نے رابعہ کے ساتھ مل کر جلد شادی کی ڈیمانڈ رکھ کر ایک اچھا رشتہ دیکھا اور پھر ایک دو مہینے کے اندر اندر شادی کی ساری تیاری مکمل کر لی۔ اس سلسلے میں بھی وہ رابعہ کو ہی بازاروں اور مارکیٹوں میں لے کر پھرتی رہی اور اب چند دن بعد اس کے بھائی کی شادی کا فنکشن شروع ہونے والا تھا۔

یورپ میں ان کا دو مہینے تک ''اسٹے'' کا ارادہ تھا۔ ان کا شینجین ویزا تھا۔ رابعہ کی پھپھو کا گھر جرمنی کے ایک بڑے قصبے پیڈربورن میں تھا۔ فہد اور رابعہ کو سیدھا ان کے گھر ہی جانا تھا اور وہاں سے وقتاً فوقتاً مختلف شہروں کی سیر کو نکلنا تھا۔

رابعہ اور فہد کے آنے کی اطلاع پر اس کی پھپھو بے انتہا خوش تھیں۔ یہی حال رابعہ کا بھی تھا۔ وہ ایک لمبے عرصے بعد اپنی اس محسن سے ملنے جا رہی تھی جس کو اس نے اپنی زندگی کے لاتعداد لمحوں میں یاد کیا تھا اور دعائیں دی تھیں۔

اب رابعہ کو ایک چھوٹا سا مسئلہ درپیش تھا۔ ان کے یورپ میں اسٹے کے دوران میں ہی فہد کی سالگرہ بھی آرہی تھی۔ اچانک ذہن میں آنے اور پھر پکا ہو جانے والے ارادے کے مطابق وہ فہد کو وہاں کی اوریجنل سوئس واچ تحفے میں دینا چاہ رہی تھی۔ اس کے لیے اس کے پاس کچھ پیسے کم پڑ رہے تھے۔ چنانچہ وہ اپنا کچھ زیور بیچنا چاہتی تھی۔

یہ وہی زیور تھا جس نے اس کے ذہن میں میٹھی سے زیادہ کڑوی یادیں چھوڑ دی تھیں۔ اس زیور سے اب اس کے مخصوص احساسات نجانے کیوں ختم ہو گئے تھے۔ وہ بہرحال اب اسے بیچنا چاہ رہی تھی..... فہد کے تحفے کے لیے۔

''سمجھ نہیں آرہی کہ سونا کدھر بیچوں، کل شایان کے ساتھ جا کر ایک دو جیولرز کو کنسلٹ کیا تھا۔ پر وہ تو بہت زیادہ کٹوتی کر کے قیمت بتاتے ہیں۔ کہیں کہتے ہیں کہ سونا کم اور ملاوٹ زیادہ ہے۔ کہیں کہتے ہیں کہ نگ زیادہ لگے ہوئے ہیں۔'' فہد کا بٹن ٹانکتے ہوئے اس نے اپنا مسئلہ ارم کے گوش گزار کیا۔ ارم دوسری طرف صوفے پر بیٹھی اپنے ناخنوں کو شیپ دینے میں مصروف تھی۔ آج اس کے بھائی کی برات تھی اور وہ علی الصباح سے تیاریوں میں مصروف تھی۔ ننھا عارب وہیں کارپٹ پر کرالنگ کر رہا تھا اور کسی بلی کے بچے کی طرح چھوٹی سی بال سے کھیلنے میں مصروف تھا۔

ارم نے تو پہلے بے دھیانی میں اس کی بات سنی پھر یکدم کھٹکی۔ سیکنڈ کے بیسویں حصے میں ایک خیال اپنی ساری جزئیات سمیت اس کے ذہن کو روشن کرتا گزر گیا۔ ہاں..... یہی وہ وقت جس کا اسے بے چینی سے انتظار تھا۔ ایک پرانا حساب چکانے کا وقت۔ وہ صوفے پر ذرا سنبھل کر بیٹھ گئی۔

''آ..... آپ عمر انکل سے کیوں نہیں بات کرتیں، وہ تو فیملی کے بندے ہیں۔ بالکل صحیح دام دیں گے۔''

''عمر بھائی..... ہاں..... پر مجھے تو ان کی شاپ کا ہی نہیں پتا، نہ کوئی کونٹیکٹ نمبر ہے؟'' رابعہ نے سرسری سے انداز میں کہا۔

''نمبر تو نہیں ہے'' ارم نے اس بات کو فوراً ٹھپ کر دیا۔ اس کا ذہن عیاری میں اتنا تیز اور باریک بین تھا کہ کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔ شاید وہ خود بھی نہیں اور پھر بات آئی گئی ہو گئی۔

ارم نے بڑے ٹھاٹ باٹ سے اپنے بھائی کی شادی میں شرکت کی۔ اس کی ماں کی بیماری کی وجہ سے رابعہ نے ان کا ہر طرح سے ہاتھ بٹایا اور کوئی کمی نہیں محسوس ہونے دی۔

یہ ولیمے سے اگلے دن کی بات ہے۔ صبح دس ساڑھے دس کا وقت تھا۔ پیر کا دن تھا۔ فہد اور بچے پچھلے دو دنوں کی تھکاوٹ لیے صبح صبح اپنے اپنے کاموں پر جا چکے تھے۔

ہاں..... وہ اپریل کی ہی ایک سہانی صبح تھی۔ گھر میں خوشحالی تھی۔ وہ لوگ اب افورڈ کر سکتے تھے اس کے باوجود رابعہ کو کچن کا کام خود کرنا ہی پسند تھا۔ اپنے شوہر اور بچوں کے لیے کچن کی مشقت رابعہ کو ہمیشہ سے بھاتی تھی..... رابعہ کچن میں ہانڈی کے لیے تڑکا تیار کر رہی تھی۔ سلیب پر ایک طرف کٹی ہوئی سبزی پڑی تھی۔ لان کی طرف کھلتی ہوئی کھڑکی سے ہوا کے خوشگوار جھونکے اندر آرہے تھے اور رابعہ کے دل اور روح کو چھوتے ہوئے گزر جاتے تھے۔ یہ کوئی عام جھونکے نہیں تھے۔ یہ اس ہوا کے جھونکے تھے جو بڑے میٹھے انداز میں چند دنوں کے لیے چلتی ہے اور اس وقت چلتی

ہے جب ایک موسم دوسرے سے ملتا ہے' ان جھونکوں میں بدلتے موسم کا سندیسہ ہوتا ہے اور وہ سندیسہ اپنے ہدف سے ٹکراتے ہی اس کے دل میں بیتے موسموں، گزری باتوں، یادگار... لمحوں اور ان میں چھپی مسکراہٹوں اور آنسوؤں کو تازہ کرتا چلا جاتا ہے۔

خلافِ معمول آج ارم صبح دس بجے ہی نیچے ٹی وی لاؤنج میں موجود تھی۔

''ارم ناشتا بنا دوں۔'' کچن نیپکن سے ہاتھ پونچھتے ہوئے رابعہ نے کچن کے دروازے سے پوچھا۔

''نہیں ابھی نہیں..... آپ ابھی ہانڈی بنا رہی ہیں۔''

وہ جیسے موقع محل کا اندازہ لگانا چاہ رہی تھی۔

''ہاں دل کر رہا تھا کہ کوئی سبزی وغیرہ بناؤں۔ دو دن مرغن کھانا کھایا ہے ناں..... میں نے تو صبح ناشتا بھی نہیں کیا۔'' رابعہ کہہ کر واپس مڑی تو ارم نے ترچھی نظر اس پر ڈالی۔

''میں نے آپ کو بتانا تھا کہ کل رات فون بک دیکھتے ہوئے اچانک عمر انکل کی بیٹی نائلہ کا نمبر نظروں سے گزرا۔ مجھے یاد آیا کہ جب انہوں نے ہماری شادی کی دعوت کی تھی تو وہاں میں نے نائلہ سے اس کا نمبر لے کر موبائل میں سیف کیا تھا۔'' رابعہ اب کچن سے فارغ ہو کر اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھی اور اس کی طرف پوری طرح متوجہ تھی۔

''اچھا۔''

''تو پھر وہ..... میں نے رات کو اس سے زیور والے معاملے پر بات کی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ شاپ تو آپ کو بہت دور پڑ جائے گی۔ میں پاپا سے پوچھ کر آپ کو بتاؤں گی۔ وہ شاپ پر جاتے ہوئے آپ کی طرف سے ہوتے جائیں گے۔''

''کیا؟'' رابعہ یکدم بوکھلا گئی۔ ''وہ یہاں آ رہے ہیں؟'' تذبذب کے آثار اس کے چہرے پر واضح تھے۔

''اوہو۔ تو اس میں ایسی کیا بات ہے۔ ان کی دعوت پر گئے تھے۔ یاد نہیں آپ کو..... یہاں سے پندرہ منٹ کی ڈرائیو پہ تو گھر ہے ان کا۔''

''مگر ارم..... فہد سے پوچھے بغیر میں نے کسی کو گھر نہیں بلایا کبھی۔ پتا نہیں...'' ارم نے فوراً بات کاٹی۔

''تو ان کو تو ویسے بھی ابھی آپ نے نہیں بتانا۔ بھئی ان کی سالگرہ کے گفٹ کا معاملہ ہے ناں۔'' رابعہ خاموش رہی تو ارم نے اب ''پریشرائز'' کرنے کا حربہ آزمایا وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔

''آپ ہی کا بھلا سوچا تھا کہ آپ کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔'' ارم نے اپنی نشست چھوڑتے ہوئے تیکھے انداز میں کہا۔ اس کا موڈ خراب دیکھ کر رابعہ جلدی سے بولی۔

''نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں، میں..... دراصل یوں اچانک ان کے آنے کا سن کر اپ سیٹ ہو گئی تھی۔ تم اپنا ناشتا بنا لو۔ میں ذرا جلدی سے ڈرائنگ روم دیکھ لیتی ہوں۔''

رابعہ ابھی بمشکل ڈرائنگ روم کے پردے پیچھے کر کے گیرج کی طرف کا دروازہ ان بولٹ کر پائی تھی کہ باہر پہلے گاڑی کا دروازہ بند ہونے کی آواز آئی اور پھر بیل بجی۔ اس نے جلدی سے سر پر دوپٹا درست کیا اور دروازہ کھولنے آئی۔ وہی کسرتی جسم، دراز قامت، بڑی بڑی شفاف آنکھیں، بھورے بال اور آج بھی وہ ہمیشہ کی طرح زبردست انداز میں سوٹڈ بوٹڈ تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے رابعہ کو سلام کیا۔ کچھ فاصلے پر اس کی سلور کلر ہنڈا سوک بڑی آب و تاب سے لشکارے مار رہی تھی۔

''وعلیکم السلام بھائی۔ اندر آیئے۔'' اس نے فوراً اس کے لیے راستہ چھوڑا۔

رابعہ عمر کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر کچن کی طرف آئی جہاں ارم پہلے سے مصروف عمل تھی۔

''آپ ان کے پاس ہی بیٹھیں ادھر۔ ساتھ جو جیولری ہے وہ بھی دکھا دیں انہیں۔ میں جوس وغیرہ لے کر آتی ہوں۔'' ارم نے کرسٹل پلیٹ نیپکن سے صاف کرتے ہوئے کہا۔ رابعہ دل ہی دل میں اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جیولری لینے کے لیے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

ارم کی شعلہ بار نگاہیں کرسٹل پلیٹ کے آر پار دیکھ رہی تھیں۔ اس کا تیار کردہ منصوبہ بھی بالکل ایسا ہی ثابت ہونے والا تھا۔ سب کچھ واضح ہونے والا تھا بالکل ویسے ہی جیسے وہ چاہتی تھی۔

اس نے فوراً انکل فہد کا فون ملایا۔ فہد کے نمبر پر بیل جاتی رہی پر کال اٹینڈ نہیں ہوئی۔ اس نے جلدی سے دوبارہ نمبر پریس کیا۔ اس دفعہ بھی وہی صورتِ حال رہی۔ ''اوہ گاڈ'' وہ سٹپٹا کر رہ گئی۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اس نے بے حد اضطراب سے کہا۔

فہد کے آفس سے گھر تک کا فاصلہ بمشکل دس منٹ کا تھا لیکن بات تو تب تھی، جب کال ملتی۔ تب اس نے تیسری مرتبہ نمبر پریس کیا۔ اس کا سارا جوش و خروش ٹھنڈا پڑ گیا۔ انکل فہد نے اپنا فون آف کر دیا تھا۔ ایسا وہ تب کرتے تھے جب کسی اہم میٹنگ میں ہوتے تھے، وہ سر تھام کر بیٹھ گئی۔

☆☆☆

رابعہ نے ایک چھوٹے باکس میں رکھی ہوئی سونے کی اشیا عمر کے سامنے ٹیبل پر رکھ دیں اور خود سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔

''عمر بھائی یہ تھوڑا گولڈ ہے جو میں بیچنا چاہ رہی ہوں۔ باہر تو میں نے اور شایان نے پتا کیا ہے پر وہ اس کی بہت کٹوتی کر رہے ہیں۔ آپ دیکھ لیں بس جو صحیح قیمت ہے ان کی، اور مجھے بس ایک دو دن کے اندر اندر چاہیے۔''

عمر نے سونے کا تھوڑا بہت جائزہ لیا اور کہا ''تم فکر نہ کرو۔ جو قیمت باہر سے پتا چل رہی ہے یہ واقعی اس سے زیادہ کا ہی ہے۔ میں رات کو ہی واپس جاتا ہوا تمہیں اس کے پیسے پکڑاتا جاؤں گا۔''

''نہیں بھائی۔ آپ کل اسی وقت آجانا۔ اصل میں وہ.....'' کہتے کہتے رک گئی۔ پھر دوبارہ ہمت کر کے بولی۔ ''اصل میں فہد کے لیے میں نے ان کی سالگرہ کا ایک گفٹ سوچ رکھا ہے۔ قیمت ذرا زیادہ ہے تو تھوڑے مزید پیسے درکار تھے۔ تو رات کو تو وہ گھر پر ہوتے ہیں اور ان سے یہ بات ہر صورت مجھے سیکرٹ رکھنی ہے۔'' رابعہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ عمر بھی ہنس پڑا۔ پھر ان کے درمیان تھوڑی دیر رسمی باتیں ہوئیں۔ رابعہ نے بتایا کہ اگلے ہفتے وہ یورپ کی سیر کے لیے جرمنی، پھپھو عالیہ کے پاس جا رہے ہیں۔ اسی دوران ارم ٹی ٹرالی لے کر اندر آئی۔ عمر اور اس کی سلام دعا ہوئی۔

''بیٹھ جاؤ ارم بیٹا۔'' رابعہ نے کہا۔

''میں بس دو منٹ میں آئی۔'' ارم نے کہا اور باہر چلی گئی۔

رابعہ نے کہا۔ ''دراصل، عمر بھائی، ہم کئی سالوں سے یورپ کے ایک ٹور کا پروگرام بناتے اور بگاڑتے رہے ہیں۔ کبھی کوئی رکاوٹ سامنے آجاتی تھی کبھی کوئی۔ اب خدا خدا کر کے یہ دیرینہ خواہش پوری ہو رہی ہے۔ فہد بھی بہت ایکسائیٹڈ ہیں۔ دعا کیجیے گا کہ ہمارا یہ سفر خیر خیریت کا رہے.....'' پھر بات کرتے کرتے جیسے اچانک رابعہ کو کچھ یاد آیا۔ اٹھتے ہوئے بولی۔ ''ایک منٹ عمر بھائی! ایک زحمت اور دینا تھی آپ کو۔''

وہ جلدی سے اپنے کمرے میں گئی اور جیولری کی ایک چھوٹی سی ڈبیا اور اٹھا لائی۔ اس میں پرانے ڈیزائن کا ایک جھومر تھا، کسی وقت رابعہ کی ایک خالہ نے اسے گفٹ کیا تھا۔ رابعہ نے یہ جھومر عمر کو دکھاتے ہوئے کہا۔ ''اگر ہو سکے تو اس کے بدلے کوئی نئے ڈیزائن کا لاکٹ مل جائے۔ میں اپنی ہونے والی چھوٹی بہو کے لیے رکھنا چاہتی ہوں۔''

عمر نے جھومر کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور بولا۔ ''یہ بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے، اگر تم کہتی ہو تو اسی کو توڑ کر لاکٹ بنوا لیتے ہیں۔ تھوڑی بہت لیبر ہی دینا پڑے گی اور اگر اس کی قیمت لگوا کر ان پیسوں سے لاکٹ خریدنا ہے تو وہ بھی ہو جائے گا۔''

''بنوانے کے جھمیلے میں کیا پڑنا ہے بھائی۔ کوئی اچھی سی بنی بنائی چیز ہی دے دیں۔'' رابعہ نے کہا۔

''اوکے، اب مجھے اجازت؟'' عمر نے چائے کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

''بہت بہت شکریہ۔'' رابعہ نے کہا۔

عمر ڈرائنگ روم کے دروازے سے باہر چلا گیا۔ رابعہ اسے گیٹ تک چھوڑنے آئی۔

☆☆☆

ارم کا پلان کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوا تھا اور وجہ یہی تھی کہ بروقت انکل فہد سے کال نہیں مل سکی تھی۔ تاہم ارم کی مایوسی پھر امید میں بدل گئی تھی۔ اس نے کھڑکی سے کان لگا کر آنٹی اور ان کے کزن عمر کی باتیں سنی تھیں۔ انکل عمر نے کل دوبارہ آنے کا کہا تھا اور آنٹی نے انہیں بتایا تھا کہ وہ صبح کے وقت ہی آئیں کیونکہ اس وقت فہد دفتر میں ہوتے ہیں۔

ارم اچھی طرح جانتی تھی کہ آنٹی اور انکل فہد میں بہت محبت ہے..... اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ جہاں محبت غیر معمولی ہوتی ہے وہاں شک وشبہات بھی غیر معمولی تیزی سے پروان چڑھتے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے اس نے آنٹی کے ظاہر باطن والی جو بات کی تھی وہ کسی نہ کسی طرح انکل فہد تک بھی پہنچی تھی اور ارم نے محسوس کیا تھا کہ ان دنوں انکل ڈیڑھ دو ہفتے تک بالکل گم صم رہے تھے اور انہوں نے ارم سے بھی بات کرنا چھوڑ دی تھی لیکن پھر دھیرے دھیرے وہ نارمل ہو گئے تھے۔

ارم نے یہ بھی نوٹ کیا تھا کہ شادی بیاہ یا فوتگی وغیرہ کے موقعوں پر جہاں سب رشتے داروں کو اکٹھا ہونا ہوتا تھا انکل فہد بہت ''ریزرو'' سے رہتے تھے۔ خاص طور سے اگر انکل عمر بھی موجود ہوتے تھے تو انکل فہد کی خواہش ہوتی کہ جلد از جلد اس تقریب سے نکل جائیں۔ ارم کا ذہن بہت گہرائی تک جاتا تھا اور وہ ہر چیز کو نہایت باریک بینی سے دیکھنے کی عادی تھی اور اس کی یہ باریک بینی بار بار گواہی دیتی تھی کہ عمر کے اس حصے میں بھی انکل فہد، آنٹی کے حوالے سے بہت حساس ہیں اور جذباتی انداز میں سوچتے ہیں۔

رات کو جب انکل گھر آئے تو انہیں ایک دم جیسے کچھ یاد

آ گیا۔ ارم سے مخاطب ہو کر بولے۔ ''کیا بات تھی ارم! صبح شاید تم مجھے کال کر رہی تھیں..... میں میٹنگ میں تھا اس وقت۔''

''وہ دراصل..... انکل..... وہ۔'' اس نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

''ہاں ہاں، کہو بھئی۔ جھجکنے کی کیا بات ہے؟'' انکل نے کہا۔

''وہ اصل میں..... مجھے نئے لیپ ٹاپ کا پاس ورڈ یاد نہیں رہا تھا..... آپ سے پوچھنا چاہ رہی تھی..... لیکن پھر ڈائری سے مل گیا۔'' اس نے سپاٹ سے لہجے میں کہا۔

انکل فہد کھوجنے والی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ پھر مسکرا کر بولے۔ ''یہی بات تھی یا کوئی اور تھی؟''

''نہیں انکل، یہی بات تھی..... آپ کے لیے چائے لاؤں۔'' اس نے بات بدلی۔

''..... لے آؤ بھئی۔'' فہد نے ذرا الجھے ہوئے سے لہجے میں کہا۔ شاید انہیں ارم کی وضاحت پر پوری طرح یقین نہیں آیا تھا۔ وہ انہیں یقین دلانا چاہتی بھی نہیں تھی۔

وہ کچن میں جا کر چائے بنانے لگی۔ اس کے ہاتھ جیسے بے ساختہ حرکت کرتے چلے جا رہے تھے..... اس کا ذہن کل کی پلاننگ میں الجھا ہوا تھا۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ جونہی انکل عمر گیٹ پر پہنچیں گے وہ انکل فہد کو فون کر دے گی۔ بفرض محال انہوں نے کال نہ اٹھائی تو وہ آفس کی لینڈ لائن پر فون کرے گی اور ریسیو کرنے والے سے کہے گی کہ فوراً فہد صاحب کو بلائے۔ ایمرجنسی کال ہے۔

☆☆☆

اگلے روز حسب وعدہ دس بجے کے لگ بھگ عمر نے گیٹ پر پہنچ کر کال بیل بجا دی۔ رابعہ اس وقت ڈرائنگ روم میں ہی تھی۔ اس کے خیال کے مطابق ارم ابھی سو رہی تھی جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔ رابعہ نے جا کر چھوٹا دروازہ کھولا اور عمر ''السلام علیکم'' کہتا ہوا اندر آ گیا۔

وہ ڈرائنگ روم والے دروازے پر پہنچے اور اندر آ بیٹھے۔ عمر نے کہا۔ ''آج کچھ زیادہ ہی خاموشی ہے۔ ارم بیٹی کہاں ہے؟''

''وہ ابھی سو رہی ہے۔ رات کو کہہ رہی تھی کہ ہلکا سا بخار بھی ہے۔'' رابعہ نے کہا۔ ''آپ بیٹھیں، میں چائے لے کر آتی ہوں۔''

''نہیں بھئی رابی! یہ تکلف کیوں کرتی ہو۔''

''تکلف کیسا بھائی! چائے تو میں نے آپ کے آنے سے پہلے ہی رکھ دی تھی۔ اب تو بس پیالیوں میں ڈال کر لانی ہے۔''

''بھئی تم بالکل نہیں بدلی ہو۔ کسی بھی لحاظ سے نہیں بدلی ہو۔'' پھر رسٹ واچ دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ٹائم ذرا کم ہی ہے۔ شاپ پر بھی پہنچنا ہے۔ چائے پھر کسی دن کے لیے نہ رکھ لیں..... فہد ساتھ ہوگا۔ میں بھی بیگم کو لے آؤں گا۔''

''میں جانتی ہوں بھائی، آپ بہت مصروف ہیں۔ آج پھنسے تو آ گئے ہیں۔ پھر کسی شادی بیاہ پر ہی ملاقات ہوگی۔'' وہ کہتی ہوئی کچن کی طرف چلی گئی۔

☆☆☆

فہد اپنے آفس میں تھا۔ لنچ سے آدھ گھنٹا پہلے ایک میٹنگ ہونا تھی۔ ابھی صبح کے وقت وہ قریباً فارغ ہی تھا۔ اس نے اپنا بریف کیس کھولا۔ اس بریف کیس میں اس کا اور رابعہ کا وہ سپنا تھا جو گزرے برسوں میں انہوں نے سوتے اور جاگتے ہوئے سیکڑوں بار دیکھا تھا..... بالآخر اس کی تعبیر کا وقت آ ہی گیا تھا۔ ان کے تمام سفری کاغذات بریف کیس میں ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔ ایئر ٹکٹس، پاسپورٹس، ہیلتھ انشورنس، ٹریول چیکس وغیرہ وغیرہ۔

اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور تصور ہی تصور میں خود کو یورپ کی مشہور زمانہ تفریح گاہوں کے آس پاس محسوس کیا۔ اسے رابعہ کے چہرے پر ایک ایسی حسین و پُرمسرت چمک نظر آئی جس کے تصور نے ہی اسے نہال کر دیا۔ وہ سوچنے لگا کہ وہ اپنے اور رابعہ کے اس ٹور کو یادگار بنانے کے لیے کہاں کہاں..... اور کیا کیا کر سکتا ہے۔ اسے رابعہ کی آنکھوں میں لہریں لیتی ہوئی پرتجسس حیرانی ہمیشہ سے پسند تھی..... اور وہ جانتا تھا کہ اس ٹور میں اس کو حیران ہونے کے بے شمار مواقع ملیں گے۔

اچانک اس کے سیل فون پر کال کے سگنل آئے۔ اس نے اسکرین دیکھی۔ یہ اس کی بہو ارم کی کال تھی۔ ''ہیلو ارم، کیا بات ہے؟'' اس نے شفیق لہجے میں پوچھا۔

دوسری طرف کچھ خاموشی سی رہی۔ اس نے دوبارہ کہا۔ ''ہیلو آج پھر تو لیپ ٹاپ کا پاس ورڈ نہیں بھول گئیں؟''

دو سیکنڈ کے وقفے کے بعد ارم کی گمبھیر آواز سنائی دی۔ وہ اشک بار اور ہانپی ہوئی سی لگتی تھی۔ ''انکل..... میں بہت دنوں سے برداشت کر رہی ہوں۔ پر اب نہیں کر سکتی..... اٹ از ٹو مچ..... ٹو مچ۔''

فہد کا دل دھک سے رہ گیا۔ ''ارم..... ارم بیٹا یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ کیا ہوا ہے؟''

وہ جیسے ایک بہاؤ میں بولتی چلی گئی۔ ''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیسے بتاؤں آپ کو۔ امی سمجھتی ہیں کہ میں

بارہ بجے سے پہلے نہیں اٹھتی..... اور میرے دیر سے اٹھنے کا فائدہ وہ جس طرح سے اٹھا رہی ہیں وہ ہمارے گھر کو..... تباہ و برباد کردے گا۔''

''ارم! تم کیا کہہ رہی ہو، میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔ رابعہ کہاں ہے؟''

وہ فہد کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے اسی ہیجانی لہجے میں بولی۔ ''انکل! اگر میں اب بھی نہ بولی تو ساری زندگی خود کو گناہ گار سمجھوں گی..... اور مجھے پتا ہے کہ اس گھر میں میری کہی ہوئی بات کی زیادہ اہمیت نہیں ہے..... اس لیے..... آپ یہ سب کچھ ابھی اور اسی وقت آکر خود دیکھ لیں..... لیکن..... آپ کو اس کے لیے فوراً گھر پہنچنا پڑے گا..... ابھی۔'' اس نے سسکی لی اور پھر روتے روتے فون بند کردیا۔

فہد کی نگاہوں میں زمین و آسمان گھوم رہے تھے۔ یہ کیا کہہ رہی تھی ارم، کیا دکھانا چاہ رہی تھی۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے ارم کا نمبر پریس کیا اور دوبارہ رابطہ کرنا چاہا..... لیکن وہ فون بند کرچکی تھی۔

نہایت گھبراہٹ اور پریشانی کے عالم میں فہد اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس کا اسسٹنٹ اس کے تاثرات دیکھ کر کچھ بھی پوچھ نہیں سکا۔ وہ تیزی سے باہر نکلا اور پارکنگ سے گاڑی لے کر گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ ذہن انگنت اندیشوں اور وسوسوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ دل یوں دھڑک رہا تھا جیسے پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔

☆☆☆

چائے واقعی تیار تھی۔ رابعہ دو منٹ میں لے کر واپس ڈرائنگ روم میں آگئی۔

عمر نے جیولری کی رقم کے ساتھ ایک کاغذ بھی رابعہ کے حوالے کیا۔ اس میں وزن، کاٹ اور نگینوں وغیرہ کا پورا حساب کتاب لکھا تھا۔ رابعہ کو خوشی ہوئی..... جیولری سے حاصل ہونے والی رقم اس کی توقع کے مطابق تھی۔ چائے کے دوران میں عمر خوشگوار موڈ میں ہلکی پھلکی باتیں بھی کرتا رہا۔ یہ باتیں زیادہ تر بچوں کے متعلق تھیں، ان کی پڑھائی کے متعلق اور ان کی ''فیوچر پلاننگز'' کے متعلق.....

چائے سے فارغ ہوکر عمر نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ویلوٹ کی خوبصورت پیکنگ والی ڈبیا رابعہ کے حوالے کی۔ اس میں دل کی شکل والا ایک نہایت دیدہ زیب لاکٹ جگمگا رہا تھا۔

رابعہ خوش ہوگئی۔ اس نے اپنی حنائی انگلیوں سے لاکٹ کو چھوا اور عمر کا شکریہ ادا کیا۔

وہ جانتی نہیں تھی اور نہ ہی عمر جانتا تھا کہ اس وقت کوئی کھڑکی سے باہر موجود ہے اور تھوڑے سے ''سرکے'' ہوئے پردے کی درز سے انہیں دیکھ رہا ہے۔ اس کی نگاہوں میں طیش اور کرب کی بجلیاں کوند رہی تھیں۔ وہ فہد احمد تھا اور وہ پچھلے چار پانچ منٹ سے یہاں موجود تھا۔

رابعہ نے سرخ ویلوٹ کا خوبصورت ڈبیا نما باکس بند کرکے گود میں رکھ لیا۔ عمر سے پوچھا۔ ''بھائی! اس کے لیے کوئی اضافی پیسے تو نہیں دینے.....؟''

''نہیں۔ بس چودہ پندرہ سو روپے کا فرق تھا۔ وہ میں نے حساب میں ایڈجسٹ کردیا ہے۔ کاغذ پر لکھا ہوا ہے۔''

''بہت بہت شکریہ۔'' رابعہ نے کہا۔

عمر اب جانے کے لیے تیار نظر آتا تھا۔ یہی وقت تھا جب رابعہ کے کانوں سے ایک آواز ٹکرائی اور وہ بری طرح چونکی۔ یہ کار کے سیکیورٹی الارم کی آواز تھی۔ رابعہ اسے درجنوں آوازوں کے اندر سے پہچان سکتی تھی۔ یہ فہد کی گاڑی کی آواز تھی اور باہر گلی کی طرف سے آئی تھی۔ جب کبھی فہد نے گاڑی باہر کھڑی کی ہوتی تھی اور کوئی بچہ اسے چھیڑ جاتا تھا یا جانور ''ٹچ'' ہوجاتا تھا تو الارم بجنے لگتا تھا۔ اب بھی کچھ ایسا ہی لگا تھا لیکن یہ کیسے ہوسکتا تھا؟ فہد تو آفس میں تھے، شاید یہ کوئی اور گاڑی تھی۔ پھر بھی رابعہ بے طرح چونک گئی تھی۔ ''میں ابھی آئی۔'' اس نے عمر سے کہا اور اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر گھبرائی ہوئی سی باہر چلی گئی۔

گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھول کر اس نے باہر کشادہ گلی میں جھانکا۔ آواز کچھ فاصلے سے گلی کے خم کی طرف سے آئی تھی..... اور غالباً جس گاڑی سے آئی تھی اس کے آگے ایک اسٹیشن وین کھڑی تھی۔ وہ گاڑی کو ٹھیک سے دیکھ نہیں پائی۔ تاہم اس کا شک کچھ اور پختہ ہوگیا۔ وہ گھبرائی ہوئی سی واپس پلٹی۔ اس کے اندر داخل ہونے سے پہلے ہی عمر جانے کے لیے اٹھ چکا تھا۔

''کیا ہوا تھا رابی؟ تم ایک دم باہر نکل گئیں؟''

''کک..... کچھ نہیں..... مجھے لگا تھا..... شاید..... گیٹ پر دستک ہوئی ہے۔'' اس نے پریشان لہجے میں کہا۔

دو منٹ بعد وہ لرزاں جسم کے ساتھ گیٹ پر کھڑی تھی اور عمر کو خدا حافظ کہہ رہی تھی۔

عمر کے جاتے ہی وہ تیزی سے واپس ڈرائنگ روم میں آئی۔ سب سے پہلے اس نے جیولری کی فروخت سے حاصل ہونے والی ڈیڑھ لاکھ کی نقدی اور چھوٹا جیولری باکس ایک کشن کے نیچے رکھے، پھر جلدی سے اپنے کمرے کی

طرف آئی..... کمرے میں کوئی نہیں تھا، تب وہ اسٹڈی کی طرف گئی۔ دروازہ بند تھا۔ اس نے دھکیلا۔ وہ کھل گیا۔ سامنے فہد موجود تھا مگر اس کا رخ ایک الماری کی طرف تھا۔ وہ اس میں سے جیسے کوئی پیپر ڈھونڈ رہا تھا۔ رابعہ کو اس کے چہرے کی صرف ایک سائڈ ہی نظر آرہی تھی۔ تاہم چہرے کی یہ جھلک رابعہ کو یہ بتانے کے لیے کافی تھی کہ وہ بہت گمبھیر موڈ میں ہے۔ اس کا اتنا سرخ چہرہ رابعہ نے کم ہی دیکھا تھا۔ یہ سرخی جیسے گہری ہو کر سیاہی مائل ہو گئی تھی۔

''فہد! آپ..... واپس آ گئے؟''

ایک لمحے توقف کے بعد اس نے اثبات میں سر ہلایا اور عجیب گھٹے گھٹے سے لہجے میں بولا۔

''ایک کاغذ یاد آ گیا تھا۔ وہ لینے آیا ہوں۔''

اس کے لہجے نے جیسے رابعہ کو سرتاپا ہلا دیا۔ وہ اس کی طرف دیکھ نہیں رہا تھا۔ بس تیزی سے الماری کی مختلف درازوں میں ہاتھ چلا رہا تھا یا شاید صرف ظاہر کر رہا تھا کہ وہ مصروف ہے۔

''آپ..... کے لیے..... پانی لاؤں؟'' رابعہ نے پوچھا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ اسی دوران میں فہد کے سیل فون پر کال کا میوزک آنے لگا۔ اس نے کال ریسیو کی۔ غالباً آفس سے ہی کال تھی۔ اس نے دھیمے لہجے میں ایک دو فقرے بولے پھر اسی طرح سیل فون کان سے لگائے لگائے وہ کوریڈور کی طرف بڑھ گیا۔ رابعہ بوکھلا کر اس کے پیچھے گئی۔ وہ تیزی سے قدم اٹھاتا لان کی طرف جا رہا تھا۔ چہرہ اسی طرح سرخ تھا۔

''فف..... فہد! آپ جا رہے ہیں۔'' اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

وہ اس کے پیچھے گیٹ تک گئی۔ وہ جب باہر نکلنے لگا تو اس نے پھر لرزتی سی آواز میں کہا۔ ''فہد! میری بات سن لیں۔''

یہ آواز جیسے اس کے کانوں تک ہی نہیں پہنچی تھی۔ وہ اسی طرح لمبے ڈگ بھرتا ہوا گلی میں پہنچا اور کچھ فاصلے پر کھڑی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

وہ اسی طرح ساکت و جامد کھڑی رہی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ کیا واقعی فہد کسی پیپر کی وجہ سے پریشان تھا اور اسے ڈھونڈتا ہوا آفس سے آیا تھا..... یا پھر..... اس سے آگے اس کے لیے سوچنا مشکل ہو گیا۔

کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ اس نے یہاں عمر کو کمرے میں دیکھ لیا تھا اور اس کا موڈ ایک دم خراب ہو گیا تھا؟

نہیں ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ اس کے اندر سے جیسے خود ہی جواب آیا۔ فہد ایسے گھٹیا انداز میں کیسے سوچ سکتا ہے۔ اگر اس نے عمر کو یہاں ڈرائنگ روم میں اس کے ساتھ دیکھ بھی لیا تھا تو اسے اس بارے میں سوال کرنا چاہیے تھا۔

نہیں..... نہیں فہد کی پریشانی اور اس کے برے موڈ کی وجہ کچھ اور ہو گی۔ اس نے خود کو تسلی دی پھر وہ ارم کے کمرے کی طرف لپکی۔ ننھا عارب ابھی سو رہا تھا۔ ارم واش روم میں تھی، تھوڑی دیر بعد وہ نکلی تو رابعہ نے کہا۔ ''تمہیں پتا ہے، ابھی تمہارے انکل آئے تھے؟''

''نہیں تو۔'' اس نے تولیے سے چہرہ پونچھتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ ''مجھے گیٹ کی تھوڑی سی آواز ضرور آئی تھی۔ میں نے سمجھا..... آپ ہوں گی..... پھر میں واش روم میں چلی گئی۔''

''وہ تمہارے انکل تھے۔ چھوٹے دروازے کو چابی لگا کر خود ہی آئے ہوں گے کہہ رہے تھے کوئی ضروری پیپر نہیں مل رہا۔ جیسے آئے تھے ویسے ہی تیزی میں چلے گئے.....''

''جب آئے..... تو آپ کہاں تھیں؟'' ارم نے انجان لہجے میں پوچھا۔

''وہ تمہارے انکل عمر آئے ہوئے تھے، جیولری کے پیسے دینے۔ مجھے تو فہد کے آنے کا پتا، ان کی گاڑی کے الارم سے چلا۔''

''انکل عمر اور انکل فہد کی بات نہیں ہوئی؟'' ارم نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''مم..... مجھے تو لگتا ہے کہ فہد نے عمر کو دیکھا ہی نہیں۔ اندر آ کر اپنی ہی رو میں اسٹڈی کی طرف چلے گئے۔''

''اور..... آپ نے جلدی سے انکل عمر کو نکال دیا ہو گا۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

''ہاں.....'' اس نے کہا اور پھر ذرا چونک کر ارم کی طرف دیکھا۔ وہ اس کے تاثرات سے کچھ بھی سمجھ نہ پائی۔

ارم بغیر کچھ کہے پھر واش روم میں گھس گئی۔

رابعہ کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ پانچ دس منٹ اس نے بمشکل گزارے، پھر اندازہ لگایا کہ اب فہد آفس پہنچ گئے ہوں گے۔ اس نے فہد کا نمبر پریس کیا۔ بیل جاتی رہی لیکن فون اٹینڈ نہیں ہوا۔ اس نے وقفے وقفے سے تین بار کوشش کی۔ وہ اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ پیپر ملا یا نہیں۔ جب اس نے چوتھی بار ٹرائی کی تو فون آف ہو چکا تھا۔ اس کا دل ہولنے لگا۔ ایک بار پھر ذہن میں سوال ابھرا کہ کیا بات صرف پیپر کی تھی؟ یا پھر کسی اتفاق کے تحت فہد گھر آیا تھا اور عمر کو اس کے ساتھ دیکھ کر اس کا موڈ بگڑ گیا تھا۔ شام تک کا

وقت رابعہ نے غیر معمولی بے چینی سے گزرا۔ اس بے چینی کے باوجود وہ پیکنگ وغیرہ بھی کرتی رہی۔ سامان میں ایک خوبصورت سا ''ٹینٹ'' بھی شامل تھا۔ پروگرام کے مطابق انہوں نے جرمنی اور سوئٹزرلینڈ میں کچھ جگہوں پر کیمپنگ وغیرہ بھی کرنا تھی۔ پھپھو اور ان کے بچوں کے لیے تحائف وغیرہ بھی سامان میں شامل تھے..... پیکنگ کے دوران میں بھی اس نے دو تین بار فہد کے نمبر پر ٹرائی کیا مگر فون بند ملا۔ اس نے پھر یہ سوچ کر خود کو تسلی دی کہ اہم میٹنگز کے موقع پر فہد اپنا موبائل مستقل آف کر دیتے ہیں۔

وہ جانتی نہیں تھی کہ اس کی زندگی میں کتنا بڑا طوفان آچکا ہے..... یہ تفریحی ٹور تو رہا ایک طرف' اس کی پوری زندگی پر مہیب زہریلے سائے امڈ آئے تھے گھر کا ماحول بھی کچھ عجیب سا تھا۔ ارم قریباً سارا دن ہی ننھے عارب کو لے کر اپنے کمرے میں گھسی رہی تھی۔ رات کے نو بجے تک بھی جب فہد گھر واپس نہیں آئے تو رابعہ کا صبر جواب دے گیا۔ اس نے ارسلان سے کہا کہ وہ اپنے پاپا کے آفس فون کرے اور پتا کرے کہ وہ کہاں ہیں۔

ارسلان پہلے فون پر ٹرائی کرتا رہا۔ پھر وہ گاڑی لے کر فہد کے آفس چلا گیا۔ دو گھنٹے بعد وہ ناکام واپس لوٹ آیا۔ اس نے بتایا کہ پاپا چار بجے ہی آفس سے اٹھ گئے تھے۔ اس کے بعد کہاں گئے کچھ پتا نہیں۔ رابعہ دل تھام کر بیٹھ گئی۔

☆☆☆

فہد کو یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی دنیا اندھیر ہو گئی ہے۔ زندگی کے ایک نہایت خوبصورت موقع پر اس پر ایک ایسا جانکاہ صدمہ آیا تھا جس کا کوئی مداوا ہی نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا اسے جھٹلانا ممکن ہی نہیں تھا۔ یہ شخص اسے کبھی بھی اچھا نہیں لگا تھا۔ نجانے کیوں فہد کے ذہن میں ہمیشہ یہ اندیشہ موجود رہا تھا کہ یہ بندہ کبھی نہ کبھی اس کو نقصان پہنچائے گا اور آج صبح یہ سب ہو گیا تھا۔ ارم کی دلخراش کال سننے کے بعد وہ جیسے ہواؤں میں معلق ہو گیا اور اسی حالت میں گھر پہنچا تھا۔ اس نے بند کمرے میں عمر کو رابعہ کے ساتھ دیکھا تھا۔ آوازیں اس تک نہیں پہنچ رہی تھیں مگر جو کچھ وہ دیکھ رہا تھا وہی اس کو زندہ درگور کرنے کے لیے کافی تھا۔ ان دونوں کی ہنسی اب تک فہد کے کانوں میں تیزاب انڈیل رہی تھی۔ وہ سارے مناظر فہد کی آنکھوں میں نیزوں کی طرح پیوست تھے۔ عمر کا رابعہ کو لاکٹ کا تحفہ دینا، رابعہ کی جھکی نظریں اور مسکراتا چہرہ، پھر گلی میں کھڑی فہد کی کار کا الارم بجنا۔ رابعہ کا بری طرح چونکنا، گھبراہٹ میں باہر جانا۔ پھر واپس آنا اور افراتفری میں عمر کو گھر سے نکال دینا۔

ہاں یہ سب کچھ دہکے نیزوں کی طرح تھا اور اس کی آنکھوں میں پیوست تھا..... رات کے دس بج چکے تھے۔ وہ گھر نہیں گیا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ اس کا کوئی گھر ہے ہی نہیں اور اگر تھا تو آج صبح جل کر خاک ہو گیا ہے۔ وہ اس وقت اپنے ایک پرانے دوست شہزاد کے گھر تھا..... اور رات وہیں گزارنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ وہ مسلسل سگریٹ پھونک رہا تھا۔ شہزاد نے اسے کریدنے کی بہت کوشش کی تھی۔ یہ بھی کہا تھا کہ اگر بھابی سے کوئی ان بن ہو گئی ہے تو بتاؤ، مسئلے کا کوئی حل سوچتے ہیں مگر فہد کے نہایت سخت جواب نے شہزاد کو ہونٹ سینے پر مجبور کر دیا تھا۔

پھر رات بارہ بجے کے لگ بھگ شہزاد کے نمبر پر بھی ایک کال آئی تھی۔ یہ کال فہد کے پریشان حال بیٹے ارسلان کی طرف سے تھی۔ اس نے کسی موہوم امید کے سہارے شہزاد سے اپنے پاپا کے بارے میں استفسار کیا تھا۔ ارسلان کی نہایت پریشان کن آواز سننے کے بعد شہزاد نے فہد کو مجبور کیا کہ وہ کم از کم ایک بار کال کر کے گھر والوں کو تسلی دے دے۔ یہ نہ ہو کہ وہ اسے تھانوں اور اسپتالوں میں ڈھونڈنا شروع کر دیں۔

شہزاد کے مجبور کرنے پر رات ایک بجے کے قریب فہد نے اپنا فون آن کیا اور ارسلان سے کال ملائی۔

اس کی آواز پہچانتے ہی ارسلان پکارا ''پاپا..... پاپا کہاں ہیں آپ؟ آپ نے تو ہم سب کی جان نکال دی ہے۔ فون کیوں بند کر رکھا تھا آپ نے؟''

فہد نے خود کو بہ مشکل بولنے پر آمادہ کیا اور زخمی لہجے میں بولا۔ ''میں ٹھیک ہوں۔ اپنے ایک دوست کے گھر ٹھہرا ہوا ہوں..... کل شام تک آجاؤں گا۔''

''لیکن پاپا ہوا کیا ہے۔ امی کا تو رو رو کر برا حال ہے۔ آپ نے کم از کم.....'' اس کی بات ادھوری رہ گئی تھی کیونکہ فہد نے فون بند کر دیا تھا۔

ارسلان کے آخری فقرے کی بازگشت فہد کے کانوں میں تھی۔ ''امی کا تو رو رو کر برا حال ہے۔''

رابعہ کی صورت اس کی نگاہوں میں گھومی اور اس کا دل درد سے بھر گیا۔ وہ خاموشی کی زبان میں اس سے مخاطب ہوا۔ ''تم نے ایسا کیوں کیا میرے ساتھ؟ کیوں ایسا صدمہ دے دیا، جس کا کوئی مداوا ہی نہیں۔ کیا کمی رہ گئی تھی میرے پیار میں اور میری وفا میں۔ اس سے تو اچھا تھا

مجھے اپنے ہاتھوں سے زہر کھلا دیا ہوتا۔''

پھر اس کے اندر سے ہی آواز آئی..... فہد! ایک بار اس سے پوچھنا تو چاہیے کہ وہ سب کیا تھا؟ کیوں تھا؟ وہ کیوں اس حد تک چلی گئی..... کیسے چلی گئی؟ ارم نے اسے فون پر بتایا تھا کہ یہ سب کچھ کافی عرصے سے چل رہا تھا۔ پتا نہیں کہ وہ اس گھر کے علاوہ بھی کب سے اور کہاں کہاں مل رہے تھے۔

اس کے سینے میں کچھ بھڑکنے لگا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ رابعہ کا سامنا کرنے کے بجائے اپنے ہاتھوں سے اپنی جان لے لے۔

☆☆☆

اگلے روز صبح نو دس بجے تک رابعہ کو یقین ہو چکا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ جو آفت اس گھر پر ٹوٹی تھی اس کی وجہ صرف اور صرف عمر ہی تھا۔ فہد کسی بہت بڑی غلط فہمی کا شکار ہو چکا تھا۔ مزید ہولناک بات یہ تھی کہ آج صبح سے رابعہ کو ارسلان اور شایان کا رویہ بھی کچھ بدلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ خاص طور سے ارسلان تو بالکل گم صم تھا۔ اس نے پاپا کے بارے میں کوئی بات کی اور نہ رابعہ کو کسی طرح کی تسلی دی۔

ارم بھی ایک دم خاموش تھی۔ ارسلان کے آفس جانے کے بعد رابعہ نے ارم سے پوچھا۔ ''ارم! یہ ارسلان کو کیا ہوا ہے؟''

وہ جیسے تنک کر بولی۔ ''جب گھر میں اس طرح کے معاملات چل رہے ہوں..... تو پھر جوان اولاد کا یہی حال ہوتا ہے۔''

وہ ٹھٹک کر بھو کی طرف دیکھنے لگی، جو آج بالکل بیگانی سی نظر آ رہی تھی۔ اس نے ارم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ تم..... کیا کہہ رہی ہو ارم۔ تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہیں۔''

وہ بے رخی سے بولی۔ ''یہ باتیں میں نہیں کر رہی۔ سب کر رہے ہیں۔ آپ انکل فہد کو ڈھونڈنے کے لیے جگہ جگہ فون کرتی رہی ہیں۔ سب کو پتا چل گیا ہے کہ وہ آپ کی وجہ سے گھر چھوڑ کر چلے گئے ہیں اور..... انکل عمر کے یہاں آنے والی بات بھی اب چھپی نہیں رہی ہے۔''

رابعہ کانپ گئی۔ ''ارم! یہ کیا کہہ رہی ہو۔ عمر والی بات کا میرے اور تمہارے سوا کس کو پتا تھا۔ اگر کسی کو پتا چلا ہوگا..... تو..... تمہاری طرف سے چلا ہوگا۔''

ارم نے کہا۔ ''ارسلان نے ڈرائنگ روم میں چائے کے برتن اور ایش ٹرے میں سگریٹ کے ٹکڑے دیکھے تھے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کل صبح کون آیا تھا یہاں..... میں ان سے جھوٹ نہیں بول سکی۔''

رابعہ نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ اس کے جسم کا خون اس کے سر کو چڑھ رہا تھا۔ وہ اشکبار ہو کر بولی۔ ''لیکن..... ارم..... تم تو اچھی طرح جانتی ہو۔ عمر کیوں آیا تھا یہاں؟ یہ سب کچھ..... تمہارے مشورے سے ہی تو ہوا تھا..... تم گواہ ہو ساری بات کی۔''

''میں کوئی گواہ نہیں ہوں۔'' وہ حد درجہ بے رخی سے بولی۔ ''پرسوں وہ میرے سامنے آئے تھے، لیکن کل تو میں اپنے کمرے میں سو رہی تھی۔ مجھے کیا پتا کہ..... وہ بند کمرے میں کب سے آپ کے پاس بیٹھے تھے..... اور انکل فہد نے وہاں کیا دیکھا۔''

رابعہ کو لگا کہ آسمان ٹوٹ کر اس کے سر پر آن گرا ہے۔ اس کا دل چاہا کہ زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے۔

اس نے بہو کی... نفرت سے بھری... آنکھوں میں دیکھا اور اسے لگا کہ وہ کسی خوفناک سازش کا شکار ہوئی ہے۔ کہیں..... ایسا تو نہیں تھا کہ ارم نے ہی فون کر کے فہد کو دفتر سے بلایا ہو اور اس کے کانوں میں زہر انڈیلا ہو۔ اگر ایسا تھا تو پھر اس نے عمر کے یہاں آنے والی بات صرف ارسلان تک ہی نہیں پہنچائی تھی..... اپنے میکے اور خاندان کے دیگر لوگوں تک بھی پہنچا دی تھی۔

''اوہ خدایا..... مجھ پر رحم کر..... مجھ پر رحم کر۔'' وہ دل ہی دل میں پکار اٹھی۔ ''کیا انسان اتنا بھی گر سکتا ہے؟ کیا ایک بیٹی جیسی بہو، اپنی ساس سے دشمنی چکاتے چکاتے اتنا گھٹیا قدم بھی اٹھا سکتی ہے؟''

وہ ارم سے کچھ کہنا چاہ رہی تھی مگر وہ پاؤں پٹختی ہوئی کمرے میں جا چکی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ بچے کو اٹھائے اور وزنی شولڈر بیگ لٹکائے باہر نکل آئی۔

''کک..... کہاں جا رہی ہو ارم؟'' رابعہ ہکلائی۔

''مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ تم..... جانتی ہو اصل بات۔ سب کچھ جانتی ہو۔''

''میں کچھ نہیں جانتی۔'' وہ پھنکاری۔ ''اتنا عرصہ آپ کے پاس رہ کر آپ کو نہیں پہچان سکی تو دو تین ملاقاتوں میں آپ کے کزن کو کیا پہچانوں گی..... مجھے شرم آ رہی ہے اپنے آپ سے۔ میں ایسے گھر میں، ایسے گھٹیا ماحول میں نہیں رہ سکتی۔ میں جا رہی ہوں۔''

رابعہ نے کانپتے ہاتھوں سے اس کا بازو تھامنا چاہا مگر وہ بے رحمی سے اسے دھکیلتی ہوئی باہر نکل گئی۔ اس کی

زہریلی بڑبڑاہٹ رابعہ کے کانوں تک پہنچی۔ ''ایسی عمر میں ایسی حرکتیں..... نہ اپنا خیال نہ جوان بچوں کا.....''

رابعہ سکتہ زدہ سی کھڑی رہ گئی۔ اسے اپنی سماعت پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا..... آنسو تواتر سے گر رہے تھے، پھر وہ خود کو گھسیٹتی ہوئی فون تک پہنچی۔ اس نے روتے روتے ارسلان کو فون کیا۔ اس کا فون بند تھا۔ اس نے شایان کو فون کیا۔ دو دفعہ مسلسل بیل جاتی رہی لیکن کال اٹینڈ نہیں ہوئی۔ یکدم اسے لگا کہ وہ بالکل تنہا رہ گئی ہے۔ سب نے اس سے منہ موڑ لیا ہے۔ پھر اس نے تصور میں دیکھا کہ کچھ نادیدہ لوگ اس کی چاروں طرف ہیں۔ اسے گھسیٹ کر کسی بلند جگہ پر لے جا رہے ہیں، اسے سرِعام سنگسار کرنے کے لیے۔

وہ کرب سے پکار اٹھی۔ ''کہاں ہیں فہد! آپ تو میرے سر کے تاج ہیں، آپ تو میرا لباس ہیں۔ آپ نے مجھ کو ڈھانپنا ہے۔ آپ آئیں..... آپ سب کو بتائیں، سب لوگوں کو بتائیں۔ میری بیوی ایسی نہیں ہے، میری رابعہ ایسی نہیں ہے۔ آپ کہاں ہیں فہد!'' وہ بلکتی رہی اور خاموشی کی زبان میں اسے پکارتی رہی۔

☆☆☆

شام سات آٹھ بجے تک کا وقت رابعہ نے پتا نہیں کس طرح گزارا تھا اور یہ وہ وقت تھا جب انہیں اپنی تیاری فائنل کرنا تھی اور پھر رات بارہ بجے کے لگ بھگ اپنے بیرونی ٹور پر روانہ ہونے کے لیے لاہور ائرپورٹ کے لیے نکلنا تھا۔

پیک شدہ سامان کمرے کے وسط میں حسرت کی تصویر بنا پڑا تھا..... رابعہ نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا، اب بھی وہ تکیے میں منہ دیے مسلسل رو رہی تھی۔ اچانک اسے کچھ آہٹیں سنائی دیں۔ اسے اندازہ ہوا کہ فہد گھر آ گئے ہیں اور کوریڈور سے گزر کر سیدھا اسٹڈی روم میں چلے گئے ہیں۔

گھٹا ٹوپ اندھیرے میں امید کی کچھ کرنیں اس کے سینے میں نمودار ہوئیں۔ ابھی تو آٹھ ہی بجے تھے۔ فلائٹ کے جانے میں اب بھی قریباً آٹھ گھنٹے باقی تھے۔ شاید..... شاید کوئی کایا پلٹ ہونے والی تھی۔ شاید اس گمبھیر ترین صورت حال میں سے کوئی راہ نکلنے والی تھی۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ اٹھی۔ بال جوڑے کی شکل میں لپیٹے۔ سر پر دوپٹا درست کیا اور چپل گھسیٹ کر اسٹڈی کی طرف لپکی۔ گیراج میں گاڑی موجود تھی فہد اسٹڈی میں ہی تھے۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔

اس نے دروازہ کھٹکھٹانا شروع کیا۔ ساتھ ساتھ وہ فہد کو آواز بھی دے رہی تھی۔ ''فہد! دروازہ کھولیں۔ میری بات سنیں۔''

اندر پہلے تو خاموش رہی پھر فہد کی دہاڑتی ہوئی سی آواز آئی۔ ''چلی جاؤ یہاں سے۔ میں تم سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتا۔''

فہد کی آواز بہت بھاری اور بھرائی ہوئی تھی۔ اس نے دروازے سے منہ لگا کر کہا۔ ''فہد! آپ کو بہت بڑی غلط فہمی ہو رہی ہے۔ آپ دروازہ کھولیں، میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں سب کچھ۔''

''مجھے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ چلی جاؤ یہاں سے۔ میں تمہاری آواز بھی سننا نہیں چاہتا۔'' وہ گرجا۔ رابعہ کو محسوس ہوا جیسے فہد نشے میں ہے یا شاید اس نے سکون آور دوا زیادہ مقدار میں کھا رکھی تھی۔ رابعہ جانتی تھی کہ کسی وقت پریشانی یا ڈپریشن میں وہ سکون آور دوا لے لیتے ہیں۔

رابعہ نے پھر التجا کی کہ وہ دروازہ کھولے، وہ اسے سب کچھ بتانا چاہتی ہے مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ سارے گھر میں ایک سوگوار سا سناٹا تھا۔ ارسلان ابھی گھر ہی نہیں آیا تھا۔ شایان کی بائیک بھی گیراج میں موجود نہیں تھی .... وہ شہر سے باہر تھا۔

رابعہ نے دروازے پر دو ہتڑ برسائے اور چلا کر بولی۔ ''فہد! آپ نے کیا سمجھ رکھا ہے مجھے؟ کیا میں اتنی گری ہوئی ہوں۔ کیا آپ کی بیوی اتنی نیچ ہو سکتی ہے؟ اگر آپ کی سوچ ایسی ہے تو مجھے شرم آ رہی ہے آپ کی سوچ پر۔ آپ دروازہ کھولیں، میں آپ کو بتاتی ہوں سب کچھ۔''

''تم تماشا مت لگاؤ۔ چلی جاؤ یہاں سے۔ میں تمہاری شکل دیکھنا نہیں چاہتا۔''

وہ اور بپھر گئی۔ ''کیوں شکل دیکھنا نہیں چاہتے..... اس لیے کہ میرا کریکٹر ٹھیک نہیں..... اس لیے کہ میں نے آپ کی غیر موجودگی میں اپنے کزن کو گھر بلایا اور اس کے ساتھ بند کمرے میں بیٹھی؟ اس لیے کہ میں نے..... کوئی یارانہ پال رکھا ہے؟ آپ ایسی گھٹیا سوچ رکھیں گے، میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ آپ دروازہ کھولیں۔'' اس نے ایک بار پھر دروازے پر دو ہتڑ برسائے۔ اس کی چوڑیاں ٹوٹ گئیں اور دو انگلیوں کی پوروں سے خون رسنے لگا۔

دروازہ پھر بھی نہیں کھلا۔ لاچار ہو کر اس نے اپنا سر دروازے سے ٹکایا اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ اسے لگا جیسے اندر ایک انسان نہیں ایک پتھر ہے۔ وہ روتے روتے التجا آمیز لہجے میں بولی۔ ''فہد! میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو

تیار ہوں، میرا کردار بالکل صاف ہے۔ میری نیت میں کوئی کھوٹ نہیں۔ عمر میرے بھائیوں کی طرح ہے۔''

''بھائیوں کی طرح ہے لیکن بھائی تو نہیں ہے۔'' اندر سے فہد کی گرجتی ہوئی آواز ابھری۔ ''اگر وہ بھائی تھا تو سب کے سامنے کیوں نہیں ملتا تھا تم سے۔ سب کے سامنے تمہیں تحفے کیوں نہیں دیتا تھا؟ شوہروں کی غیر موجودگی میں بیویاں اس طرح بند کمروں میں ملتی ہیں اپنے کزنوں کے ساتھ؟'' وہ اتنے زور سے بولا کہ کمرے کی دیواریں لرزتی محسوس ہوئیں۔

رابعہ وہیں دہلیز پر بیٹھے بیٹھے پکاری۔ ''فہد! یہ سب ویسا نہیں ہے جیسا آپ سمجھ رہے ہیں۔ میں اپنی مری ہوئی ماں کی قسم کھاتی ہوں، میرے اور عمر کے درمیان کچھ نہیں ہے۔ میں..... صرف..... اپنی تھوڑی سی جیولری بیچنا چاہتی تھی، مجھے ارم نے ہی مشورہ دیا تھا کہ میں انکل عمر کو بلالوں۔ ارم نے ہی عمر کی بیٹی سے عمر کا نمبر لیا تھا اور کہا تھا کہ بازار میں ٹھیک قیمت نہیں ملتی، اس لیے عمر انکل سے بات کر لیتے ہیں۔ فہد! میں نے زندگی میں آپ سے کبھی کچھ نہیں چھپایا..... نہ اب چھپا رہی ہوں.....''

وہ گرجا۔ ''تم نے کبھی کچھ نہیں بتایا..... نہ اب بتا رہی ہو۔ تم نے ہمیشہ جھوٹ بولا..... اور اب بھی بول رہی ہو، مجھے تو لگتا ہے کہ اس حرامزادے سے کبھی تمہارا تعلق ٹوٹا ہی نہیں تھا۔ کسی نہ کسی شکل میں تمہارے رابطے ہمیشہ رہے ہیں۔''

فہد کی آواز میں غنودگی بھری لڑکھڑاہٹ تھی۔ وہ مختصر سے اسٹڈی روم میں دروازے کے پاس ہی سنگل صوفے پر بیٹھا تھا۔

رابعہ نے اپنی زخمی انگلیوں کے باوجود ایک بار پھر دروازے کو بری طرح پیٹا۔ ''آپ دروازہ کھولیں، فہد! ورنہ..... ورنہ میں کچھ کر بیٹھوں گی اپنے آپ کو۔''

وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ گھر خالی تھا، اس کی آہ و بکا سننے والا کوئی نہیں تھا..... اور اندر.....؟ اندر تو واقعی کوئی پتھر تھا' انسان نہیں تھا اور پتھروں پر آنسوؤں کا اثر کہاں ہوتا ہے۔

نجانے کتنی ہی دیر اسی طرح گزر گئی۔ رابعہ کے گلے میں پھندا سا لگ گیا تھا۔ اس نے بمشکل خود کو بولنے کے قابل کیا اور فہد کو مخاطب کر کے سسکیوں میں بولی۔ ''جیولری والی بات آپ سے صرف اس لیے چھپائی فہد! کہ آپ کو تحفہ دینا چاہتی تھی۔ آپ کو سرپرائز دینے کی خواہش تھی دل میں۔ آپ کی کلائی پر اپنے ہاتھوں سے گھڑی باندھنے کی آرزو پال رکھی تھی۔ مجھ بدنصیب کو کیا پتا تھا کہ یہ خواہش میرے سر پر کتنی بڑی قیامت توڑ دے گی۔ مجھے نہیں پتا، ارم نے آپ کو کیا بتایا ہے اور کس طرح بتایا ہے لیکن حقیقت وہی ہے فہد! جو میں آپ کو بتا رہی ہوں..... اور آپ نے جس تحفے کی بات کی وہ ایک لاکٹ ہے اور وہ تحفہ نہیں تھا۔ میں نے پرسوں عمر کو وہ پرانا جھومر دیا تھا جو ایک مرتبہ خالہ مہناز نے مجھے گفٹ کیا تھا، عمر نے وہ بیچ کر مجھے یہ لاکٹ لا کر دیا اور یہ میں نے شایان کی ہونے والی بیوی کے لیے منگوایا تھا۔ میری ان باتوں کی تصدیق کے لیے آپ مجھے جس آزمائش سے گزارنا چاہتے ہیں گزار لیں اور میں ایک بار پھر کہتی ہوں، میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔ ہر حلف اٹھانے کے لیے آمادہ ہوں..... آپ..... میری بات سن رہے ہیں ناں فہد؟''

اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ دہلیز پر بیٹھے بیٹھے اس نے دروازے پر دستک دی۔ ''آپ سن رہے ہیں ناں فہد؟''

اندر نامانوس سی خاموشی تھی۔ اس نے دروازے کو قدرے زور سے ہلایا۔ دفعتاً اسے خیال آیا کہ اسٹڈی کا ایک چھوٹا دروازہ گھر کی بغلی راہداری کی طرف بھی کھلتا ہے۔ کہیں فہد اس دروازے سے نکل کر چلے تو نہیں گئے تھے؟ وہ تڑپ کر اٹھی اور اندرونی کوریڈور کی طرف سے گھوم کر اسٹڈی کے عقبی دروازے پر پہنچی۔ وہ کھلا ہوا تھا۔ فہد اسٹڈی روم میں موجود نہیں تھا۔

''فہد..... فہد۔'' وہ بے ساختہ پکاری۔

گاڑی گیراج میں ہی تھی لیکن ایسے لگتا تھا کہ فہد گھر سے نکل چکا ہے۔ وہ دیوانی سی پورے گھر میں چکرا گئی۔ فہد جا چکا تھا۔ ''اوہ میرے خدا'' اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا اور وہ سر تھام کر اسٹڈی کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔ فہد جا چکا تھا اور وہ خالی کمرے کے سامنے بیٹھی روتی رہی تھی، اپنی صفائیاں پیش کرتی رہی تھی۔

اسے لگا کہ اس کے دل کو کچھ ہو جائے گا۔ خود کو بمشکل سنبھالتی ہوئی وہ چھوٹے دروازے سے اسٹڈی میں داخل ہوئی۔ سامنے ہی ٹیبل پر ایک بریف کیس کھلا پڑا تھا۔ یہ وہی بریف کیس تھا جس میں فہد پچھلے کئی روز سے اپنے سفری کاغذات اور ضرورت کی دیگر اشیا بڑی ترتیب سے رکھتے رہے تھے۔ اب اس بریف کیس میں کچھ نہیں تھا۔ صرف دو پھٹے ہوئے پاسپورٹ تھے..... پھٹے ہوئے ٹکٹس تھے اور ٹریول چیکس وغیرہ کے ٹکڑے تھے۔

رابعہ کے موبائل پر میسیج کی ٹون آئی۔ اس نے بھیگی آنکھوں کے ساتھ اسکرین دیکھ کر میسیج کھولا۔ یہ واٹس ایپ

میسج اس کی ایک بھانجی کی طرف سے تھا۔ اس نے اسے سفر کے لیے وش کیا تھا۔ کمرے میں ایک انگلش سونگ کی آواز گونجنے لگی۔

ہیپی جرنی..... ہیپی جرنی

ڈونٹ فارگیٹ دی ون ہولو یو سو..... ہیپی جرنی..... ہیپی جرنی۔

اس نے دھندلائی ہوئی نگاہوں سے وال کلاک کی طرف دیکھا۔ ہاں یہی وہ وقت تھا جب انہیں ائرپورٹ جانے کے لیے تیار ہونا تھا..... کتنی شدت سے فہد نے انتظار کیا تھا اس وقت کا۔ آہ، یہ سب کیا ہو گیا تھا.....

ایک دم خیالوں کا یہ طویل سلسلہ ٹوٹ گیا۔ وہ ماضی کے دھندلکوں سے نکل آئی۔ وہ وہیں فرینکفرٹ کے ہلٹن ہوٹل میں تھی۔ چوتھی منزل کا کمرا نمبر 203۔ آتش دان میں حرارت تھی۔ اس نے اپنی گود میں پڑے کافی کے خالی کپ کو گھورا اور اسے تپائی پر رکھ دیا۔ کھڑکیوں سے باہر ایک جگمگاتی ہوئی رات دھیرے دھیرے اپنے وسط کی طرف سرک رہی تھی۔ اسے لگا کہ اس کے رخساروں پر نمی ہے..... ہاں یہ نمی انہی حسرت ناک یادوں کی دین تھی جو آج مسلسل اس کے دل و دماغ پر حملہ آور ہو رہی تھیں۔ اسے آج بھی اپنی وہ زخمی انگلیاں بھولی نہیں تھیں جو اسٹڈی روم کے بند دروازے پر دستک دے دے کر خونچکاں ہو گئی تھیں..... اس کی ایک کلائی پر آج بھی ان ٹوٹی ہوئی ست رنگی چوڑیوں کے مدھم نشان موجود تھے جنہوں نے ایک بند دروازے سے ٹکرا ٹکرا کر خود کو چکنا چور کیا تھا..... آہ، کچھ دروازے اس طرح بند کیوں ہو جاتے ہیں کہ پھر کھلنے کا نام نہیں لیتے؟ ان دروازوں کے پیچھے بیٹھے ہوئے لوگ کیوں گوشت پوست کے انسان نہیں رہتے، پتھر کے مجسمے بن جاتے ہیں۔ بے شک بعد میں وہ بہت پچھتاتے ہیں، تڑپتے ہیں لیکن جب محبت بھری دستکوں کے لمحے گزر جاتے ہیں تو کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

رابعہ کو سب کچھ یاد تھا، کچھ بھی بھولا نہیں تھا۔ اس رات فہد کے گھر سے چلے جانے کے بعد رابعہ نے ہر پل ماہی بے آب کی طرح گزارا تھا۔ ارسلان تو اس رات گھر آیا ہی نہیں تھا۔ شایان رات کو ڈیڑھ دو بجے کے لگ بھگ آیا اور آتے ہی اوپر اپنے کمرے میں جا کر دروازہ بند کر کے سو گیا تھا۔ اس نے رابعہ کے کمرے میں جھانکنے کی زحمت بھی نہیں کی تھی، حالانکہ رابعہ کے کمرے کی لائٹ آن تھی۔ اس رات رابعہ کو واقعی ایسا ... لگا تھا جیسے وہ بالکل تنہا رہ گئی ہے۔ اس رات اپنی زخمی انگلیوں اور ہتھیلیوں پر برف کی ٹکور کرتے کرتے اور اپنے آنسو پونچھتے پونچھتے رابعہ کے دل سے ایک آواز گواہی بن کر ابھری تھی۔ اس آواز نے پورے یقین کے ساتھ کہا تھا کہ آج اس کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے یہ اسی طمانچے کا بدلہ ہے جو کچھ عرصہ پہلے ارسلان کی جانب سے ارم کے گال پر مارا گیا تھا۔ رابعہ کے دل میں ہمیشہ یہ کھٹکا رہا تھا کہ ارم اتنی آسانی سے اپنی وہ بے عزتی بھولے گی نہیں اور حالات کا اشارہ یہی تھا کہ آج یہ اندیشہ درست ثابت ہو گیا ہے۔ رابعہ نے اس رات بیٹھ کر اس معاملے کو شروع سے آخر تک دیکھا۔ وہ جتنا سوچ رہی تھی اس معاملے کی گرہیں کھلتی جا رہی تھیں۔ اسے اس بات کا یقین ہو گیا کہ یہ ارم کی بڑی صفائی اور باریک بینی سے تراشی ہوئی ایک بھیانک سازش تھی، فہد کی حد تک تو یہ معاملہ درد، تکلیف اور آنسوؤں تک تھا پر اب اس کی نظر میں اس طوفان کی تباہ کاریاں حدود سے باہر نکل چکی تھیں۔ اب اس کی اولاد، اس کے بچے، اس کا مان، اس کی پارسائی کے شاہد، اس کے جگر گوشے اس کے بارے میں بدگمان ہو چکے تھے اور اس سب کی وجہ کون بنی تھی.....؟ وہ جس کی آنکھوں میں، جس کی باتوں میں دیوانوں کی طرح اپنے لیے ایک بیٹی تلاشتی رہی تھی۔ آج اسے اس روپ کے پیچھے اس عورت کا اصل چہرہ نظر آ رہا تھا۔ اس وقت اس کا دل چاہ رہا تھا کہ ارم اس کے پاس ہو تو وہ اس کا گریبان پکڑ کر اسے جھنجوڑے اور اس سے پوچھے کہ کس جرم کی پاداش میں اس نے اس کا ہنستا بستا گھر برباد کر دیا؟ وہ ترسے ہوؤں کی طرح ہمیشہ اس میں اپنی بیٹی تلاشتی رہی لیکن وہ..... وہ تو صرف ایک عورت تھی۔ ایک عورت جو ازل سے دوسری عورت کے ساتھ مقابلہ کرتی آئی ہے۔ اس پر برتری پانے کے لیے۔

فہد اور اس کی زندگی بھر کا ساتھ اور عمر بھر کی محبت کیا ہوئی۔ بچوں میں لگ کر اس نے اپنی جان رول دی، دیوانوں کی طرح ان کو پیار کیا، ان کی تعلیم و تربیت میں اَن تھک محنت کی۔ اپنے خون سے سینچ کر انہیں تناور درخت بنایا۔ پر سب کیا ہوا..... سمتِ مخالف سے چلے ہوئے ہوا کے ایک آوارہ جھونکے نے سب کچھ تہس نہس کر کے رکھ دیا تو اب کیا وہی ماں، وہی بیوی ان کو اپنی پاکبازی کا یقین دلانے کے لیے اپنی صفائیاں پیش کرے؟ وضاحتیں دے؟ نہیں..... یہ نہیں ہو پائے گا مجھ سے۔ اس رات اسے اپنی مرحوم بہن کی بے انتہا یاد آئی جس نے کچھ ایسا ہی ظلم برداشت کیا تھا..... صفائی دینے کی کوشش کی تھی اور پھر ایک دن بالآخر اسی ظلم نے اس کی جان لے لی تھی۔

رابعہ کی آنکھیں یکدم خشک ہوگئیں اور سانس تیزی سے چلنے لگی۔ جسم کی حرارت بڑھ رہی تھی۔ اعصاب تن چکے تھے۔

اگلے روز اسد کو کالج بھیج کر اس نے اپنی ضرورت کا مختصر سا سامان چھوٹے ٹرالی سوٹ کیس میں رکھا، ایک مختصر سا رقعہ فہد کی اسٹڈی ٹیبل پر چھوڑا اور چپ چاپ اس کالونی کا رخ کیا جہاں اس کی مرحوم والدہ کا گھر تھا۔ وہ گھر اس نے اپنی والدہ کی وفات کے بعد کرائے پر دے رکھا تھا اور کوئی تین چار گھر چھوڑ کر اس کے ٹیچنگ کے زمانے کی دوست آسیہ باجی کا گھر تھا۔ کبھی کبھار والدہ کے گھر کا چکر لگتا تو فہد کے ہمراہ آسیہ باجی کے گھر بھی وہ ضرور جاتی تھی۔ اس نے کرایہ داروں کو ایک مہینے کے اندر گھر خالی کرنے کا نوٹس دیا اور اتنے عرصے کے لیے اپنی دوست کے ہاں ٹھہر گئی۔

آسیہ ایک معاملہ فہم اور خوش مزاج خاتون تھی، اس نے اس سلسلے میں رابعہ کو زیادہ کریدنے کی کوشش تو نہ کی مگر رابعہ کی زبانی وہ اتنا جان چکی تھی کہ کوئی معاملہ ایسا ہے جس کی وجہ سے فی الحال وہ اس گھر میں نہیں رہ سکتی۔ وہ معاملہ کتنی شدید نوعیت کا ہوسکتا ہے اس کا اندازہ بھی انہیں ہو چکا تھا۔ وہ اپنے بچوں کو چھوڑ کر آ چکی تھی۔

☆☆☆

رات کے گیارہ بج چکے تھے لیکن فہد ابھی تک گھر نہیں گیا تھا۔ اس کے روم کے علاوہ آفس کی تقریباً سب لائٹس بند ہو چکی تھیں۔ اس کے کمرے کے بلب کی روشنی میں سگریٹ کا اٹھتا ہوا دھواں صاف دکھائی دے رہا تھا۔ رابعہ کے جانے کے بعد کچھ دن سے اس کا یہی معمول تھا۔ پر آج...... دو گھنٹے سے مسلسل سگریٹ پینے کے باوجود اس کی بے چینی اور اضطراب میں کمی نہیں آئی تھی۔ اسے اب متلی سی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی سرخ ہوتی آنکھوں کو گھڑی کی سوئیاں قدرے دھندلائی ہوئی دکھ رہی تھیں۔ اس نے اپنے گریبان کا بٹن بند کر کے کوٹ اور بریف کیس اٹھایا اور ی سے باہر نکل گیا۔ آفس کا پرانا چوکیدار منشا فہد کی تیزی سے نکلتی ہوئی گاڑی متفکر انداز میں دیکھتا رہا۔

اس کے اعصاب بری طرح کھنچے ہوئے تھے۔ گاڑی اور سڑک تو در کنار فی الحال اسے اپنا آپ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اس کے ذہن میں اس عورت کی شبیہہ گھومتی جو اس کی رگوں میں خون بن کر دوڑتی تھی اور دوسرے ہی لمحے چند دن پہلے گھر کے ڈرائنگ روم میں دیکھے گئے مناظر۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ پاگل ہو جائے گا یا پھر اس کے دماغ کی کوئی نس پھٹ جائے گی۔ رابعہ کے رقعے سے وہ جان چکا تھا کہ وہ کہاں ہے مگر اسے تو اس طرف جانا ہی نہیں تھا۔ اس کو گئے دس بارہ دن ہو چکے تھے اور اس دوران میں اس نے رابعہ سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ فہد کے لیے اس کا یوں اپنی صفائی پیش کیے بغیر چلے جانا، اپنا جرم تسلیم کرنے کے مترادف تھا۔ فہد نے اپنی گاڑی ایک مشہور فائیو اسٹار ریسٹورنٹ کے پارکنگ لاٹ میں کھڑی کی۔ اندرونی کیفیت کو دبائے، انگلیوں سے بال درست کرتا ہوا وہ اندر کی جانب بڑھا۔ یہ وہی ریسٹورنٹ تھا جہاں ہمیشہ فہد اور رابعہ بچوں کے ہمراہ اپنی شادی کی سالگرہ سیلیبریٹ کرتے تھے۔ فہد نے زندگی میں کبھی شیشے کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ پر پتا نہیں کیوں وہ آج شیشے کا تیز نشہ کرنے کے لیے یہاں آ گیا تھا۔ یہاں یہ نشہ کافی مہنگے داموں مہیا کیا جاتا تھا۔ آرڈر کرنے کے بعد اس نے اپنا پرس کھولا اور کپکپاتے ہاتھوں سے چند بڑے نوٹ کیشیئر کو تھمائے۔ ایک احساس جرم، ایک احساس گناہ اس کے ذہن پر تو دستک دے رہا تھا پر دل تک نہیں پہنچ پا رہا تھا۔ پے منٹ کے بعد بقایا رقم رکھنے کے لیے اس نے اپنا پرس کھولا تو اب کی بار دوسری پاکٹ میں اسے ایسی چیز نظر آئی جس نے اس کے ہاتھوں اور نظروں کو وہیں جام کر دیا۔ دل کی دھڑکنیں اچانک تیز تر ہو گئیں۔ یہ اور کچھ نہیں وہی آیت الکرسی کا چھوٹا سا کارڈ تھا جس کو وہ ہمیشہ اپنے والٹ میں رکھتا تھا۔

''سر اینی پرابلم؟'' کاؤنٹر پر کھڑے کیشیئر کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ فہد نے چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر آرڈر کینسل کر دیا۔ ''نہیں...... آ...... آئی ڈونٹ وانٹ دس۔'' اس نے اپنا پرس واپس رکھا اور جیسے تیزی سے آیا تھا ویسے ہی واپس چلا گیا۔

فہد کو یاد نہیں تھا کہ کبھی عشا کی نماز اس سے چھوٹی ہو۔ پر اب کئی دنوں سے اپنی نمازوں کا جیسے ہوش ہی نہیں تھا اسے۔ وہ بے انتہا تھکا ہوا تھا مگر گھر آ کر اس نے بڑی مشکل سے ہمت جمع کر کے وضو کیا اور جائے نماز پر کھڑا ہو گیا۔ بس وہ پہلا سجدہ...... وہ پہلی دوا تھی جو کئی دنوں سے رستے ہوئے زخموں پر لگی تھی۔ وہ بڑی دیر تک اسی کیفیت میں رہا۔

☆☆☆

ارم نے سارا معاملہ اس طرح سے ترتیب دیا تھا کہ اس میں شک کی گنجائش نہ ہونے کے برابر تھی۔ فہد، شایان اور ارسلان رابعہ سے بدگمان ہو چکے تھے۔ اس بدگمانی نے ان کی زندگی کو بنیادوں تک ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ان میں سے کسی نے رابعہ سے فی الحال رابطہ نہیں کیا تھا۔ البتہ اسد ایک

TAGPK.COM

شام چپ چاپ کالج سے واپسی پر اپنی ماں کے پاس چلا گیا۔ اس کے استفسار کرنے کے بعد رابعہ نے ساری بات بڑی تفصیل سے اس کے گوش گزار کردی کہ کوئی تو اس کے کردار کی گواہی دے۔ ساری بات سن کر وہ تو جیسے آگ بگولا ہوگیا۔

''مما! کیا بکواس ہے یہ سب۔ ان سب کے دماغ خراب ہوگئے ہیں کیا؟'' وہ ماں کی بات سن کر دوبارہ بوٹ جرابیں پہننے لگا۔

''کہاں جارہے ہو تم؟'' رابعہ نے اسے بازو سے پکڑ لیا۔

''ان سب کا دماغ ٹھیک کرنے۔ بھابی کے نام پر دھبا ہے یہ عورت۔ باقی سب کا دماغ بھی خراب کرکے رکھ دیا ہے۔'' اس نے چیخ کر کہا۔

''نہیں اسد..... نہیں..... اگر تم میرے بیٹے ہو۔ تمہیں میرے ساتھ رہنا ہے تو تم میری کوئی صفائی انہیں پیش کرنے نہیں جاؤ گے۔'' رابعہ اپنے اندر کی تکلیف کو دباتے ہوئے بڑی دیر تک اسد کا غصہ ٹھنڈا کرتی رہی۔ اسد بچپن سے ہی سخت جان تھا۔ پر آج وہ اس کی چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی میں تواتر سے جذب ہوتے آنسوؤں کو پوچھ رہی تھی۔

''سچائی اپنا آپ خود منواتی ہے اسد..... میں بے قصور ہوں۔ یہ بات میں جانتی ہوں اور میرا رب جانتا ہے اور یقین کرو ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ مجھے اس زمانے کے ہاتھوں رسوا ہونے کے لیے چھوڑ دے۔'' رابعہ نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بڑے یقین سے اسد کی طرف دیکھا اور اس کے سونے کے لیے کمرا سیٹ کرنے کے لیے اٹھ گئی۔

آج اس کی بے چینی اور بے قراری حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ حق پر ہوتے ہوئے بھی خاموش رہنا کچھ نہ کہنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ پر اس کے صبر کو، اس کی انا کو یہ گوارا نہیں تھا کہ وہ اپنے شوہر کو اپنے بچوں کو اپنی صفائی دیتی پھرے۔ رات کا ایک بجنے والا تھا اور وہ بڑی بے چینی سے اپنے کمرے میں چکر کاٹ رہی تھی۔ یہ وہی کمرا تھا جہاں اس کی والدہ سویا کرتی تھیں اور راتوں کو ڈر کر وہ یہاں آجایا کرتی تھی اور اپنی امی سے لپٹ کر دیر تک روتی رہتی تھی مگر آج اتنی بے چینی تھی..... اتنا درد تھا جتنا زندگی میں پہلے کبھی نہیں ہوا تھا اور آج یاں بھی نہیں تھی۔ وہ کچھ دنوں سے سکون آور گولی لے رہی تھی پر آج نہیں لی تھی۔ اسد نے سونے سے پہلے کہا تھا۔

''مما..... کل میرا پیپر ہے۔ ابھی مجھ سے پڑھا نہیں جائے گا۔ صبح اذانوں کے وقت اٹھا دینا۔'' گولی نہ لینے کی وجہ سے وہ بے کلی محسوس کررہی تھی۔ پھر ایک خیال کے آتے ہی اس نے چپ چاپ وضو کیا اور نفل پڑھنے کے لیے جائے نماز پر کھڑی ہوگئی۔ پچھلے چند دنوں میں آنکھوں کے حلقے گہرے ہوگئے تھے۔ آنسو ٹپ ٹپ گر کر جائے نماز میں جذب ہونے لگے اور وہ سوز و گداز میں ڈوبا ہوا پہلا سجدہ..... اس نے اس کے زخموں پر ایسا مرہم رکھا کہ چند ساعتوں کے لیے وہ بھول ہی گئی تھی کہ وہ کس دنیا میں ہے۔ یہی وہ وقت تھا جب فہد، رابعہ کی زندگی کے آسمان پر چمکنے والا مہتاب، اپنی ہستی میں اتر آنے والے اندھیروں سے گھبرایا ہوا، تر بتر چہرہ لیے اپنے رب کے حضور سجدہ ریز تھا۔

☆☆☆

رابعہ کے گھر سے چلے جانے کے بعد ارم نے ارسلان اور فہد کو تسلی تشفی میں لپٹی ہوئی ایسی باتیں کہیں جنہوں نے اس کی طرف سے رابعہ پر اچھالے جانے والے کیچڑ کو کیچڑ نہیں رہنے دیا تھا بلکہ صاف شفاف آئینہ بنا دیا تھا جس میں وہ رابعہ کا عکس ویسا ہی دیکھ رہے تھے جیسا وہ انہیں دکھانا چاہ رہی تھی۔

وقت اپنی مخصوص رفتار سے آگے بڑھنے لگا۔ خود کو معصوم اور شریف النفس ثابت کرنے کے لیے ارم گھر کی ذمے داریاں بطریق احسن پوری کرنے لگی تھی۔ روز ہانڈی بنتی، سب کو ان کے وقت پر تازہ روٹی ملتی، چاہے کوئی کھائے یا نہ کھائے۔ گھر کے باقی کام بھی بڑے اچھے طریقے سے ہو رہے تھے لیکن..... ارم کو اپنا سب عیش و آرام لٹتا دکھائی دینے لگا تھا۔ لیکن یہ سب کچھ اس کا اپنا کیا دھرا ہی تو تھا۔

دوسری طرف رابعہ نے اپنے پریشان کن خیالات کی بے پناہ اذیت سے جان چھڑانے کے لیے ایک قریبی پرائمری اسکول میں ٹیچنگ شروع کردی۔ یہ پارٹ ٹائم جاب اسے باجی آسیہ کے توسط سے ملی۔ آج پہلے دن وہ جاب سے واپس آئی تھی۔ زندگی بھی دریا کے مانند ہی ہوتی ہے۔ بہتی جاتی ہے۔ ہاں بس رستے بدل جاتے ہیں۔ منظر..... تبدیل ہوجاتے ہیں۔ گھر ترتیب دینے کے بعد ابھی بس وہ گرم گرم چائے کا ایک کپ لے کر صوفے پر بیٹھی ہی تھی کہ اس کے موبائل کی ریمائنڈر بیل بج اٹھی۔ آج..... شایان کا برتھ ڈے تھا۔ وہ کتنی ہی دیر موبائل فون ہاتھ میں لیے بیٹھی رہی اور اسے یاد آرہا تھا کہ آج رات کو ہی اس نے شایان کو خواب میں دیکھا تھا۔ اس نے دیکھا تھا کہ اس کے

ایک ہاتھ سے مسلسل خون بہہ رہا ہے اور وہ پاگلوں کی طرح دوپٹے کے پلو سے اسے روکنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس خواب نے تازہ ہو کر اس کے ذہن میں کھلبلی سی مچادی۔

''نجانے کیسا ہے میرا شایان۔ خدا کرے وہ بالکل ٹھیک ہو۔۔۔ پتا نہیں اپنی دوا باقاعدگی سے لے رہا ہے یا نہیں۔۔۔'' کچھ دیر ذہن اور دل کی لڑائی ہوئی۔ بہرحال وہ ایک ماں کا دل تھا جیت گیا۔ اس نے ہر اندیشے کو بالائے طاق رکھ کر شایان کو کال ملادی۔ تھوڑی دیر بیل جاتی رہی پھر فون اٹھایا گیا لیکن دوسری طرف سے جو آواز آئی اس نے ایک لمحے میں جیسے اس کے جسم کے سارے خون کو سر میں پہنچادیا۔

''ہیلو کون بول رہا ہے۔'' یہ آواز بلاشبہ ارم کی ہی تھی۔ رابعہ بھی جان گئی تھی کہ اس نے ارادتاً ہی اس کا فون ریسیو کیا تھا۔

''شایان سے بات کرنی ہے مجھے۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ طیش اور درد جیسے گلے میں گرہ باندھ رہا تھا۔

''اوہو! امی جان! یہ تو آپ ہیں۔ کیسی ہیں؟..... شایان ویسے ابھی ابھی چھت پر گیا ہے اکیلا ہی۔'' اس کا لہجہ بڑا کاٹ دار تھا جیسے وہ کچھ بتانا بھی چاہ رہی ہے اور چھپا بھی رہی ہے۔

''وہ ٹھیک تو ہے ناں..... میں نے بس یہ جاننا تھا کہ وہ اپنی دوا وقت پر لے رہا ہے؟'' رابعہ نے تڑپ کر استفسار کیا۔

''کیسے ٹھیک ہوسکتا ہے وہ امی جان۔ تنہائی پسند ہوگیا ہے وہ۔ اتنا بڑا دھچکا جو لگا ہے بے چارے کو۔ دو سال پرانا رشتہ ٹوٹ گیا ہے۔'' رابعہ کے سر پر جیسے بم آن کر گرا۔

''کیا..... پر کیسے..... میرا مطلب ہے.....'' رابعہ کو بوکھلاہٹ میں سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کیا کہے۔

''رہنے دیں امی جان سب پتا ہے آپ کو۔ کیسے اور کیوں؟ شایان کے ہونے والے سسرالیوں نے انگوٹھی واپس کردی ہے۔ جو آفت آپ کی وجہ سے اس گھر میں آئی ہے اس کی تباہ کاریوں کو ہم کہاں تک روک سکتے ہیں۔ جنگل میں آگ کی طرح پھیلتی ہیں ایسی باتیں.....'' وہ اندر کا زہر بلا دریغ رابعہ پر نکال رہی تھی۔

''خدا کا واسطہ ہے ارم۔ ایسا مت کرو۔ تم سب جانتی ہو۔ اس طوفان کو تم اپنی صاف گوئی سے ختم کرسکتی تھیں..... تم سب کو.....'' ارم نے رابعہ کی بات کاٹ ڈالی۔

''میں کچھ نہیں جانتی۔ مجھے اپنے ظاہر باطن کا نہیں پتا تو آپ کے ظاہر باطن کی کیا خبر ہوگی۔'' ارم نے ایک آگ میں بجھا تیر چھوڑا... جو سیدھا آکر اس کے دل پہ لگا۔ وہ مزید بولی۔

''مجھے بھی وہی کچھ پتا ہے جو باقی سب خاندان کے لوگ آپ کے بارے میں جان چکے ہیں۔''

''یہ کیا بکواس کر رہی ہو تم۔ کون کیا جان گیا ہے۔'' رابعہ نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔

''فہد انکل کے سختی سے منع کرنے کے باوجود یہ باتیں کیسے پھیل رہی ہیں۔ یقین کریں مجھے تو ''کچھ'' نہیں پتا.....'' آخری جملہ اس نے خاص لہجے میں کہا اور بولی۔

''مجھے تو بات کرتے ہوئے بھی شرم آتی ہے جو بدنامی کا داغ آپ نے لگایا ہے ہم اسے صاف تو نہیں کرسکتے، لیکن پھر بھی حالات سے نبرد آزما ہونے کی کوشش کر رہے ہیں اور ایک خبر اور ہے آپ کے لیے۔ آپ کے میاں آج کل زیادہ وقت گھر سے باہر ہی گزارتے ہیں۔ آپ کے دکھ میں نہیں بلکہ ایک سکون اور طمانیت ہے ان کے چہرے پر۔ معاف کردیں ہمیں بس۔'' اس کا انداز بڑا ہی جارحانہ تھا۔

رابعہ کتنی ہی دیر سر کو پکڑے صوفے پر بیٹھی رہی۔ اس کی چائے کا کپ سینٹر ٹیبل پر ہی پڑا رہ گیا اور وہ چپ چاپ اپنے بیڈ پر آکر لیٹ گئی۔ شام کو اسد گھر آیا تو اس نے دیکھا کہ اس کی ماں اپنے بستر پر بے سدھ پڑی ہے اور اس کا جسم تپا ہوا ہے۔ وہ واپس بائیک دوڑاتا ہوا قریبی میڈیکل اسٹور پر گیا اور دوا اور انسٹنٹ سوپ کا پیکٹ لے کر آیا۔ پہلے سوپ بنا کر اس نے رابعہ کو اپنے ہاتھوں سے پلایا اور پھر دوا کھلائی اور کمبل اوڑھا دیا۔ آج وہ دوسرے کمرے میں نہیں گیا بلکہ رابعہ کے پاس ہی صوفے پر لیٹ گیا۔ رابعہ نے اٹھ کر پانی پینا چاہا تو اسد نے خود اٹھ کر تپائی پر رکھے ہوئے جگ میں سے پانی گلاس میں ڈال کر رابعہ کے ہاتھوں میں تھمایا۔ اس نے اپنی ماں کی نحیف کلائیوں کو دیکھا جن پر چوڑیاں بڑی اور ڈھلکی ہوئی لگ رہی تھیں۔ یہی خوبصورت سفید کلائیاں تھیں جو کچھ عرصے پہلے گداز اور بھری بھری تھیں اور یہ چوڑیاں ان پر بالکل فٹ آتی تھیں۔ آج ماں کے ہاتھ دیکھے تو اسے لگا کہ ہاتھوں کی نسیں ابھری ہوئی اور ہڈیاں نمایاں ہو رہی ہیں۔ وہ کتنی ہی دیر اپنی ماں کے پاؤں میں سر رکھ کر روتا رہا۔

''ماں تو عظیم ہے۔ تو مقدس ہے، میرے لیے تو ایک آسمان سے اترے ہوئے صحیفے کی طرح پاک ہے اور سچی ہے۔ تیرے پارسا وجود کی گواہی میری رگوں میں دوڑتا ہوا

لیو بنا ہے ماں ..... میری ماں .....“

اللہ نے رابعہ کو اس گھر میں اسد کا سہارا دے دیا تھا۔ ورنہ تو اپنوں کی بے وفائیاں اور بے رخی اس کی جان ہی لے لیتی۔ شایان کا رشتہ ٹوٹ جانے پر وہ دونوں ملول ہوئے تھے لیکن اس سلسلے میں وہ کیا کر سکتے تھے‘روز وشب اپنی مخصوص رفتار سے گزر رہے تھے۔ شام کی چائے کے وقت تک اسد گھر آچکا ہوتا تھا۔ وہ دونوں اکٹھے بیٹھتے، ایک دوسرے کا درد بانٹتے، حوصلہ دیتے اور آنے والے وقت سے بہتری کی امید لگاتے۔ ان دونوں کے لیے ایک دوسرے کا سہارا، اس کڑی دھوپ میں گھنی چھاؤں بن گیا تھا۔ اسد اپنی ماں کی خاطر بڑھتے ہوئے ہر طوفان سے ٹکر لینے کے لیے تیار تھا۔ اس گھر میں ماں اور اولاد کے بے مثال رشتے کی ایک عظیم مثال قائم ہو رہی تھی۔ رابعہ کو لگنے لگا تھا جیسے وہ ہمیشہ سے اپنے بیٹے کے ساتھ اس گھر میں رہ رہی ہے۔ اس دوران اسد نے رابعہ سے اصرار کر کے اپنے کالج میں ہی ٹیچر اسسٹنٹ کی جاب شروع کردی۔ وہ ٹھیک وہی دن تھا جب اسد کو پہلی پے کے نام پر تھوڑی سی رقم ملی تھی۔ سردی اپنے پر پھیلا رہی تھی۔ سورج بھی جاڑے کی ایک مہین سی چادر اوڑھ چکا تھا۔

”مما! کھانا کھا کر فوراً ریڈی ہو جائیں۔ ہم باہر جارہے ہیں۔“ اسد نے اپنے پسندیدہ قیمہ کریلے کھاتے ہوئے کہا۔

”باہر کہاں بھئی۔“ رابعہ نے حیرت سے پوچھا۔

”مما! پہلی پے ملی ہے آج مجھے اور آپ کو ایک گرم شال لے کر دینی ہے مجھے۔“ اسد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ماشاءاللہ یہ تو بڑی اچھی بات ہے بیٹا..... مبارک ہو تمہیں۔ پر ایک دھیان رکھو‘ میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں۔ جاب کے چکر میں اپنی پڑھائی پر سمجھوتا نہ کرنا اور مجھے بہت خوشی ہے تمہاری زندگی کی اس پہلی کمائی کی۔“ رابعہ نے بھی مسکراتے ہوئے اور خوش کن احساسات لیے کہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اسد کے اصرار پر بادل ناخواستہ ایک شاپنگ سینٹر میں موجود تھی۔ آج شام بڑی خنک تھی۔ اکتوبر کی ہوا میں آتے ہوئے جاڑے کی خوشبو تھی اور جیسے جیسے شام کے سائے بڑھ رہے تھے ہر شے دھند کی لپیٹ میں آتی نظر آرہی تھی۔ شال خرید کر انہوں نے شاپنگ سینٹر کے اندر سے ہی ایک شاپ سے کافی لی اس کی چسکیاں لیتے ہوئے نیچے اترنے لگے۔ وہ ابھی ایگزٹ سے باہر ہی نکلے تھے کہ انہیں سیڑھیوں کے پاس اسی لڑکی کا بھائی نظر آیا جہاں شایان کی منگنی رہ چکی تھی۔ وہ اپنے ایک غیر مہذب دکھنے والے دوست کے ساتھ کھڑا تھا۔ ان کی انگلیوں میں سگریٹ کے شعلے جلتے دکھائی دے رہے تھے۔ اس لڑکے نے ہلکی سی سرگوشی میں اپنے ساتھی سے کچھ کہا۔ جیسے ہی وہ ان دونوں لڑکوں کو ”اگنور“ کر کے آگے بڑھنے لگے۔ اسی لڑکے نے کہا۔

”قسم سے یار قیامت کی نشانیاں ہی ہیں۔ بڑھے لوگ..... رنگین روحیں۔“ یہ جملہ اتنی آواز میں کہا گیا تھا کہ رابعہ کے ساتھ اسد نے بھی صاف سنا تھا۔ اسد چلتے چلتے رک گیا۔ اس کا دماغ جیسے بھک سے اڑ گیا تھا۔ تلوؤں کے نیچے جیسے کسی نے انگارے رکھ دیے ہوں۔ وہ کسی عقاب کی طرح اس لڑکے پر جھپٹا اس کا گریبان پکڑ کر اسے جھنجوڑا۔

”کیا بکواس کی ہے تو نے..... کس کو بول رہا ہے۔“ اس کے دوست نے درمیان میں پڑنے کی کوشش کی تو اس عدنان نامی لڑکے نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ وہ بڑے ڈھیٹ انداز سے کبھی اسد اور کبھی رابعہ کو دیکھ کر مسکرائے جا رہا تھا۔

”چھوڑو اسد! دفع کرو اسے..... ادھر آؤ۔“ رابعہ نے اسد کی قمیص پکڑ کر کھینچا اسے۔

”جا جا کے اپنی ماں کی بات سن..... عقل مند ہے وہ..... اسے پتا ہے کہ پہلے ہی کتنے بکھیڑے ہیں اس کی وجہ سے خاندان میں۔“ اس نے اسد کی کلائی مروڑتے ہوئے کہا اور پیچھے کی طرف دھکا دیا۔

”اپنی زبان کو لگام دے۔“ اسد غرایا۔

”لگام کی تو تم لوگوں کو ضرورت ہے۔ اپنے بزرگوں کو دینے کے لیے۔“ اب اسد کی برداشت سے سب باہر ہو چکا تھا۔ وہ کسی زخمی شیر کی طرح دہاڑا ایک ہاتھ سے اس کی کلائی مروڑی اور ایک زوردار مکے کی ضرب اس کی ناک کی ہڈی پر لگی۔ وہ درد سے کراہا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب اس کے دوست نے آ کر اسد کو اپنے بازوؤں کے کلاوے میں لے لیا۔ عدنان کی ناک سے خون بہہ کر..... ٹائلز پر قطروں کی صورت میں گرنے لگا۔ وہ قد کاٹھ میں اسد سے چھوٹا پر جسمانی طور پر گٹھا ہوا ایک بھرپور مرد تھا۔ اس نے چست جسامت والے اسد کو گھونسوں اور لاتوں پر رکھ لیا۔ رابعہ چلا چلا کر وہاں کے گارڈز کو ادھر متوجہ کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

اسد کی کہنی کی شدید ضرب اس لڑکے کی آنکھ پر پڑی جس نے پیچھے سے اسے اپنے شکنجے میں لے رکھا تھا۔ کچھ راہ

گیرانہیں زبانی کلامی روکنے کی بھی کوشش کررہے تھے۔ایک دولڑکے اس عدنان نامی لڑکے کو اسد سے دور ہٹانے لگے۔ بہرحال پولیس کے آنے سے پہلے وہ دونوں لڑکے اپنی موٹر بائیک پر بیٹھ کر گالیاں بکتے اور گندے جملے اچھالتے ہوئے وہاں سے دفع ہوگئے۔ اسد اب بھی اپنے پاؤں پر کھڑا تھا لیکن اس کی آنکھ کا بالائی حصہ اور ہونٹ بری طرح زخمی تھے۔ ہونٹ کے زخم سے خون ابل ابل کر اس کے ہلکی سی براؤن رنگ کی جرسی میں جذب ہورہا تھا اور رابعہ..... وہ اپنی چادر کے پلو سے دیوانوں کی طرح اس خون کو روکنے کی کوشش کررہی تھی۔ ایسا ہی خواب اس نے چند دن پہلے دیکھا تھا اور اب وہی خواب تھوڑے سے فرق کے ساتھ حقیقت کے روپ میں اس کے سامنے تھا۔ اسد کو اسپتال لے جایا گیا جہاں اسے اسٹیچز لگے اور مرہم پٹی ہوئی۔

☆☆☆

اسد کے زخم چند دنوں میں بھر گئے مگر دل کے زخم..... ایک دفعہ پھر پوری شدت سے رسنے لگے۔ ایک دن رابعہ جاب سے گھر آئی تو کچھ دیر بعد آسیہ آنٹی ان کے گھر آگئیں۔

''ابھی تھوڑی دیر پہلے تمہاری بہو ارم آئی تھی۔ وہ گھر کی بیل دے رہی تھی تو میں نے اسے دیکھ لیا۔ میں باہر سبزی خرید رہی تھی۔''

''کیا..... ارم آئی تھی.....؟'' رابعہ نے بے یقینی کی کیفیت میں کہا۔

''ہاں ہاں۔ وہ اپنی گاڑی پر تھی پھر میں نے اسے جا کر بتایا کہ تم اس وقت جاب پر ہوتی ہو۔ بڑی خوش مزاج ہے..... میں نے تھوڑی دیر اسے اپنے گھر بٹھایا، چائے وغیرہ پلائی۔ پھر وہ چلی گئی۔ کہہ رہی تھی کہ پھر کسی دن چکر لگائے گی تمہاری طرف۔'' اس نے ہلکے پھلکے انداز میں ساری بات اس کے گوش گزار کی۔ آسیہ آنٹی اور رابعہ میں اکثر واٹس ایپ پر اخلاقی اور سبق آموز ویڈیوز اور اقوال زریں وغیرہ کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔ بس پھر اس دن کے بعد سے آسیہ آنٹی کی طرف سے عورت کے فرائض اور اس سے متعلق اخلاقیات کے ایسے واٹس ایپ آنے لگے جس سے رابعہ کو یقین ہوگیا کہ ارم نے آسیہ آنٹی کو اصل بات اور اس کے گھر چھوڑ کر ادھر آنے کی وجہ سے آگاہ کردیا ہے۔ رابعہ تو اب جیسے سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

''ایسی باتیں جنگل میں آگ کی طرح پھیلتی ہیں۔'' رابعہ کو ارم کی یہ بات اچھی طرح یاد تھی اور اب اسے یہ بات بھی معلوم ہوگئی تھی کہ آگ لگانے والی اور پھیلانے والی ارم بذات خود ہے۔ لگتا یہی تھا کہ اس نے ڈھکے چھپے الفاظ میں آسیہ آنٹی کو بھی کافی کچھ بتادیا ہے۔ حالات کی تندخو اور بے رحم ہوائیں اپنی ضد نہیں چھوڑ رہی تھیں۔ اب رابعہ کے لیے اس شہر میں رہنا مشکل ہوگیا تھا جہاں اس کے اپنے بس رہے تھے۔ چند روز پہلے اسد کے زخمی ہونے والا واقعہ بھی کسی طور رابعہ کے ذہن سے نکلتا نہیں تھا۔

وہ اکثر سوچتی۔

''فہد! یہ تم نے کیا کیا۔ دنیا تو بے رحم تھی ہی پر تم کیسے بے وفا ہوگئے۔ میری زندگی کے بند دریچوں پر تم نے دستک دی۔ ٹھٹھری ہوئی تنہائیوں اور اندھیروں سے کھینچ کر مجھے مرغزاروں میں لے آئے۔ زندگی کی شاہراہ پر مجھے سینے سے لگا کر چلے۔ میرے سر پر اپنی محبت کا سایہ رکھا اور پھر..... ایک دن چپ چاپ خود ہی میرے پیروں کے نیچے سے زمین کھینچ لی۔'' اکیلے گھر میں اس کی سسکیاں گونج اٹھتیں۔

''فہد تم نے تو کبھی مجھے تنہا لڑنا سکھایا ہی نہیں۔ میں تو ہمیشہ تمہارے سائے میں چلتی رہی۔ میرے جسم میں تو تپش سہنے کی سکت ہی نہیں ہے فہد.....'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی۔

☆☆☆

دوپہر بارہ بجے کا وقت تھا۔ سورج کی تیز روشنی نے سیدھی جاتی چوڑی چکلی شاہراہ کو جیسے سونے کا وجود بنا رکھا تھا۔ ایک کوسٹر بڑی سبک رفتاری سے اپنی منزل کی طرف رواں تھی۔ اسی کوسٹر میں رابعہ اور اسد بھی تھے۔ رابعہ سیٹ کی بیک سے ٹیک لگائے کھڑکی سے دور ہرے بھرے کھلیانوں کو دیکھ رہی تھی۔ گندم کی کٹائی ہو رہی تھی۔ مرد و زن کھیتوں کھلیانوں میں جابجا پھیلے ہوئے تھے۔ اسد ایک انگریزی معلوماتی ڈائجسٹ کا مطالعہ کرنے میں مصروف تھا۔ رابعہ اس شہر سے اپنے تمام ناتے توڑ آئی تھی، نشان مٹا آئی تھی جس شہر میں اس نے فہد کی سنگت میں حقیقی معنوں میں چلنا سیکھا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کے ساتھ راولپنڈی جارہی تھی۔ اپنی والدہ کے گھر کو دوبارہ کرائے پر چڑھا کر اب وہ یہاں کرائے پر مناسب سا پورشن لینے والے تھے۔ سورج کی نرم گرم کرنیں اس کی متورم آنکھوں کو سکون بخش رہی تھیں۔ وہ آنکھیں، لمبی پلکوں کے بھار سے بوجھل آنکھیں، گھائل تھیں جیسے برسوں سے برس رہی ہوں۔

رات اور دن ایک دوسرے کا پیچھا کرتے رہے۔ سورج اور تارے آنکھ مچولی کھیلتے رہے اور اسی طرح دو برس بیت گئے۔ راولپنڈی کی ایک متوسط آبادی میں رابعہ نے

تین مرلے کا مکان کرائے پر لے لیا تھا۔ وہ لوگ اوپر والے پورشن میں تھے جبکہ نیچے والے پورشن میں مالکان رہائش پذیر تھے۔ لاہور والے گھر کا کرایہ بڑی خاموشی سے اسد کے ایک ہمراز دوست کے ذریعے راولپنڈی میں ان تک پہنچ جاتا تھا۔ اسد نے یہاں پرائیویٹ طور پر سیکنڈ ایئر کے ''اگیزامز'' دیے اور توقع سے بڑھ کر نمبر حاصل کیے۔ اسے اسلام آباد کی ایک انجینئرنگ یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا تھا اور اب وہ ..... دوسرے سال میں تھا اور یونیورسٹی میں ہی ٹیچر اسسٹنٹ کی جاب بھی کر رہا تھا۔ رابعہ نے خود کو وہاں کی ایک نجی ویمن این جی او سے منسلک کر دیا تھا۔ رابعہ اور اسد نے صرف لاہور سے ناتا نہیں توڑا تھا بلکہ ہر اس شخص سے ناتا توڑ لیا تھا جس کا تعلق کسی بھی طرح ان کے ماضی سے تھا۔ وہ ایک بالکل الگ تھلگ زندگی گزار رہے تھے۔

اسد اب بھی کبھی کبھی ہارے ہوئے شکستہ لہجے میں ماں سے کہتا کہ وہ گھر والوں کو اپنی صفائی کیوں نہیں دیتیں؟ کیوں حالات کے دھارے پر خود کو چھوڑ دیا ہے۔ پر وہ اس گرہ کو نہیں دیکھ سکتا تھا جو رابعہ کے دل پر لگ چکی تھی اور جسے وہ خود بھی نہیں کھول پاتی تھی۔

گرمی میں لوڈ شیڈنگ کی تنگی کی وجہ سے وہ کبھی کبھار اوپر چھت پر دو چار پائیاں ڈال لیتے تھے۔ ایسے میں رابعہ کبھی چودھویں کے چاند کو دیکھتی تو اسے یاد آتا کہ اس کے گھر چودھویں کا چاند اس کے کمرے کی کھڑکی سے سیدھا بیڈ پر نظر آتا تھا۔ وہ سوچتی شاید اس وقت فہد بھی تنہا بیڈ پر لیٹے کمرے کی کھڑکی سے اسی چاند کو دیکھ رہے ہوں یا شاید..... نہیں۔

وہ جس این جی او میں کام کرتی تھی اس کے وائس چیئرمین ... وسیم ریاض صاحب تھے۔ عمر پچاس سے اوپر ہی رہی ہوگی۔ ذرا فربہ جسم کے تھے۔ پیشانی سے بال اترے ہوئے تھے۔ ویسے خوش شکل تھے اور اچھا لباس پہنتے تھے۔ کبھی کبھار ہی این جی او کے دفتر میں نظر آتے تھے۔ وہ ایک معروف ڈریس ڈیزائنر بھی تھے۔ کافی روپیا پیسا تھا وسیم ریاض صاحب کے پاس۔

ایک روز وہ این جی او کے دفتر سے نکلی تو ابر آلود موسم ایک دم بارش کی شام میں بدل گیا۔ دفتر سے اس کا گھر زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ اکثر پیدل ہی چلی جاتی تھی۔ ایک طرح کی واک بھی ہو جاتی تھی، مگر اس شام وہ دیر تک شیڈ تلے کھڑی بارش رکنے کا یا کم ہونے کا انتظار کرتی رہی۔ اس دوران میں وسیم صاحب اپنی لمبی ہنڈا کار میں آفس سے نکلے۔ انہوں نے رابعہ کو یوں کھڑے دیکھا تو گاڑی اس کے پاس روک لی۔ کھڑکی کھول کر بولے۔ ''آیئے میں آپ کو ڈراپ کر دیتا ہوں۔''

''نہیں سر! بارش شاید کم ہو رہی ہے۔ میں چلی جاؤں گی۔''

''کم نہیں ہو رہی، زیادہ ہو رہی ہے، آپ آ جائیں۔'' انہوں نے شائستگی سے کہا۔

اسی دوران میں بجلی بھی چلی گئی۔ اردگرد اندھیرا پھیل گیا۔ رابعہ کو یہ آفر قبول کرنا ہی مناسب لگا۔ وسیم صاحب نے اگلا دروازہ کھول دیا تھا۔ وہ شکریہ ادا کرتی ہوئی اور جھجکتی ہوئی بیٹھ گئی۔

''آپ کا نام رابعہ ہے ناں شاید؟''

''جی ہاں۔''

''آپ کو شاید آپ کے بھائی لینے آتے ہیں؟'' وسیم صاحب نے ڈرائیو کرتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں سر! وہ میرا چھوٹا بیٹا ہے۔ ماشاءاللہ انجینئرنگ کر رہا ہے۔''

انہوں نے ذرا تعجب سے رابعہ کی طرف دیکھا۔ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہے ہوں اتنی زیادہ عمر کی تو نہیں لگتی ہو۔

''اور آپ کے ہسبینڈ؟'' انہوں نے پوچھا۔

''وہ بیرون ملک ہیں۔ سس..... سعودیہ، وہاں جاب کرتے ہیں۔''

رابعہ کے مختصر جواب نے شاید وسیم صاحب کو سمجھا دیا تھا کہ وہ زیادہ بات کرنا نہیں چاہتی۔ کچھ دیر بوجھل خاموشی طاری، پھر وہ بولے۔ ''معاف کرنا رابعہ! آپ پر ایک ذاتی سا تبصرہ کرنے لگا ہوں۔ آپ کو پتا ہے آپ نے یہ براؤن اور سیاہ کمبی نیشن والا جو سوٹ پہن رکھا ہے یہ میری ہی فرم کا ڈیزائن کردہ ہے۔''

وہ چونک کر بولی۔ ''واقعی؟''

''آپ اس پر لیبل دیکھ لیجیے گا۔ وسیم انٹر پرائز لکھا ہوگا..... اور مجھے خوشی ہے کہ یہ آپ پر جچ رہا ہے.....''

انہوں نے ایک بار پھر اسے دھیان سے دیکھا۔

وہ جیسے اپنے آپ میں سمٹ سی گئی۔ اس کو آخری فقرہ کچھ اچھا نہیں لگا تھا، مگر ردعمل ظاہر کرنا بھی مناسب نہیں تھا۔ وہ پی گئی..... راستے میں وسیم صاحب نے دو چار اور باتیں بھی کیں جن سے رابعہ کے کام اور شخصیت کی توصیف کا پہلو نکلتا تھا۔ رابعہ وائس چیئرمین صاحب کے حوالے سے کوئی اچھا تاثر لے کر گاڑی سے نہیں اتری۔

سپاٹ لہجے میں خدا حافظ کہہ کر وہ گھر کی طرف بڑھ

گئی۔ اس نے شکر کیا کہ ایسے شخص کا مزید سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ درحقیقت اس ''این جی او'' میں اس کے یہ آخری تین چار روز تھے۔ وہ پہلے ہی ایک اور زیادہ بہتر ''این جی او'' سے منسلک ہونے کا فیصلہ کر چکی تھی (پہلے کی طرح اس کی یہ نئی مصروفیت بھی بغیر کسی معاوضے کے تھی)

ابھی اسد گھر نہیں پہنچا تھا۔ آج اسے دیر سے آنا تھا۔ رابعہ کا موڈ اس ''لفٹ'' کی وجہ سے خراب ہو رہا تھا جو اس نے خوامخواہ لے لی تھی۔ وسیم ریاض کا وہ فقرہ بار بار اس کے کانوں میں چبھ رہا تھا..... یہ براؤن اور بلیک کمبی نیشن بہت جچا ہے آپ پر۔

شادی کے بعد اپنے حوالے سے اسے صرف اور صرف ایک شخص کی تعریف پسند آتی تھی اور وہ تھا اس کا شریک حیات فہد۔ اس کی سماعت کو کبھی یہ گوارا نہیں ہوا تھا کہ کوئی اور..... خاص طور سے کوئی غیر مرد اس کے لیے توصیفی کلمات کہے۔ اس کو لگا کہ اس فقرے کی طرح یہ بلیک براؤن لباس بھی اسے بری طرح چبھ رہا ہے۔ وہ اسے فوراً بدل لینے کے ارادے سے کمرے میں گھسی، لیکن تب ایک دم ٹھٹک گئی۔ وہیں ایک صوفے پر بیٹھ کر سوچنے لگی۔ اس کے جسم پر بلیک اور براؤن امتزاج والے کپڑے فہد کو بھی تو بہت اچھے لگتے تھے۔ وہ جب کبھی یہ کمبی نیشن پہنتی تھی وہ خصوصی تعریف کیا کرتے تھے۔ اس نے ایک نئی نظر سے اپنے لباس کو دیکھا اور کھوئے کھوئے انداز میں دوپٹے اور قمیص کے گھیرے پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

دل کا موسم ایک دم اور ہو گیا تھا۔ اس نے شال اتاری۔ ہولے ہولے چلتی قد آدم آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ میک اپ کے بغیر بھی اس کے رخساروں پر ہلکی سرخی تھی۔ وہ عمر کے لحاظ سے 45 کے ہندسے کو چھونے والی تھی مگر ایسا لگتا نہیں تھا..... اس نے اپنے کس کر باندھے ہوئے جوڑے کو کھولا، لمبے گھنے بال اس کے شانوں سے نیچے تک چلے گئے اور اس کے رخساروں کو ڈھانپ لیا۔ اس نے انہیں ڈھیلے ڈھالے انداز میں ربر بینڈ سے باندھا اور اپنے بائیں شانے سے آگے کی طرف گرا لیا..... ہاں، یہی انداز تھا ناں جو فہد کو بہت اچھا لگتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔

کہاں ہو فہد..... کیوں اتنی دور چلے گئے ہو؟ کیا یہیں تک تھا ہمارا ساتھ۔ کیا اتنی جلدی چھوڑ جانا تھا؟ بس یہی طاقت تھی ہمارے پیار کی؟ چند لفظوں کے ریلے میں بہہ گیا..... پھر اس کی نگاہوں کے سامنے ارم کا چہرہ آیا۔ کرب کی شدت سے دل کی رگیں ٹوٹنے لگیں۔ اس کی کوئی بیٹی نہیں تھی۔ اس نے ارم کو بیٹی بنانا چاہا تھا اور بیٹی نے کیا کیا..... ایسے موقعوں پر اسے لگتا تھا کہ اس کے اندر سے ارم کے لیے کوئی بددعا نکل جائے گی۔ وہ جلدی سے اپنی سوچوں کا رخ پھیر لیتی تھی۔ دھیان کسی اور طرف لگا کر خود کو نارمل کر لیتی تھی۔ وہ ہمیشہ سے ایسی ہی تھی۔ سمندر کی طرح گہرا سینہ رکھنے والی۔ طوفانوں کو اپنے اندر چھپا لینے والی۔ اس نے کھڑکی تھوڑی سی کھولی۔ ہوا کے مدھم جھونکے اس کے چہرے کو چھونے لگے۔ گھنے بال لہرا سے گئے۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں بولی۔ ''دیکھو فہد! وہی اکتوبر نومبر کے دن ہیں۔ وہی قندھاری اناروں والا موسم۔ وہی ہلکی سرد ہوا اور رم جھم، سب کچھ وہی ہے لیکن تم نہیں ہو..... کیا یاد ہے..... کبھی سرگوشی کے انداز میں کسی کو پیار سے ''قندھاری'' کہا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے..... تمہاری محبت پر ایمان ہے.....''

وہ ہولے ہولے چلتی الماری کی طرف گئی۔ ایک دراز کا لاک کھولا۔ کچھ کاغذات کے نیچے رکھی ہوئی ایک فریم شدہ تصویر نکالی۔ یہ فہد کی تصویر تھی۔ گھر چھوڑتے وقت اس نے یہ تصویر ہی تو اہتمام سے اپنے سامان میں رکھی تھی..... وہ اسی لباس میں بستر پر لیٹ گئی۔ فریم شدہ تصویر اس کے سینے پر تھی۔ اس نے کسی کو اپنے بہت قریب محسوس کیا..... بہت قریب۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ گرم پانی اس کی آنکھوں سے نکل کر نیم سرخ رخساروں پر رینگنے لگا۔

☆☆☆

اس دن نیا مہینا شروع ہوئے چار پانچ دن ہو گئے تھے اور راشن کی بیشتر چیزیں ختم ہو گئی تھیں۔ آج شام انہیں لازمی سپر اسٹور جانا تھا۔ رابعہ بس اسد کے گھر آنے کا انتظار کر رہی تھی اور اسد کے آتے ہی وہ دونوں خریداری کے لیے نکل پڑے۔ وہ سپر اسٹور جس علاقے میں تھا وہ خاصا گنجان کمرشل ایریا بنتا جا رہا تھا۔ پارکنگ میں وہاں بمشکل ہی جگہ ملتی تھی۔ اس لیے اسد نے گاڑی سپر اسٹور سے کچھ فاصلے پر کھڑی کی اور وہ پیدل دکانوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے سپر اسٹور کی جانب بڑھنے لگے۔ ابھی انہوں نے تھوڑا سا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ انہیں کچھ فاصلے پر عجیب سی ہلچل کا احساس ہوا اور پھر یہی ہلچل دیکھتے دیکھتے چیخ و پکار میں بدل گئی۔ پینٹ شرٹ میں ملبوس ایک فربہ اندام شخص نے ایک دبلی پتلی سی برقع پوش لڑکی کو بازو سے پکڑ رکھا تھا۔ چند افراد ان کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ ایک بندوق بردار گارڈ نے انہیں روک کر پوچھا کہ کیا معاملہ ہے۔ اس

عورت کو کہاں لے کر جا رہے ہو۔

''چور ہے یہ خان صاحب۔ رنگے ہاتھوں پکڑی گئی ہے۔ دروازہ کھول کر میری گاڑی میں گھسی ہوئی تھی۔ اندر سے کچھ نکالنا چاہتی تھی۔ آج کل ایسی عورتوں کا پورا گروہ وارداتیں کرتا پھر رہا ہے۔''

''چھوڑ دو مجھے..... چور نہیں ہوں میں..... چھوڑو۔''

وہ عورت حد درجے سہمی ہوئی اور بوکھلائی ہوئی تھی۔ خوف کے مارے جیسے اس سے سانس نہیں لیا جا رہا تھا۔

''چل..... اب تو تھانے جا کر اپنی صفائی پیش کرنا۔'' اس شخص نے اسے اس جھٹکے سے کھینچا کہ اس کے چہرے کا نقاب سرک گیا اور پھر جو کچھ رابعہ اور اسد نے دیکھا اس نے چند ثانیے کے لیے ان دونوں کو اپنی اپنی جگہ منجمد کر دیا۔ وہ ششدر نگاہوں سے دیکھتے چلے گئے۔

وہ اور کوئی نہیں..... ارم ہی تھی۔ رابعہ فوراً پہچان گئی تھی۔ آج ایک لمبے عرصے بعد وہ چہرہ اچانک سامنے آ گیا تھا۔ اس چہرے سے جڑی یادیں کچھ ایسی تھیں کہ اس کے نقوش رابعہ کے ذہن میں دھندلائے نہیں تھے۔

اسی لمحے وہ شخص ارم کو گھسیٹتا ہوا تھانے کی طرف بڑھنے لگا۔

''اسد..... ارم۔'' رابعہ نے کٹے پھٹے، بے یقینی میں غرق لہجے میں کہا۔

''مما..... وہ..... وہ ارم بھابی ہی تھیں؟'' اسد بھی جیسے ابھی تک شاک سے نہیں نکلا تھا۔

''ہاں اسد..... چلو۔'' رابعہ نے اسد کا ہاتھ پکڑا اور اس شخص کے پیچھے لپکی جو ارم کو کھینچتا ہوا لے جا رہا تھا۔

''بھائی صاحب..... رکیں۔'' رابعہ پکاری۔ اس شخص نے پلٹ کر ان دونوں کی طرف دیکھا اور پھر رک گیا۔

''جی کیا بات ہے؟'' اس شخص کا پارہ چڑھا ہوا تھا۔ اسد غصے سے آگے بڑھا اور ارم کا ہاتھ اس شخص کی گرفت سے ایک جھٹکے سے چھڑایا۔ ''ہوش میں ہو تم..... یہ بہن ہے ہماری۔'' ارم بے یقینی کی کیفیت میں اسد اور رابعہ کو دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں میں دہشت کے سائے ماند پڑنے لگے اور ان کی جگہ یکدم امڈ آنے والے آنسوؤں اور ہچکیوں نے لے لی۔ رابعہ نے فوراً آگے بڑھ کر ارم کو اپنے ساتھ لگا لیا۔

پانچ دس منٹ میں اسد اور رابعہ نے بات چیت کر کے معاملے کو رفع دفع کیا۔ ارم نے بھی سرسری انداز میں بتایا کہ کچھ اوباش قسم کے لڑکے اس کا پیچھا کر رہے تھے۔ ان سے گھبرا کر اور بوکھلاہٹ میں اس نے گاڑی میں پناہ لینا چاہی تھی۔ اس وقت ادھر ایک اور شخص آ گیا۔ وہ خوانچہ فروش تھا۔ ''یہ لی بی بھاگتے ہوئے میرے پاپ کارن کے ٹھیلے سے ٹکرا گئی تھی اور سارا ٹھیلا الٹ گیا تھا۔'' وہ فریادی لہجے میں بولا ایک اور بندے نے بھی تائید کی۔

''بڑا نقصان ہوا ہے میرا جی۔ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ روٹی سالن نہیں پورا ہوتا۔'' اس نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ لوگوں کا ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا تھا۔ اسد نے اپنا والٹ نکالا اور کچھ رقم خوانچہ فروش کی طرف اچھالی اور ارم اور رابعہ کو اپنے بازو کے گھیرے میں لیے جلدی سے وہاں سے نکل گیا۔ راشن کی خریداری کینسل کر کے وہ ارم کو لے کر فوراً گھر آ گئے۔ ارم کی انگلی کا ایک ناخن بری طرح ٹوٹا ہوا تھا اور خون نکل کر اس کی ہتھیلی پر جما ہوا تھا۔ پاؤں میں بھی موچ آئی ہوئی تھی جس کی وجہ سے اسے چلنا مشکل ہو رہا تھا۔

گھر آ کر فوراً رابعہ نے گرم دودھ میں ہلدی ڈال کر ارم کو پلایا، بینڈج اور مرہم پٹی انہوں نے رستے میں ہی لے لی تھی۔ ارم نے رابعہ اور اسد کو بھی یہی بتایا کہ مارکیٹ میں اچانک کچھ لڑکے اس کا پیچھا کرنے اور دھمکیاں دینے لگے تھے۔ ان کے پاس اسلحہ بھی تھا۔ بس اسی دوران گھبرا کر اس نے گاڑی میں پناہ لینا چاہی تھی۔ رابعہ نے اسے کریدنا اور مزید استفسار کرنا مناسب نہ سمجھا تھا۔ وہ اس کی مرہم پٹی کرنے لگی تھی البتہ اسد اور رابعہ از حد حیران تھے کہ لاہور سے اتنی دور ارم سے... اچانک ملاقات کیسے ہو گئی؟ وہ اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتے تھے لیکن وہ بے حد گم صم تھی۔ اس کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کچھ بھی نہیں بتائے گی۔ شام کے سائے بڑھ رہے تھے اور وہ جلد از جلد گھر جانا چاہتی تھی۔ وہ یہاں راولپنڈی میں اپنے ماموں کے ہاں آئی ہوئی تھی۔ وہ بس اتنا ہی بتا پائی تھی اور ان دونوں کے سامنے آنکھیں اٹھا نہیں پا رہی تھی۔ پہلے سے کافی کمزور ہو چکی تھی۔ چہرے کی رعنائی بالکل ماند پڑ چکی تھی۔

''ارم بھابی ہم چھوڑ آتے ہیں آپ کو۔'' اسد نے کہا۔ رابعہ نے بھی تائید کی۔

''نہیں اسد۔ بہت شکریہ۔ مجھے بس رکشا لا دو۔ میں چلی جاؤں گی۔'' انہوں نے زیادہ اصرار کرنا مناسب نہ سمجھا اور اسد جا کر ایک رکشا لے آیا۔ ارم کی آنکھوں میں نمی تھی اور چہرے سے اندازہ ہوتا تھا کہ کوئی جنگ چل رہی ہے اس کے اندر۔ رابعہ اور اسد اسے دروازے تک چھوڑنے آئے۔ اس نے دروازے کی دہلیز پار کی پھر پلٹ کر رابعہ کی طرف دیکھا۔ وہ ایسا ہی وقت تھا جب کسی اپنے کو سامنے

پا کر دکھوں پر باندھے ہوئے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ جاتے ہیں۔ وہ بھی انا کی دیواریں توڑ کے گلے لگ کر ہچکیوں کے ساتھ رونے لگی۔ رابعہ نے بڑی مشکل سے اسے سنبھالا وہ تو جیسے زمین میں گڑی جا رہی تھی۔ پھر یکدم جیسے سب کچھ اس کی برداشت سے باہر ہو گیا۔ وہ بلک پڑی۔

''امی مجھے معاف کر دیں۔'' وہ یہ جملہ بار بار بولنے لگی۔ اس دن ارم نے پہلی مرتبہ رابعہ کو امی کہا اور یہی وہ لفظ تھا جسے وہ کبھی اس کے منہ سے سننے کے لیے ترستی تھی۔ اسد بھی حیرت کی تصویر بنے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ رابعہ ارم کو واپس اندر لے آئی۔ بیڈ پر لٹا کر اسے کمبل اوڑھایا۔ کچھ دیر بعد طبیعت سنبھلنے پر ارم نے جو روداد سنائی، وہ بہت حیران کن اور سنسنی خیز تھی..... ''رابعہ کے گھر سے چلے جانے کے بعد سب کچھ منتشر ہو کر رہ گیا تھا۔ شروع شروع میں ارم نے بڑی کوشش کی کہ گھر کی باگ ڈور سنبھالے۔ پر اسے جلد احساس ہو گیا کہ یہ اس اکیلی کے بس کا کام نہیں۔ فہد تو جیسے سب سے کٹ گئے تھے۔ کھانا گھر پر کھاتے نہ کسی سے زیادہ بات چیت کرتے تھے۔ شایان بھی چپ رہتا تھا اور اکثر چھپ چھپ کر روتا تھا۔ رابعہ کے چلے جانے کا فہد کے بعد جس نے سب سے زیادہ اثر لیا وہ ارسلان تھا۔ وہ چند مہینے شدید ڈپریشن کا شکار رہا۔ پھر علاج وغیرہ کرانے پر آہستہ آہستہ اس کی روٹین کی زندگی دوبارہ شروع ہوئی۔ اس کی پہلی جاب چھوٹ گئی تھی اور اب جہاں جاب ملی تھی وہاں اکثر اسے نائٹ ڈیوٹی کرنا ہوتی تھی۔ پورے گھر پر جیسے اس عرصے میں اداسی اور ویرانیوں کے بادل چھائے رہے تھے۔ ارم کے پہلے جیسے آرام اور عیش و عشرت ختم ہو گئے تھے۔ وہ بس گھر تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ ارسلان کا اکھڑا رویہ اس کی تنہائی میں اضافہ کرتا تھا، اس کا تو جیسے ہر چیز سے دل اٹھ گیا تھا۔ اگر اسے کسی کا خیال تھا تو وہ ننھا عارب تھا یا پھر فہد۔ اپنے باپ کی گرتی ہوئی صحت اور تنہائی دیکھ کر وہ پریشان رہتا تھا۔ ارم نے اس دوران رابعہ سے رابطہ کرنے کی کوشش بھی کی۔ اس کے گھر تک آئی، پر ملاقات نہیں ہو پائی اور پھر پتا چلا کہ وہ اسد کے ساتھ کہیں اور چلی گئی ہیں۔ ارم کی زندگی میں اس کے اپنے ہاتھوں سے کھودا ہوا یہ گڑھا کم نہ تھا کہ مصیبت کا ایک اور پہاڑ اس پر ٹوٹ پڑا۔

شرجیل اس کی یونیورسٹی کے زمانے کا دوست کہیں سے اچانک اس کی زندگی میں مصیبتوں کا اضافہ کرنے آ گیا تھا۔ اس نے ارم کو کہیں بازار وغیرہ میں دیکھ لیا تھا اور اب پورے ایک سال سے وہ اسے مسلسل بلیک میل کر رہا تھا۔ یونیورسٹی کے زمانے میں ان کی دوستی تھی اور پھر یہ دوستی اتنی بڑھی کہ بات منگنی تک پہنچ گئی۔ دونوں فیملیز آپس میں ملی تھیں اور اس سے پہلے کہ ارم کے والدین خاندانی لیول پر اس متوقع رشتے کے بارے میں انکشاف کرتے، کسی خیر خواہ نے شرجیل نامی اس لڑکے کے بارے میں کچھ ایسی باتیں ثبوت کے ساتھ بتائیں کہ ارم اور اس کے گھر والوں نے پیچھے ہٹنے میں دیر نہیں کی۔

ارم اور شرجیل کی کچھ تصویریں تھیں جو ان دونوں نے کسی وقت نہایت بے تکلف اور رومینٹک موڈ میں بنائی

آئیڈیا

گاہک دکاندار سے۔ ''گھی کے جس کنستر سے مرے ہوئے چوہے نکلے ہیں، وہ گھی آپ نے ضائع کیا کہ نہیں؟''

دکاندار۔ ''جناب! اس گھی کو میرا ملازم گرم کر رہا ہے۔''

گاہک۔ ''اس سے کیا فائدہ ہوگا؟''

دکاندار۔ ''جناب! گھی گرم ہوگا تو چوہے کے مردہ جسم کے جرثومے گرمی سے ختم ہو جائیں گے۔ گھی قابلِ استعمال ہو جائے گا۔ کیوں کیسا آئیڈیا ہے؟''

مجبوری

جج (ملزم سے)۔ ''کیا یہ سچ ہے کہ تم نے مدعی کے مکان کے کمرے کی پچھلی دیوار توڑ کر چوری کی ہے۔''

ملزم۔ ''جناب! یہ واقعی سچ ہے کہ میں نے (سینہ مار کے) دیوار توڑ کر چوری کی ہے۔''

جج۔ ''تم نے ایسا کیوں کیا؟''

ملزم۔ ''جناب! اپنی بدنصیبی کی وجہ سے میں نے یہ غلط قدم اٹھایا ہے۔ میں مجبور تھا۔''

جج۔ ''کس قسم کی بدنصیبی نے تمہیں یہ قدم اٹھانے پر مجبور کیا؟''

ملزم۔ ''جناب جج صاحب! کئی لوگ ایسے خوش نصیب ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو چھپر پھاڑ کے رزق دیتا ہے۔ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ چھپر پھاڑ کے رزق نہیں دیتا، میں ان بدنصیب لوگوں میں شامل ہوں اس لیے دیواریں پھاڑ کر محنت سے میں اپنا رزق حاصل کرتا ہوں۔''

(مرسلہ: بشیر احمد بھٹی، بہاولپور)

تھیں۔ اب چار سال بعد یہی شرجیل نامی لڑکا ان تصویروں اور وڈیو کلپس کے ساتھ اس کی زندگی میں آن دھمکا تھا اور اس کی زندگی اجیرن کرنا شروع کردی تھی۔ اس کے کرتوتوں کی وجہ سے اس کے گھر والے اس سے ناتا توڑ چکے تھے اور اب اسے پیسوں کی ضرورت تھی۔ مختصر یہ کہ پچھلے ایک سال میں وہ ان تصویروں کے زور پر ارم سے تھوڑی تھوڑی کرکے بہت سی رقم اینٹھ چکا تھا۔ وہ پس وپیش سے کام لیتی تو وہ تصویریں نیٹ پر وائرل کرنے کی دھمکی دیتا تھا۔ ارسلان اس ساری صورت حال سے قطعی بے خبر تھا۔ قریباً چھ سات ماہ پہلے شرجیل نے ارم سے اپنا رابطہ اچانک منقطع کردیا۔ اس کا فون نمبر بند ہوگیا اور اس کا کوئی نیا مطالبہ بھی سامنے نہیں آیا۔ ارم کو امید سی ہوگئی کہ شاید اب یہ بلا ٹل گئی ہے لیکن ڈھائی تین ماہ پہلے یہ خوش فہمی دور ہوگئی۔ شرجیل نے پھر بذریعہ فون ارم کے کانوں میں زہر گھولنا شروع کردیا۔ اس مرتبہ اس نے ارم سے ایک بڑی رقم کا مطالبہ کیا۔ وہ پندرہ لاکھ روپے مانگ رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اپنا کاروبار کرکے شریفانہ زندگی شروع کرنا چاہتا ہے۔ اس نے اس موقع پر اپنی مری ہوئی ماں کی قسم کھائی اور کہا کہ اگر ارم مطلوبہ رقم کا انتظام کردے تو وہ اس کی تصویروں اور کلپس والی یو ایس بی پوری دیانتداری سے اس کے حوالے کردے گا اور اس حوالے سے اسے زندگی بھر کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔

شرجیل اسی ڈیل کے لیے لاہور آنا چاہتا تھا مگر ارم نے اسے راولپنڈی ہی میں رکنے کا کہا۔ وہ کئی دن سخت عذاب میں رہنے کے بعد ایک آخری فیصلے پر پہنچ چکی تھی۔ اس نے اپنی شادی کے زیور خاموشی سے بیچنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اس نے شرجیل کو بتایا کہ چند روز بعد وہ راولپنڈی میں اپنے ماموں کے گھر آئے گی اور چھ سات روز وہاں رہے گی۔ اسی دوران میں وہ اس سے ملے گی۔ اسے نقد رقم دے کر اپنی تصویریں وغیرہ حاصل کرلے گی۔ دونوں کے درمیان یہ معاملہ بارہ لاکھ میں طے ہوا۔ پروگرام کے مطابق چار روز پہلے ارم اپنے چار سالہ عارب اور دو سالہ عامر کے ساتھ لاہور سے پنڈی پہنچی تھی۔ نقد رقم اس کے پاس موجود تھی۔ آج صبح اس کے اور شرجیل کے درمیان ملاقات کا وقت اور مقام طے ہوا تھا۔ یہ بڑے پوسٹ آفس کے قریب ایک رہائشی فلیٹ تھا۔ آج چار بجے کے قریب ارم وہاں پہنچی۔ شرجیل سے ملاقات ہوئی۔ سب کچھ ٹھیک جارہا تھا لیکن اس سے پہلے کہ ارم ''یو ایس بی'' حاصل کرکے رقم شرجیل کو تھماتی، دروازے پر ناک ہوئی۔ شرجیل نے دروازہ کھولا۔ دو لڑکے اسے تقریباً دھکیلتے ہوئے اندر داخل ہوگئے۔ یہ اس کے وہی دوست تھے جن کا یہ فلیٹ تھا۔ ان کی نیت بدل گئی تھی۔ ایک لڑکے نے للچائی نظروں سے ارم کو دیکھا اور کہا کہ ہمیں نہیں پتا تھا کہ یہ لڑکی اتنی ونڈرفل ہوگی۔ اس پر تو سب کچھ قربان کرنے کو دل چاہتا ہے۔ دوسرے لڑکے نے لوفرانداز میں شرجیل سے کہا۔ ''اسے یو ایس بی دے دو اور ساتھ پیسے بھی رہنے دو اس کے پاس۔ بس اسے راضی کرلو کہ تھوڑا وقت ہمارے ساتھ گزار لے۔''

شرجیل نے کہا کہ وہ اپنی مری ماں کی قسم کھا بیٹھا ہے۔ اپنے دوستوں سے اس کا جھگڑا ہوگیا۔ ایک لڑکے نے پھرتی سے ارم کا رقم والا شولڈر بیگ ارم کے کندھے سے کھینچ لیا۔ وہ جان بچانے کے لیے کھڑکی سے کود کر کوریڈور میں آگئی۔ شرجیل دونوں لڑکوں سے گتھم گتھا تھا۔ اسی دوران میں اس نے یو ایس بی کھڑکی سے باہر کوریڈور میں پھینک دی۔ ارم یو ایس بی اٹھا کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ بلڈنگ کا یہ فلور تقریباً بے آباد ہی تھا۔ وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے بازار میں آئی۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ کم از کم ایک لڑکا اس کے پیچھے ہے۔ وہ اس سے بچنے کے لیے ایک بغلی سڑک میں گھس گئی۔ ایک لڑکا واقعی اس کے پیچھے تھا۔ وہ ٹریفک کے درمیان سے راستہ بناتا تیزی سے قریب آرہا تھا۔ ارم جان بچانے کے لیے ایک گلی میں گھسی۔ اسے سامنے ہی ایک گاڑی کھڑی دکھائی دی۔ کچھ اور نہیں سوجھا تو اس نے گاڑی کے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا۔ دروازہ کھلا تھا۔ وہ گاڑی میں چھپ کر بیٹھ گئی۔ صورت حال مسلسل پلٹے کھا رہی تھی..... وہ تعاقب کرنے والے لڑکے سے تو بچ گئی مگر ذرا ہی دیر بعد گاڑی کا مالک وہاں پہنچ گیا۔ اس نے ''چور چور'' کی صدا لگا دی۔ بدحواسی میں ارم نے دوسری جانب والا دروازہ کھولا اور ایک بار پھر بھاگ نکلی..... تاہم کچھ آگے جاکر پکڑی گئی۔

ارم کی روداد ختم ہوئی تو اس کے رخسار آنسوؤں سے تر تھے۔ رابعہ کی اپنی آنکھوں میں بھی بار بار آنسوؤں کی نمی نظر آئی تھی۔ آخر میں ارم سسک کر بولی۔ ''امی جان! یہ سب کچھ میرے کرموں کا پھل ہے۔ پلیز مجھے کہنے دیں کہ پچھلے ایک سال میں جو جو کچھ میرے ساتھ ہوا ہے، وہ اسی لیے ہوا ہے کہ میں نے بدلہ لینے کے لیے..... آپ کے پاک صاف دامن پر کیچڑ اچھالا۔ آپ کو اذیت پہنچائی۔ آپ کو آپ کی اولاد کے سامنے شرمندہ کیا، آپ کو میری وجہ سے دربدر ہونا پڑا.....'' وہ ہچکیوں سے رونے لگی۔ روتے

روتے بلند آواز میں بولی۔ ''میں نے سوچ لیا ہے امی جان، میں اپنے گناہ کا کفارہ ادا کروں گی۔ میں اور تلافی بھی کروں گی۔ میں..... میں آج ہی سب کو حقیقت بتاؤں گی۔ اپنے جرم کا اعتراف بھی کروں گی اور اپنے لیے سزا بھی طلب کروں گی.....'' وہ بس روتی جارہی تھی اور بولتی جارہی تھی۔

رابعہ نے ارم سے وہ منحوس یو ایس بی لے لی۔ اسے توڑ کر بیکار کیا وہ پرزے پرزے ہوگئی تو اسے واش روم میں جاکر فلیش میں بہادیا۔ جب وہ واپس ڈرائنگ روم میں پہنچی تو غیر متوقع طور پر ارم وہاں سے جاچکی تھی..... اسد نماز پڑھ رہا تھا اور وہ بھی اسے جاتے ہوئے نہیں دیکھ سکا تھا۔ وہ دونوں سٹپٹا کر رہ گئے تھے۔

☆☆☆

ارم راولپنڈی سے واپس لاہور آچکی تھی۔ اس نے بہت کوشش کرکے خود پر ضبط کررکھا تھا اور خود کو نارمل ظاہر کر رہی تھی..... مگر اندر تو ایک طوفان برپا تھا۔ پچھلے 20 گھنٹوں میں اس کے ساتھ جو کچھ ہوا، بس وہی جانتی تھی۔ اسے وہ سارے واقعات ایک ڈراؤنے خیال کی طرح لگ رہے تھے۔

اس کے ساتھ ساتھ اس کے ذہن میں ابھی تک یہ اندیشہ بھی موجود تھا کہ وہاں شرجیل کی طرف پتا نہیں، کیا صورت حاصل ہوئی ہوگی۔ ارم کو تنہا اور بے بس دیکھ کر ان لڑکوں کی آنکھوں میں شیطانیت چمکی تھی۔ شرجیل ان سے جھگڑ پڑا تھا۔ ارم کو یہ خدشہ بھی تھا کہ ان کی لڑائی نے سنگین صورت اختیار نہ کرلی ہو اور بات پولیس وغیرہ تک نہ پہنچ گئی ہو مگر آج شام تک اس حوالے سے اسے اخبار، ٹی وی یا کسی اور ذریعے سے کوئی ایسی ''بدخبر'' نہیں ملی اور اس کے اندیشے کافی حد تک کم ہوگئے۔

ارسلان کو آفس میں کام تھا اور اسے آج رات بارہ ایک بجے کے بعد آنا تھا اور یہ ایک طرح سے اچھا ہی تھا۔ اس دوران میں ارم خود کو سنبھالنے اور کوئی حتمی فیصلہ کرنے میں کامیاب ہوسکتی تھی۔ بچوں کو سلا کر وہ بے قرار سی، کمرے میں ٹہلنے لگی اور سوچنے لگی۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ کل کے اس ایک واقعے نے اس کے اندر انا، نفرت اور دشمنی کے سارے بت مسمار کرکے رکھ دیے ہیں۔ اپنی ساس کا ملول و متفکر چہرہ بار بار اس کی نگاہوں میں گھومتا تھا۔ اس نے کتنی نفرت کی تھی اس چہرے سے..... کتنی حدوں کو پھلانگ گئی تھی اپنی کدورت میں۔ اس نفرت اور کدورت کی بنیاد کیا تھی؟ شاید اس کی بنیاد وہی ایک تھپڑ تھا جو اس کے گال پر پڑا تھا۔

ان کی اس ایک خطا کے بدلے میں ارم نے انہیں ایک طویل سزا کے حوالے کیے رکھا تھا مگر..... مگر انہوں نے کل ارم کو ان برے حالوں میں دیکھ کر جو رویہ اپنایا تھا اور جو اپنا پن دکھایا تھا وہ یقیناً بت شکن ہی تھا۔ اس نے ارم کی ہستی کو تہ و بالا کردیا تھا۔

کل، ان کے کہے ہوئے الفاظ ارم کے کانوں میں گونجنے لگے۔ ''نہیں ارم! تم نے گھر میں شرجیل کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتانا۔ میری اللہ سے دعا ہے اور مجھے یہ لگتا بھی ہے کہ یہ معاملہ شاید یہیں پر ختم ہوجائے۔ ارسلان بہت سمجھ دار اور بردبار ہے لیکن..... لیکن پھر بھی ایک مرد ہے ارم! وہ بہت محبت کرتا ہے تم سے..... اور محبت جتنی زیادہ ہوتی ہے اتنی ہی جلدی شک کی زد میں بھی آجاتی ہے۔'' انہوں نے عجیب لہجے میں کہا تھا۔

ارم بولی تھی۔ ''لیکن امی..... میں اب اور جھوٹ بولنا نہیں چاہتی، کسی معاملے میں بھی نہیں۔''

''خاموش رہنا جھوٹ نہیں ہوتا۔'' انہوں نے کہا تھا۔ ''تم اس معاملے میں بس خاموشی اختیار کرو۔ میرا اللہ سوہنا تمہارا پردہ رکھے گا۔ تم سب کچھ ذہن سے نکال دو۔ یوں سمجھو کہ آج یہاں کچھ ہوا ہی نہیں۔ نہ تم شرجیل سے ملی، نہ لڑکوں سے واسطہ پڑا، نہ تم نے مجھے دیکھا، نہ اسد کو۔ کچھ بھی نہیں ہوا۔''

پھر انہوں نے اس سے وہ یو ایس بی لی تھی جس میں ارم کے ماضی کی چھوٹی چھوٹی غلطیاں محفوظ تھیں۔ وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی تھیں۔ شاید کچن میں..... وہ اس یو ایس بی کو ضائع کررہی تھیں۔ یہی لمحے تھے جب ارم نے تیزی کے ساتھ فیصلہ کیا تھا اور اس گھر سے نکل آئی تھی۔ شاید اس نے ٹھیک ہی کیا تھا۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ ساس (جنہیں اس نے کبھی دل سے امی نہیں کہا تھا) اسے مجبور کردیں گی۔ اس کو کسی وعدے یا قسم کی زنجیر میں جکڑ دیں گی اور یہ وعدہ یہی ہوگا کہ وہ گھر میں جاکر ان کے بارے میں اور اسد کے بارے میں مکمل خاموشی اختیار کرلے..... اور اس کے ساتھ ساتھ آج کے اس سنگین واقعے کو بھی سینے میں دفن کرلے۔

ارسلان گھر آیا تو ارم اپنے خیالات کے بھنور سے نکلی۔ رات کے دو بج چکے تھے۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ ارسلان ٹھٹکا ہوا تو صبح سے تھا، اب ارم کی یہ حالت دیکھ کر بالکل ہی ڈسٹرب ہوگیا۔ وہ سمجھ گیا کہ وہ جو یوں آناً فاناً راولپنڈی سے واپس چلی آئی ہے تو کوئی اہم اور

براواقعہ رونما ہو چکا ہے۔

اس نے بریف کیس ایک طرف پھینکا اور ارم کو اپنے بازو میں لے کر صوفے پر آبیٹھا۔ ''ارم! میرا اور اپنا وقت ضائع نہ کرنا۔ تمہیں پتا ہے کہ میں اصل بات جانے بغیر رہوں گا نہیں۔ جو کچھ بھی ہے مجھے صاف صاف بتاؤ۔''

اس نے چہرہ اپنے ہاتھوں میں چھپایا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ''برداشت کرلو گے؟..... نہیں کرسکو گے برداشت۔''

ارسلان کا رنگ زرد ہوگیا۔ وہ کچھ دیر خاموشی سے ارم کو گھورتا رہا پھر بولا۔ ''تم بتاؤ، میں کروں گا برداشت۔''

اور پھر واقعی اس نے سب کچھ ارسلان کو بتادیا۔ وہ بھی جو ماضی میں ہوا تھا اور وہ بھی جو وہ پچھلے ایک برس سے چپکے چپکے بھگت رہی تھی..... اور پھر وہ بھی جو کل راولپنڈی میں ہوا تھا اور جس کے ڈانڈے.... اتفاقاً ارسلان کی والدہ اور چھوٹے بھائی سے جا ملے تھے۔ ارم کے طویل بیان میں یہ دلدوز اعتراف بھی شامل تھا کہ تین برس پہلے اس نے اپنی ماں جیسی ساس پر جو سنگین الزام لگایا وہ بے بنیاد تھا اور مکمل طور پر ''پلان'' کیا ہوا تھا۔

یہ ساری روداد کم وبیش ایک گھنٹے پر مشتمل تھی۔ اس دوران میں دھواں دھواں چہرے والے ارسلان نے ارم سے کئی سوال بھی کیے تھے۔ ارم کے اس اعترافی بیان کے دوران میں ارسلان کے چہرے پر کئی رنگ گزرے۔ جس آخری رنگ نے ارسلان کے چہرے کو ڈھانپا اور اس پر ٹھہر گیا، وہ بے انتہا دکھ اور سخت ترین طیش کا رنگ تھا۔ اس کی آنکھوں سے آتشیں آنسو ٹپک رہے تھے۔ اس نے ایک ہاتھ ارم کے سر کے پیچھے رکھا اور دوسرے ہاتھ کے ساتھ جنونی انداز میں اس کا منہ دبالیا۔ انداز ایسا ہی تھا کہ جیسے اسے دم گھونٹ کر مار دینا چاہتا ہو۔ وہ اس کے سر کو وحشت میں آگے پیچھے جھلاتا ہوا بولا۔ ''تو طلاق کے قابل بھی نہیں..... تو قتل کے قابل ہے۔ تیری جان لے لینی چاہیے، اس جگہ مار دینا چاہیے تجھے۔''

پھر اسے چھوڑ کر وہ الماری کی دراز کی طرف بڑھا، اس میں سے لوڈڈ پستول نکال لیا اور ارم کے سر پر رکھ دیا۔ ارم نے آنکھیں بند کرلیں۔ خود کو جیسے مکمل طور پر ارسلان کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا۔ ''میں اسی قابل ہوں ارسلان! مجھے مار دیں..... اگر معاف نہیں کرسکتے تو مار دیں..... میں آپ کو اپنا خون معاف کرتی ہوں..... مار دیں۔''

ارسلان نے پستول دونوں ہاتھوں میں تھام رکھا تھا..... غیظ وغضب انتہا کو تھا۔ لیکن کچھ بھی تھا، وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو کسی کو قتل کرسکتے ہیں۔ اس کا جسم لرزتا چلا جارہا تھا۔ اسی دوران میں دروازہ دھماکے سے کھلا..... اس کے والد فہد اور دیگر اہل خانہ لپکتے ہوئے اندر آگئے۔

☆☆☆

ارم کے جانے کے بعد رابعہ ایک دم پریشان ہوگئی تھی۔ ایک عجیب سی بے کلی تھی جو اس کے سینے میں بھرتی چلی جارہی تھی۔ وہ اسد سے مخاطب ہوکر بولی۔ ''اسد! اب کیا ہوگا۔ ہماری یہ رہائش اب کسی سے چھپی نہیں رہ سکے گی۔''

''میرے خیال میں ہمیں ارم بھابی کو یہاں گھر میں لانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ کہیں اور لے جاتے..... کسی ریسٹورنٹ میں یا پارک وغیرہ میں۔'' اسد نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔

''لیکن اسد! وہ اتنی ایمرجنسی والی صورت حال تھی کہ ذہن نے کام ہی نہیں کیا۔''

اسد نے ایک طویل سانس لے کر صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی اور ماں کو ریلیکس کرنے کے لیے ذرا ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔ ''اب تو ایک ہی حل ہے۔ ہم گھر کو تالا لگا کر کچھ دنوں کے لیے نتھیا گلی یا ایبٹ آباد وغیرہ چلے جائیں اور اس دوران میں کوئی دوسرا گھر ڈھونڈ لیں۔''

''اسد! یہ بہت سنجیدہ بات ہے۔ میں اب ان لوگوں میں سے کسی کا سامنا کرنا نہیں چاہتی۔ تم کیا جانو، ان دو تین برسوں میں میں نے کتنی مشکلوں سے خود کو سنبھالا ہے۔''

اسد بھی سنجیدہ ہوگیا۔ حقیقت یہی تھی کہ اب وہ بھی ماضی کی طرف پلٹنا نہیں چاہتا تھا۔ جو کچھ اس کے گھر والوں نے اس کی والدہ کے ساتھ کیا تھا، وہ ساری زندگی فراموش نہیں کرسکتا تھا۔ وہ معافی بھی مانگ لیتے تو یہ معافی اس دکھ کی تلافی ہرگز نہیں تھی جو گزرے ماہ وسال میں اسے اور اس کی لاچار ماں کو جھیلنا پڑے تھے۔ وہ سنجیدگی سے یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ کیوں نہ کچھ دنوں کے لیے وہ اپنی ماں کو لے کر کہیں اوجھل ہوجائے۔ دوسری طرف رابعہ بھی بالکل اسی انداز میں سوچ رہی تھی.....

لیکن اگلے روز شام کے وقت جو کچھ ہوا وہ اتنا آناً فاناً تھا کہ ان کی ساری پلاننگ دھری کی دھری رہ گئی۔ اسد آفس سے گھر آیا ہی تھا۔ رابعہ اس کے لیے چائے بنا رہی تھی۔ گھر کے سامنے کسی گاڑی کے رکنے کی آواز آئی۔ رابعہ نے بغلی کھڑکی کے سامنے جاکر دیکھا۔ گاڑی پر لاہور کا نمبر تھا۔ یہ ہنڈا سٹی تھی، پھر اسی میں سے کچھ لوگ باہر نکلے۔ رابعہ کا سینہ

دھک سے رہ گیا۔ سب سے پہلے اس کی نظر فہد پر ہی پڑی۔ اس کے بالوں میں سفیدی کافی بڑھ چکی تھی۔ وہ پہلے سے کمزور نظر آرہا تھا۔ وہ جھکا سا گاڑی سے نکلا۔ اس کے عقب میں ارسلان تھا، اس کے عقب میں شایان پھر ارم اور اس کے دونوں بچے نظر آئے۔

چند سیکنڈ بعد ڈور بیل بجنا شروع ہوگئی۔ رابعہ کا یہ حال تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ وہ جیسے چاہ رہی تھی کہ زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے۔ وہ تو کل تک یہاں سے اوجھل ہونے کا سوچ رہی تھی اور آج ایک دم وہ سب اس کے سامنے آگئے تھے۔ اس نے اسد کو پکارنا چاہا مگر اس کی آواز گلے میں گھٹ کر رہ گئی۔

☆☆☆

وہ بڑی ہیجان خیز رات تھی۔ وہ ایک صوفے پر بیٹھی تھی۔ ارسلان اور شایان قالین پر تھے۔ ان دونوں نے ماں کے پاؤں پکڑ رکھے تھے۔ رو رو کر ان کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ کچھ ایسی ہی کیفیت فہد کی بھی تھی۔ وہ ایک طرف صوفے پر سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔ ندامت آمیز پچھتاوا اس کے چہرے پر درج تھا۔

ارسلان نے ماں کے پاؤں پر آنسو گراتے ہوئے کہا۔ ”پلیز امی جان! ایک بار دل سے معاف کردیں۔“

رابعہ نے اپنا پاؤں سمیٹنے کی ناکام کوشش کی اور بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اشک بار لہجے میں بولی۔

”میرے بچو! میں نے معاف کیا..... میرے خدا نے معاف کیا۔ میرے دل میں کوئی گلہ نہیں۔ تم یہ کیوں بھول رہے ہو، میں ماں ہوں، میں اپنے دل میں تمہارے لیے کوئی گلہ رکھ ہی نہیں سکتی۔“

شایان نے ماں کا گھٹنا تھامتے ہوئے کہا۔ ”تو پھر آپ ہمارے ساتھ جانے سے انکار کیوں کررہی ہیں۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ آپ دل سے معاف نہیں کررہیں۔“

”نہیں شانی! اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ میں تھوڑا وقت چاہتی ہوں۔ اپنے دل کو ٹھکانے پر لانا چاہتی ہوں۔“

ارم بھی رابعہ کے قدموں کے پاس قالین پر بیٹھ گئی۔ اس نے رابعہ کا پایاں گھٹنا تھام کر اس پر اپنا سر رکھا اور ہچکیوں سے روتی چلی گئی۔ ”امی! میری غلطی بہت بڑی ہے..... اور جتنی بڑی ہے اتنی ہی شرمناک بھی ہے۔ میں سوچتی ہوں تو اپنے آپ میں غرق ہوجاتی ہوں..... پتا نہیں اس وقت کیا ہوگیا تھا مجھے جو آپ جیسے محترم رشتے پر اتنا بڑا الزام لگا دیا میں نے..... کاش اسی وقت موت آگئی ہوتی مجھے..... یا آپ میں سے کسی نے مجھے..... میں اب بھی ہر سخت سے سخت سزا کے لیے تیار ہوں۔“ وہ بچوں کی طرح بلک رہی تھی۔

رابعہ کا سانس جیسے اس کے سینے میں رکنے لگا تھا، اس نے ارم کے سر پر بھی ہاتھ پھیرا۔ اسی دوران میں دروازہ تیزی سے کھلا اور اسد کا لال بھبھو کا چہرہ دکھائی دیا۔ اس کی آنکھوں میں آتشیں آنسو تھے۔ وہ پرتپش لہجے میں بولا۔

”میں آپ سب کے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ مجھے اور میری ماں کو ہمارے حال پر چھوڑ دیں۔ آپ نے جو کچھ کرنا تھا وہ کرچکے ہیں۔ اب وہ سب کچھ واپس نہیں ہوسکتا..... لیکن اب کم از کم ان کو زندہ تو رہنے دیں، میں آپ کی منت کرتا ہوں، ابھی آپ لوگ چلے جائیں یہاں سے۔“

ارسلان اٹھ کر اپنے چھوٹے بھائی کی طرف گیا۔ اس کو اپنی بانہوں کے کلاوے میں لے کر..... اور اس کا سر چومتا ہوا اسے کمرے سے باہر لے گیا۔

کمرے میں کچھ دیر نہایت گمبھیر خاموشی طاری رہی، پھر فہد نے ٹھہرے ہوئے بوجھل لہجے میں کہا تھا۔

”شایان..... ارم..... تم لوگ بھی باہر جاؤ۔“

وہ دونوں خاموشی سے باہر نکل گئے۔ ارم جاتے جاتے دروازہ بھیڑ گئی تھی۔ فہد اپنی جگہ سے اٹھا اور تین نشستوں والے صوفے پر رابعہ کے قریب جا بیٹھا۔ وہ کچھ دیر جھجکتا رہا پھر اس نے اپنا ہاتھ رابعہ کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

”رابعہ! غلطی بہت بڑی ہے..... بلکہ غلطی بھی کیا گناہ ہے لیکن رابعہ! خدا بھی تو اپنے گناہ گار ترین بندوں کو معاف کردیتا ہے۔ ہم سب مل کر تمہارے دکھ کو اور تمہارے ہر اس احساس کو بانٹ لیں گے جو تمہیں تکلیف پہنچاتا ہے۔ یہ سب کچھ ہمارا ہی دیا ہوا ہے۔ ہم ہی تمہیں اس سے دور کریں گے۔“

وہ فہد کی طرف دیکھے بغیر بولی۔ ”پلیز فہد! میں نے آپ کی ساری باتیں سن لی ہیں لیکن میری درخواست یہی ہے کہ مجھے تنہا چھوڑ دیں۔ آپ میرے سامنے رہیں گے تو میں اپنے ہی آپ میں مرتی چلی جاؤں گی۔ آپ..... آپ سب مجھے کچھ وقت دیں۔“

اس نے اپنا ہاتھ فہد کے ہاتھ کے نیچے سے سرکایا۔ فہد نے دوبارہ اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا، ذرا ڈھیلے لہجے میں بولا۔ ”رابعہ وقت کی ضرورت تو ہمیں بھی تھی۔ کاش تین سال پہلے تم تھوڑا سا وقت ہمیں بھی دے دیتیں..... تاکہ ہم اپنی غلطی کو محسوس کرسکتے، اس پر تہ دل سے شرمندہ ہوسکتے لیکن

تم تو ایک دم سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر نکل گئیں۔ کچھ بتایا تک نہیں کہ کیا گزر رہی ہے تم پر۔''

وہ سسک اٹھی۔ ''میں نے بتانے کی بہت کوشش کی تھی فہد! اس رات میں بڑی دیر تک آپ کے کمرے کے بند دروازے کے سامنے بیٹھ کر روتی رہی تھی۔ اس دروازے پر دستک دے دے کر میرے ہاتھ زخمی ہو گئے تھے فہد! میرے ناخنوں سے خون بہہ نکلا تھا۔ پر آپ نے اپنے کان بند کر لیے تھے اور کان ہی بند نہیں کیے تھے فہد! مجھے روتا چھوڑ کر وہاں سے چلے بھی گئے تھے۔ اس رات میری سمجھ میں اچھی طرح آ گیا تھا کہ میں دھتکاری پھٹکاری جا چکی ہوں۔ اب میری آہ و بکا کسی کے کانوں تک نہیں پہنچ سکے گی۔''

فہد نے اپنے لرزتے ہاتھ سے رابعہ کے داہنے ہاتھ کو سہلایا۔ جیسے تین سال پہلے کے ان زخموں پر مرہم رکھنا چاہتا ہو۔

وہ دیر تک رابعہ کو منانے کی کوشش کرتا رہا۔ یہ کوشش کرتا رہا کہ وہ اپنا جھکا ہوا سر اٹھائے لیکن وہ تو شاید اپنی ہی نظروں میں گر چکی تھی اور جو اپنی نظروں میں گر چکا ہو اسے اٹھانا بہت مشکل ہوتا ہے۔

☆☆☆

فہد اور دیگر اہلِ خانہ لاہور واپس جا چکے تھے۔ رابعہ نے انہیں معاف تو کر دیا تھا مگر اب وہ ان کے ساتھ جانے کے لیے اور دوبارہ ان در و دیوار کو دیکھنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ وقتِ رخصت فہد اور ارسلان نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ وہ اس گھر کو کرائے پر چڑھا کر شہر کے کسی دوسرے علاقے میں کسی دوسرے گھر میں شفٹ ہو جائیں گے اور بعد ازاں وہ گھر فروخت ہی کر دیں گے۔

رابعہ کے روز و شب ایک شدید قسم کی الجھن میں گزرنے لگے۔ وہ اپنے پیاروں کے دل توڑنا نہیں چاہتی تھی لیکن دوسری طرف جو داغ اس کے کردار پر لگ چکا تھا وہ بھی آسانی سے مٹنے والا نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی عورت کی ذات شیشے کی طرح ہوتی ہے۔ ٹوٹنے کے بعد اس شیشے کو کتنی بھی صفائی سے جوڑا جائے لکیر باقی رہتی ہے۔

گاہے بگاہے دونوں بیٹوں اور ارم کی طرف سے فون بھی آ رہے تھے مگر فہد کی طرف سے بس ایک بار ہی فون آیا تھا۔ اسد کا خیال تو اب بھی یہی تھا کہ اس کی ماں اپنے ماضی سے الگ رہے گی تو سکھی رہے گی اور صحت مند بھی رہے گی۔

ایک روز اسد شام کو دیر سے گھر آیا۔ اس نے رابعہ کو بتایا۔ ''اسلام آباد میں ایک فلیٹ دیکھا ہے میں نے..... امی جان کرایہ بھی مناسب ہے اور میرے آفس سے زیادہ دور بھی نہیں ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ کل جا کر آپ بھی دیکھ لیں۔''

رابعہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسد کو کیا جواب دے لیکن آخر اس نے ہامی بھر لی۔

اگلے روز اسد آفس سے سہ پہر کو ہی واپس آ گیا۔ وہ رابعہ کو فلیٹ دکھانے لے جا رہا تھا۔ ابھی وہ تیار ہی ہو رہے تھے کہ ارم کا فون آ گیا۔ رابعہ کا حال احوال پوچھنے کے بعد اس نے ذرا آزردہ لہجے میں کہا۔ ''امی جان! آپ سوچتی تو ہوں گی کہ ہم آپ کو بار بار فون کر رہے ہیں..... لیکن پاپا نے آپ کو دوبارہ فون نہیں کیا۔''

وہ بری طرح چونک گئی۔ ''ہاں..... میں..... سوچ تو رہی تھی۔ ویسے وہ..... خیریت سے تو ہیں ناں؟'' رابعہ نے بوکھلائی آواز میں کہا۔

''نہیں امی جان۔'' وہ گمبھیر آواز میں بولی۔ ''ان کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ ایک دن تو بے ہوش ہی رہے۔ کندھے اور جبڑے پر سخت چوٹ آئی ہے۔ ٹھیک سے بولا بھی نہیں جاتا۔ ارسلان آپ کو فون کرنا چاہ رہے تھے لیکن منع کر دیا۔ کہہ رہے تھے کہ پریشان ہوں گی۔''

رابعہ گم صم سنتی رہی۔ آخر میں ارم بولی۔ ''امی جان! انہیں آپ کی ضرورت ہے بہت زیادہ ضرورت ہے۔ وہ اندر سے بری طرح ٹوٹے ہوئے ہیں۔ انہیں آپ ہی جوڑ سکتی ہیں..... پلیز آپ آ جائیں۔ اب تو ارسلان اور شایان نے لاہور سے باہر رہائشی اسکیم میں بنا بنایا گھر بھی لے لیا ہے۔ اگلے ہفتے چابیاں ملنے والی ہیں.....''

وہ رقت آمیز آواز میں بولتی رہی اور رابعہ کو اپنی رائے بدلنے پر آمادہ کرتی رہی۔

رابعہ کا چار سالہ پوتا عارب بھی کہیں پاس ہی موجود تھا۔ گاہے بگاہے اس کے بولنے کی آواز رابعہ کے کانوں میں پڑ رہی تھی۔ ارم نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ''یہ لیں امی! اپنے پوتے سے بات کریں۔ یہ بھی آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔''

ارم نے ریسیور عارب کو تھمایا۔ اس نے زیادہ کچھ نہیں کہا اور جو کچھ کہا شاید اس کا مفہوم بھی اسے ٹھیک سے معلوم نہیں تھا۔ توتلی زبان میں السلام علیکم کہنے کے بعد اس نے بس ایک ہی فقرہ بولا۔ ''دادو! آپ آ جائیں..... ہم چھپ کو ماپ کر دیں۔''

رابعہ کو یوں لگا جیسے اس معصوم کا یہ ایک فقرہ ہزار ہا فقروں اور دلیلوں پر بھاری ہے۔ اس نے فون بند کر کے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ آنسو تواتر سے اس کی جھولی

میں گر رہے تھے۔ اتنے میں اسد بائیک کی چابی لے کر آ گیا۔ ''چلیں امی؟'' اس نے کمرے کے دروازے پر کھڑے ہو کر پوچھا۔

رابعہ نے اپنا آنسوؤں سے بھیگا ہوا چہرہ اٹھایا۔ اپنے ریشمی بالوں کی لٹوں کو کانوں کے پیچھے اڑسا اور ٹھہری ہوئی آواز میں بولی۔ ''نہیں اسد! ہم فلیٹ دیکھنے نہیں جا رہے۔ ہم..... لاہور جا رہے ہیں۔''

☆☆☆

زندگی بڑی عجیب و غریب چیز ہے۔ ہر قسم کے حالات میں آگے چلتی ہی رہتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے واقعات بھی انسان کی زندگی میں بڑی بڑی تبدیلیاں لے آتے ہیں..... اور ارم کے ساتھ ہونے والا واقعہ تو بہت بڑا تھا۔ اس نے اس کی زندگی اور سوچوں کو بالکل بدل کر رکھ دیا تھا۔ وہ کیا سے کیا ہو گئی تھی..... اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ وہ بہو سے بیٹی بن گئی تھی۔ بے حد پیار کرنے والی اور خیال رکھنے والی بیٹی۔ رابعہ کو یوں لگا کہ تین بیٹوں کے بعد بالآخر اس کی بیٹی کی خواہش بھی پوری ہو گئی ہے۔

دو ہفتے اسپتال میں رہنے کے بعد فہد بھی گھر آ چکے تھے..... اور وہ اسی نئے گھر میں واپس آئے تھے جو خوبصورت رہائشی اسکیم میں حال ہی میں خریدا گیا تھا۔ زندگی بہتے ہوئے پانی کی طرح اپنے راستے ڈھونڈنے لگی۔ شروع شروع میں رابعہ اپنے محبوب شوہر سے ایک عجیب طرح کا کھچاؤ محسوس کرتی رہی۔ وہ ایک ہی بیڈروم میں ہوتے ہوئے ایک دوسرے سے بہت دور ہوتے تھے۔ ایک ہی روش پر چہل قدمی کرتے ہوئے ان کے درمیان جیسے کئی قدموں کا فاصلہ ہوتا تھا..... لیکن پھر دھیرے دھیرے فہد کی محبت اس کی بھرپور توجہ اور غمگساری نے رابعہ کو بدلنا شروع کر دیا۔ وہ اپنے لباس اور حلیے پر توجہ دینے لگی۔ اس کی خوبصورت سڈول کلائیوں میں پھر سے خوش رنگ چوڑیاں جھلک دکھانے لگیں۔ بالوں سے جھلکنے والی تھوڑی سی سفیدی میں مہندی کا رنگ نظر آنے لگا۔ ان دونوں کو لگا کہ وہ سب کچھ لوٹ رہا ہے جو کھو گیا تھا۔ وہ ایک دوسرے کی بانہوں میں کھونا، وہ میٹھی سرگوشیاں وہ دلنشیں قربت۔ یہی رابعہ کی گمشدہ جنت تھی۔ جو تھوڑی بہت کسر رہ گئی تھی وہ ان دو ننھے فرشتوں نے پوری کر دی جو اس کے پوتے تھے اور اس کے اردگرد منڈلاتے رہتے تھے۔ ہاں..... زندگی واقعی بڑی عجیب چیز ہے۔ بہتے پانی کی طرح ہر قسم کی..... بڑ زمین پر اپنی راہیں ڈھونڈ لیتی ہے۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا تھا، ماضی کے دیے ہوئے زخم بھرتے گئے۔ شایان کی شادی ہوئی پھر اسد کی شادی ہوئی..... پھر ان کے بچے..... بچوں کی شرارتیں، ان کی سالگرہیں، ان کے تفریحی سفر..... شب و روز میں رنگ بکھرنے لگے۔ چھوٹے چھوٹے غم اور چھوٹی چھوٹی خوشیاں تو زندگی کا حصہ ہوتی ہی ہیں تاہم آنے والے ماہ و سال میں اللہ کریم نے انہیں کسی بھی بڑی پریشانی سے بچائے رکھا۔ لاہور میں ان کے جو ایک دو قریبی رشتے دار تھے وہ بیرون ملک شفٹ ہو چکے تھے۔ دور کے رشتے داروں سے انہوں نے اپنا میل جول ویسے ہی بہت کم کر لیا تھا..... یوں وہ بتدریج اپنے ماضی کی تلخ یادوں سے دور ہٹتے چلے گئے تھے۔ برسوں پہلے رابعہ پر بہتان لگنے کا جو واقعہ ہوا تھا اس میں ایک کردار عمر کا بھی تھا۔ وہ بھی اس واقعے کے حوالے سے شدید اذیت کا شکار رہا تھا۔ تاہم جب ارم نے خدا کو حاضر و ناظر جان کر خود رابعہ کی مکمل صفائی پیش کی تھی تو عمر نے بھی خود کو ہلکا پھلکا محسوس کیا تھا۔ وہ اب اپنی فیملی کے ساتھ مستقل طور پر مدینہ منورہ شفٹ ہو چکا تھا اور سرتاپا مذہبی رنگ میں ڈھل چکا تھا۔ فہد کو ریٹائر ہوئے دو تین سال ہی ہوئے تھے جب فہد اور رابعہ کے بڑے بیٹے ارسلان کو اٹلی میں کمپیوٹر پروگرامنگ کی ایک نہایت اعلیٰ جاب مل گئی۔ وہ فہد اور رابعہ کی اجازت سے اٹلی منتقل ہو گیا۔ اسد بھی ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں بڑی اچھی جاب کرنے لگا۔ یوں گھر میں خوشحالی کی ایک نئی لہر آ گئی اور فہد اور رابعہ کے لیے بھی زندگی پہلے سے زیادہ آسودہ ہو گئی۔ انہی دنوں رابعہ اور فہد نے اپنا وہ دیرینہ سپنا پورا کیا تھا جس نے نوجوانی سے لے کر ادھیڑ عمری تک انہیں اپنے سحر میں جکڑے رکھا تھا۔ ارسلان نے انہیں اٹلی بلایا تھا اور انہوں نے ارسلان کے ساتھ یورپ کا ایک بھرپور دورہ کیا تھا..... ان دنوں ''ساٹھ اور پچپن سال کی عمر میں بھی'' وہ دونوں خود کو ایک بار پھر جوان محسوس کرنے لگے تھے۔

یکایک ساتھ والے کمرے سے فہد کے کھانسنے کی آواز آئی اور رابعہ اپنے ماضی کے طویل سفر سے نکل کر اپنے حال میں واپس آ گئی۔ الیکٹرک آتش دان کے مسلسل آن رہنے سے دو کمروں کے اس ''سوئٹ'' کا ٹمپریچر کچھ بڑھ چکا تھا۔ اس نے آتش دان کا ''تھرماسٹیٹ'' نچلے درجے پر ایڈجسٹ کیا اور تیزی سے اٹھ کر فہد والے کمرے میں پہنچی فہد کی سانسیں کافی بوجھل تھیں۔ اسے دیکھتے ہی رابعہ سمجھ گئی کہ اسے ''ان ہیلر'' کی ضرورت ہے۔ لائٹ آن کر کے اس

نے فہد کو تکیے کے سہارے بٹھایا اور ان ہیلر دیا۔

''اگر ضرورت ہے تو ڈاکٹر کو بلا لیتی ہوں۔ وہ دو منٹ میں پہنچ جائے گا۔'' رابعہ نے فہد سے پوچھا۔

''نہیں مجھے لگتا ہے کہ ایسے ہی ٹھیک ہو جائے گا۔'' فہد نے کہا۔

فہد کا اندازہ درست تھا۔ چند منٹ بعد اس کے سانس کی آمد و رفت بہتر ہو گئی۔ رابعہ نے اسے ڈاکٹر کی تجویز کردہ سکون بخش گولی دی..... کچھ ہی دیر بعد وہ پھر سو گیا۔ اس کے چہرے پر سکون تھا۔ رابعہ محویت سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے اپنا جھریوں بھرا ہاتھ اٹھایا اور شوہر کے سفید..... بالوں میں انگلیاں چلائیں..... ذرا سی تلاش کے بعد اسے پرانے زخم کا وہ نشان دوبارہ نظر آنے لگا جس نے کل شام ایک مدت کے بعد اسے اپنی جھلک دکھائی تھی..... اور اسے یادوں کے ایک طویل سفر پر روانہ کیا تھا.....

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ اس نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر دیکھا، ہوٹل ملٹن کی کھڑکیوں سے باہر فرینکفرٹ اپنے دریائے مائنز سمیت اونگھتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ ایک یخ بستہ شب نے اسے ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ بہت آہستگی کے ساتھ شوہر کے پہلو میں دراز ہو گئی..... ماضی کے طویل سفر نے اسے تھکا سا دیا تھا۔

☆☆☆

اگلا دن بھی بڑا چمکیلا اور سہانا تھا۔ چوتھی منزل کے اس... کمرے کی کھڑکیاں دریا کی طرف کھلتی تھیں۔ سورج کی کرنیں نیلگوں پانی پر اٹکھیلیاں کر رہی تھیں۔ فہد کی طبیعت زیادہ اچھی نہیں تھی، بلڈ پریشر بڑھا ہوا تھا۔ رابعہ نے ڈاکٹر کو فون کیا۔ اکرم نامی یہ پاکستانی ڈاکٹر اس ہوٹل کی ایڈمنسٹریشن کا حصہ تھا۔ اس نے آ کر فہد کا تفصیلی چیک اپ کیا۔ اس نے کہا۔ ''پریشانی کی بات نہیں۔ بس ''بی پی'' بار بار شوٹ کر رہا ہے۔ ہارٹ کا فنکشن نارمل ہی ہے۔ میں ایک انفیوژن لگا دیتا ہوں۔ انہیں پانی وغیرہ زیادہ دیں۔''

صبح کی ساری ادویات لینے کے بعد اور انفیوژن لگوانے کے بعد فہد آرام کرسی پر نیم دراز ہو گیا۔ رابعہ اس کے قریب کرسی پر بیٹھ گئی۔ اٹلی سے ارسلان کی کال آئی۔ دونوں نے کچھ دیر بیٹے سے باتیں کیں..... وہ پرسوں کے بجائے کل ہی یہاں آنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اپنی طبیعت کے پیش نظر فہد کو جلد گھر آ جانا چاہیے۔ تاہم فہد نے پروگرام میں اس تبدیلی کو ریجیکٹ کر دیا۔

فہد کی نگاہیں دریا اور اس سے آگے فرینکفرٹ کی اونچی نیچی خوبصورت عمارتوں پر جمی ہوئی تھیں۔ ان کے اوپر گہرا نیلا آسمان تھا جس پر مسافر طیاروں کی چھوڑی ہوئی سفید لکیریں تھیں۔ وہ کھوئے کھوئے سے نحیف لہجے میں بولا۔ ''رابعہ کبھی کبھی لگتا ہے کہ اب زندگی کی جمع پونجی ختم ہونے والی ہے۔ عمر کی اس سڑک پر کسی بھی وقت ڈی اینڈ کا سائن بورڈ نظر آ جائے گا۔''

رابعہ نے ناراض نظروں سے شوہر کو گھورا۔ وہ بولا۔ ''کل تم نے سر کی چوٹ والی بات چھیڑی تو بہت کچھ نگاہوں کے سامنے گھومنے لگا..... پتا نہیں کیوں اب دل چاہ رہا ہے کہ زندگی کے ان آخری ایام میں کچھ بھی تم سے چھپا کر نہ رکھوں۔ وہ راز بھی بتا دوں جو برسوں سے سینے میں ہے اور کبھی کبھی میرے ضمیر کو کچوکے بھی لگاتا ہے۔''

''میں آپ کی بات سمجھی نہیں فہد۔'' رابعہ نے اپنا ہاتھ فہد کے مرجھائے ہوئے ہاتھ پر رکھا۔

وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔ ''کوئی وقت تھا کہ میں تمہیں پیار سے قندھاری کہا کرتا تھا۔ یہ تمہاری خوبصورتی کے لیے ایک تشبیہ تھی تم میرے عشق کو پوری رات کا چاند کہا کرتی تھیں اور یہ بھی ایک تشبیہ تھی۔ میرا عشق چاند ہی تھا اور..... اب بھی ہے رابعہ! لیکن چاند میں ایک داغ بھی تو ہوتا ہے.....''

وہ یک ٹک، سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ کمرے میں اتر آنے والی خاموشی بوجھل ہو گئی۔

وہ عجیب لہجے میں کہنے لگا۔ ''رابعہ دل چاہتا ہے کہ آج تمہیں بتا دوں کہ میرے سر کی اس چوٹ کے پیچھے وہ بات نہیں تھی، جو تم سمجھتی رہی ہو۔ مجھے تھائی لینڈ سے آنے والے کسی پیکٹ یا پارسل کا انتظار نہیں تھا۔''

''مم..... میں سمجھ نہیں پائی۔'' رابعہ کی آنکھوں میں حیرت امڈ آئی۔

''ہاں رابعہ! مجھے تھائی لینڈ سے آنے والے پیکٹ کا انتظار نہیں تھا، مجھے لاہور ہی سے آنے والے ایک پیکٹ کا انتظار تھا۔ وہ پیکٹ..... وہ پیکٹ ایک..... عورت نے بھیجا تھا رابعہ۔'' فہد نے کراہ کر کہا اور ہانپ سا گیا۔

''عورت نے بھیجا تھا؟''

''اس کا نام تانیہ تھا رابعہ! ہمارے ہی آفس میں کام کرتی تھی۔ تھوڑی بہت ماڈلنگ بھی کرتی تھی۔ پہلے شوہر سے طلاق ہو چکی تھی..... یہ ان دنوں کی بات ہے، جب ارسلان اور شایان اسکول جانا شروع ہو گئے تھے۔ تم پھر امید سے تھیں اور اسد کی پیدائش ہونے والی تھی..... انہی دنوں تانیہ

سے میری راہ و رسم ہوگئی۔ دو تین ماہ میں ہی ہم ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے..... اور پھر ہم سے وہ غلطی بھی ہوئی جو نہیں ہونی چاہیے تھی..... ہرگز نہیں ہونی چاہیے تھی.....'' فہد ایک ہی سانس میں سب کچھ کہتا چلا گیا۔ اس کی آنکھوں میں کرب لہریں لے رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اعترافِ گناہ کے اس مرحلے سے جلد از جلد گزر جانا چاہتا ہے۔

رابعہ اپنی جگہ بے حس و حرکت بیٹھی سب سن رہی تھی۔ کھڑکیوں سے باہر دریا کی اچھلتی لہریں بھی جیسے ساکت نظر آنے لگی تھیں۔

فہد نے جیسے سہارے کے لیے رابعہ کا ہاتھ تھام لیا اور بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''وہ..... امید سے ہوگئی تھی..... وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی تھی مگر میں اتنا بڑا قدم نہیں اٹھا سکتا تھا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ گھر بسانے والی لڑکیوں میں سے نہیں ہے۔ میں نے اس سے ملنا جلنا چھوڑ دیا اور اس سے کہا کہ وہ ابارشن کرا لے۔ اس نے ابارشن کرا لیا..... اور پھر کچھ ہی دنوں میں ایک نیا شکار پھانس کر اس کے ساتھ ساؤتھ افریقا جانے کو تیار ہوگئی لیکن میرے خلاف اس کے دل میں جو نفرت اور عداوت پیدا ہو چکی تھی..... اس کا اظہار اس نے تمہارے نام بھیجے گئے اس پیکٹ سے کیا تھا۔''

یہاں تک پہنچ کر فہد نے چند گہری سانسیں لیں اور پھر ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے رابعہ کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''اس پیکٹ میں کچھ تصویریں تھیں..... کچھ خط تھے..... اور ابارشن کی رپورٹیں وغیرہ تھیں۔ یعنی اس نے وہ تمام ثبوت تمہارے نام send کر دیے تھے جو میرے اور اس کے تعلق کو پوری طرح ثابت کرتے تھے۔ مجھے اپنے اور اس کے ایک مشترکہ دوست کی زبانی پتا چلا کہ تانیہ نے وہ پیکٹ رابعہ کے ایڈریس پر روانہ کر دیا ہے۔ جس روز میں آفس سے ہانپا کانپا گھر پہنچا تھا، اسی پیکٹ کے لیے پہنچا تھا..... ہاں رابعہ میں اسی پیکٹ کے لیے پہنچا تھا..... تم..... سن رہی ہو ناں رابعہ؟''

''ہاں سن رہی ہوں۔'' رابعہ کی آواز جیسے کسی گہرے کنوئیں سے آئی۔

فہد نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن وہ پیکٹ اس دن نہیں آیا۔ دو تین دن بعد تک بھی نہیں آیا۔ تمہیں یاد ہوگا کہ دو تین دن میں گھر سے باہر ہی نہیں نکلا تھا۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ اس نے کون سی کوریئر سروس استعمال کی ہے۔ میں نے پیکٹ کو ٹریس کرنے کی کوشش کی۔ کئی دفتروں کے چکر لگائے۔ ان دنوں چھوٹی عید کی آمد بھی تھی۔ پوسٹ آفس اور کوریئر سروسز پر بے پناہ لوڈ تھا۔ ایسے میں اسائنمنٹ کبھی کبھی گم بھی ہو جاتی ہیں یا پھر کہیں غلط ایڈریس پر ڈلیور ہو جاتی ہیں۔ اس پیکٹ کا کچھ پتا نہیں چلا تاہم مشترکہ دوست کی زبانی ایک بار پھر تصدیق ہوئی کہ ساؤتھ افریقا جانے سے پہلے تانیہ نے وہ پیکٹ تمہارے نام پر بھیج دیا تھا۔ مشترکہ دوست کو تانیہ کی کال موصول ہوئی تھی جس میں اس نے میرے کرنٹ گھریلو حالات دریافت کرنے کی کوشش کی تھی۔''

یہاں تک کہتے کہتے فہد کو پھر شدید کھانسی شروع ہوگئی۔ رابعہ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے نیم گرم پانی پلایا۔ اس کے سینے کی مالش کی اور ان ہیلر کے تین چار ''پف'' دیے۔

کچھ دیر بعد وہ سنبھل گیا۔ اس کی بوڑھی گدلی آنکھوں میں آنسو تھے اور ایک دو قطرے رخسار کی جھریوں میں بھی چمک رہے تھے۔ اس کے پورے جسم میں ہلکی سی لرزش تھی۔ وہ اب خاموش ہوگیا تھا اور سوالیہ نظروں سے رابعہ کی طرف دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ جیسے اس کے دل کی کیفیت اس کے تاثرات سے جاننا چاہ رہا ہو مگر اس کا چہرہ کچھ ظاہر نہیں کر رہا تھا۔ وہ ہمیشہ سے ایسی ہی تھی۔ کتنی ہی دیر کمرے میں ایک نہایت بوجھل خاموشی طاری رہی۔ آخر اس خاموشی کو فہد نے ایک طویل سانس لے کر توڑا۔ ''رابعہ! میں جانتا ہوں، میں نے آج تمہیں بہت زیادہ..... تکلیف پہنچائی ہے لیکن میں کیا کرتا۔ ضمیر کا یہ بوجھ گا ہے بگا ہے مجھے بری طرح کچلتا مسلتا رہتا تھا اور کل شام کے بعد تو جیسے سارے مندمل زخموں کے منہ کھل گئے تھے اور یہ بوجھ بھی ناقابلِ برداشت ہوگیا تھا.....''

وہ خاموش تھی۔ فہد نے طویل توقف کے بعد پھر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''کیا..... میں امید رکھوں..... کہ تم اس بے وفائی کے لیے اپنے اس کمزور، بوڑھے اور بیمار شوہر کو..... معاف کر دو گی؟''

وہ ساکت و جامد بیٹھی رہی، پتھر کی مورتی کی طرح، کمرے کی خاموشی بوجھل تر ہوتی چلی گئی پھر دو آنسو پتھر کی اس مورتی کی آنکھوں سے ٹپکے۔ وہ فہد کا ہاتھ دبا کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''میں نے آپ کو بہت عرصہ پہلے معاف کر دیا تھا۔ شاید اسی دن..... جس دن آپ وہ پیکٹ ڈھونڈتے ہوئے آفس سے گھر پہنچے تھے۔''

فہد نے ٹھٹک کر اس کی جانب دیکھا، وہ سسکی۔ ''آج

آپ نے ذکر کیا ہے تو..... میں بھی بتا دیتی ہوں..... وہ پیکٹ مجھے اسی روز مل گیا تھا فہد۔''

کمرے کے اندر جیسے کوئی چیز زبردست چھناکے سے ٹوٹ گئی تھی۔ ہر طرف اس کی نادیدہ کرچیاں بکھر گئیں۔ وہ دونوں ساکت وجامد بیٹھے رہے۔ گردشِ دوراں تھمی سی ہوئی تھی۔ پھر رابعہ نے کھوئے کھوئے سے لہجے میں بات مکمل کی۔ ''چند دن بعد مجھے اسی تانیہ کی ایک فون کال بھی سباؤتھ افریقا سے آئی تھی۔ اس نے مجھ سے تصدیق چاہی تھی کہ پارسل مجھے ملا یا نہیں؟ میں نے اسے بتایا کہ مل گیا اور فون بند کر دیا تھا اور اس کے ساتھ ہی میں نے اپنی اور آپ کی زندگی کے اس تلخ باب کو بھی بند کر دیا تھا۔''

طویل وقفے کے بعد فہد گمشدہ لہجے میں بولا۔ ''میرے پاس آؤ..... رابعہ۔''

وہ گھٹنوں پر تھوڑا زور دے کر کرسی سے اٹھی اور کرسی کو فہد کی ایزی چیئر کے ساتھ لگا دیا۔ جب بیٹھی تو فہد نے اپنا سر اس کے شانے پر ڈال دیا..... اور پھر ایک دم ہچکیوں سے رونے لگا۔ یہ تشکر کے آنسو تھے۔ یہ آنسو جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہے تھے۔ ''رابعہ! تم ٹھیک ہی دعویٰ کیا کرتی تھیں، عورت کا دل بڑا ہوتا ہے۔ مرد اسے جرم بے گناہی کی سزا بھی دے دیتا ہے اور وہ اسے سنگین جرائم کی سزائیں بھی معاف کر دیتی ہے۔''

☆☆☆

پتا نہیں کیا بات تھی فہد جلد یہاں سے جانا نہیں چاہتا تھا۔ اگلے روز اس نے اسکائپ پر پھر اسلان اور ارم سے کہہ دیا کہ وہ ویک اینڈ تک مزید یہاں رہنا چاہتے ہیں۔ ارسلان اور ارم کو یہ بات ماننے ہی بنی تھی۔

رات کو کمرے کی کھڑکی میں سے فرینکفرٹ کی جگمگاتی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ فہد نے رابعہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھامتے ہوئے کہا۔ ''رابعہ! برسوں پہلے ارم والے واقعے سے تمہیں جو اذیت پہنچی تھی اس نے مجھے اپنی نظروں میں چھوٹا کر دیا تھا..... لیکن..... کل تم نے جو کچھ بتایا ہے اس نے مجھے اپنی نظروں میں بہت ہی چھوٹا کر دیا ہے۔''

رابعہ کو یہ بات بہت بری لگی۔ وہ کتنی ہی دیر خاموش بیٹھی رہی۔ فہد بے چین ہو گیا۔ تب رابعہ نے فہد کی کلائی پکڑ کر اس کا دایاں ہاتھ اپنے سر پر رکھا اور حتمی لہجے میں بولی۔ ''آپ چھوٹے ہوں گے تو میں خود کو آپ سے کہیں زیادہ چھوٹا محسوس کروں گی۔ میری بات یاد رکھیں۔ اگر آئندہ آپ نے پھر کبھی ایسی بات کہی یا ایسا خیال ذہن میں لائے تو میرا مرا ہوا منہ دیکھیں گے۔''

فہد نے صوفے پر بیٹھے بیٹھے اسے گلے سے لگا لیا اور وہ کتنی ہی دیر، اسی طرح ایک دوسرے کی آنکھوں کی نمی اپنے اپنے کندھے پر محسوس کرتے رہے۔

وہ پانچ چھ دن فہد اور رابعہ نے دریائے مائنز کے کنارے اسی ملٹن ہوٹل میں عجیب سی آسودگی میں گزارے۔ پتا نہیں کیوں رابعہ کو اور شاید فہد کو بھی لگ رہا تھا کہ وہ اب دونوں دوبارہ اکٹھے یہاں نہ آسکیں گے۔ اس روز کے بعد ان دونوں نے پھر کبھی ماضی کے اس واقعے کا ذکر نہیں چھیڑا جس کا تعلق فہد کے خزاں رسیدہ بالوں کے درمیان سے نمودار ہونے والے نشان سے تھا۔ وہ ماضی کے ہر دکھ کو بھول کر جیسے حال کے ان.... دنوں میں ہی زندہ رہنا چاہتے تھے۔

ہفتے کی نصف شب کو رابعہ نے محسوس کیا کہ فہد بستر پر کچھ بے چین سا ہے۔ وہ ایک نگاہ میں جان جاتی تھی کہ فہد کو کیا درکار ہے۔ وہ اٹھی فہد کے لیے ادرک کی، ہلکی چینی والی چائے بنائی اور بڑی خندہ پیشانی سے اس کے سامنے رکھ دی۔ حسب معمول اس نے چائے پینے میں فہد کی مدد بھی کی۔ نیپکن سے فہد کا منہ صاف کرنے کے بعد اس نے لائٹ مدھم کی اور پھر شوہر کے پہلو میں لیٹ گئی۔ وہ ایسے ہی ہر وقت فہد کی خدمت کے لیے کمربستہ رہا کرتی تھی۔

''شکریہ رابعہ!'' فہد نے کہا۔

''کس بات کا؟'' وہ مصنوعی ناراضگی سے بولی۔

''ہر بات کا۔'' فہد نے عجیب لہجے میں کہا۔

اس نے مسکرا کر اپنا ہاتھ فہد کے بازو پر رکھ دیا۔

اگلے روز فہد اس دنیا میں نہیں تھا۔ صبح نو بجے کے لگ بھگ رابعہ نے دیکھا۔ وہ بستر پر ٹیک لگانے والے انداز میں نیم دراز تھا۔ اس کے چہرے پر سکون تھا اور آسودگی تھی۔ رابعہ تڑپ گئی۔ اس نے دھڑکن ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ پھر ڈاکٹر اکرم کو فون کیا۔ وہ دو تین منٹ میں پہنچ گیا..... اس نے بھی موت کی تصدیق کر دی۔

وہ کچھ دیر ساکت وجامد کھڑی رہی، پھر جیسے بلک کر قالین پر بیٹھ گئی اور اپنا سر محبوب شوہر کے زانو پر رکھ دیا۔ اس کے کانوں میں کل رات کے الفاظ گونج رہے تھے۔

''شکریہ رابعہ۔''

''کس بات کا؟'' اس نے پوچھا تھا۔

''ہر بات کا۔'' فہد نے جواب دیا تھا۔

⌘⌘⌘

آپ نے ذکر کیا ہے تو..... میں بھی بتا دیتی ہوں..... وہ پیکٹ مجھے اسی روز مل گیا تھا فہد۔''

کمرے کے اندر جیسے کوئی چیز زبردست چھناکے سے ٹوٹ گئی تھی۔ ہر طرف اس کی نادیدہ کرچیاں بکھر گئیں۔ وہ دونوں ساکت وجامد بیٹھے رہے۔ گردشِ دوراں تھمی سی ہوئی تھی۔ پھر رابعہ نے کھوئے کھوئے سے لہجے میں بات مکمل کی۔ ''چند دن بعد مجھے اسی تانیہ کی ایک فون کال بھی سباؤتھ افریقا سے آئی تھی۔ اس نے مجھ سے تصدیق چاہی تھی کہ پارسل مجھے ملا یا نہیں؟ میں نے اسے بتایا کہ مل گیا اور فون بند کر دیا تھا اور اس کے ساتھ ہی میں نے اپنی اور آپ کی زندگی کے اس تلخ باب کو بھی بند کر دیا تھا۔''

طویل وقفے کے بعد فہد گمشدہ لہجے میں بولا۔ ''میرے پاس آؤ..... رابعہ۔''

وہ گھٹنوں پر تھوڑا زور دے کر کرسی سے اٹھی اور کرسی کو فہد کی ایزی چیئر کے ساتھ لگا دیا۔ جب بیٹھی تو فہد نے اپنا سر اس کے شانے پر ڈال دیا..... اور پھر ایک دم ہچکیوں سے رونے لگا۔ یہ تشکر کے آنسو تھے۔ یہ آنسو جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہے تھے۔ ''رابعہ! تم ٹھیک ہی دعویٰ کیا کرتی تھیں، عورت کا دل بڑا ہوتا ہے۔ مرد اسے جرم بے گناہی کی سزا بھی دے دیتا ہے اور وہ اسے سنگین جرائم کی سزائیں بھی معاف کر دیتی ہے۔''

☆☆☆

پتا نہیں کیا بات تھی فہد جلد یہاں سے جانا نہیں چاہتا تھا۔ اگلے روز اس نے اسکائپ پر پھر اسلان اور ارم سے کہہ دیا کہ وہ ویک اینڈ تک مزید یہاں رہنا چاہتے ہیں۔ ارسلان اور ارم کو یہ بات ماننے ہی بنی تھی۔

رات کو کمرے کی کھڑکی میں سے فرینکفرٹ کی جگمگاتی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ فہد نے رابعہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھامتے ہوئے کہا۔ ''رابعہ! برسوں پہلے ارم والے واقعے سے تمہیں جو اذیت پہنچی تھی اس نے مجھے اپنی نظروں میں چھوٹا کر دیا تھا..... لیکن..... کل تم نے جو کچھ بتایا ہے اس نے مجھے اپنی نظروں میں بہت ہی چھوٹا کر دیا ہے۔''

رابعہ کو یہ بات بہت بری لگی۔ وہ کتنی ہی دیر خاموش بیٹھی رہی۔ فہد بے چین ہو گیا۔ تب رابعہ نے فہد کی کلائی پکڑ کر اس کا دایاں ہاتھ اپنے سر پر رکھا اور حتمی لہجے میں بولی۔ ''آپ چھوٹے ہوں گے تو میں خود کو آپ سے کہیں زیادہ چھوٹا محسوس کروں گی۔ میری بات یاد رکھیں۔ اگر آئندہ آپ نے پھر کبھی ایسی بات کہی یا ایسا خیال ذہن میں لائے تو میرا مرا ہوا منہ دیکھیں گے۔''

فہد نے صوفے پر بیٹھے بیٹھے اسے گلے سے لگا لیا اور وہ کتنی ہی دیر، اسی طرح ایک دوسرے کی آنکھوں کی نمی اپنے اپنے کندھے پر محسوس کرتے رہے۔

وہ پانچ چھ دن فہد اور رابعہ نے دریائے مائنز کے کنارے اسی ملٹن ہوٹل میں عجیب سی آسودگی میں گزارے۔ پتا نہیں کیوں رابعہ کو اور شاید فہد کو بھی لگ رہا تھا کہ وہ اب دونوں دوبارہ اکٹھے یہاں نہ آسکیں گے۔ اس روز کے بعد ان دونوں نے پھر کبھی ماضی کے اس واقعے کا ذکر نہیں چھیڑا جس کا تعلق فہد کے خزاں رسیدہ بالوں کے درمیان سے نمودار ہونے والے نشان سے تھا۔ وہ ماضی کے ہر دکھ کو بھول کر جیسے حال کے ان.... دنوں میں ہی زندہ رہنا چاہتے تھے۔

ہفتے کی نصف شب کو رابعہ نے محسوس کیا کہ فہد بستر پر کچھ بے چین سا ہے۔ وہ ایک نگاہ میں جان جاتی تھی کہ فہد کو کیا درکار ہے۔ وہ اٹھی فہد کے لیے ادرک کی، ہلکی چینی والی چائے بنائی اور بڑی خندہ پیشانی سے اس کے سامنے رکھ دی۔ حسب معمول اس نے چائے پینے میں فہد کی مدد بھی کی۔ نیپکن سے فہد کا منہ صاف کرنے کے بعد اس نے لائٹ مدھم کی اور پھر شوہر کے پہلو میں لیٹ گئی۔ وہ ایسے ہی ہر وقت فہد کی خدمت کے لیے کمربستہ رہا کرتی تھی۔

''شکریہ رابعہ!'' فہد نے کہا۔

''کس بات کا؟'' وہ مصنوعی ناراضگی سے بولی۔

''ہر بات کا۔'' فہد نے عجیب لہجے میں کہا۔

اس نے مسکرا کر اپنا ہاتھ فہد کے بازو پر رکھ دیا۔

اگلے روز فہد اس دنیا میں نہیں تھا۔ صبح نو بجے کے لگ بھگ رابعہ نے دیکھا۔ وہ بستر پر ٹیک لگانے والے انداز میں نیم دراز تھا۔ اس کے چہرے پر سکون تھا اور آسودگی تھی۔ رابعہ تڑپ گئی۔ اس نے دھڑکن ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ پھر ڈاکٹر اکرم کو فون کیا۔ وہ دو تین منٹ میں پہنچ گیا..... اس نے بھی موت کی تصدیق کر دی۔

وہ کچھ دیر ساکت وجامد کھڑی رہی، پھر جیسے بلک کر قالین پر بیٹھ گئی اور اپنا سر محبوب شوہر کے زانو پر رکھ دیا۔ اس کے کانوں میں کل رات کے الفاظ گونج رہے تھے۔

''شکریہ رابعہ۔''

''کس بات کا؟'' اس نے پوچھا تھا۔

''ہر بات کا۔'' فہد نے جواب دیا تھا۔

⌘⌘⌘